انسانیت کی مسیحائی

تحریک پیام انسانیت کے قیام کے بعد اس کے جلسوں میں کی گئی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تقریروں کا مجموعہ

ترتیب وتدوین:

عبدالہادی اعظمی ندوی

ناشر:

دارالاشاعت، کراچی

ایڈیشن:

اکتوبر 2014ء

فہرست

عرض ناشر ۱۴
عرض مرتب ۲۲

۱

زندگی کا سب سے بڑا عذاب

(۲۳-۳۷)

انسان کا حوصلہ بڑھانے کے لیے سب سے بڑی ضرورت ۲۳
غلطیاں کرنا انسان کی فطرت کے خلاف نہیں. ۲۴
زندگی کا لطف ۲۴
ہماری اور آپ کی کہانی ۲۵
دنیا کی ایک بڑی بدقسمتی ۲۶
خلوص ومحبت کی طاقت ۲۷
آج ہر جگہ شک وشبہ کی فضا چھائی ہوئی ہے ۲۷
انسانیت کے زوال کی آخری چیز ۲۸
خطرناک ذہنیت ۲۹
ہمارے ملک کی موجودہ صورت حال ۳۰
ملک کے ساتھ ہی قوم کے ضمیر کو بھی آزاد کرانے کی ضرورت تھی ۳۰
ضمیر کی غلامی زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے.... ۳۱
ظلم ظلم ہے چاہے کوئی کرے ۳۲
آج پورے ملک میں بدعنوانی اور بدانتظامی کا دور دورہ ہے ۳۲
ہمیں کسی نے بنانے کی کوشش ہی نہیں کی. ۳۳
درخت اپنی فطرت کے مطابق ہی پھل دیتا ہے.. ۳۴
ایک اخلاقی مقدمہ ۳۴
ایک بڑی کوتاہی ۳۵
اخلاقی پستی اور انسانی زوال ۳۶
''خدا کی نگری'' سے پیام انسانیت کا آغاز ۳۶

۲

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

(۳۸-۵۰)

تاریخ انسانی کے کسی دور میں یہ نہیں ہوا.... ۳۸
کبھی کسی ملک کو جاہل اور بے پڑھے لکھے انسانوں نے تباہ نہیں کیا ۳۹
غلامی اور محکومی کے اسباب ۳۹
بیرونی حکومت اور ملکی حکومت کا فرق ۴۱
آپ کی کہانی کہنی ہے ۴۲
ایسی پستی ایسی گراوٹ ۴۳
منفی حب الوطنی ۴۴
اصلاح سے مایوسی خطرناک ہے ۴۵
نقار خانہ میں طوطی کی آواز ۴۶
آزادی کے بعد ۴۶
مسئلہ صرف ایک پارٹی کا نہیں ۴۷
ایک یا دو فرد سوسائٹی کو نہیں بگاڑ سکتے ۴۷
مصنوعی صورت حال ۴۸
بغاوت اور انقلاب کا نعرہ نہیں بلکہ اصلاح کا نعرہ. ۴۸

خوفِ خدا اور حب الوطنی ۴۸
یورپ آج جذبۂ حب الوطنی کی وجہ سے باقی ہے . ۴۹
مسلمانوں کی دوہری ذمہ داری ۴۹

۳

خدا نسل انسانی سے مایوس نہیں

(۵۱-۵۹)

خدا کا معاملہ نسل انسانی کے ساتھ ۵۱
انسان کا معاملہ انسان کے ساتھ ۵۱
سب سے حسین اور دلآویز تخلیق انسان کی ہے. ۵۲
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں .. ۵۲
انسان کی سب سے انمول چیز ۵۳
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے ۵۴
وہ دل انسان کا دل نہیں جس پر کبھی درد کی چوٹ نہ لگے ۵۴
آج خطرہ اندرونی ہے ۵۵
بارات بے نوشہ نہیں ۵۶
اس شاخ کی فکر کیجیے جس پر آشیانہ ہے... ۵۷
انسان کی حقیقت سے ناآشنا ۵۷
نحیف آواز نے انقلاب برپا کر دیا ۵۸
اس وقت کا سب سے بڑا کام ۵۹

۴

ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا

(۶۰-۶۸)

زندگی کا دستور العمل ۶۰
انصاف بے رنگ ہوتا ہے ۶۲
عالمی بگاڑ کا سبب ۶۳
دو سبق آموز واقعات ۶۴
ہندوستان کی زمین تیار کیجیے! ۶۶
دلوں میں جگہ پیدا کیجیے! ۶۷

۵

ذرائع کی افادیت نیک مقاصد پر منحصر ہے

(۶۹-۸۵)

میں اپنی خوشی آپ سے چھپا نہیں سکتا ۶۹
اپنے ملک کی بپتا اپنے ملک کی کہانی ۷۰
ذرائع اور وسائل ۷۲
ذرائع کی ترقی کا دور ۷۲
ذرائع خدا کی نعمت ہیں ۷۳
صرف وسائل و ذرائع ہی کافی نہیں ۷۴
اخلاقیات سائنس کا موضوع نہیں ۷۶
آج کی دنیا کا سانحہ ۷۶
ذرائع اور مقاصد کی ہم آہنگی ۷۷
جب ذرائع کم تھے لیکن مقاصد اعلیٰ تھے .. ۷۸
اس صدی کی سب سے بڑی ٹریجڈی ۷۹
تنہا ذرائع کچھ نہیں کر سکتے ۸۰
سائنس کا مست ہاتھی ۸۰
مثالی حکمراں ۸۱
اصل ضرورت ۸۱
میں ترقی کا مخالف نہیں ۸۲
انسانیت کا سفینہ گرداب میں ۸۳
فقیرانہ آئے صدا کر چلے ۸۴
امید کی کرن ۸۵

۶
انسانی معاشرہ کو تباہی سے بچائیں
(۸۶-۹۱)

میری زندگی کا تاریخی دن ۸۶
لیڈرشپ قانون داں طبقہ کے ہاتھ میں .. ۸۶
موت وحیات کی جنگ ۸۷
سب ڈوب جائیں گے ۸۸
آپ میدان میں نکل آئیں.............. ۸۸
ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں ۸۹
حیرت کی بات ۹۰

۷
جب پڑھے لکھے آدمی پر ہسٹیریا کا دورہ پڑتا ہے
(۹۲-۱۰۶)

میں اپنی خوشی ظاہر کرنا چاہتا ہوں ۹۲
زندگی تکلیف دہ اور خوش کن واقعات کا مجموعہ ہے ۹۲
کسی انسان کے لیے سب سے زیادہ دل شکن
اور حوصلہ شکن چیز ۹۳
علم وادب کا سارا ذخیرہ اسی قدر دانی کا نتیجہ ہے . ۹۳
انسان کے لیے سب سے بڑی سزا ۹۴
جیل خانہ جیل خانہ کیوں معلوم ہوتا ہے؟.. ۹۴
ہماری فطرت خراب نہیں اوپر کی چیزیں خراب ہیں ۹۵
ملک میں احساس ذمہ داری اور محبت واعتماد کی کمی ۹۵
آخر انسان کو ہو کیا جاتا ہے؟............ ۹۶
انسان کی ترقی کے مدارج ۹۷
آج ایک غلط نعرہ ہم کو پاگل بنا دینے کے لیے
کافی ہے ۹۸
جانور بھی اتنی سمجھ رکھتے ہیں کہ ذی شعور ذمہ دار ہے ۹۹
انسان انسان پر حملہ کیسے کر سکتا ہے؟ ۹۹
ایک پہیلی ۱۰۰
اگر تعلیم سب کچھ کرتی ہے مگر آدمی کو آدمی نہیں
بناتی ۱۰۰
انسان اندر سے بنتا ہے باہر سے نہیں بنتا.. ۱۰۰
انسانیت کے بیش بہا نمونے ۱۰۱
ہم نے جو کچھ کھویا ہے اندر کھویا ہے ۱۰۳
چیز جہاں کھوتی ہے وہیں ملتی ہے......... ۱۰۴
انسانیت مری نہیں سوئی ہوئی ہے ۱۰۴
سب نارمل حالات میں ہوا ہے.......... ۱۰۵
مایوس ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ۱۰۵

۸
دو راستے
(۱۰۷-۱۱۷)

بہت بڑا امتحان ۱۰۷
کھلا ہوا چمن ۱۰۸
اس دنیا میں دو راستے ہیں ۱۰۹
زندگی کیا اسی کا نام ہے؟ ۱۱۰
خلوص سے خالی، خود غرضی پر مبنی ۱۱۱
خود غرضی کی بھی قسمیں ہیں ۱۱۱
خلوص کی جنتری چل رہی ہے ۱۱۲
جو دشمنی کرے اس سے دوستی کر ۱۱۲
بادشاہوں نے گردنیں جھکوالیں لیکن دل جھکانے
میں کامیاب نہیں ہوئے ۱۱۳
خلوص دماغ کی چیز نہیں بلکہ دل اور روح کی چیز ہے ۱۱۴

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے ۱۱۴
یہ ملک دوسرے ممالک کی رہنمائی کرسکتا ہے .. ۱۱۴
آج کسی کے اندر کام کرنے کی امنگ نہیں . ۱۱۵
آج دو چیزیں زندہ ہیں ۱۱۵
اہلِ مرادآباد کو مبارک باد ۱۱۶
اصل قیمت دل کی بات کی ہے ۱۱۶
ظلم ظلم ہے چاہے کسی کے ساتھ کیا جائے .. ۱۱۶

۹

دنیا میں آنے والے انسان- چمن کے کانٹے یا پھول؟

(۱۱۸-۱۳۲)

نئے مہمانوں کی آمد............ ۱۱۸
خدا نسل انسانی سے مایوس نہیں............ ۱۱۹
نوشتۂ دیوار ۱۱۹
نگاہوں کا جادو ۱۲۰
خدا کی بردباری دیکھیے ۱۲۲
علم نے کیا فائدہ پہنچایا؟ ۱۲۲
خطرہ مول لینا پڑتا ہے............ ۱۲۳
ایک بلیغ مثال ۱۲۴
ہمارا سماج ڈانواں ڈول............ ۱۲۵
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے ۱۲۷
سوسائٹی کے زوال کا آخری نقطہ ۱۲۷
ہم اور آپ ایک ہی کشتی کے سوار ہیں ۱۲۷
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں ۱۲۸
ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں ۱۲۸
ظلم کو خدا برداشت نہیں کرتا............ ۱۲۹
قصور کرے کوئی مارا جائے کوئی!! ۱۲۹
ہزار چیتوں سے زیادہ خونخوار ۱۳۰
کیا زمانہ میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟ ۱۳۰
یہ لمبی نیند ہے ۱۳۱
کیا ہم فسادات کی خبریں ہی سننے کے لیے زندہ رہ گئے؟ ۱۳۲

۱۰

اس ملک کو تباہی سے بچائیے!

(۱۳۳-۱۴۶)

تشویش کی اصل بات ۱۳۳
ملک وملت اور تہذیب وتمدن کو تباہی سے صرف دو طبقے بچا سکتے ہیں ۱۳۶
دانشور طبقہ کی خصوصیت ۱۳۷
علم کی فطرت ۱۳۸
وہ دانشور طبقہ جو کسی ملت یا معاشرہ کا سب سے بڑا حصار ہوتا ہے............ ۱۳۹
روشن ضمیر مذہبی دانشوروں کی بے لوث قیادت ۱۴۰
سیاسی طرز فکر اس فساد کا سب سے بڑا ذمہ دار ۱۴۰
نازک صورت حال............ ۱۴۱
ڈوبتی کشتی کے آخری ملاح ۱۴۲
اصل کشمکش ۱۴۲
نازک دور میں ہندوستان کی قیادت اور اس کے روشن کارنامے ۱۴۳
صرف سیاسی جوڑتوڑ اور دَل بدلی ۱۴۳
ملک کے لیے منحوس ترین دن............ ۱۴۴
عصر حاضر کی ذہنیت ۱۴۴
اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موج تند جولاں بھی .. ۱۴۵
حرف آخر............ ۱۴۶

۱۱
ہمارا ملک جل رہا ہے
(۱۴۷-۱۵۸)

گذشتہ اور تا قیامت آنے والے دوروں کی صحیح عکاسی اور تصویر کشی ۱۴۷
﴿أُولُوا بَقِيَّةٍ﴾ کا مفہوم ۱۴۸
تشویش ناک صورت حال ۱۴۹
انبیاء کے جانشین یہی ﴿أُولُوا بَقِيَّةٍ﴾ ہیں ۱۵۰
حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی خدمات ۱۵۰
مذہبی طبقہ کا صرف ذاتی عبادات میں ہی مشغول رہنا کافی نہیں ۱۵۱
موجودہ حالات میں آپ کا فرض ۱۵۱
ایک بڑی خدمت اور سعادت ۱۵۳
تحریک پیام انسانیت انہی ﴿أُولُوا بَقِيَّةٍ﴾ کی تلاش میں ہے ۱۵۳
ہم ظالم کی مدد کیسے کریں؟ ۱۵۳
وہ کیریکٹر جو اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے ... ۱۵۵
پورا ملک زیر وزبر ہو رہا ہے.............. ۱۵۶
پیام انسانیت ۱۵۷
اصل تشویش اور فکر کی بات ۱۵۷
دو باتیں ۱۵۸

۱۲
ملک کا حقیقی مسئلہ اور اس کے لیے اصل خطرہ
(۱۵۹-۱۷۵)

تعمیری کاموں اور خدمت انسانی کا سب سے بڑا محرک اور راز ۱۵۹
انسان کی فطرت سلیم پر یقین واعتماد ۱۵۹
عالم انسانی میں سب سے زیادہ خطرناک اور تشویش انگیز بات ۱۶۰
ظلم ملک ومعاشرہ کے لیے سب سے بڑا خطرہ ۱۶۰
اندر کا ظلم وزیادتی باہر والوں کے ظلم وزیادتی سے زیادہ تباہ کن اور خطرناک ۱۶۱
ملک کی طاقت کا حقیقی سرچشمہ ۱۶۲
ہمارے ملک نے ہر دور میں معلم و مصلح اور روحانی لوگ پیدا کیے ۱۶۲
ہندوستان کے روشن دماغ اور بیدار ضمیر کی آواز ۱۶۳
آگ لگی ہوئی ہے اسے بجھائیے!! ۱۶۴
ملک کی داخلی کمزوری اس کے لیے ہلاکت آفریں ثابت ہوسکتی ہے ۱۶۵
تنہا تعلیم درندگی اور مجرمانہ حرکتوں کی طرف میلان کا تدارک نہیں ۱۶۶
اپنے فرقہ اور اپنے ساتھیوں کا بے لاگ اخلاقی محاسبہ کرنے اور ان کی خبر لینے کے بجائے دوسرے فرقہ کو وعظ ونصیحت ۱۶۷
اب معمولی اخلاق اپیلوں یا حکومتی انتظامات سے کام نہیں چل سکتا ۱۶۸
ایک جھوٹا سچا نعرہ ہزاروں انسانوں کو پاگل بنا سکتا ہے ۱۶۸
قوم کی تعمیر اور شعور وضمیر کی تربیت میں مجرمانہ کوتاہی ۱۶۹
ہندوستان تاریخ کے ایک نازک موڑ اور فیصلہ

کن دوراہے پر ۱۶۹
انسانیت کا آخری سہارا دو طبقے ہیں ۱۷۰
چار نکاتی (ہمہ گیر اور طویل المیعاد) پروگرام کی ضرورت ۱۷۱
انوکھی معذرت ۱۷۵

۱۳

مختلف مذاہب اور تہذیبوں کے دیس میں زندگی گزارنے کا طریقہ

(۱۷۶-۱۸۵)

عشق ہے پیارے کھیل نہیں ہے ۱۷۶
ہمارے اندر اخلاق کی جہانگیری ہونی چاہیے .. ۱۷۸
اس دنیا میں جو کچھ خیر ہے وہ سب پیغمبروں کا صدقہ ہے ۱۷۸
مجھے فسادات کے پیچھے بھی پیسے کی محبت ہی نظر آتی ہے ۱۷۹
حقائق کا سامنا کرنا چاہیے ۱۸۰
آج ہمارا ملک سخت خطرے سے دوچار ہے . ۱۸۰
آج سارا ملک دو کیمپوں میں تقسیم ہے ۱۸۱
وہ فساد جو گھر گھر ہو رہا ہے ۱۸۱
یہ راستہ کوئی پھولوں کی سیج نہیں ہے ۱۸۲
اس انسانیت میں کوئی مزہ ہے؟ ۱۸۲
انسانیت کا انتہائی زوال ۱۸۳
جو چیز رہنے والی ہے اس سے رشتہ جوڑو . ۱۸۳
یہ پیام انسانیت پیغمبروں کا پیام ہے ۱۸۴
پیام انسانیت کو ہندوستان کے گوشہ گوشہ تک پہنچائیے ۱۸۴

۱۴

ملک کا خطرناک رخ اور دانشور طبقہ کی ذمہ داری

(۱۸۶-۲۰۳)

اصل فکر و پریشانی کی بات اور خطرناک صورت حال ۱۸۷
انسانیت کی کھیتی ہر زمانہ میں کھاد چاہتی ہے ۱۸۸
انسانیت کی بقا کی حقیقی ضمانت ۱۸۸
سماج کی اصل روح ۱۸۹
سماج کے لیے سب سے بڑا خطرہ ۱۸۹
ذوق سلیم نے بارہا دھوکا کھایا ہے لیکن قلب سلیم دھوکا نہیں کھاتا ۱۹۰
اخلاقی تربیت اور اس کی کامیابی کا آخری نمونہ ۱۹۱
اخلاقی جرأت و غیر جانب داری اور خلوص کی طاقت ۱۹۱
اس وقت کی ضرورت ۱۹۲
اسباب کے پیچھے اسباب ۱۹۳
اس ملک کی اخلاقی قیادت کا جھنڈا بلند کریں ۱۹۴
ایک زریں موقع ۱۹۵
مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے ۱۹۵
انسانی ضمیر کے کارنامے ۱۹۶
انسانیت کی ڈوبتی کشتی ہمیشہ انھی لوگوں نے بچائی ہے ۱۹۷
ہمارے ملک اور جاں بلب معاشرے کی اصل ضرورت ۱۹۸
ہر وقت کی ایک دعوت اور ضرورت ہوتی ہے .. ۱۹۹

ملک کی اخلاقی گراوٹ ۲۰۰
ظلم سلطنتوں، تہذیبوں اور معاشروں کے لیے
پیغام موت ہے ۲۰۰
ہماری سوسائٹی کا روگ ۲۰۱
تو ہما کا ہے شکاری ابھی ابتدا ہے تیری ۲۰۲

۱۵

محبت کے ماحول میں جینا سیکھئے پھر زندگی کا مزہ دیکھئے!

(۲۰۴-۲۱۵)

انسان سب سے زیادہ محبت اور پیار کا بھوکا ہے ۲۰۴
اس زمانہ کی ایک بہت بڑی بیماری ۲۰۵
تم ایک سوئی لائے ہوتے!! ۲۰۵
سب سے بڑی قینچی ۲۰۶
زیر قلمت ہزار جان است ۲۰۶
ہمارے سماج کا زہر ۲۰۸
خوف اور نفرت کا فلسفہ ۲۰۸
نفرت کی کاشت کی جارہی ہے ۲۰۹
ہماری ایک کمزوری ۲۱۰
محبت کے کرشمے ۲۱۱
محبت کے ساتھ جینا سیکھئے ۲۱۲
ایک واقعہ ۲۱۳
نقار خانہ میں طوطی کی آواز ۲۱۴
اعتماد کی فضا پیدا کیجیے!! ۲۱۴

۱۶

اعتماد و اطمینان کا ماحول پیدا کیجیے!

(۲۱۶-۲۲۹)

معتدل اور خوشگوار حالات بہت بڑی نعمت ہیں ۲۱۶
امن و امان اور محبت و اعتماد کا شامیانہ ۲۱۷
امن بہت بڑی نعمت ہے ۲۱۸
معتدل حالات پیدا کیجیے! ۲۱۹
سب سے پہلے کرنے کا کام ۲۲۰
اس زمانہ کا مرض ۲۲۱
پوری زندگی لاٹری بن گئی ہے ۲۲۲
ہماری خرابیوں کا اصل سبب ۲۲۳
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں ۲۲۴
مجھے تعجب ہے ۲۲۵
دشمن ہمارے اندر چھپا ہے ۲۲۵
اپنے ملک میں آکر خوشی نہیں ہوتی ۲۲۶
اب بس ایک چیز رہ گئی ہے ۲۲۸
ہماری ذمہ داری ۲۲۸

۱۷

انسانی معاشرہ میں عدل واحسان کی اہمیت

(۲۳۰-۲۳۷)

بھرے بازار اور شاہراہ عام پر کی جانے والی
بات کی اہمیت و تاثیر ۲۳۰
معتدل و پرسکون حالات وفضا کی ضرورت ۲۳۱
اس عہد اور معاشرہ کی سب سے بڑی کمی. ۲۳۲
خود غرضوں اور دولت پرستوں کی سنگ دلی اور
انسانیت کی پامالی ۲۳۴
آدمیت پیدا کیجیے ۲۳۴
عدل و احسان کی برکت ۲۳۵
خود غرضی ساری خرابیوں کی جڑ ہے ۲۳۶
کیا انسان ہی مارنے کے لیے رہ گیا ہے؟ ۲۳۶
راجا بکرماجیت کا نام کیوں زندہ ہے؟ ... ۲۳۷

۱۸

مسلمانوں کے مسائل وجذبات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے!

(۲۳۸-۲۶۴)

ڈائلاگ کی ضرورت وافادیت ۲۳۸
مختلف قوموں کی ایک دوسرے سے لاعلمی یا ناقص واقفیت اور اس کے اثرات ونقصانات ۲۳۸
مسلمانوں کی بنیادی خصوصیتیں ۲۴۱
مسلمانوں کی پہلی بنیادی خصوصیت: معین عقیدہ، اور مستقل دین وشریعت ۲۴۱
دینی تسلسل اور اپنی اولاد ونسل کی دینی تعلیم کی اہمیت کی وجہ ۲۴۳
مسلم پرسنل لا کی اہمیت کی وجہ ۲۴۵
مسلمانوں کا اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق .. ۲۴۵
قرآن مجید سے تعلق ۲۴۷
گاندھی جی کی بالغ نظری اور اس کا فائدہ. ۲۴۸
برعکس اور ناقابل فہم طرز عمل ۲۵۱
ملک کے لیے صحیح اور محفوظ راستہ.......... ۲۵۷
ملک کے لیے تین بڑے خطرے ۲۵۷
اصول پسندی کی ایک روشن مثال......... ۲۵۹
تیسری چیز جو فوری توجہ کی مستحق اور تشویش کا باعث ہے ۲۶۰
ہندوستانی پریس اور اخبار نویسوں سے شکایت ۲۶۱

۱۹

ملک کی نازک صورت حال اور محبان وطن کی ذمہ داری

(۲۶۵-۲۷۶)

ہر انسان کے دو گھر ہوتے ہیں ۲۶۵
آپ کے گھر کی قسمت ملک سے وابستہ ہے . ۲۶۶
گھر کے باہر کی فضا کا سازگار ہونا ضروری ہے . ۲۲۶
ایک مثال ۲۶۷
مستقل طور پر ساتھ رہنے والی چیز باہر کی کائنات اور ماحول ہے ۲۶۷
نفس پرستی اور دولت پرستی کا نتیجہ پورے معاشرہ پر پڑتا ہے ۲۶۸
اس وقت کا سب سے بڑا مرض ۲۶۹
صرف اپنے گھر کی فکر کر لینا اور اس کو مثالی بنا دینا کافی نہیں ۲۷۰
اہل وطن کی ذمہ داری.................. ۲۷۰
حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کا واقعہ .. ۲۷۱
سیدھوں کے ساتھ سیدھا اور ٹیڑھوں کے ساتھ بھی سیدھا ۲۷۱
اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت ... ۲۷۲
کسی سماج کی اخلاقی ترقی وتنزلی کا تھرمامیٹر. ۲۷۳
مسلمانوں نے اپنے فرض کو ادا کرنے میں کوتاہی کی ۲۷۴
ملک سو گیا ہے مرا نہیں ہے ۲۷۵

۲۰

غیرت ورحمت الٰہی کائنات کے بگاڑ کو پسند نہیں کرتی

(۲۷۷-۲۸۰)

انسانیت کی پستی ۲۷۷
ہر دور میں خدا شناسی اور انسانیت دوستی کا سبق دینے والے پیدا ہوتے رہے ۲۷۸

غیرت مالک کون و مکان اور رحمت خالق
انسان ۲۷۸
تشدد اور رشوت خوری و بدانتظامی ۲۷۹
ملک کو برباد کرنے والے دو دشمن ۲۷۹
تشدد کا رجحان ملک کے لیے تباہی اور بربادی کا
پیش خیمہ ۲۸۰

۲۱
غلطی کو غلطی تسلیم نہ کرنا خطرناک ہے
(۲۸۱-۲۸۶)

غلطی کرنا اور بیمار ہونا کوئی خلاف فطرت بات
نہیں ۲۸۱
ملک کے ایک عظیم دانشور کے دکھتے ہوئے دل
کی کراہ ۲۸۱
اس ملک کو دنیا کی اخلاقی قیادت کرنا چاہیے ۲۸۳
دنیا کی اخلاقی قیادت کا تخت آج خالی ہے ۲۸۴
تاریخ ایک سویا ہوا شیر ہے اس کو جگانا نہیں
چاہیے ۲۸۵

۲۲
یہ ملک ڈوب رہا ہے
(۲۸۷-۲۹۴)

ایک معمہ یا دو متضاد پہلو ۲۸۷
تاریخ کا سبق ۲۸۸
ملک ڈوب رہا ہے ۲۸۸
زبان معجز بیانی سے ترجمانی ۲۸۹
جب آگ لگتی ہے تو سب کے گھر جلا کر خاک
کر دیتی ہے ۲۹۱
احساس ذمہ داری کی ضرورت ۲۹۱
خدا کے پیغمبروں کا مشن ۲۹۲
مذہبی طبقہ کی خصوصیات اور ذمہ داری ۲۹۲
اہم ضرورت ۲۹۲
یک لحظہ غافل بودم ۲۹۳
امید کی کرن ۲۹۴

۲۳
ملک و معاشرہ کا سب سے خطرناک مرض ظلم و سفاکی
(۲۹۵-۳۱۱)

امیر جمع ہیں احباب درد دل کہہ لے ۲۹۵
بعض اوقات کسی مظلوم کی آہ سے پورے دور کا
خاتمہ ہو گیا ۲۹۵
کیا شکار بنانے کے لیے صرف انسان ہی رہ گیا ہے؟ ۲۹۶
سب سے زیادہ ڈرنے والی چیز ۲۹۷
پورے پورے ملک اور عہد پر دورہ پڑ جانا کوئی
انوکھی اور تعجب خیز بات نہیں ۲۹۸
اصل ڈرنے کی بات ۳۰۰
دورے تو پڑتے رہتے ہیں ۳۰۰
جو چیز ہوتی ہے اس کا ذکر بھی کرنا پڑتا ہے . ۳۰۱
انسان ہی اس دنیا کی رونق و بہار ہے ... ۳۰۲
انسان جب بھیڑیا بن جائے تو آپ کا دل
کیوں نہیں دکھتا؟ ۳۰۳
کرو مہربانی تم اہل زمیں پر ۳۰۳
مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ۳۰۴
اس جنون کو دور کرنے والوں کی ضرورت ۳۰۴

ایجوکیشن، پولیس اور پریس اگر درست ہو جائیں .. ۳۰۵
بیماری پھیلنے سے نہ گھبرائیے ۳۰۶
سیکولرزم، ڈیموکریسی اور عدم تشدد ۳۰۷
تاریخ کو الٹا سفر کرانا بڑی غلطی ہے ۳۰۸
دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو...... ۳۰۹
ہر ملک تہذیب اور ہر عہد کے لیے خطرناک بات . ۳۱۰

۲۴

ملک کی آزادی کا صحیح مطلب اور فائدہ

(۳۱۲-۳۱۸)

حضرت سید احمد شہیدؒ اور تحریک آزادیٔ ہند ۳۱۲
آج غلامی کے دور کو یاد کیا جانے لگا ہے . ۳۱۴
اس سے زیادہ شرم کی کوئی بات نہیں ۳۱۶
یہ میکدہ کی یہ ساقی گری کی ہے توہین ۳۱۷

۲۵

ظلم کا انجام

(۳۱۹-۳۳۷)

یہ دنیا اعتبار پر چل رہی ہے ۳۱۹
صحت اور بیماری انسان کی زندگی کی علامت ہیں ۳۲۰
پورے سماج اور ملک کا بیمار ہونا کوئی نئی بات نہیں ۳۲۰
پیغمبر پوری انسانیت کا چارج لیتے تھے .. ۳۲۲
بڑا خطرہ ۲۲۳
کیا خدا کی غیرت اتنی بھی نہیں؟ ۲۲۴
انسانیت کے بیش بہا نمونے ۲۲۵
ضرورت ہے کہ کچھ لوگ دیوانے و بے قرار ہو کر نکلیں ۲۲۶
اپنے شہر ہی نہیں بلکہ پورے ملک کی فکر کریں . ۲۲۸
اس ملک کو بربادی سے بچائیے ۲۲۹
اپنی اپنی دسترس کے مطابق ملک کو بچانے کی کوشش کریں ۲۲۹
آگ کو جب کچھ کھانے کو نہیں ملتا تو وہ خود کو کھانے لگتی ہے ۳۳۱
زندگی کا مزہ صرف کھانے پینے سے نہیں ہے ۳۳۳
محبت کے گیت ۳۳۴
انسان انسان پر حملہ کیسے کرسکتا ہے؟ ۳۳۵
مقصد اور ذرائع دونوں صحیح ہونے چاہئیں . ۳۳۶

۲۶

اس وقت ملک کو بربادی سے بچانے کے لیے دیوانوں کی ضرورت ہے

(۳۳۸-۳۴۷)

ایک چونکا دینے والی آیت ۳۳۸
جب نسل انسانی خودکشی پر آمادہ تھی ۳۳۹
انسانیت کے محسن............ ۳۳۹
اس وقت چار چیزوں کی پرستش ہو رہی ہے . ۳۴۰
جغرافیائی نقشہ کے بجائے اخلاقی نقشہ ... ۳۴۱
اس ملک کو دیوانوں کی ضرورت ہے ۳۴۲
ملک ہے تو سب کچھ ہے ۳۴۲
انسانیت کی محبت، ایثار، قربانی اور استغناء کی دولت ۳۴۲
پوری انسانیت کو بچانا آپ کا فرض ہے . ۳۴۳
اس ملک کو ڈوبنے سے بچائیے ۳۴۴
صحافت کا کردار ۳۴۴
اصل ہے انسانی ضمیر اور اخلاقی اصول ... ۳۴۵

زمانہ آپ کا منتظر ہے.................. ۳۴۶
مسلمانوں کی ذمہ داری................. ۳۴۷

۲۷
ملک کی فکر کیجیے!
(۳۵۱-۳۴۸)

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن ۳۴۸
ملک کی خطرناک صورت حال.......... ۳۴۹
آگ کو جب کچھ کھانے کو نہیں ملتا.......... ۳۵۰

۲۸
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
(۳۶۰-۳۵۲)

اللہ کے نام سے........................ ۳۵۲
صفات رحمت زندگی کا رخ متعین کرتی ہیں ۳۵۳
رحمت الٰہی ہر چیز پر سایہ فگن ہے........ ۳۵۳
کرو مہربانی تم اہل زمیں پر................ ۳۵۴
زمین میں بگاڑ نہ پیدا کرو.............. ۳۵۴
ظلم وزیادتی معاشرے کو کھا جاتی ہے... ۳۵۴
تاریخ کا دردناک سبق.................. ۳۵۵
مذہب امن کا پیامبر ہوتا ہے........... ۳۵۶
خدا کا قانون یکساں ہے.................. ۳۵۶
سب سے زیادہ خوش قسمت ملک ۳۵۷
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے ۳۵۷
خدائی تعلیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہوتی ہے.......................... ۳۵۷
ہندوستان محبت کی سرزمین ہے.......... ۳۵۸
مثالی جگہ بنائیے...................... ۳۵۸
ملک بچانے کا واحد راستہ.............. ۳۵۹
محبت کو عام کیجیے...................... ۳۶۰

۲۹
انسانیت کی بقا و تحفظ کی فکر
(۳۶۴-۳۶۱)

تعجب کی بات........................ ۳۶۱
ہماری ذمہ داری...................... ۳۶۲
ترقیات کے پردے میں تنزل وانحطاط ۳۶۳
آج کی ضرورت...................... ۳۶۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی حکمت وبصیرت اور دور اندیشی عطا فرمائی تھی، مولانا کے خیال میں اتنے طویل وعریض ملک میں جس میں اکثریت غیروں کی ہو، ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا، اور خاص طور پر ایسے ماحول میں جہاں بدگمانیاں بڑھ رہی ہوں، اور سیاسی صف بندیاں ہورہی ہوں اور اکثریت کے طبقہ میں مسلمانوں کے بارے میں توحش وتنفر پیدا کیا جارہا ہو، خاموش تماشائی بن کر رہنا بڑے خطرہ کا پیش خیمہ بن سکتا تھا، اسی طرح اشتعال انگیز تقریریں آگ پر تیل چھڑکنے کے مترادف تھیں، جس سے پورا ملک آگ کی بھٹی میں تبدیل ہوسکتا تھا، جس کے بعد کسی کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ ایسی صورت حال میں اس کی شدید ضرورت تھی کہ اعتماد کا ماحول پیدا کیا جائے، اور امن وامان کی فضا بحال کی جائے، اس کے بغیر دینی، تعلیمی کوششیں، رفاہی ادارے اور انجمنیں کسی کی کوئی ضمانت نہیں تھی، آزادی کے بعد ہی حضرت مولاناؒ نے اس ضرورت کو محسوس کرکے مخلوط اجتماعات کا سلسلہ شروع فرمایا جس کے بڑے اثرات مرتب ہوئے تھے، مگر بعض مجبوریوں کی بنا پر یہ سلسلہ جاری نہیں رہ سکا تھا، لیکن مولانا کو اس کی ضرورت کا بڑا احساس تھا۔

حضرت مولانا پیام انسانیت سے متعلق دیے گئے انٹرویو میں خود فرماتے ہیں :

> "میں اس بات کے سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ یہ اخلاقی سدھار کی مہم اور پیام انسانیت کی تحریک، ملک کے تمام دینی، تعلیمی، علمی کوششوں اور تحریکوں کے لیے ایک حصار کی حیثیت رکھتی ہے جس کے اندر رہ کر ہر کوشش کامیاب ہوسکتی ہے، اور اس کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے پرسکون اور معتدل فضا مہیا ہوگی، اس لیے اس تحریک کو میں ہر تحریک کا خادم اور معاون سمجھتا ہوں۔"

حضرت مولانا کا خیال یہ تھا کہ اکثریت کے سامنے اسلام کے تعارف کا بھی یہی راستہ ہے کہ پہلے ان تک پہنچا جائے، اور ان کے سامنے ایسی مشترک باتیں رکھی جائیں کہ وہ خود متوجہ ہوں،

اس سلسلہ میں ایک جگہ وہ تحریر فرماتے ہیں :

''غیر مسلم اکثریت کے ان افراد کو متوجہ کرنے اور ان کے ذہن و ضمیر تک پہنچنے کا کوئی راستہ اس وقت زندگی کے مشترک مسائل، انسانیت اور اخلاق، اور ملک کے مفاد کے تذکرہ اور تمام مسائل و مصائب کے حل کی نشان دہی کے سوا اور نہیں، یہی طریقہ ان کو اسلام کے مطالعہ اور مسلمانوں کے سمجھنے اور ان کو ان کا صحیح مقام دینے پر اور اس خدا داد دولت (مسلمانوں کی موجودگی) سے فائدہ اٹھانے پر جو اس ملک کی تاریخ نہیں بلکہ تقدیر بن گئی ہے، آمادہ کرسکتا ہے۔''

ایک جگہ مولانا نے یہاں تک فرمایا کہ ''یہ پورے عالم انسانی کی ضرورت ہے۔'' مولانا کے سامنے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا اسوہ ہے، آپ ﷺ نے ''حلف الفضول'' میں شرکت فرمائی تھی، بعد میں بھی آپ ﷺ فرماتے تھے کہ اگر مجھے کوئی آج بھی اس طرح کے معاہدہ میں شریک کرنا چاہے تو میں تیار ہوں۔

مولانا سے جب سوال کیا گیا کہ اس بھرے پُرے ملک میں جس میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے، آپ ہی نے کیوں اپنی یہ ذمہ داری سمجھی کہ اس دعوت کو لے کر کھڑے ہوں؟ اس پر حضرت مولانا نے فرمایا کہ :

''مسلمان اپنے مذہب کی رو سے بھی اس کا ذمہ دار ہے کہ وہ جہاں کہیں ہو اپنے ماحول کی فکر کرے، شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دھنسا کر خطروں سے آنکھیں بند نہ کرلے، ''اور سب خیریت ہے'' کا سبق نہ دہرائے، مسلمانوں کو ہر جگہ بھلائی کا حکم دینے، اور برائی سے روکنے کا حکم ہے، اس کو سمجھنا چاہیے کہ وہ زندگی کی جس کشتی پر سوار ہے، وہ جب ڈوبے گی تو اس کو لے کر ڈوبے گی............ یہ ہمارے ملک کی کشتی ہے، اگر خدانخواستہ ڈوبی تو نہ ہمارے ادارے بچیں گے نہ کتب خانے، نہ مقدس اور خدارسیدہ افراد، نہ عالم و فاضل، نہ بزرگ۔''

۲۸، ۲۹، ۳۰ر دسمبر ۱۹۷۴ء کو الہ آباد میں اس موضوع پر ایک بڑی کانفرنس بلائی گئی اور ان الفاظ کے ساتھ ہندگیر مہم کا آغاز کردیا گیا کہ :

''افسوس ہے کہ اس لمبے چوڑے ملک میں اخلاقی کمزوریوں کو دور کرنے اور روحانی اور انسانی زندگی کو رواج دینے کے لیے کوئی تحریک اور کوئی جماعت نظر نہیں آتی، ہم نے بہت انتظار کیا اور آخر یہ فیصلہ کیا کہ جو کچھ بن پڑے اس کو شروع کردیں۔''

’’کل ہند حلقۂ پیام انسانیت‘‘ کے نام سے باقاعدہ لکھنؤ میں اس کا دفتر قائم کردیا گیا اور کام شروع ہوگیا، یہ کوئی نئی تحریک یا انجمن سازی نہیں تھی بلکہ حضرت مولانا نے ایک صدا لگائی تھی، نہ مخصوص ارکان اس کے لیے منتخب کیے گئے، نہ کوئی باقاعدہ صدر یا جنرل سکریٹری چنا گیا، ایک نامانوس اور نئی صدا لگانے والوں کا یہ ایک مشترکہ پلیٹ فارم تھا، ایک کارواں تھا جو حضرت مولانا کی قیادت میں آگے بڑھ رہا تھا۔

تحریک کے ترجمان مولانا اسحاق جلیس ندویؒ اس کے مقاصد کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’۱- خالص انسانی رشتے اور ہندوستانی ناطے سے ملک میں عام محبت و بھائی چارے کی فضا قائم کرنے اور اخلاقی گراوٹ کا ماحول ختم کرنے کے لیے عوامی رابطہ کی مہم، جلسوں اور سیمینار کا انعقاد، مفید اخلاقی لٹریچر کی مختلف زبانوں میں اشاعت۔

۲- خدمت خلق کے ذریعے روٹھے ہوئے، بیزار اور آپس میں دست و گریباں انسانوں کو زندگی کے حقیقی لطف اور صحیح مقصد سے روشناس کرانا۔

۳- معاشرہ سے رشوت، اقرباء پروری، بدعنوانی، ذخیرہ اندوزی، فرقہ پرستی اور معاشی استحصال کو دور کرنا اور بے حیائی و عریانی کے خلاف بھرپور جدوجہد۔

۴- غلط اور ظالمانہ رسم و رواج کے انسداد کی کوشش۔

۵- ملک کے مظلوم، پس ماندہ، غریب اور پریشان حال افراد کی بلا امتیاز مذہب وملت ہر ممکن امداد۔

۶- نوجوان نسل خاص طور سے طلبہ میں سنجیدگی، علمی لیاقت اور سماج کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا تاکہ ہمارے ملک کو ان خطرات سے بچایا جاسکے جو نئی نسل کی بے راہ روی سے پیدا ہورہے ہیں۔

۷- اپنے حلقۂ اثر، محلہ، بستی، شہر اور پورے ملک میں برادرانہ ماحول پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش وجدوجہد‘‘۔

اس تحریک نے آگ پر پانی کا کام کیا، زخموں پر مرہم رکھا اور حالات کو معتدل و پرسکون بنانے میں اہم کردار ادا کیا، پورے ملک کے طول وعرض میں جابجا اس کی کانفرنسیں ہوئیں، جس میں ہر طبقہ اور فرقہ کے لوگ شریک ہوئے، غلط فہمیاں دور کی گئیں، دل صاف کیے گئے اور دماغوں میں نفرتوں کی جو تہیں جم رہی تھی ان کو کھرچا گیا، بقائے باہمی کی فضا قائم کی گئی، اور بڑی حد تک

اعتماد کا ماحول بحال ہوا۔ پیام انسانیت کے ان جلسوں میں حضرت مولانا اکثر افتتاحی خطاب فرماتے تھے اور اس سے پورے اجلاس کا رخ متعین ہو جاتا تھا، بعد میں آنے والے مقررین کی تقریریں اکثر مولانا کی پُرمغز تقریر کی تشریح کے طور پر ہوا کرتی تھیں۔

حضرت مولانا کی تقریروں میں اس پر خاص زور دیا جاتا تھا کہ انسان کے اندر انسانیت موجود ہے، اس کو بیدار کرنے اور جگانے کی ضرورت ہے۔ ۲؍دسمبر ۱۹۹۰ء کی ایک تقریر میں فرماتے ہیں:

''تاریخ کے قدیم ترین دور سے لے کر ہمارے زمانہ تک جس چیز نے انسانیت کی شمع مسلسل طور پر روشن رکھی وہ خدا کی یہ نعمت ہے کہ اچھے انسان، انسان سے مایوس نہیں ہوئے، انھوں نے اس کو نا قابل علاج مریض اور نا قابل اصلاح حیوان نہیں سمجھا، وہ بھی اس کے وجود سے ایسے متنفر نہیں ہوئے کہ اس کی صورت دیکھنے تک کے روادار نہ ہوں، انھوں نے کبھی اس کے زندہ رہنے کے استحقاق کا انکار نہیں کیا۔

انسانیت کا چراغ بے تیل بتی کے جل سکتا ہے، وہ ہوا کے تیز جھونکوں اور طوفانوں کے تھپیڑوں میں روشن رہ سکتا ہے، اور انسانیت کی تاریخ بتاتی ہے کہ پیغمبروں نے انسانیت کا چراغ روشن رکھا، انھوں نے پیٹ پر پتھر باندھ کر اور مسلسل فاقہ کر کے جنگلوں اور بیابانوں، کڑاکے کے جاڑوں کی راتوں اور تپتی ہوئی دوپہریوں میں انسانیت کی خدمت کی۔ ان میں سے کوئی چیز ان کی ہمت توڑنے اور ان کو ان کے مقدس کام سے روکنے کے لیے کافی نہ تھی، ان کی نہ ختم ہونے والی قوت کے مقابلہ کا راز اور ان کی حیرت انگیز قوت عمل کی بنیاد یہ تھی کہ وہ انسان کو دست قدرت کا شاہکار (Master Piece) سمجھتے تھے''۔

ایک تقریر میں انسانوں کی انسانیت کو للکارتے ہوتے بڑے جوش کے ساتھ فرماتے ہیں :

''کیا ایک شہری دوسرے شہری کو اپنا بھائی سمجھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ خدا کا بنایا ہوا ایک انسان ہے؟ بالکل نہیں، ہر شخص دوسرے کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ ایک شکار ہے......... ایک قیمتی انسان سے ایک موذی جانور کا سا سلوک کیا جاتا ہے .... ہماری نظر اس کے دھڑکتے ہوئے دل، اس کی سلگتی ہوئی روح، اس کے بلکتے ہوئے بچوں، اس کی بوڑھی ماں، اور اس کے غریب خاندان پر نہیں ہوتی، ہماری نظر اس کی جیب کے چار پیسوں پر رہتی ہے۔ سارے ملک کا یہ حال ہو گیا ہے کہ کسی

کو کسی سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی، سارا ملک ایک منڈی اور ایک جوا خانہ بن گیا ہے، جس میں ایک کی جیت اور ہزاروں کی ہار ہے، کسی کے دل میں کوئی بلند جذبہ، بلند تخیل، انسانیت کا احترام، خدا کا لحاظ باقی نہیں رہا۔ انسانیت کو اس پر ماتم کرنا چاہیے اور انسانیت کے دعویداروں کو شرم کے مارے اپنی گردن جھکا لینی چاہیے۔"

دوسری چیز جس پر مختلف تقریروں میں حضرت مولانا نے زور دیا ہے وہ مسلسل محنت اور تگ ودو ہے، حضرت مولانا نے بار بار یہ بات فرمائی ہے کہ "یہ کوئی تھوڑی دیر کا کام نہیں ہے، بلکہ یہ ایک جہد مسلسل کا نام ہے۔" ایک تقریر میں فرماتے ہیں :

"حضرات! کوئی کام شدید جدوجہد، خطرات اور قربانیوں کے بغیر نہیں ہو سکتا، قوم کی صحیح تعمیر اور انسانیت کا احترام اور باہمی اعتماد و محبت پیدا کرنے کے لیے ہم کو ایک مجنونانہ اور سرفروشانہ جدوجہد کی ضرورت ہے۔

ہندوستان تاریخ کے ایک نازک موڑ اور فیصلہ کن دوراہے پر کھڑا ہے، ایک راستہ ہمیشہ کی تباہی، نہ مٹنے والے انتشار اور نہ ختم ہونے والے زوال کی طرف لے جاتا ہے۔ ایک راستہ ہمیشہ کے امن وامان، اتحاد و یکجہتی کی طرف لے جاتا ہے۔

ہر ایسے موڑ پر کچھ ایسے لوگ سامنے آجاتے ہیں جو تاریخ کا رُخ موڑ دیتے ہیں اور واقعات کا دھارا بدل دیتے ہیں، ان کی دلیری، ان کی صاف گوئی اور ان کی جانبازی پورے پورے ملک اور قوم کو بچالے جاتی ہے، یہی لوگ ملک کے معمار ہوتے ہیں، اُردو کے کسی پرانے شاعر نے صحیح کہا ہے ؎

اولوالعزمان دانشمند جب کرنے پہ آتے ہیں
سمندر پاٹتے ہیں کوہ سے دریا بہاتے ہیں

پیام انسانیت کی تقریروں میں حضرت مولانا کی یہ بہت بڑی خصوصیت ہے کہ وہ دعوت حق حکیمانہ انداز میں پیش کرتے چلے جاتے ہیں، خدا کی عظمت و کبریائی کا تذکرہ ان تقریروں میں جا بجا ملتا ہے، اور متعدد موقعوں پر یہ حدیث حضرت مولانا نے برادران وطن کے سامنے سنائی ہے کہ "تمہارا رب بھی ایک اور تمہارا باپ بھی ایک، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم کو مٹی سے بنایا گیا۔"

ایک تقریر میں فرماتے ہیں :

"کسی ملک یا قوم کے تحفظ و بقا کے لیے اور افراد کو خود غرضی، ظلم، بے ایمانی اور

خیانت سے بچانے کے لیے اصل طاقت تو خدا کا عقیدہ اور خوف ہے، جب کسی انسان کے دل و دماغ میں یہ عقیدہ جاگزیں ہو جائے کہ ایک ایسی بالاتر ہستی ہے جو اندھیرے اُجالے میں میری نگراں ہے اور مجھے اس کے سامنے جواب دہی کرنی ہے تو وہ کوئی غلط کام نہیں کرسکتا، اصلاح کے لیے اس سے بہتر کوئی نسخہ نہیں، یہ وہ اصل طاقت ہے جو چوروں کو پاسباں بناتی ہے۔''

اس میں حضرت مولانا بڑے خوبصورت انداز میں توحید اور آخرت کے عقیدہ کی طرف اشارہ فرمادیا ہے۔ ۱۹۸۰ء میں ''بارہ دری'' (لکھنؤ) کے اجلاس پیامِ انسانیت میں حضرت مولانا نے جو اختتامی تقریر فرمائی تھی وہ خالص الہامی معلوم ہوتی ہے، اس کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر کا کام کرتا ہے، اس میں مولانا نے جس طرح برادرانِ وطن کے سامنے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت، کام اور مقام کا تذکرہ کیا ہے وہ مولانا ہی کا حصہ ہے، فرماتے ہیں :

''ہمارے سامنے اس سلسلہ میں سب سے اونچا نمونہ خدا کے پیغمبروں کا ہے، وہ کس حال میں اور کس زمانہ میں آئے! ایک آدمی ان کی بات سننے کا روادار نہیں تھا، ایک آدمی ان کی بات سمجھنے کے قابل نہیں تھا، معلوم ہوتا ہے جنگل میں آگئے ہیں، درندوں میں آگئے ہیں، کوئی ان کی بولی سمجھنے والا نہیں۔ چنانچہ قرآن شریف میں ہے کہ ایک پیغمبر کو خطاب کرکے ان کی قوم نے کہا کہ: '' قالوا يا شعيبُ ما نفقهُ كثيرا مما تقول وإنا لنراك فينا ضعيفا''، اکثر آپ کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، ہمارے پلے کچھ نہیں پڑ رہا ہے، ہم نہیں جانتے آپ کیا کہہ رہے ہیں؟! ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ہمارے درمیان سب سے کمزور آدمی ہیں، پھر ہم آپ کی بات کیوں سنیں؟ لیکن انہوں نے کیا کہا، پارس کی بھی حقیقت ہے کہ پتھر کو چھو جاتا ہے تو سونا بنا دیتا ہے، کیمیا کی بھی کیا حقیقت ہے کہ مٹی کو وہ سونا بنا دیتی ہے۔ انہوں نے انسانوں کو فرشتوں سے اونچا کردیا، انسانوں میں وہ صبر وضبط پیدا کیا کہ اگر تاریخ کی متواتر شہادتیں نہ ہوتیں تو یقین کرنا مشکل تھا کہ انسان اتنا صابر وضابط ہوسکتا ہے، آپ دیکھیں گے کہ جو ان کے خون کے پیاسے تھے ان کو انہوں نے سینے سے لگایا، دل میں جگہ دی، اس کے بعد وہ ان پر اپنی جان نچھاور کرنے لگے، لوگ ان کو مارنے کے لیے آتے تھے لیکن ان کا کلمہ پڑھتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوتے

تھے، جنہوں نے خون کیے تھے اور جن کی آنکھوں سے اب بھی خون ٹپک رہا تھا، انہوں نے ان کو محبت کا پیغام دیا، انہوں نے ان کو اپنے سینے سے لگایا پھر دنیا کیا ہوگئی! دنیا میں کیسی ہوائیں چلنے لگیں، خزاں کے بعد بہار کا دور آیا، باد سموم کے بعد نسیم جانفزا کے جھونکے چلے، آج تک وہ ہم کو محسوس ہو رہے ہیں۔ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں، بغیر کسی معذرت کے کہ اس وقت بھی جو کچھ دنیا میں خیر ہے، اس وقت بھی دنیا میں محبت کا جو کچھ مادہ ہے، اس وقت بھی انسانوں کے دلوں میں جو کچھ روشنی ہے، اس وقت بھی انسانوں کے دلوں پر درد کی جو چوٹ ہے، وہ سب ان پیغمبروں کا صدقہ ہے۔''

حضرت مولانا کی ان تقریروں کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ان میں مسلمانوں کو بھی خطاب کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں ان کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلاتے ہیں، اور اس طرح اسلام کے پیغام کو اور مسلمانوں کے کام کو غیروں کے سامنے پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔

مشہور تقریر جو ''اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے'' کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے، اس کا اختتام کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

''آخر میں میں اپنے مسلمان دوستوں اور بھائیوں سے کہوں گا کہ ان کی اس موقع پر دوہری ذمہ داری ہے، ایک تو یہ کہ ان کا مذہبی صحیفہ قرآن، اور ان کے پیغمبر کی تعلیم ان کو نہ صرف اس عام بگاڑ، اس پھیلی ہوئی آگ، اور دولت کی پرستش کے اس بہتے ہوئے گندے پانی سے بچنے کی تلقین کرتی ہے بلکہ ان پر اس کو روکنے اور اس سے لوگوں کو بچانے کی ذمہ داری بھی عائد کرتی ہے۔

ان کی دوسری ذمہ داری کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس ملک میں انسانیت کے احترام، عدل و مساوات اور سماجی انصاف کا پیغام لے کر آئے تھے، اور انہوں نے اس ملک کی بڑے نازک وقتوں میں مدد کی، یہ پیغام ان کی مذہبی تعلیمات میں اب بھی پورے طور پر محفوظ ہے۔ اگر انہوں نے ملک کی سوسائٹی کی اس ڈوبتی یا ڈگمگاتی کشتی کو بچانے کی امکانی کوشش نہ کی، تو وہ خدا کے سامنے قصوروار اور گنہگار ٹھہریں گے اور تاریخ میں فرض ناشناس بلکہ احسان فراموش اور مجرم قرار پائیں گے۔''

پیام انسانیت کے جلسوں میں کی گئی یہ مؤثر تقریر مختلف رسالوں میں منتشر تھیں، اور اس کی

ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی تھی کی یہ تقریریں یکجا کر کے مرتب کردی جائیں تا کہ محفوظ بھی ہوجائیں اوراس کا فائدہ بھی عام ہوجائے۔

عزیز القدر مولوی عبدالہادی اعظمی ندوی سلمہ حضرت مولاناؒ کے مقالات، خطابات اور منتشر تقریروں سے جتنا واقف ہو چکے ہیں، کم لوگ واقف ہوں گے، اب تک انہوں نے آٹھ مجموعہ اشاعت کے لیے تیار کیے ہیں، جن میں اکثر شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں، اب یہ نواں مجموعہ ناظرین کے سامنے ہے، اللہ تعالیٰ عزیز موصوف کو اجر عطا فرمائے، اور یہ سلسلہ مکمل فرمائے۔

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مركز الإمام أبي الحسن الندوي،
دارعرفات، رائے بریلی

۱۳/صفر المظفر ۱۴۳۵ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض مرتب

دسمبر۱۹۷۴ء میں تحریک پیام انسانیت کے قیام کے بعد اس کے جلسوں میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے جو تقریریں کیں، یا اس سے متعلق اجلاسوں کے لیے جو پیغامات لکھے، انھیں اس مجموعہ میں جمع کیا گیا ہے۔ تحریک پیام انسانیت کے قیام سے قبل مخلوط اجتماعات میں کی گئی تقریروں کا مجموعہ ''تعمیر انسانیت'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

اس مجموعے میں مندرجہ ذیل پانچ خطبات شامل نہیں کیے گئے ہیں، کیونکہ ان کے مضامین کتاب کے دوسرے خطبات میں آچکے ہیں:

(۱) ملک و معاشرہ انتہائی خطرناک موڑ پر: ۵/اکتوبر ۱۹۸۶ء کو ناگپور میں دانشوروں اور صحافیوں کے ایک چیدہ مجمع میں گفتگو اور تبادلۂ خیال (ڈائلاگ)۔

(۲) وہ فساد جو گھر گھر ہو رہا ہے: ۲۸/فروری ۱۹۸۸ء کو اندور میں کی گئی تقریر۔

(۳) ہندوستان تاریخ کے ایک نازک دور اور فیصلہ کن دوراہے پر کھڑا ہے: ۱۷/مارچ ۱۹۹۰ء کو کانسٹیٹیوشن ہال، نئی دہلی میں ایک اجلاس میں پیش کیا گیا مقالہ۔

(۴) کسی ملک و معاشرہ کے لیے سب سے خطرناک بات: ۲/دسمبر ۱۹۹۰ء کو گنگا پرشاد میموریل ہال، لکھنؤ میں پیش کیا گیا مقالہ۔

(۵) ہمارا معاشرہ کوہ آتش فشاں کے دہانے پر: حکومت کے زیر سرپرستی دہلی میں ۱۲/دسمبر ۱۹۹۰ء کو منعقد ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک مشترکہ اجلاس کے لیے لکھا گیا پیغام۔

مذکورہ بالا تمام مضامین ''تعمیر حیات'' لکھنؤ میں شائع ہو چکے ہیں، ان میں اول الذکر علاحدہ رسالہ کی شکل میں بھی شائع ہوا۔ کتاب میں بعض مقامات پر حضرت مولاناؒ کے حواشی ہیں، ان کے آگے بین القوسین ''ح'' کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرما کر اس کے نفع کو عام فرمائے۔

۱۳/ جمادی الاولی ۱۴۳۵ھ

عبدالہادی اعظمی ندوی

۱

زندگی کا سب سے بڑا عذاب(۱)

انسان کا حوصلہ بڑھانے کے لیے سب سے بڑی ضرورت

جناب صدر اور معزز حاضرین!

میرے لیے بڑی خوشی اور عزت کا موقع ہے کہ میں ایک ایسے تاریخی شہر میں آپ سے مخاطب ہوں جو صرف دریاؤں کا نہیں؛ بلکہ کئی تحریکوں کا سنگم اور منبع ہے۔ یہاں سے کئی تحریکیں پیدا ہوئیں اور انھوں نے پورے ملک کو متاثر کیا، اور ہمارے صوبے ہی کو نہیں؛ بلکہ ہمارے ملک کو عالمی شہرت رکھنے والے رہنما، لیڈر اور منتظم مہیا کیے۔

حضرات! انسان کے لیے انسان کا حوصلہ بڑھانے کے لیے، سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اس پر اعتماد کیا جائے، اس کو شک کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے؛ بلکہ اس سے اچھی امید قائم کی جائے، اس کی باتوں کو کان لگا کر سنا جائے، اور اگر اس کو کسی چیز کی فکر ہے یا اس کے دل میں کوئی درد ہے، تو اس درد کی قدر کی جائے، اس درد میں شریک ہونے کی کوشش کی جائے۔

اگر دنیا میں یہ نہ ہو تو پھر یہ دنیا احساس، ضمیر اور دل رکھنے والوں کی جگہ نہیں؛ بلکہ ایک ایسی دکان ہے جس میں دو ہی فریق ہیں: ایک بیوپاری بیچنے والا، اور ایک گاہک۔ اگر دنیا ایسی ہی ہو جائے تو پھر اس دنیا میں جینے کا کوئی مزہ نہیں، اور اگر دنیا ایسی ہی رہی ہوتی تو پھر اس کی تاریخ لکھنے کی بالکل ضرورت نہ تھی۔ اگر یہ دنیا صرف کھانے کمانے کی بستی بن جائے، وہ زیادہ خوش قسمت سمجھا جائے جو زیادہ کما سکے اور زیادہ بہتر طریقہ پر کھا سکے، تو پھر اس زندگی کی کوئی قیمت، کوئی ویلو (Value) باقی نہیں رہ جاتی۔

---

(۱) حضرت مولاناؒ نے ملک کی دن بدن بگڑتی ہوئی صورت حال اور یہاں انسانی اور اخلاقی قدروں کی پامالی سے متاثر ہو کر ۲۸، ۲۹ اور ۳۰ دسمبر ۱۹۷۴ء کو الٰہ آباد سے ''تحریک پیام انسانیت'' کا آغاز کیا، اسی سلسلے میں یہ تقریر نیو انگلش کالج، سول لائن (الٰہ آباد) میں ۲۸ دسمبر ۱۹۷۴ء کو کی گئی۔

غلطیاں کرنا انسان کی فطرت کے خلاف نہیں

غلطیاں کرنا تو انسان کی فطرت کے خلاف نہیں ہے۔ مذاہب، اخلاقی فلسفے، تاریخ، نفسیات کا علم اور علم الاخلاق بھی اس کو تسلیم کرتا ہے؛ بلکہ غلطی تو انسان کی ایک طرح کی خوبی ہے، اگر یہ نہ ہو تو انسان اور پتھر میں کیا فرق؟ پتھر کوئی غلطی نہیں کر سکتا، پتھر نہ غلطی کرتا ہے، اور وہ اپنے کو بہتر بھی نہیں بنا سکتا۔ انسان کی خوبی یہ ہے کہ وہ غلطی کرتا ہے، دس بار کرتا ہے، پچاس بار کرتا ہے، لیکن غلطی کو مانتا بھی ہے، غلطی کا اقرار بھی کرتا ہے، اس کے اندر جذبہ بھی ہوتا ہے کہ آئندہ میں غلطی نہ کروں، وہ ٹھوکر کھاتا ہے، سنبھل جاتا ہے، ٹھوکر کھانا اتنا برا نہیں، لیکن ٹھوکر کھا کر نہ سنبھلنا: یہ ہے انسان اور انسانیت کا سب سے بڑا المیہ!!

خطرہ کی یہ بات نہیں کہ انسان غلطی کرتا ہے، پاپ کرتا ہے، اگر پاپ نہ کرتا ہوتا تو پھر معلمین اخلاق کو، خدا کے پیغمبروں کو دنیا میں ظہور فرمانے کی کیا ضرورت تھی؟ اور پھر جدوجہد میں کیا رکھا تھا؟ جدوجہد کا کوئی میدان ہی نہ تھا، زندگی کی ساری لذت تو جدوجہد سے ہے، ایک چیز پیدا ہو، اس کے برے اثرات کو دور کرنے کی کوشش، اس کو بہتر بنانے کی کوشش، زندگی میں جو کچھ آپ رنگ دیکھتے ہیں، زندگی میں جو آپ کشش پاتے ہیں، اس میں جو توانائی ہے، تروتازگی ہے، وہ سب اس کا نتیجہ ہے کہ مقابل خیالات پیدا ہوتے ہیں، مقابل جذبات پیدا ہوتے ہیں، انسان غلطی کرتا ہے پھر وہ اس غلطی کو تسلیم کرتا ہے، وہ کچھ کھوتا ہے پھر پانے کی کوشش کرتا ہے، اور جہاں کھونا نہیں وہاں پانا کیا؟ پانے کی لذت ہی نہیں، بغیر کچھ کھوئے پانے کی لذت بھی نہیں، تو انسان سے یہ شکایت بالکل فضول ہے، ناجائز ہے کہ اس نے غلطی کیوں کی؟ میں بھی غلطی کروں گا آپ بھی غلطی کریں گے، اگر انسان سے آپ اس بات کی امید کریں کہ وہ فرشتہ بن جائے، خدا کے پیغمبروں نے بھی یہ امید نہیں کی اور اس کا مطالبہ نہیں کیا کہ انسان فرشتہ بن جائے، یا پتھر بن جائے۔ فرشتے اور پتھر میں بہت بڑا فرق ہے، میں اس فرق سے اچھی طرح واقف ہوں؛ لیکن اس کے باوجود دونوں میں ایک چیز مشترک ہے، غلطی نہ فرشتے سے ہوتی ہے نہ پتھر سے ہوتی ہے، لیکن انسان کی خوبی، انسان کی طاقت، اور اصل یہ ہے کہ وہ غلطی کر سکتا ہے، کرتا ہے، ہزار بار کرتا ہے، مگر غلطی کو محسوس کرتا ہے، دور کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ کبھی کبھی اپنے قصور کا اقرار بھی کرتا ہے، اور اس سے اس کی عزت بڑھتی ہے، گھٹتی نہیں، کوئی بٹہ نہیں لگتا اس کی عزت پر۔

زندگی کا لطف

اس زندگی کا جو لطف ہے، وہ یہ ہے کہ چار آدمی ایک دوسرے پر بھروسہ کریں، اور ٹھنڈے

دل سے بات سنیں۔ زندگی کا سب سے بڑا عذاب یہ ہے کہ ہر بات کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھا جائے، ابھی بات سنی نہیں اور پہلے سے ایک خیال دل میں قائم کر لیا کہ یہ اپنی فلاں غرض کے لیے کچھ کہنا چاہتا ہے۔

تو اس وقت آپ حضرات کے ایک منتخب مجمع اور پڑھے لکھے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو دیکھ کر میرے دل میں حوصلہ پیدا ہوتا ہے اور خود مجھے اپنے اوپر اعتماد پیدا ہوتا ہے کہ اتنے بھائی اچھی امید لے کر یہاں آئے، ان کا خیال ہے کہ کوئی کام کی بات کہی جائے گی۔

ہماری اور آپ کی کہانی

میرے بھائیو! کہانی لمبی بھی ہے اور مختصر بھی، اور ہر کہانی کی طرح اسے پھیلایا بھی جا سکتا ہے اور اسے سمیٹا بھی جا سکتا ہے، کہانی کوئی پرانی کہانی نہیں ہے، کسی قوم کی، کسی ملک کی نہیں؛ بلکہ ہماری اور آپ کی کہانی ہے، ہم کو اور آپ کو خدا نے اپنی طرف سے اپنی نعمتوں سے مالا مال کرنے میں اور ہماری قسمت بیدار کرنے میں اور ہماری جھولی بھرنے میں کوئی کمی نہیں کی، کسی بخل سے کام نہیں لیا، ہمیں بھر بھر کر دیا، اور جو بہتر سے بہتر مواقع ہو سکتے تھے، بہتر سے بہتر ذرائع ہو سکتے تھے، بہتر سے بہتر خزانے ہو سکتے تھے، وہ سب اس نے ہمارے قدموں میں ڈال دیے، خدا نے ہم کو اتنا بڑا ملک دیا، ایسا ملک دیا جو قدرتی خزانوں سے مالا مال ہے، جس کی بڑی شاندار تاریخ ہے، وہ خود اپنی جگہ پر ایک دنیا ہے۔ واقعہ یہ ہے جغرافیائی اصطلاح کے مطابق ہم اس کو ملک کہتے ہیں؛ لیکن یہ اچھا خاصا ایک براعظم ہے، اس ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تو سفر کرنا بہت مشکل ہے، کسی کو یہاں سے مثلاً جنوبی مدراس تک بھی سفر کرنے کا موقع ملا ہو تو اس ملک کی وسعت دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

یہاں بہت سے معزز سامعین ہوں گے جن کو یورپ کے سفر کا اتفاق ہوا ہو، مجھے بھی بعض علمی، تعلیمی ضرورتوں سے یورپ کا کئی بار سفر کرنے کا اتفاق ہوا، ان کے ملکوں کا تو حال یہ ہے کہ آدمی زیادہ احتیاط سے کام نہ لے، تو اچانک وہ اپنے ملک کی سرحد پار کر جاتا ہے اور دوسرے ملک کی سرحد میں پہنچ جاتا ہے، اور ہمارا ملک تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک دنیا ہے، آدمی تیز سے تیز گاڑی پر بھی بیٹھے بیٹھے اکتا جاتا ہے، کئی کئی راتیں نکل جاتی ہیں، کئی کئی دن نکل جاتے ہیں؛ لیکن آدمی منزل مقصود تک نہیں پہنچتا۔

خدا نے ہم کو اتنا بڑا ملک دیا اور اتنی بڑی تعداد میں ایک قوم یہاں رہتی ہے، اس قوم کی بہت

سی تہذیبیں، خصوصیات ہیں، اس کا وسیع ادب ہے، لٹریچر ہے اور پھر یہ ملک قدرتی خزانوں سے مالا مال ہے، اس کے علاوہ خدا نے یہاں کی طبیعتوں میں ایک نرمی رکھی ہے، حق کی تلاش کا جذبہ رکھا ہے، انصاف کا مادہ رکھا ہے، خدا کو پہچاننے کی کوشش یہاں ہر زمانے میں ہوتی رہی ہے، اور اس سلسلے میں اس ملک نے اپنی ہی پیاس نہیں بجھائی؛ بلکہ دوسروں کی بھی پیاس بجھائی ہے، بہت سے ملکوں کی رہنمائی کی ہے۔

تو خدا نے یہ ملک ہمیں ایک ایسے زمانے میں عطا کیا جو زمانہ مادہ پرستی کا تھا، جس میں دنیا کے دوسرے ملکوں میں بہت سے تجربے کیے گئے اور تجربے پورے طور پر کامیاب نہیں ہوئے، جو نقشے، منصوبے بنائے گئے تھے وہ منصوبے پورے نہیں ہوئے اور دنیا بڑی مشکلات میں مبتلا ہوگئی۔

دنیا کی ایک بڑی بدقسمتی

جو حضرات پڑھے لکھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ساری دنیا کی قیادت حاصل کرنا، رہنمائی حاصل کرنا ہنسی کھیل نہیں ہے، اس کے لیے بڑی کوشش کرنی پڑتی ہے، بڑی صلاحیتیں اس کے لیے درکار ہیں؛ لیکن یہ دنیا کی بدقسمتی تھی کہ اس دنیا کی قیادت ان لوگوں کے ہاتھ چلی گئی جو نہ خدا کو پہچانتے تھے، نہ انسانیت کے احترام سے واقف تھے، ان کے نزدیک تو سیاسی برتری، قوموں کو غلام بنانا، زیادہ سے زیادہ ملکوں پر اور وسیع سے وسیع رقبے میں اپنی حکومت قائم کرنا اور ان کا استحصال کرنا، وہاں کے ذرائع پر قبضہ کرنا، اور ان ذرائع سے کام لے کر اپنی پڑوسی قوموں پر اپنی بڑائی کا نقش قائم کرنا اور ان سے بازی لے جانا اصل مقصد تھا۔

یورپ کی مصیبت تو یہ ہے کہ وہاں چھوٹے چھوٹے ملک ہیں، اُن کے ذرائع بہت محدود ہیں، جرمن قوم، فرانسیسی قوم، انگریز قوم میں مسابقت رہی، تو اُن کے لیے اس کی ضرورت تھی کہ وہ اپنی حکومت کے رقبہ کو وسیع کریں، اور دنیا کی مارکیٹ پر قبضہ کریں، اور وسائل و ذرائع پر قبضہ کریں، اور یہ ثابت کریں کہ ہم تم سے زیادہ اہل ہیں، یہ جذبہ جو زمینداروں، جاگیرداروں میں کبھی ہوا کرتا تھا، وہ جذبہ اب بھی ان قوموں میں کام کرتا رہتا ہے، فرانسیسی جرمن قوم کو زک دینا چاہتے تھے اور ان پر دھاک جمانا چاہتے تھے، اور اس کی صورت یہ تھی کہ ان کی کالونیاں ہوں، ان کی نوآبادیاں ہوں، بیچارے افریقہ کے غیر تعلیم یافتہ سیاہ فام لوگ اور غیر مہذب لوگ ان کا نشانہ بنے، وہ ان کو غلام بنا کر ان کی کوئی خدمت نہیں کرنا چاہتے تھے، اپنی حریف جرمن قوم کو دکھانا چاہتے تھے کہ ہم اتنی بڑی طاقت ہیں، اور یہی انگریزوں کا معاملہ ہے۔

یہ دنیا کی بڑی بدقسمتی تھی کہ جو قیادت یورپ میں چلی اور اس قیادت، اس لیڈرشپ نے انسانیت کا سبق ہی نہیں پڑھا، یہ نہیں جانتی کہ انسان کس عزت کا مستحق ہے، انھوں نے یہ سبق ہی نہیں پڑھا کہ خدا اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے۔

خلوص ومحبت کی طاقت

حضرت مسیح (علیہ السلام) جن کو ہم سب خدا کا پیغمبر مانتے ہیں، انھوں نے انسانی ہمدردی، انسانی محبت اور خدا کے خوف کا سبق دیا تھا، یورپ نے ان سے یہ سبق بہت کم لیا، فخر کے طور پر ایک مذہب تو انھوں نے قبول کرلیا؛ لیکن حضرت مسیح (علیہ السلام) کی تعلیمات سے پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا، ان قوموں کی قیادت کی وجہ سے ساری دنیا ایک مصیبت میں مبتلا ہوگئی، اور بس ایک اقتصادی ریس، ایک مقابلہ کا میدان جس میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے، ریس شروع ہوگئی، وہ مشرقی اور ایشیائی قومیں جن کو اللہ تعالیٰ نے آسمانی مذہب کی نعمت سے سرفراز کیا ہے، یہ ان کا موقع تھا کہ دنیا کو یہ سبق دیتے، دنیا کے سامنے خلوص کا ایک نمونہ پیش کرتے کہ بھئی! انسانی مسائل صرف قابلیت، ذہانت، سائنس اور ٹکنالوجی سے حل نہیں ہوتے، وہ خلوص سے حل ہوتے ہیں، خدا کے پیغمبروں کو دیکھیے! کتنی صدیاں گزر گئیں؛ لیکن آج تک دنیا ان کا کلمہ پڑھتی ہے، ان سے محبت رکھتی ہے اور ادب واحترام کے ساتھ ان کا نام لیتی ہے، اور دنیا کی دو بڑی جنتریاں ایک عیسائی جنتری (شمسی) اس کا حساب آفتاب سے چلتا ہے، اور ایک اسلامی جنتری اس کا حساب چاند سے چلتا ہے، یہ دو پیغمبروں کی یادگار ہیں، ساری دنیا اپنے تمام کاموں میں ان کی پابند ہے، کتنا گہرا نقش ہے ان کا انسانی تہذیب پر، انسانی زندگی پر۔

یہ سب خلوص کا نتیجہ ہے، ہم ہندوستان میں خلوص کا ایک نمونہ پیش کرتے، پہلے تو ہم اپنے ملک میں اس زندگی کا تجربہ کرتے، ہم دکھاتے کہ ہم تھوڑے وسائل سے کتنا بڑا کام لے سکتے ہیں، ہم دکھاتے کہ انسان کی محبت میں کیا طاقت ہے، کیا جادو ہے، اور ہم دنیا میں وہ جنس پیش کرتے جو نایاب ہوچکی ہے، جس کا کہیں وجود نہیں، جس کو دنیا ترس رہی ہے، نہ علم کی کمی ہے، نہ ذہانت کی کمی ہے، نہ صنعت کی کمی ہے، نہ ٹکنالوجی کی کمی ہے، نہ سائنس کی مختلف شاخوں کی کمی ہے؛ کمی خلوص کی ہے۔

آج ہر جگہ شک وشبہ کی فضا چھائی ہوئی ہے

دنیا میں کوئی کام بے غرض نہیں ہوتا، ہر کام کے پیچھے غرض کام کرتی ہے، یہ جو ہماری الیکشن کی

فلاسفی ہے، یہ تو ساری دنیا اس پر Base کرتی ہے، یہ ساری دوڑ دھوپ، خوشامدیں، منتیں اور جانفشانیاں اور یہ میٹھی میٹھی باتیں، یہ ساری اغراض پر مبنی ہیں، آج بالکل اس کا رواج نہیں رہا کہ کوئی آدمی کسی سے کوئی بے غرض بات کرے، انسان اپنے تجربوں کا غلام ہے، وہ تجربوں کی رہنمائی میں چلتا ہے، اب حال یہ ہے کہ کوئی شخص کیسی ہی بے غرض بات کہے، اور اس میں دور دور غرض کا سایہ نہ ہو، پھر بھی وہ کہتے ہیں کہ دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے، تو آدمی اتنے تجربے کر چکا ہے کہ وہ آسانی سے مطمئن نہیں ہوتا، ہر شخص یہ انتظار کرتا ہے کہ اب اس کی غرض سامنے آئے گی، یہاں تک کہ اب بعض بعض ملک ایسے ہیں کہ جن کی حکومت کی بنیاد شک وشبہ پر ہے اور ہوشیار رہنے پر ہے، انھوں نے انسان پر اعتماد کرنا بالکل چھوڑ دیا ہے، ان کی ساری فلاسفی یہ ہے: انسان اعتماد کے قابل نہیں ہے، اور وہ ہر انسان کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں، بھائی کو بھائی پر بھروسہ نہیں رہا، پورے پورے ملک میں شک وشبہ کی فضا چھائی ہوئی ہے، ہر شخص دوسرے کے متعلق غیر مطمئن رہتا ہے، وہ کھل کر دل کی بات نہیں کہہ سکتا، وہ دنیا نہیں جہنم اور دوزخ ہے کہ جہاں آدمی کھل کر بات نہ کر سکے۔

میرے عزیزو اور بھائیو! اس وقت ہم اور آپ کو زندگی کے زیادہ گہرے مسائل پر غور کرنا چاہیے، اس وقت اگر بعض لوگ ملک کے حالات سے بے اطمینانی ظاہر کرتے ہیں تو سیاسی انداز میں ظاہر کرتے ہیں، سیاست کا میں بالکل انکار نہیں کرتا، سیاست زندگی کی ایک اہم ضرورت ہے، ایک حقیقت ہے، سیاسی تحریک ہی نے اس ملک کو آزاد کیا، آزادی کی جو تحریک اٹھائی گئی اس میں الٰہ آباد کا بہت بڑا حصہ ہے، سیاست کے ہم سب تھوڑے بہت احسان مند ہیں؛ لیکن سیاست کی تہہ سے نیچے بھی کچھ ہے۔

انسانیت کے زوال کی آخری چیز

بھائیو! حقیقت یہ ہے کہ جب بیماری پھیل جائے اور پھر دل و دماغ اس سے متاثر ہوں، تو پھر اس کا واحد علاج خلوص و درد ہے، وہ درد و خلوص جو خدا کے پیغمبر لے کر آئے تھے، وہ ایسے ہی زمانے میں آئے تھے جب ہر انسان شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، ہر بات شبہ کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی، مریض تھے اور دل کے مریض، یہ مرض انسانیت کے زوال کی آخری چیز ہے، جسم مریض ہو تو اس کا علاج کر لیجیے؛ لیکن دل مریض ہو جائے، روح مریض ہو جائے، انسان شک وشُبہ کا مریض ہو جائے، انسان کو چھوت لگ جائے، مایوسی پھیل جائے، اور آدمی کی کیفیت یہ ہو جائے کہ وہ سب

سے مایوس ہوکر، ملک کی حالت سے مایوس ہوکر وہ اپنے فائدے کوسوچنے لگے، یہ ایک مریض ذہنیت ہے، سمجھ لیجیے! یہ بالکل سکرات کی کیفیت ہے، جب انسان انسانیت سے مایوس ہوکر، اپنی قوم سے مایوس ہوکر، سدھار سے مایوس ہوکر، ملک کی اصلاح سے مایوس ہوکر، سب سے مایوس ہو کر یہ کہے کہ اب تو جو کچھ ہوسکے وہ کر لینا چاہیے، ہمیں اپنا فائدہ دیکھنا چاہیے، اس کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے کہ ہم اس ملک کو درست کرلیں گے، اس ملک کو کوئی درست نہیں کرسکتا، یہ ملک اگر نہیں ڈوبا تو اب ڈوب جائے گا، اگر یہ مریض ذہنیت پیدا ہوجائے تو ملک کبھی سنور نہیں سکتا، یہ وہ کیفیت ہے کہ جب کسی قوم میں پیدا ہوجاتی ہے تو پھر اس قوم کو بچانا بڑا مشکل ہوجاتا ہے۔

خطرناک ذہنیت

اس وقت ہمیں جوڈر ہے وہ یہ ہے کہ سب کے دل میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ ملک کا جو اتنا بڑا مسئلہ ہے، اس کا تعلق لاکھوں کروڑوں انسانوں سے ہے، اس میں تو کچھ ہو نہیں سکتا، یہ تو وقت ضائع کرنا ہے، اور اپنی توانائی برباد کرنا ہے، اور فائدہ اس کا کچھ نہیں ہے، یہ بڑی خطرناک ذہنیت ہے، اس وقت ملک کی جو کیفیت ہے، وہ یہ ہے کہ ہر شخص وہ اپنی زبان سے نہ کہے؛ لیکن قریب قریب مایوس ہے، اور وہ اپنے بچانے بچانا نہیں، بلکہ اپنے کو فائدہ پہنچانے اور زیادہ سے زیادہ فائدہ، وقت کی اس خرابی سے اور ملک کے غلط رخ پر پڑ جانے کی وجہ سے، زیادہ سے زیادہ ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کررہا ہے۔

اور اس کی مثال میں نے ایک جگہ دی کہ اگر ہم اور آپ اخبار میں پڑھیں کہ خدانخواستہ ایک ہوائی جہاز فلاں جگہ گر گیا، اور جب وہ گر گیا تو اس کے چاروں طرف جو دیہات کے لوگ تھے، وہ دوڑے، اور کسی کی گھڑی کھول لی اور کسی کا پرس نکال لیا، غرض جو ان کے ہاتھ لگا لیا، تو ہم اور آپ کتنی نفرت کریں گے، کتنی لعنت بھیجیں گے ایسے سنگ دل لوگوں پر، یہ تو بالکل درندوں سے بھی بدتر لوگ ہیں کہ ایسی حالت میں ان کو یہ بات سوجھی، اس وقت تو ان کو یہ دیکھنا چاہیے تھا کہ کون مریض کراہ رہا ہے جس کی جان بچائی جاسکے، کوئی پیاسا تھا تو اس کے ہونٹوں میں پانی ڈالنا چاہیے تھا، اور جو کچھ بھی ہمدردی ان کے ساتھ کی جاسکتی تھی کرنی چاہیے تھی، بجائے اس کے کہ ان جاں بلب لوگوں کو لوٹیں۔

اس واقعہ کو تو آپ اتنی نفرت کی نگاہ سے دیکھیں گے کہ لعنت بھی بھیجیں گے اور کہیں گے: تف ہے اس بے حسی پر، اور خدا کا غضب ان پر نازل ہو۔

ہمارے ملک کی موجودہ صورت حال

حضرات! اب پورے ملک کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ وہ بھی اس بدقسمت جہاز کی طرح ہو گیا ہے جو حادثہ کا شکار ہوگیا ہو، اور جمع ہونے والا بے درد مجمع مسافروں کی بےبسی سے یہی فائدہ اٹھا رہا ہو۔

اس صورت حال سے آپ اپنے دل میں نفرت کا کوئی جذبہ کیوں نہیں پاتے؟ ہماری قسمت اسی ملک سے وابستہ ہے، اگر خدانخواستہ یہ کشتی ڈوبی تو ہم ڈوبیں گے، نہ عابد اور زاہد لوگ بچیں گے اور نہ بڑے عالم اور فاضل لوگ بچیں گے، کشتی پر بیٹھنے کا ٹیکس سب کو دینا پڑے گا، کشتی ڈوب گئی تو اس کی فکر نہ کرے گی کہ اس میں نیک اور پارسا لوگ ساحل پر اتر جائیں، یا آسمان سے کوئی ایسی چیز اترے جو نیک لوگوں کو اچک لے جائے، یہ انہونی باتیں ہیں، عقل، تجربے اور تاریخ کے خلاف ہے، جب کشتی ڈوبے گی تو سب کو لے کر ڈوبے گی۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ ملک کو وہ بدقسمت ہوائی جہاز کیوں سمجھ رہے ہیں؟ کیا کوئی اور کسر باقی ہے؟ کیا ہم اور آپ کسی اور اسٹیج کے انتظار میں ہیں؟ آج ہمارے ملک میں کیا ہو رہا ہے؟ ہمارے ملک میں سب کی نظر اس پر ہے کہ جو فائدہ ذاتی طور پر ہم کو پہنچ سکے اس میں ہم کمی نہ کریں، کرپشن کا بازار گرم ہے، کام میں کاہلی عام ہے، اپنا فائدہ اٹھالینا، اپنا حق وصول کر لینا اور دوسرے کا حق دینے کا کوئی ارادہ، کوئی کوشش، کوئی خواہش نہیں۔

آج حالت یہ ہے کہ ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک کسی کو یہ فکر نہیں کہ دوسرا بھی شہری ہے، دوسرے سے ہمدردی کا جذبہ نہیں کہ اس سے انسانیت کا ناطہ ہے، ہندوستانیت کا رشتہ ہے، ہم سب ایک ہی ملک کے رہنے والے ہیں، لیکن مدد کرنے کا جذبہ بالکل ختم ہوگیا، ہر شخص گویا یہ سمجھ رہا ہے یہ کشتی تو ڈوبی، اب اس میں جو کچھ لگا ہوا ہے، جو کچھ ہم نکال سکیں اور جس پر ہم قبضہ کر سکیں کر لیں، یہ بڑی خطرناک ذہنیت ہے، اور اس ذہنیت اور اس صورت حال میں کوئی چیز بچائی نہیں جاسکتی۔

ملک کے ساتھ ہی قوم کے ضمیر کو بھی آزاد کرانے کی ضرورت تھی

اس ملک کو آزاد کرانے کے لیے جو کوشش کی گئی کرنی چاہیے تھی؛ بلکہ اس سے دس گنا زیادہ کرنی چاہیے تھی، اور وہ سب لوگ قابل مبارک باد ہیں، ہندوستان کی تاریخ میں نہیں، اس انسانیت

کی تاریخ میں ان کا نام روشن رہے گا جنھوں نے یہ مقدس فریضہ انجام دیا؛ لیکن مجھے آپ یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ ملک کا آزاد کرنا تو بہت ضروری کام تھا، لیکن قوم کو آزاد کرنے کی بھی ضرورت تھی، قوم کو آزاد کرانے کے معنی کیا ہیں؟ قوم کی ایک ہی غلامی نہیں ہوتی، ملک کی ایک ہی غلامی ہے، ملک کی غلامی تو یہ ہے کہ باہر سے جو طاقت آئے اس پر حکومت کرے، اپنی حکومت کی ایجنسی قائم کرے، اپنا ایڈمنسٹریشن قائم کرے، وہاں ایک نظام لائیں، وہاں سے وہ فائدے حاصل کریں؛ لیکن انسان کو غلام بنانے کے لیے بہت سی چیزیں ہیں، انسان کو غلام بنانے کے لیے اس کے نفس کی خواہشات ہیں، ظلم کی محبت ہے، ظلم سے نفرت کا نہ ہونا ہے، بے انصافی کا جذبہ ہے، دولت کی حرص ہے، انسانیت کا احترام نہ کرنا ہے، روپے کی حد سے بڑھی ہوئی محبت ہے، پچاس باتیں انسان کو غلام بناتی ہیں۔

ملک تو آزاد کرنے کی کوشش کی گئی، بہت بڑی کوشش تھی، اور بلا ایک منٹ تاخیر کرنی چاہیے تھی، لیکن قوم کو آزاد کرنا، قوم کے ضمیر کو آزاد کرنا بھی ضروری تھا، جسم کے آزاد ہونے سے کام نہیں چلتا، اب تو یہ حقیقت بالکل روز روشن کی طرح واضح ہوگئی ہے کہ صرف جسم کے آزاد ہونے سے کام نہیں چلتا، جسم کو آپ آزاد کرا لیجیے، کتنی قوموں کے جسم آزاد ہوئے؛ لیکن ان کا ضمیر غلام تھا، ہمارا آپ کا ضمیر غلام ہے، اگر ہم انگریزوں کی تہذیب، خیالات اور ڈپلومیسی کے غلام ہیں تو ہم غلام ہیں۔

ضمیر کی غلامی زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے

ظلم صرف باہر کا آدمی نہیں کرتا، اندر کا بھی کرتا ہے۔ ہماری ایک بڑی بھول یہ ہے کہ جب ظلم باہر کا آدمی کرتا ہے تو ہم اس کا نام ظلم رکھتے ہیں، اور جب ہمارے اندر کا آدمی کرتا ہے، ہم خود کرتے ہیں، تو اس کے بڑے خوشنما خوشنما نام رکھتے ہیں، اور ہم اس کو ظلم کہنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

ہم ظلم کے عادی ہوگئے ہیں، ہم کو ظلم کا شوق ہوگیا ہے، ظلم ہمارے اندر سرایت کر گیا ہے، ظلم ہمارا مزاج بن گیا ہے، ناانصافی ہمارا شعار بن گیا ہے، پیسے کی قیمت ہمارے اوپر اتنی سوار ہوگئی ہے کہ نہ ہم بھائی کو دیکھتے ہیں، نہ ہم ماں کو دیکھتے ہیں، نہ ہم باپ کو دیکھتے ہیں، نہ بیٹے کو دیکھتے ہیں، ہم پیسے کو دیکھتے ہیں، ہم اپنے لیے مصیبت ہیں، اپنے بھائیوں کے لیے مصیبت ہیں، اپنے ملک کے لیے مصیبت ہیں، اور اگر آپ مجھے معاف کریں اور بدگمانی نہ کریں، تو میں کہوں کہ باہر کی غلامی

سے یہ ضمیر کی غلامی کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے، ہم نے ملک کو تو آزاد کرایا اور آزاد کرانا چاہیے تھا؛ لیکن قوم کو آزاد کرانا، اس کے ضمیر کو آزاد کرانا، اس کی برین واشنگ (Brain Washing)، اس کے ضمیر کو دھونا، پاک کرنا، اس کے اندر سے پاپ کی خواہش اور مال کی محبت نکالنا، اس کی ہم نے فکر نہیں کی۔

ظلم ظلم ہے چاہے کوئی کرے

ظلم کی طرف بڑھنے والا ایک ہندوستانی کا ہاتھ باہر کے ایک جرمن، ایک فرنچ، ایک انگریز سے کچھ کم پاپی نہیں، اگر آپ کو اس سے اتفاق نہیں تو میں آپ کا ہرگز ساتھ نہ دوں گا، میں کہوں گا کہ یہ کھلی ہوئی ناانصافی ہے، انگریز کیا کرتا تھا؟ وہ آپ سے لے کر آپ کے ملک کا انتظام کرتا تھا، میں اس کو کہنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ وہ اس سے اچھا انتظام کرتا تھا، بہت سخت لفظ ہے، میرا ضمیر احتجاج کرتا ہے، مجھے تکلیف محسوس ہوتی ہے، لیکن میں یہ کہوں گا، اس سے زیادہ آپ کو یہاں اطمینان حاصل تھا، آپ ریل پر آنکھ بند کر کے سفر کرتے تھے، کوئی خیال تک نہیں کرسکتا تھا کہ ریل پر کوئی واقعہ پیش آسکتا ہے، آج ڈاکے پڑ رہے ہیں، ہم روز اخبار میں پڑھتے ہیں کہ روز ریلوں پر ڈاکے پڑ رہے ہیں، ہمارے اندر بھیڑیے، سانپ اور بچھو پیدا ہو گئے ہیں، آپ انگریزوں کو سانپ کہیے یا بچھو کہیے، مگر یہ سانپ اور بچھو آپ سے ہمیشہ لپٹے نہیں رہتے تھے، یہ تو سول لائن (Civil Line) میں رہتے تھے، یہ تو بڑی اونچی کوٹھیوں میں رہتے تھے، جب تک یہاں رہتے تھے اپنے ملک کو یاد کرتے رہتے تھے، اور جس طریقے سے سرشام چڑیاں اپنے گھونسلوں کی طرف جاتی ہیں، اس طریقے سے جب چھٹی ہوتی تھی، جب گرمی ہوتی تھی تو یہ اڑ کر لندن پہنچ جاتے تھے، مگر یہ سانپ اور بچھو تو آپ سے لپٹے ہوئے، چمٹے ہوئے ہیں، یہ تو آپ کی کھال سے چمٹے ہوئے ہیں، مال کی محبت، پاپ کا اندر بسیرا کرلینا، ہمارے دماغوں، ہمارے دلوں میں پاپ نے ڈیرے ڈال دیے ہیں، انسانیت کی عزت کا جذبہ ہمارے دلوں سے نکل گیا ہے، ہمارا فائدہ ہو، ہمارا کام نکل آئے، ہمارا اُلو سیدھا ہو جائے، باقی ہمیں مطلب نہیں۔

آج پورے ملک میں بدعنوانی اور بدانتظامی کا دور دورہ ہے

دفتروں، کچہریوں، اسٹیشنوں اور ڈاک خانوں؛ غرض ہر جگہ ابتر حالت ہے، یہ محکمے انگریزوں کے زمانے میں خوش انتظامی اور باقاعدگی میں ضرب المثل تھے، بدقسمتی یا خوش قسمتی سے

خط بھی میرے پاس بہت آتے ہیں اور میں بھی بہت خطوط لکھتا ہوں، مجھے ڈاک خانے کا تجربہ ہے، ریل کا سفر بھی بہت کرتا ہوں، بہت سے سفر اپنی قسمت میں لکھوا کے لایا ہوں، خدا جانے کب ان کی فہرست پوری ہوگی، ہندوستان کے اندر اور ہندوستان کے باہر بھی سفر کرتا ہوں، مجھے ریل کا خوب تجربہ ہے، کوئی کام بغیر پیسہ دیے ہوئے ہوتا ہی نہیں۔

حکومت نے ہر طرح کی سہولتیں دیں؛ لیکن اس کا کیا علاج کہ ہمارے ہر شہری کے اندر مال کی محبت ایسی بس گئی ہے کہ وہ بالکل اندھا ہو گیا ہے، بس ناجائز طریقہ پر زیادہ سے زیادہ پیسہ اس کے پاس آجائے اور پھر کس سے؟ کیا غیر ملکیوں سے؟ نہیں؛ بلکہ اپنے ہی بھائیوں سے۔

سیٹ بک کرانے جائیے تو جواب ملتا ہے: نہیں صاحب! سیٹ نہیں، سب سیٹیں الاٹ ہو گئی ہیں، اور جب وہاں پہنچے کمپارٹمنٹ میں، تھری ٹائر میں یا فرسٹ کلاس میں، تو معلوم ہوا کہ چار چار سیٹیں خالی جا رہی ہیں، اب وہاں کاروبار ہو رہا ہے، بات بہت کڑوی ہے، اور میں بھی ذائقہ رکھتا ہوں، کڑوے اور میٹھے کا فرق سمجھتا ہوں، میں اس وقت جو الفاظ کہہ رہا ہوں، اپنے منہ میں کڑواہٹ محسوس کر رہا ہوں اور مجھے تکلیف ہوتی ہے۔

آج ہمارے ملک کا کیا حال ہے؟ سب کچھ ہونے کے باوجود کس نے ہمارے ہاتھ باندھ رکھے ہیں؟ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، کیا تعلیم کی کمی کی وجہ سے ہو رہا ہے؟ میں تو اتنا سادہ لوح نہیں ہوں کہ یہ مان لوں، میں تو اپنے عرب دوستوں سے کہتا ہوں کہ آپ کیا دو یونیورسٹیوں پر بڑا ناز کر رہے ہیں، ہمارے یہاں آئیے ہندوستان میں، آپ تو فہرست پڑھتے پڑھتے اُکتا جائیے گا، اتنی یونیورسٹیاں ہیں۔!!

ہمیں کسی نے بنانے کی کوشش ہی نہیں کی

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ پیسے کی کمی اس کا سبب ہے؟ سبب یہ ہے کہ ہمیں کسی نے بنانے کی کوشش کی ہی نہیں، میں کہتا ہوں کہ ملک کے آزاد کرانے کی کوشش جس طرح کی گئی اس کے چوتھائی حصہ، ربع حصہ اس قوم کو بنانے کی کوشش کی گئی ہوتی، ان کو درست کرنے کی کوشش کی گئی ہوتی اور اس کے اندر اخلاقی بنیادیں قائم کی جاتیں، اس سے آدمی آدمی بنتا ہے، اس سے آدمی کے مرتبہ کو پہچانتا ہے، جس سے وہ سمجھتا ہے کہ پاپ، ظلم، ناانصافی، خیانت بری چیز ہے، دوسرے کا پیسہ میری جیب میں آئے گا، وہ پیسہ نہیں، یہ زہر ہے، یہ بچھو ہے، یہ سانپ ہے، یہ احساس ہی نہیں

ہوگا اس کے نزدیک پیسہ ہونا چاہیے، اس سے مطلب نہیں جس راستے سے آئے چاہے۔

درخت اپنی فطرت کے مطابق ہی پھل دیتا ہے

بھائی! آپ درخت لگاتے ہیں اور درخت ہے نیم کا، آپ اس کی سیوا کیجیے، پانی دیجیے، اس کے بعد نمکولی اس سے پیدا ہو، اسے آپ چکھیں، اور اس سے آپ کے منہ کا مزہ بدلے، تو آپ کہیں: لعنت ہو اس درخت پر، اور یہ درخت نمک حرام ہے، ہم نے اس کی اتنی خدمت کی، اس کو پانی دیا، دسمبر کی سرد راتوں کو کھڑے ہو کر ہم نے پانی دیا، یہ نمک حرام ہمیں کڑوی چیز کھلا رہا ہے۔ کوئی سمجھ دار آدمی آپ کی بات نہیں مانے گا، ارے بھائی! تم نے نیم کا درخت کیوں لگایا تھا؟ تم نے نیم کے درخت سے توقع کیوں کی کہ تمھیں الہ آباد کا امرود کھلائے؟۔

ایک اخلاقی مقدمہ

ہم نے جو درخت اس ملک میں اُگایا، اور ساری مغربی تہذیب نے، میں سب کو کہتا ہوں، اور میں سب کے خلاف احتجاج کرتا ہوں؛ بلکہ آپ کی عدالت عالیہ میں مقدمہ دائر کرتا ہوں، ایک منصف جج سے آج فیصلہ کرانا چاہتا ہوں، میں اس معزز عدالت میں، اس الہ آباد میں کھڑے ہو کر، یہاں کے اس نامی ہائی کورٹ میں جس نے ہزاروں آدمیوں کو، ہزاروں مظلوموں کو ان کا حق دے دیا ہے، اور ہزاروں یتیموں اور بیواؤں کو ان کی جائیداد دلائی ہے، میں آج اس میں ایک اخلاقی مقدمہ دائر کرتا ہوں، میں عدالت کو محدود نہیں سمجھتا، میں سمجھتا ہوں کہ اس کو اخلاقی مقدمہ کا بھی فیصلہ کرنا چاہیے، اگر میری پہنچ وہاں تک نہیں ہے تو آپ کے ضمیروں کی عدالتوں میں، آپ کے دلوں کی عدالت میں، جس نے یہ عدالت پیدا کی ہے، آپ کے دل نہ ہوتے، آپ کے روشن دماغ نہ ہوتے، آپ کا علم نہ ہوتا، آپ کی کوشش نہ ہوتی، تو یہ عدالتیں کہاں ہوتیں؟ یہ عدالتیں آپ کی پیدا کی ہوئی ہیں، آپ ان عدالتوں کے پیدا کیے ہوئے نہیں ہیں، آج میں آج کے پورے فلسفۂ زندگی کے خلاف، اس پوری مادہ پرست تہذیب کے خلاف، موجودہ سیاست کے خلاف ایک نالش کرتا ہوں، میں آپ سے پوچھتا ہوں، مجھے آپ جواب دیجیے، آپ نے جو درخت لگایا تھا، آپ کو اس درخت سے کیوں شکایت ہے؟ کیا آپ اس درخت کی فطرت، اس درخت کے نیچر (Nature) کے خلاف اس کو بغاوت کرانے کی خواہش رکھتے تھے؟ آپ کی خواہش جائز نہیں تھی۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو عاقل بالغ انسان بنایا ہے، آپ سے کہا ہے کہ یہ آم کا درخت ہے، یہ نیم کا درخت ہے، یہ امرود کا درخت ہے، یہ سیب کا درخت ہے، زمین بنانے والے نے یہ اعلان کیا کہ میں نے زمین کو حکم دیا ہے کہ جیسا بیج ڈالا جائے، وہ اسی طرح کا درخت پیدا کرے، میں نے بارش کو حکم دیا کہ اس درخت میں اس کے قطرے جائیں، اور اس درخت کی فطرت کے مطابق اس کی صلاحیت کو ابھاریں، نہ بارش میرے حکم سے سرتابی کرسکتی ہے، نہ زمین میرے حکم سے سرتابی کرسکتی ہے، لیکن میں تمھیں اے انسانو! اے پڑھے لکھے انسانو! اور عاقل بالغ انسانو! میں تمھیں مجبور نہیں کرتا کہ تم نیم کا درخت لگاؤ، تمھیں اختیار دیتا ہوں چاہے سیب کا درخت لگاؤ، چاہے نیم کا درخت لگاؤ، آپ نے نیم کا درخت لگایا، آپ کا انتخاب یہی تھا، اور اب آپ ناک بھوں چڑھاتے ہیں، آپ کا انصاف یہ کیسا؟

ایک بڑی کوتاہی

ہم نے نیم کا درخت لگایا، ہم نے کسی بچے کو نہیں بتایا کہ خدا ہے، ہم نے کسی بچے کو سبق نہیں پڑھایا کہ مرنا ہے، ہم نے کسی بچے کو یہ سبق نہیں پڑھایا کہ اوپر خدا اور نیچے انسان ہے، ہم نے کسی بچے کو یہ سبق نہیں دیا، پرائمری اسٹیج سے لے کر، مجھے معاف کیا جائے، الٰہ آباد یونیورسٹی کے آخری اسٹیج تک، پی. ایچ. ڈی. اور ڈی. لٹ. . ریسرچ وغیرہ کے آخری اسٹیج تک، ہم نے ایک دن اس کو یہ نہیں بتایا، ہم نے کیا کیا چیزیں بتائیں؟ وہ چیزیں بتائیں جن کے جاننے سے انسان کی قسمت نہیں بدلتی، جن کے نہ جاننے سے انسان کی قسمت نہیں پھوٹتی، وہ اگر جانے تو اچھا، اگر نہ جانے تو کوئی نقصان نہیں، ہم نے وہ چیز اس کو نہیں بتائی جس کے جاننے سے انسان کی قسمت بدل جاتی ہے، یہ دنیا جنت بن جاتی ہے، جس کے نہ جاننے سے سب کچھ ہوتے ہوئے بھی یہ دنیا جہنم ہے۔

کس اسٹیج پر ہم نے اپنے بچے کو یہ بتایا، مسلمان اور ہندو بچے کو یہ بتایا کہ میاں، بھیا، انسان سب سے بڑی چیز ہے، یہ خدا کا پیدا کیا ہوا خدا کی قدرت کا سب سے بڑا نمونہ ہے، یہی تمہاری سب سے بڑی خدمت ہے کہ اس کی سیوا کرو، اس کے دل کو خوش کرو، جیسے تمھارے ماں باپ انسان ہیں، یہ بھی انسان ہیں، یہ بھی کسی کا باپ ہے، یہ بھی کسی کا بیٹا ہے، ہم نے کبھی بتایا کہ یہ پیسہ جو ناجائز طریقہ پر ہم لیتے ہیں پیسہ نہیں ہے، یہ آگ کا ایک انگارہ ہے؟ یہ خدا کے پیغمبروں نے بتایا، اور آپ نے ایسی سوسائٹی پیدا کی کہ واقعی انسانوں نے اس کو انگارہ سمجھا؟ انگارے سے بڑھ کر سمجھا؟ جہاں ایسے واقعات پیش آئے کہ دنیا کے بادشاہوں کے تاج ان کے قدموں کے

نیچے تھے اور وہ ان کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے، میاں! پیٹ پر پتھر بندھے ہوتے تھے، اور اگر وہ چاہتے تو اچھے اچھے پکوان پکا سکتے تھے، اور بڑے جشن منا سکتے تھے؛ لیکن نظر اٹھا کر بھی انھوں نے نہ دیکھا۔

اخلاقی پستی اور انسانی زوال

ہمارے ملک میں انسان اور انسانیت کی پامالی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اگر کوئی ضرورت مند کسی دفتر جاتا ہے تو اسے غرض مند دیکھ کر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک شکار پھنس گیا، موٹا شکار ہاتھ آ گیا، گویا کوئی انسان نہ ہوا کوئی چوہا یا موذی جانور ہوا کہ جو پنجرے میں پھنس گیا ہو، بھائی! یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ہمارا ایک بھائی آیا ہے، اس کا کام ہمارے ذریعہ سے ہو جائے، اور ہم اس کا دل خوش کردیں، یہ ہماری سعادت ہے کہ ہمیں اپنے ہی بھائی اور اپنے جیسے ایک انسان کی خدمت کا موقع اللہ تعالیٰ نے نصیب کیا۔

یہ کیا ذہنیت ہے، یہ کیا شقاوت ہے کہ بے چارہ ایک غرض مند ہمارے پاس آئے اور ہم یہ کہیں کہ ایک شکار پھنس گیا، اب اس سے خوب وصول کریں گے، اپنے خاندان کی کئی فرمائشوں کو پورا کرنا تھا، خوب موٹا شکار ہاتھ آیا ہے، تم نے اس کو یہ کیوں نہیں سمجھا کہ یہ اپنی ماں کا لاڈلا اور باپ کی آنکھ کا تارا ہے، یہ بیمار پڑتا تھا تو اس کی ماں آنکھوں میں رات کاٹ دیتی تھی، کیسی کیسی مصیبتیں اٹھا کر اس کو پالا گیا، کیا اس دن کے لیے اس کو پالا تھا کہ آپ اس کا خون چوسیں؟ اور کیا اس کی یہی قیمت تھی کہ آپ اس سے چند پیسے وصول کریں؟

میرے بھائیو! اخلاقی پستی اور انسانی زوال کی اس آخری سرحد تک ہمارا ملک اور ہمارا سماج پہنچ چکا ہے، لیکن کوئی منظّم اور مؤثر اصلاحی کوشش، اور گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کوئی روشنی کی کرن نظر نہیں آتی، ہمارا یہ جلسہ، ہمارا یہ سفر اور ہماری یہ جدوجہد اس ملک کی وسعت اور اس کام کی اہمیت کے اعتبار سے قطعاً ناکافی ہے، مگر تحریکیں اسی طرح پروان چڑھتی ہیں، کارواں اسی طرح بنتے ہیں کہ بات ایک سے دوسرے تک پہنچے۔

’’خدا کی نگری‘‘ سے پیامِ انسانیت کا آغاز

الٰہ آباد سے ہم نے کام کا آغاز کیا ہے، اس شہر کا نام ’’الٰہ آباد‘‘ یعنی ’’خدا کی نگری‘‘ ہے، یہیں سے خدا پرستی کی تحریک اور انسانیت کے احترام کی دعوت شروع ہونا چاہیے، خدا (جس کے

نام کا یہ شہر ہے) کے بندوں کی عزت اور انسانیت کی خدمت کے کام کا آغاز ''خدا کی نگری'' سے ہونا چاہیے تھا، ہمارا مقصد کسی نئی جماعت کی تشکیل نہیں؛ بلکہ انسانیت کے بھولے ہوئے سبق کی یاد دہانی کی یہ جد و جہد ہے، اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کام اگر نہیں ہوا تو اس ملک کا مستقبل تاریک، اور اس کی آزادی اور سلامتی بھی خطرے میں ہے، اور پھر اس کو کوئی منصوبہ بندی، اوپر کی لیپا پوتی نہیں بچا سکے گی۔!!![1]

(۱) پندرہ روزہ ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۱۰ و ۲۵/جنوری ۱۹۷۵ء)۔

۲

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے (۱)

حضرات! اس موقع پر جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کے اظہار کے لیے ایک شعر سے کام لوں گا، وہ شعر لکھنوی مذاق اور لکھنوی زبان کا شعر ہے۔ لکھنؤ کے ایک مشاعرہ میں جو نوابی عہد میں ہوا تھا اور جس میں لکھنؤ کے بڑے بڑے اساتذہ موجود تھے، جب ایک کمسن شاعر نے اپنی غزل کا یہ مطلع پڑھا تو مشاعرہ میں دھوم مچ گئی، مطلع یہ تھا۔

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اس شعر کا دوسرا مصرع زیادہ مشہور ہے، اور خاص موقعوں پر پڑھا جاتا ہے، اس کو ایسے موقع پر پڑھتے ہیں جب کسی گھرانے کا کوئی بچہ بڑا ہونہار ہو، جس کی پیشانی پر بڑائی کے آثار کندہ ہوں، اور کچھ امیدیں اپنے خاندان کی اور جاننے والوں کی اس سے وابستہ ہوں، اگر اس سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی ہے، اور وہ اپنے خاندان کے نام کو بٹہ لگاتا ہے، یا اپنے خاندان کے لیے کسی مصیبت کا باعث بن جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں:

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

آپ دیکھیے کہ آج دنیا کا نقشہ ایسا ہی ہے، انسانیت کے گھرانے کو مشرق سے لے کر مغرب تک، شمال سے لے کر جنوب تک، اس گھر کے چراغ ہی سے آگ لگی ہے، باہر سے یہ آگ نہیں آئی۔

تاریخ انسانی کے کسی دور میں یہ نہیں ہوا

تاریخ انسانی کے کسی دور میں یہ نہیں ہوا کہ جانوروں، درندوں، سانپوں اور بچھوؤں نے

(۱) ۲۲ مئی ۱۹۷۵ء کو لکھنؤ کے تاریخی مقام گنگا پرشاد میموریل ہال (امین الدولہ پارک) میں منعقد پیام انسانیت کے جلسہ میں کی گئی تقریر۔

انسانیت پر کبھی کوئی منظّم حملہ کیا ہو، تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ فلاں سلطنت کا زوال اس طرح ہوا اور ملک کی اینٹ سے اینٹ اس طرح بجی کہ شہر کے چیتوں، شیروں اور بھیڑیوں نے اس پر یلغار کی اور انسانوں کو لقمۂ اجل بنالیا، اور تہذیب کا چراغ بھی گل ہو گیا۔ سانپ اور بچھو تو شہر کے اندر بھی ہوتے ہیں، لیکن ایک گھر یا ایک خاندان کے متعلق بھی تاریخ میں لکھا ہوا نہیں ملتا کہ سانپوں اور بچھوؤں کی وجہ سے اس گھر کا صفایا ہوا ہو، محلے کا محلّہ صاف ہو گیا ہو۔

کبھی کسی ملک کو جاہل اور بے پڑھے لکھے انسانوں نے تباہ نہیں کیا

انسانی تاریخ کے جتنے بھی اَلمیے (Tragedies) ہیں، ملکوں اور قوموں کی تباہی، Societies اور معاشروں کی بربادی کے جتنے واقعات ہیں، وہ سب انسانوں کے کرتوت ہیں۔ اگر مجھے معاف کیا جائے تو میں کہوں کہ انسانی تاریخ کے بڑے بڑے اَلمیے اور انسانوں پر جو بڑی بڑی مصیبتیں آئیں، وہ زیادہ تر ان انسانوں کی لائی ہوئی تھیں جو زیادہ پڑھے لکھے تھے، جو زیادہ مہذب، شائستہ اور آسودہ تھے، اور اگر یہ کہا جائے کہ بہت زیادہ ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے تو غلط نہ ہوگا، کسی ملک کو کبھی جاہل، کندۂ ناتراش، بے پڑھے لکھے انسانوں نے تباہ نہیں کیا، ایک واقعہ بھی تاریخ میں نہیں مل سکتا کہ کوئی ملک اس ملک کے جاہلوں کے ہاتھ تباہ ہوا، ان بے چاروں میں اتنی سمجھ نہیں ہوتی، وہ تو بے چارے موٹی موٹی باتیں جانتے ہیں، ان کو تو کھانا پینا ملتا رہے، وہ تو تباہ کن آلات ایجاد بھی نہیں کر سکتے، ان کا ذہن وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتا، قوموں اور سوسائٹیوں کی تباہی کچھ ہنسی کھیل نہیں ہے، وہ کسی ایک دو افراد کی غلطی یا کسی ایک طبقہ کے ظلم کا نتیجہ نہیں ہوتا، جب کسی تمدن کا قوام بگڑ جاتا ہے، تمدن جب سڑ جاتا ہے، اس میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے، تو تباہی آتی ہے۔

غلامی اور محکومی کے اسباب

تاریخ میں ایسی بہت کم مثالیں ہیں کہ کسی قوم نے کسی قوم پر سیکڑوں، ہزاروں برس تک حکومت کی ہو، یہ تو غیر فطری چیز ہے کہ کوئی قوم باہر سے آئے اور اس کو غلام بنائے اور صدیوں تک غلام ہی رکھے، بعض قوموں کے زوال سے یا کسی بادشاہ یا حکمراں کی غلطی سے ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے، خود ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالیے، جب یہ انتظام بگڑا اور لوگوں کی عزت و آبرو خطرہ میں پڑ گئی، زندگی ان کے لیے عذاب بن گئی، نہ امن و امان تھا، نہ سکون و اطمینان؛ اس وقت ملک کی آبادی زبانِ حال سے کہتی تھی کہ کوئی اور طاقت ملک کا انتظام سنبھالے، اور ہم کو اس عذاب سے نجات دے۔

پیغام دوطرح کے ہوتے ہیں ، ایک پیغام جوآفیشیل (Official) ہوتا ہے، قانونی اور تحریری ہوتا ہے، اورایک پیغام ہوتا ہے جودل، دماغ اورروح کی زبان سے ادا ہوتا ہے، روح کہتی ہے اورروح سنتی ہے، قوم کی روح جوستائی ہوئی اور کرب واذیت میں ڈوبی ہوتی ہے، فریاد کرتی ہے، بچوں کی آہ وفغاں، عورتوں کی نالہ وفریاد، دکھے ہوئے انسانوں کی آہیں، ان کے دل کی کراہ خداتک ہزاروں پردوں کو چاک کرکے پہنچتی ہے، اگراس کی راہ میں سمندر حائل ہو، پہاڑ حائل ہوں، وہ اس کی راہ کوروک نہیں سکتے، جیسے کہ اللہ کے پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ مظلوم کی آہ سے بچو! اس لیے کہ وہ سیدھی آسمان تک پہنچتی ہے، کوئی چیز اس کوروک نہیں سکتی۔ [1] خدا کواپنی مخلوق پر پیار آتا ہے، اپنی بنائی ہوئی چیز سے پیار ہوتا ہے، ایک کمہار کواپنی مٹی کی بنائی ہوئی چیز سے پیار ہوتا ہے، خدا کی مخلوق کہیں ہو، جب اس کا دل دکھے گا، جب اس کی انسانیت پامال ہوگی، جب اس کی ہستی کو خاک میں ملایا جائے گا، جب اس کے حق کا خون کیا جائے گا، جب حقیقت کا انکار کیا جائے گا، جب دن کورات اوررات کودن کہا جائے گا، جب بچوں کے منھ سے نوالہ چھین لیا جائے گا، جب بیواؤں کے سر پر سے دوپٹہ اتارلیا جائے گا، جب غریب کے چولہے پر سے توا کھینچ لیا جائے گا، تو درودیوار سے آواز آنے لگتی ہے کہ ہماری مدد کرو۔ اس وقت خدا یہ نہیں دیکھتا کہ ان غریبوں اوردکھ کے مارے انسانوں کونجات دلانے والا کہاں سے آتا ہے۔

یہی انسانی تاریخ کا بار بار کا تجربہ ہے کہ جب لوگ زندہ درگور ہوکر زندگی گزارتے ہیں، جن کا ایک گھنٹہ ایک ساعت گزارنا مشکل ہوجاتا ہے، اس وقت پورے ملک کا پتہ پتہ، تنکا تنکا اور درودیوار یہ صدا لگاتے ہیں کہ ہمیں بچاؤ! زندگی عذاب بن گئی ہے، ہم ان اپنوں کولے کر کیا کریں، یہ ہمارے کس کام کے جو امن قائم نہیں رکھ سکتے ؟ اس وقت خدا ان کوسزا دیتا ہے، ان غریبوں کی مدد کرتا ہے۔ اورآپ دیکھیں گے کہ تاریخ میں جب کبھی ایسی صورت حال پیدا ہوئی تو باہر سے کوئی اورقوم آئی، اس نے ملک کا نظم ونسق سنبھال لیا، فائدہ بھی پہنچایا، اور فائدہ بھی اٹھایا، اس صورت حال پر آپ جتنے بھی چیں بہ جبیں ہوں، آپ کو اختیار ہے؛ لیکن مجھے اس پر بالکل تعجب نہیں آتا، کیونکہ خدا کوبہر حال اپنی مخلوق کی دادرسی کرنی ہے اوراس صورت حال میں زیادہ دن باقی رہنے کی صلاحیت نہیں۔ میرے نزدیک بیرونی حکومت کی یہی توجیہ ہے کہ وہ ملک کے ذمہ داروں اور برسر حکومت طبقہ کی بے عنوانیوں اورنااہلی کی سزا اورمظلوموں کی آہ وفغاں کا نتیجہ ہوتی ہے۔

(۱) مسند الإمام أحمد بن حنبل (۱۲۵۷۷)۔

بیرونی حکومت اور ملکی حکومت کا فرق

لیکن یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ انگریزوں کو جنھوں نے اس ملک پر سو برس تک حکومت کی، اس ملک سے کوئی تعلق نہ تھا، وہ ان کے نزدیک صرف ایک دودھ دینے والی گائے کی حیثیت رکھتا تھا، وہ تو اپنے اور اپنی قوم کے مفاد کے لیے آئے تھے اور چلے گئے۔ اگر وہ یہاں سے ریل کی پٹریاں اور مکانوں کے دروازے اور کھڑکیاں اکھاڑ کر لے جاتے تو مجھے کچھ تعجب نہیں تھا، اس لیے کہ ان کو اس ملک میں رہنا ہی نہیں تھا، وہ اس ملک میں رہ کر بھی اپنے ملک کی فکر میں رہتے تھے۔ لیکن تعجب اس پر ہے کہ ؎

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

انگریز اس گھر کے چراغ تو نہیں تھے، سچی بات یہ ہے کہ وہ اس گھر کی آگ تھے، اگر وہ آگ لگاتے بھی تو ہمیں تعجب نہ ہوتا، وہ یہاں مہمان کی طرح آئے اور مہمان کی طرح رہے اور مہمان کی طرح چلے گئے، ان کے تو دن گنے ہوئے تھے۔ انگریزوں کے جانے کے بعد اس ملک کے ساتھ اپنوں نے جو سلوک کیا، وہ سلوک حیرت انگیز ہے، آپ مجھے معاف کریں، میں آپ ہی میں کا ایک فرد ہوں، اگر میں آپ کی شکایت کرتا ہوں تو اپنی ہی شکایت کرتا ہوں، اگر میں آپ پر تنقید کرتا ہوں تو اپنے پر تنقید کرتا ہوں۔ یہاں آپ کو بلانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ آپ صورت حال کا جائزہ لیں اور ہم اقرار کریں ؎

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

جن لوگوں نے اس ملک کا چارج لیا، وہ اس ملک کے اصلی باشندے تھے، جن کی قسمت اس ملک سے وابستہ تھی، جن کو اس ملک میں جینا اور اس ملک میں مرنا تھا، اور جنھوں نے آزادی کی لڑائی جوش وخروش سے لڑی، یہ امین آباد پارک جو آپ سے چند گز کے فاصلہ پر ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ آواز وہاں پہنچ رہی ہے، یہ پارک ابھی تک گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریروں سے گونج رہا ہے، یہ گنگا پرشاد میموریل ہال جس میں آپ اس وقت جمع ہیں، یہ اس احتساب کے لیے بہت موزوں مقام ہے، یہ جنگ آزادی کے رہنماؤں کا خاص ایوان اور اسٹیج رہ چکا ہے، میں نے بھی ان کی تقریریں سنی ہیں، آج گویا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، مولانا آزاد، مولانا شوکت علی اس جگہ کھڑے ہو کر تقریر کر رہے ہیں، یہ کل کی بات مجھے معلوم ہو رہی ہے، اور یہ امین آباد پارک تو جنگ آزادی کے

عظیم ترین اسٹیجوں میں سے ایک اسٹیج تھا، ہمارے لکھنؤ کو فخر ہے، آزادی کی لڑائی میں اس کا وہ حصہ ہے جو ہندوستان کے کم شہروں کا حصہ ہوگا، سائمن کمیشن ہندوستان آیا ہوا ہے، ملک کے رہنماؤں کی طرف سے اس کے بائیکاٹ کی اپیل کی گئی ہے، اسی سلسلہ میں امین آباد پارک میں ایک زبردست جلسہ ہوا، جس میں مولانا محمد علی جوہر اور پنڈت جواہر لال نہرو کی تقریر ہوئی، میں اس جلسہ میں شریک تھا، اسی لکھنؤ میں آزادی کا صور پھونکا گیا، اسی پارک میں ولایتی کپڑوں کو آگ لگائی گئی، یہ میری آنکھوں کے سامنے کے مناظر ہیں۔

صرف لکھنؤ ہی میں نہیں، سارے ہندوستان میں ایک آگ لگی ہوئی تھی۔ اگر کوئی شخص دیکھتا تو وہ کہتا کہ وہ لائق ترین لوگ ہیں جو اس ملک کی کشتی پار لگائیں گے، یہ وہ لوگ ہیں جو اس ملک کو ایک گلدستہ بنادیں گے، یہ وہ لوگ ہیں جو اس ملک سے ہر قسم کا دکھ درد دور کردیں گے، یہ وہ لوگ ہیں جو صرف ہندوستانیت ہی نہیں بلکہ انسانیت کو سربلند کریں گے، یہ وہ لوگ ہیں جن کے زمانہ میں ہر قسم کی تکلیفیں دور ہوجائیں گی، بدامنی کافور ہوجائے گی، ناانصافی کوئی جانے گا بھی نہیں، عدالتیں انصاف کا پیکر ہوں گی، محکمے ذمہ داری اور امانت داری کا نمونہ ہوں گے، پولیس کی ضرورت نہیں ہوگی، ہندو مسلمان اس طرح سے ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہوں گے جیسے بھائی بھائی۔ اتحاد ومحبت اور ایثار وقربانی کے یہ مناظر آپ میں سے بہت سے لوگوں نے دیکھے ہوں گے۔ کسی کے وہم وخیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد اس ملک کا یہ نقشہ ہوگا جو ہم دیکھ رہے ہیں۔ یہ ملک تو خود اہل ملک کے ہاتھ سے تباہ ہوا، لیکن جیسا میں نے کہا کہ ؎

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

آج سارے ملکوں اور ساری دنیا میں انسانیت جس طرح پامال ہورہی ہے وہ تو ایک لمبی داستان ہے اور ایک عام موضوع ہے، میں اس پر کیا روشنی ڈالوں؟ اس کے لیے تو بہت اسٹیج ہوسکتے ہیں، موٹی موٹی کتابیں بھی لکھی جاسکتی ہیں۔

آپ کی کہانی کہنی ہے

لیکن آج مجھے آپ سے آپ کی کہانی کہنی ہے اور مجھے تو اپنا اور آپ کا محاسبہ کرنا ہے، خود مدعی بن کر میں آپ کے اور اپنے خلاف آپ ہی کی عدالت میں مقدمہ دائر کرتا ہوں، آج ہمارے سامنے ملک کا جو نقشہ ہے، کیا جنگ آزادی کے رہنماؤں کے وہم وگمان میں بھی آسکتا تھا؟ میں سمجھتا ہوں کہ ان میں سے کسی کے ذہن میں یہ بات آجاتی تو شاید ان کے ہاتھ سست ہوجاتے اور جس

جوش وخروش کے ساتھ جنگ آزادی لڑ رہے تھے، وہ ختم ہو جاتا۔

ہم نے ملک کی کیا حالت بنا رکھی ہے؟ ہم اپنے ہاتھوں سے کس طرح اس کا حلیہ بگاڑ رہے ہیں، جیسے یہ ملک کسی دشمن کے ہاتھ لگ گیا ہے، اور وہ اچھی طرح سے اس سے انتقام لینا چاہتا ہے، اپنے دل کا بخار نکال رہا ہے، بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کو اجاڑ کر رکھ دینا چاہتے ہیں، اور اس کو کسی قابل رہنے دینا نہیں چاہتے۔ ریلوں پر سفر کر کے آپ دیکھ لیجیے، بسوں پر سفر کر کے آپ دیکھ لیجیے، آپ کسی شعبہ میں جا کر دیکھ لیجیے، انصاف کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ ہم خود اپنے ملک کو اپنے ہاتھ سے تباہ کر رہے ہیں، ریل کا حال یہ ہے کہ پنکھے، نلوں کی ٹوٹیاں، کھڑکیاں، سیٹوں کے چمڑے چرائے جاتے ہیں، گلیوں میں مین ہول کے ڈھکن چرا لیے جاتے ہیں، اس کی بھی پرواہ نہیں ہوتی کہ معصوم بچوں کی اس میں جان چلی جائے گی۔

ایسی پستی ایسی گراوٹ

ایک ایسی انسانی پستی، ایک ایسی گراوٹ کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں، ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ایسے مجمع کے سامنے مجھے کہتے ہوئے تکلیف محسوس ہوتی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ میں اپنے مقام سے گر رہا ہوں، لیکن حقائق ہیں جن کے بغیر صورت حال کی صحیح عکاسی اور تصویر آپ کے سامنے نہیں آسکتی، پھر یہ دیکھیے! کیا ایک شہری دوسرے شہری کو اپنا بھائی سمجھتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ خدا کا بنایا ہوا ایک انسان ہے؟ بالکل نہیں، ہر شخص دوسرے کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ یہ ایک شکار ہے۔

آج ہمارے معاشرہ اور انتظامیہ میں قیمتی انسان سے ایک موذی جانور کا سا سلوک کیا جاتا ہے، آج یہ حال ہو گیا ہے کہ ہم اپنے ہی طرح انسانوں کو، اپنے ہم وطن کو، اس ملک کے شہری کو اپنا بھائی نہیں سمجھتے، ہماری نظر اس کی جیب پر ہوتی ہے، ہماری نظر اس کے دھڑکتے ہوئے دل، ہماری نظر اس کی سلگتی ہوئی روح، ہماری نظر اس کے بلکتے ہوئے بچوں، ہماری نظر اس کی بوڑھی ماں، اس کے غریب خاندان پر نہیں ہوتی، ہماری نظر اس کی جیب کے چار پیسوں پر رہتی ہے۔ سارے ملک کا یہ حال ہو گیا ہے کہ کسی کو کسی سے ہمدردی معلوم نہیں ہوتی، سارا ملک ایک منڈی اور ایک جواخانہ بن گیا ہے، جس میں ایک کی جیت اور ہزاروں کی ہار ہے، کسی کے دل میں کوئی بلند جذبہ، بلند تخیل، انسانیت کا احترام، خدا کا لحاظ باقی نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دل و دماغ پر کوئی فالج گر گیا ہے، ہمارا ضمیر مفلوج ہو کر رہ گیا ہے، ہمارے ضمیر میں ملامت کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی، سب اقدار (Values) ختم ہو چکے ہیں، اور صرف ایک (Value) باقی ہے اور وہ ہے: پیسے کی

محبت۔ اور اس صورت حال اور اس بگاڑ سے کوئی پنجہ آزمائی کرنے کے لیے تیار نہیں۔ سارا ملک اور معاشرہ اصلاح اور سدھار سے مایوس نظر آتا ہے، یہ وہ خطرناک علامت ہے کہ جس سے ملک وقوم کبھی پنپ نہیں سکتے، اجتماعی بگاڑ نے پورے ملک کو کھوکھلا بنادیا ہے، اور ہر شخص اپنے ذاتی اغراض اور محدود مفادات کو پورے ملک پر ترجیح دے رہا ہے۔

انسانیت کو اس پر ماتم کرنا چاہیے اور انسانیت کے دعوے داروں کو شرم کے مارے اپنی گردن جھکا دینی چاہیے، ہولناک حادثات پر پتھر پگھل جاتے ہیں، مگر ہمارے معاشرہ نے سنگ دلی کے ایسے نمونے پیش کیے ہیں کہ جن کی مثال دنیا کے کسی ملک میں نہیں ملتی۔

خودغرضی اور اجتماعی مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح دینے کا جو مزاج اس ملک میں پیدا ہو گیا ہے اس نے وہ خطرات پیدا کر دیے ہیں جو کسی بیرونی طاقت سے بھی پیدا نہیں ہو سکتے۔ ریل اور ہوائی جہاز کے حادثے تو شاذ ونادر ہی پیش آتے ہیں، لیکن ہر دفتر، ہر بازار، ہر شعبۂ زندگی میں وہ لوٹ گھسوٹ اور انسانیت وشرافت کی پامالی کا سلسلہ جاری ہے جو انسانوں کے لیے باعث ننگ وعار اور باعث شرم ہے۔ سارے ملک میں کام چوری، رشوت خوری اور اقربا پروری کا عام مزاج ہو گیا ہے۔ وہی ملک ہے جو انگریزوں کے زمانہ میں تھا، مگر نہ معلوم اس کی صلاحیتِ کار کو کیا ہو گیا ہے، نہ انتظام ہے، نہ امن ہے، کسی شخص کو یہ پر مسرت احساس نہیں کہ وہ اپنے گھر میں ہے۔ لوگ بڑی سی بڑی عزت، بڑی سی بڑی دولت چھوڑ کر اپنے وطن آتے ہیں کہ وطن کی بات ہی دوسری ہوتی ہے، اپنا گھر اور اپنا ملک کہنے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو وہاں اطمینان، عزت اور خوشی حاصل ہو، ایک کو دوسرے پر بھروسا ہو، ایک دوسرے کے دکھ درد میں کام آئے، اسی کا نام ہے اپنا گھر، اپنا وطن۔ ایسے وطن میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ جس میں آرام ملے نہ امن وچین نصیب ہو، اپنے گھر اور اپنے وطن کا مطلب تو یہ ہے کہ انسان کو وہاں زیادہ آرام اور خوشی اور امن وعافیت نصیب ہو، اور اگر یہ حاصل نہ ہو تو لوگ ایسے وطن سے کیا خاک محبت کریں گے؟!!

منفی حب الوطنی

۱۹۴۷ء میں انگریزوں کے چلے جانے کے بعد انسان دوستی، ہمدردی، خلوص ومحبت کا ایسا مثالی دور آنا چاہیے تھا کہ لوگ دور دور سے دیکھنے آتے، میں ڈنکے کی چوٹ پر کہوں گا کہ ہم نے اپنے کو اس ملک کے انتظام چلانے کا اہل ثابت نہیں کیا، ہماری حب الوطنی، سلبی اور منفی

(Negative) تھی، مثبت اور ایجابی (Positive) نہ تھی، یعنی ہماری اصل دلچسپی اور صلاحیت انگریزوں کے نکالنے پر مرکوز تھیں، ملک کو بنانے اور سنوارنے سے ہمیں زیادہ دلچسپی تھی اور نہ اس کی اہلیت کا ہم نے ثبوت دیا۔

بہت سے لوگ لڑائی جیت لیتے ہیں اور صلح ہار جاتے ہیں، بہت سی قومیں ہیں جو معتدل حالات میں اس صلاحیت کا ثبوت نہیں دیتیں جو غیر معتدل حالات میں انھوں نے دیا ہے۔ جنگ کے زمانہ میں آدمی کی قوت مقابلہ اس کی تمام کمزوریوں پر پردہ ڈال دیتی ہے، ہم ہندوستانیوں میں کمزوریاں تھیں، جنگ آزادی نے اس پر پردہ ڈال دیا تھا، جب ہیجانی دور ختم ہوا اور ہمارے امتحان کا دور آیا تو ہم ناکام ہوگئے، دولت جب تک نہیں ہوتی بہت سے لوگ عابد، زاہد بن جاتے ہیں لیکن دولت آنے کے بعد ان کا رویہ اور زندگی بدل جاتی ہے، اس طرح کا تجربہ ہمیں رات دن ہوتا رہتا ہے، جنگ کا زمانہ ان چیزوں پر توجہ کرنے کی فرصت نہیں دیتا، جنگ کی بھاپ نکل جانے کے بعد اس کی تہہ میں جو چیزیں ہیں وہ اُبھر آتی ہیں۔

جب آزادی کی جنگ ختم ہوئی تو معلوم ہوا کہ ہم اہل نہیں، ہم صرف اپنا فائدہ چاہتے ہیں، ہمیں دوسرے کو فائدہ پہنچانے سے کوئی دلچسپی نہیں، معلوم ہوا کہ ہمارے اندر انسان کا دل نہیں ہے، بلکہ چیتے، بھیڑیے اور درندے کا دل ہے۔ آخر چند برس میں یہ کیا کایا پلٹ ہوگئی؟ لڑائی کے زمانہ میں ہم کیا تھے؟ جنگ آزادی کے زمانہ میں ہم غریبوں کی خدمت کرتے پھرتے تھے، ہمارے جو ساتھی جیل میں تھے، ان کے گھروں کی سیوا کرتے تھے، تمام نفرتیں اور کدورتیں کافور ہوگئی تھیں، ہندو اور مسلمان کا کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا، جنگ آزادی کی اس آگ نے ہماری آپس کی دشمنی کو پگھلا دیا تھا، لڑائی کے دوران میں تو اصلاح کا موقع نہیں تھا، لیکن جنگ آزادی شروع کرنے سے پہلے اور آزادی ملنے کے بعد ہمیں کتنا موقع ملا تھا، مگر ہم نے اپنی تربیت کا اس مدت میں کوئی سامان نہیں کیا، ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۵ء تک کتنا موقع ملا تھا؟

اصلاح سے مایوسی خطرناک ہے

ہم میں کتنے ادارے ہیں، کتنے مصنفین و ادباء ہیں جنھوں نے انسان میں صحیح شہری احساس، انسانیت کا احترام، صحیح حب الوطنی پیدا کرنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے؟ آج صورت حال سے ہر شخص پریشان و مایوس ہے، ہر مجلس کا موضوعِ گفتگو آج کی ابتر صورت حال ہے، ہر شخص یہ کہتا ہے کہ نہ کھانے کا مزہ ہے، نہ امن و امان ہے، لیکن اس صورت حال کے ہم سب ذمہ دار ہیں، اس

گندے پانی میں ہم سب گلے گلے ڈوبے ہوئے ہیں، سب اس گندے پانی کے دریا سے اپنے مفاد کا موتی نکالنا چاہتے ہیں، اس گدلے پانی پر تنقید تو ہر شخص کرتا ہے، مگر اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اسی میں غوطہ لگالے، اور ہو سکے تو اس سے اپنے فائدہ کا موتی نکالے۔

یہ سب اس مایوسی کا نتیجہ ہے کہ اب اس ملک کی قسمت میں بگاڑ ہی لکھا ہوا ہے، اور اس کی سدھار کی کوئی صورت نہیں، یہ مایوسی حد درجہ خطرناک اور ملک وقوم کے لیے بڑی مہلک ہے۔

نقار خانہ میں طوطی کی آواز

آج کا یہ جلسہ اور یہ حقیر کوشش نقار خانہ میں طوطی کی آواز سے زیادہ نہیں، ہندوستان کے ۵۵ کروڑ انسانوں کا یہ نقار خانہ، اس میں چند آدمیوں کی آواز کی حیثیت ہی کیا ہے، یہ صرف تکلیف دہ صورت حال پر احتجاج کرنے کے لیے، راستہ تلاش کرنے کے لیے ہے کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ ہمارے ساتھ شامل ہو جائے، اور اس صورت حال سے ناپسندیدگی کا اظہار کرے۔

میرے دوستو! ملک اس وقت شدید خطرے میں مبتلا ہے، باہر سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں، وہ زمانہ گزر گیا جب ایک ملک دوسرے ملک پر حملہ کرتا تھا، اور ایک قوم دوسری قوم کو غلام بناتی تھی، اس کا کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا کہ آج کے حالات میں کوئی ملک دوسرے ملک پر قبضہ کرے، لیکن صورت حال ایسی ہے کہ ہر شخص پریشان ہے، اور وہ کسی نجات دہندہ کا منتظر ہے، ہمارے ملک کے لوگ اس صورت حال سے اتنے تنگ آچکے ہیں کہ نہ تو آزادی کے اعلی اقدار کا خیال کرتے ہیں، اور نہ اس دانشمندانہ لٹریچر کی کوئی پرواہ کریں گے جو آزادی کی فضیلت میں لکھا گیا ہے، اور نہ اس زمانہ کے مصائب کا خیال کریں گے جو انگریزوں کے دور میں یہاں کے رہنے والوں نے برداشت کیے۔ وہ تو اس صورت حال کے تبدیل کرنے کے خواہش مند ہیں، جو اس ملک کی آزادی سے پورا فائدہ اٹھانے میں مانع ہے۔

آزادی کے بعد

ہندوستان کی آزادی کا تاریخ انسانی میں ایک مقام ہے، اس کا اس کتاب میں ایک زریں بات ہے، لیکن جس ملک کے رہنے والے اس ملک کے نظم ونسق (ایڈمنسٹریشن) سے مایوس ہوں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس ملک میں حق نہیں مل رہا ہے، ہمارا جائز مطالبہ ہمیں نہیں مل سکتا، ہم امن وعزت کی زندگی نہیں گزار سکتے، اس سے بڑھ کر حکومت پر سے عوام کی بے اعتمادی اور کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن یہ

کروڑوں معصوم عوام، یہ راستہ کا چلنے والا عام آدمی (Man of Street) جس نے سیاست کا ایک حرف بھی نہیں پڑھا ہے، یہ سیاسی داؤ پیچ نہیں جانتا، جو کہتا ہے صحیح کہتا ہے، یہ اس کے دل کی آواز ہوتی ہے، یہ زبان حال، زبان حقیقت، زبان واقعہ سے بار بار اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ میرا اعتماد اس نظام پر سے اٹھ چکا ہے۔

مسئلہ صرف ایک پارٹی کا نہیں

میں کسی ایک پارٹی، کسی ایک جماعت، ایک طبقہ کو نہیں کہتا، بلکہ ساری پارٹیوں، ایک دوسرے کے بعد کی آنے والی حکومتوں اور نئے تجربہ کی دعوت دینے والوں، ماہرین سیاست اور حکومت کے امیدواروں، سب کو کہتا ہوں کہ ان پر سے عوام کا اعتماد اٹھ چکا ہے، اگر آپ دلوں کو کرید سکیں، اور اس کے لیے کسی عمل جراحی کی ضرورت نہیں، اسٹیج پر تقریر کرنا، مضمون لکھنا اور چیز ہے، اصل احساسات وہ ہیں جو گھر میں اور نجی مجلسوں میں ظاہر کیے جاتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے کہا۔

نقشوں کو تم نہ جانچو، لوگوں سے مل کے دیکھو
کیا چیز جی رہی ہے، کیا چیز مر رہی ہے

ایک یا دو فرد سوسائٹی کو نہیں بگاڑ سکتے

حضرات! عام طور پر لوگ کسی خاص طبقہ یا چند افراد اور بعض اوقات تنہا کسی فرد کو پوری سوسائٹی کی خرابی کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ ان عناصر نے یا اس بگڑے ہوئے فرد نے پوری زندگی کو غلط رخ پر ڈال دیا تھا، لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں، میں تاریخ کے مطالعہ کی بنیاد پر کہتا ہوں کہ ایک مچھلی تالاب کو گندہ کر سکتی ہے لیکن ایک فرد سوسائٹی کو بگاڑ نہیں سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ اچھی سوسائٹی میں برے آدمی کا گزر نہیں ہو سکتا، وہ گھٹ گھٹ کر مر جائے گا۔ جس طرح مچھلی کو پانی سے نکال دیا جاتا تو وہ گھٹ کر مر جاتی ہے، اسی طرح جو سوسائٹی برائی کی ہمت افزائی نہیں کرتی، وہ اسے خوش آمدید (Welcome) کرنے کے لیے تیار نہیں، اس میں برائی تڑپنے لگے گی، اس کا دم گھٹنے لگے گا اور وہ دم توڑ دے گی۔

ہر زمانہ میں اچھے برے انسان ہوئے ہیں، لیکن سب برائیوں کا ان کو ذمہ دار ٹھہرانا اور تمام برائیوں کو ان کے سر تھوپ دینا ٹھیک نہیں، اگر کچھ برے لوگ حاوی ہو گئے تھے تو اس کا مطلب یہ

نہیں کہ پوری زندگی کا ہینڈل ان کے ہاتھ میں تھا، وہ جس طرف چاہتے تھے، زندگی کو موڑ دیتے تھے، بلکہ بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں سوسائٹی میں خود خرابی آگئی تھی، اس زمانہ کا ضمیر گندہ ہوگیا تھا، اس میں برائیوں کا رجحان پیدا ہوگیا تھا، اس کے اندر اندھیر، ظلم اور خواہشات کو پورا کرنے کی زبردست خواہش پیدا ہوگئی تھی، وہ خود غرض اور نفس پرست بن گیا تھا۔ جس دل کو گھن لگ جائے، جو مَن پاپی ہو جائے، آپ اس کو جرائم سے کسی طرح روک نہیں سکتے، آپ اس کو بیڑیوں میں جکڑ کر کے بھی رکھیں گے، تب بھی ان چیزوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتے۔

مصنوعی صورت حال

آج جو صورت حال ہے بالکل مصنوعی اور غیر فطری ہے، اس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ یہ اہل ملک کی کمزوری ہے کہ ہم اس صورت حال کو برداشت کر رہے ہیں۔

بغاوت اور انقلاب کا نعرہ نہیں بلکہ اصلاح کا نعرہ

میں بغاوت کا نعرہ نہیں دیتا، میں انقلاب کا بھی نعرہ نہیں دیتا، میں اصلاح کا نعرہ دیتا ہوں، میں انسانی حقوق کی اپیل کر رہا ہوں، ہندوستانی ہونے کے ناطے یہ اپیل کر رہا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ میرا اگر ان بلند پایہ شخصیتوں اور تحریکوں سے تعلق نہ ہوتا، جنھوں نے سب سے پہلے اس ملک کی آزادی کا خواب دیکھا تھا، اور اس کی آزادی کی لڑائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، تو میں اتنی صاف گوئی سے کام نہ لے سکتا، لیکن میرا دل وضمیر اس تلخ نوائی اور تنقید کے باوجود مطمئن ہے، کیوں کہ میرے اوپر اسلاف اور بزرگوں کا ریکارڈ نہ صرف صاف اور پاک ہے، بلکہ درخشاں اور تاباں ہے۔

خوفِ خدا اور حب الوطنی

کسی ملک یا قوم کے تحفظ وبقا کے لیے، اور افراد کو خود غرضی، ظلم، بے ایمانی اور خیانت سے بچانے کے لیے اصل طاقت تو خدا کا عقیدہ اور خوف ہے۔ جب کسی انسان کے دل ودماغ میں یہ عقیدہ جاگزیں ہو جائے کہ ایک ایسی بالاتر ہستی ہے جو اندھیرے اُجالے میں میری نگراں ہے، اور مجھے اس کے سامنے جواب دہی کرنی ہے، تو وہ کوئی غلط کام نہیں کر سکتا۔ اصلاح کے لیے اس سے بہتر کوئی نسخہ نہیں، یہ وہ اصل طاقت ہے جو چوروں کو پاسباں بناتی ہے۔

اس کے بعد کسی درجہ میں کوئی طاقت اس کو تباہی سے بچا سکتی ہے تو وہ سچی حب الوطنی ہے، یہ

احساس ہو کہ یہ ہمارا ملک ہے، ہمارا شہر ہے۔ خدانخواستہ کسی ملک میں یہ دونوں جذبے ختم ہوجائیں تو دنیا کی کوئی طاقت اس کو تباہی سے بچا نہیں سکتی، کوئی فلسفہ، اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم، ایک لاکھ یونیورسٹیاں کام نہیں آسکتیں۔

یورپ آج جذبۂ حب الوطنی کی وجہ سے باقی ہے

یورپ آج جذبۂ حب الوطنی کی وجہ سے باقی ہے، اس نے دو عظیم جنگیں جھیلی ہیں، یورپ دومرتبہ خون کے دریا میں نہایا ہے، ہم پر تو صرف خون کے چھینٹے پڑے ہیں، یورپ تو خون کے سمندر میں پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں ڈوب کر نکلا ہے، جنگ عظیم میں بعض بڑے بڑے شہر تباہ ہوگئے تھے، مگر وہاں کے لوگوں کی سچی حب الوطنی تھی جس نے پھر انھیں دنیا کے نقشہ پر اہمیت دلادی، کھنڈر اور ملبہ پر ایک نیا شہر وجود میں آیا، یورپ میں ہزار خرابیاں، الحاد و دہریت، فسق و فجور اور عیش و عشرت کی ترقی ہے، مگر سچی حب الوطنی، انصاف پسندی، ذمہ داری کا احساس اور ہر شہری کے حقوق کی حفاظت اور جان و مال کے تحفظ کے احساس نے اس کو تھام رکھا ہے۔

اگر کسی ملک یا قوم میں نہ تو خوف خدا ہو، نہ سچی حب الوطنی ہو تو اس کو تعمیری منصوبے اور مادی ترقیاں تباہی سے بچا نہیں سکتیں، اہل ملک اس صورت حال پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔

مسلمانوں کی دوہری ذمہ داری

آخر میں مَیں اپنے مسلمان دوستوں اور بھائیوں سے کہوں گا کہ ان کی اس موقع پر دوہری ذمہ داری ہے، ایک تو یہ کہ ان کا مذہبی صحیفہ قرآن اور ان کے پیغمبر کی تعلیم ان کو نہ صرف اس عام بگاڑ، اس پھیلی ہوئی آگ اور دولت کی پرستش کے اس بہتے ہوئے گندے پانی سے بچنے کی تلقین کرتی ہے، بلکہ ان پر اس کو روکنے اور اس سے لوگوں کو بچانے کی ذمہ داری بھی عائد کرتی ہے، ان کو ان کے پیغمبر نے صاف طریقہ پر سمجھا دیا ہے کہ اگر کسی کشتی کے کسی سوار کو بھی ایسی حرکت سے باز رکھنے کی کوشش نہ کی گئی جس سے کشتی خطرہ میں پڑجاتی ہے، اور یہ کشتی ڈوبی، تو پھر اس کشتی کا کوئی سوار بھی بچ نہیں سکے گا، اور یہ کشتی نیک و بد، قصوروار اور بے قصور، سوتے جاگتے، سب کے ساتھ ڈوب جائے گی، اور اس وقت کوئی نیکی اور کوئی دانائی کام نہ آئے گی۔

ان کی دوسری ذمہ داری کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس ملک میں انسانیت کے احترام، عدل ومساوات اور سماجی انصاف کا پیغام لے کر آئے تھے اور انھوں نے اس ملک کی بڑے نازک وقتوں

میں مدد کی، یہ پیغام ان کی مذہبی تعلیمات میں اب بھی پورے طور پر محفوظ ہے، اگر انھوں نے ملک کی سوسائٹی کی اس ڈوبتی یا ڈگمگاتی کشتی کو بچانے کی امکانی کوشش نہ کی، تو وہ خدا کے سامنے قصوروار اور گنہ گار ٹھہریں گے، اور تاریخ میں فرض ناشناس؛ بلکہ احسان فراموش اور مجرم قرار پائیں گے۔[(۱)]

---

(۱) یہ تقریر پہلے پندرہ روزہ ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۲۵ر مئی و ۱۰ر جون ۱۹۷۵ء) میں شائع ہوئی، بعد میں تلخیص، ترتیب اور حضرت مولاناؒ کی نظر ثانی کے بعد متعدد بار علاحدہ رسالہ کی شکل میں بھی شائع ہوئی۔

۳

خدا نسلِ انسانی سے مایوس نہیں (۱)

خدا کا معاملہ نسلِ انسانی کے ساتھ

حضرات! مجھے اس کثیر مجمع کے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، جو انسانیت کے نام اور انسانیت کے مسئلہ پر غور کرنے کے لیے یہاں جمع ہوا ہے، اس مجمع کو کسی سیاسی غرض اور خاندانی مفاد نے نہیں جمع کیا، اس سے میرے اندر ایک حوصلہ اور نئی امنگ پیدا ہوئی، انسانیت کے مستقبل کی طرف سے امید کی ایک کرن نظر آئی کہ اس کا مستقبل روشن ہے اور مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔

خدا کا معاملہ نسلِ انسانی کے ساتھ، اور انسانی نسل کا معاملہ نسلِ انسانی کے ساتھ بالکل برعکس ہے، خدا نسلِ انسانی سے مایوس نہیں، اس کی مہربانیاں اور اس کی نعمتیں اس کائنات پر، اس سنسار پر برس رہی ہیں، کائنات کی ہر چیز نسلِ انسانی سے پُر اُمید ہے، لیکن ہمارا معاملہ ایک دوسرے کے ساتھ یہ بتاتا ہے کہ ہم انسان سے مایوس ہیں۔

کسی ''مفکر'' نے کہا ہے کو جو بچہ اس دنیا میں آتا ہے، وہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ خدا نسلِ انسانی سے مایوس نہیں، اگر مایوس ہوتا تو اس نسل میں اضافہ نہیں کرتا، اسے اپنی قسمت اور صلاحیت آزمانے اس دنیا میں نہ بھیجتا۔

انسان کا معاملہ انسان کے ساتھ

لیکن انسان انسان کا گلا کاٹتا ہے، انسان سے نفرت کرتا ہے، انسان انسان کا استحصال کرتا ہے، جونک کی طرح خون پیتا ہے، اسے گاہک سمجھ کر فائدہ اٹھاتا ہے، اور اپنے رویے سے اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ انسانیت کی صلاحیت، اور مستقبل سے وہ مایوس ہے۔

خدا اور انسان کے یہ مظاہرے برابر جاری ہیں، بارش کا ایک ایک قطرہ اس کا اعلان کرتا ہے

(۱) بھوپال میں پیامِ انسانیت کے ایک جلسہ میں ۳؍دسمبر ۱۹۷۷ء کو کی گئی تقریر۔

کہ دنیا کا پیدا کرنے والا اپنی پیاسی مخلوق سے، اپنی ظالم مخلوق سے ابھی مایوس نہیں ہے، زمین روئیدگی کی صلاحیت رکھتی ہے، اس کی پیداوار اس بات کا اعلان ہے کہ خدا اس زمین کے رہنے والوں سے مایوس نہیں، سورج چمکتا ہے، وہاں کوئی اسٹرائک نہیں، چاند برابر نکلتا ہے، اور اپنی چاندنی کی چادر پھیلاتا ہے، آنکھوں کو ٹھنڈا کرتا ہے، دلوں کو بھی ٹھنڈک پہنچاتا ہے، یہ سب اس بات کا اعلان ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان سے ابھی مایوس نہیں۔

لیکن ہمارا اور آپ کا عمل یہ ثابت کرتا ہے کہ ہم انسان سے مایوس ہیں، ہم اپنے کردار و عمل سے اس بات کا مظاہرہ کر رہے ہیں کہ ہم اس انسان کو جو خدا کی صنعت کا بہترین نمونہ ہے، کوئی وقعت نہیں دیتے۔

سب سے حسین اور دلآویز تخلیق انسان کی ہے

خدا کی قدرت اور حسن تخلیق کے مظاہر ہر چیز میں ہیں، پھول، کلی، قطرہ، گھاس کا تنکہ، مٹی کا ذرہ، درخت کے پتے، جس چیز کو دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں ایک دنیا ہے، ان سب سے حسین اور دلآویز تخلیق انسان کی ہے، ساری چیزیں، پوری کائنات اس کی خدمت کے لیے پیدا کی گئی، یہ سب اس بات کا اعلان کرتی ہیں کہ انسان خدا کا محبوب ہے، اشرف المخلوقات ہے، اس دنیا کی بارات کا دولہا ہے۔

لیکن ہمارا اور آپ کا طرز عمل یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان میں کوئی خوبی نہیں، ہم اپنے عمل سے خدا کی عدالت میں اپنے خلاف مقدمہ دائر کرتے ہیں کہ ہم کو دنیا سے اٹھالیا جائے، گویا ہم فرشتوں کی اُس بات کو ثابت کرنا چاہتے ہیں جس کی تردید خدا نے کی تھی، جب تخلیق انسان کے وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: ﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ (میں اسے زمین پر اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں) تو فرشتوں نے اندیشہ ظاہر کیا تھا: ﴿أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ﴾ (سورۃ البقرۃ: ۳۰)، (کیا آپ ایسے کو ''خلیفہ'' بنا رہے ہیں جو زمین پر بگاڑ پیدا کرے گا اور خون بہائے گا؟) جب خدا نے علمِ اشیاء کے بارے میں آدم سے سوال کیا تو اس نے ٹھیک جواب دیا، فرشتے جواب میں ناکام رہے، خدا نے انسان کو جِتایا تھا، ہم اس کو ہرا رہے ہیں۔

جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

خدا نے یہ فرمایا کہ تم کو معلوم نہیں کہ انسان میں کیسے کیسے گُن ہیں، اس سے علم کا دریا کیسا

اُبلتا ہے، سمندروں میں وہ وسعت اور گہرائی نہ ہوگی جو اس میں ہے، اس کی آنکھوں میں محبت کی جو چمک ہے، وہ پیش کرنے سے تم قاصر ہو، اس کے دل میں نرمی ہے، محبت ہے، گداز ہے، اس پر درد کی چوٹ لگتی ہے جس سے تم محروم ہو، اقبالؔ نے بڑی جرأت سے کہا تھا۔

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

اس سے بڑھ کر یہ کہ۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّ و بیاں

فرشتوں کے پاس یہ دولت نہیں، انسان خدا کے یہاں فرشتوں کے مقابلہ میں وہ دل پیش کرسکتا ہے جو چوٹ کھایا ہوا ہو۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

کسی پر خنجر چلے، کسی کے تلوے میں کانٹا چبھے تو اس کی کسک اپنے دل میں محسوس ہوتی ہے، انسان کے پاس جو سب سے بڑا سرمایہ ہے، وہ رحم کا سرمایہ ہے، وہ محبت کا سرمایہ ہے، وہ ایک آنسو ہے جو انسان کی آنکھ سے کسی بیوہ کے سر کو ننگا، کسی غریب کے چولہے کو ٹھنڈا، کسی مریض کی کراہ سن کر ٹپک پڑتا ہے، آنسو کا وہ قطرہ جو سمندر میں ڈال دیا جائے تو اسے پاک کردے، گناہوں کے جنگل میں ڈال دیا جائے تو سب کو جلا کر نور سے بدل دے، فرشتے سب کچھ پیش کر سکتے ہیں لیکن آنسو کا وہ قطرہ پیش نہیں کرسکتے، جس کی قیمت آپ نے بھی نہیں پہچانی، جو ایک انسان دوسرے انسان کے لیے بہاتا ہے۔

ہم رات کو اٹھ کر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

فرشتے اپنے مالک کو دیکھ دیکھ کر اور اس کی ذات وصفات کو پہچان کر نہیں سو سکتے، لیکن وہ انسان جو کسی انسان کی مصیبت و درد کی وجہ سے نہیں سو سکتا، اس کے جاگنے کو فرشتوں کی بیداری نہیں پہنچ سکتی۔

انسان کی سب سے انمول چیز

انسان کے پاس سب سے انمول چیز یہ ہے کہ وہ دوسرے کے درد سے متأثر ہوتا ہے، اس

کے اندر محبت کا مادہ ہے، اس کو حرکت دینے والی کوئی چیز مل جائے تو وہ حرکت میں آجاتا ہے، پھر نہ مذہب کو دیکھتا ہے، نہ ملت کو، نہ فرقے کو، نہ علاقے کو، نہ وطن کو دیکھتا ہے، نہ ملک کو دیکھتا ہے، انسان انسان کا دل دیکھتا ہے، اس کے درد کو محسوس کرتا ہے، جس طرح مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے، اور وہ کھنچنے پر مجبور ہے، اسی طرح انسان کے دل کا مقناطیس انسان کے دل کو کھینچتا ہے۔

جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

اگر انسان سے یہ دولت چھن جائے تو وہ دیوالیہ ہو جائے گا، اگر کوئی ملک اس سے محروم ہو جائے، اگر امریکہ کی دولت، روس کا نظام، عرب ممالک کے پٹرول کے چشمے ہوں، ہُن برستا ہو، سونے اور چاندی کی گنگا جمنا بہتی ہو، لیکن اس ملک میں محبت کا چشمہ خشک ہو چکا ہو، تو وہ ملک کنگال ہے، اس ملک پر اللہ کی رحمتیں نازل نہ ہوں گی۔

ابھی انسان کی آنکھ آنسو بہانے کے قابل ہے، ابھی انسان کا دل تڑپنے والا، سلگنے اور چوٹ کھانے کے قابل ہے، جو دل اس قابل نہیں ہے ایسے دل کو دل نہیں کہتے، بلکہ پتھر کی سِل کہتے ہیں جو خدا کی بارگاہ میں کوڑی کے قابل نہیں، چاہے وہ مسلمان کا دل ہو یا ہندو، سکھ، عیسائی کا دل ہو، دل تو اس لیے ہے کہ وہ تڑپے، لرزے، روئے، اس میں زمین سے زیادہ شادابی، آبشار سے زیادہ سیرابی، کائنات سے زیادہ وسعت اور بادلوں سے زیادہ برسنے کی صلاحیت ہو۔

کوئی جا کر کے کہہ دے ابر نیساں کہ یوں برسے
کہ جیسے مینھ برستا ہے ہمارے دیدۂ تر سے

وہ دل انسان کا دل نہیں جس پر کبھی درد کی چوٹ نہ لگے

وہ آنکھ انسان کی آنکھ نہیں نرگس کی آنکھ ہے جس میں نمی نہ ہو، وہ دل انسان کا دل نہیں چیتے کا دل ہے جس پر کبھی درد کی چوٹ نہ لگے، جو کبھی انسانیت کے غم میں رونا تڑپنا نہ جانے، وہ پیشانی جس پر کبھی ندامت کا پسینہ نہ آئے، وہ پیشانی نہیں بلکہ کوئی چٹان ہے۔

جو ہاتھ انسانیت کی خدمت کے لیے نہیں بڑھتا وہ مفلوج ہے، وہ ہاتھ جو انسان کی گردن کاٹنے کے لیے بڑھتا ہے، اس سے شیر کا ہاتھ بہتر تھا، اگر انسان کا کام کاٹنا تھا تو قدرت اس کو بجائے ہاتھوں کے تلوار دے دیتی، اگر انسان کا مقصد زندگی صرف مال جمع کرنا تھا، تو اس کے سینے میں دھڑکتے ہوئے دل کے بجائے ایک تجوری رکھ دی جاتی، اگر انسان کا کام صرف تخریب کے

منصوبے بنانا تھا تو اس کے اندر انسان کا دماغ نہ رکھا جاتا، بلکہ کسی شیطان کسی راکشس کا دماغ رکھ دیا گیا ہوتا۔

پاریکھ صاحب نے اپنی تقریر میں انسان کے جسمانی تخلیق کے عجائبات بتلائے ہیں، لیکن آپ اس کے دل کے عجائبات دیکھیں تو جسم کے عجائبات ماند پڑ جائیں، اس کو ایسا دل دیا ہے کہ مشرق میں کسی کو تکلیف ہو تو وہ مغرب میں تڑپ اٹھے، یہ دل کی زندگی تھی کہ جنگ بدر کے موقع پر جو لوگ قیدی بنائے گئے اور ان کی مشکیں کسی گئیں تو رسول اللہ ﷺ ان قیدیوں کی تکلیف کے احساس سے رات بھر سو نہ سکے، اگر کوئی بچہ روتا تو آپ نماز مختصر کر دیتے، کہ کہیں اس کی ماں بے چین نہ ہو، جو دل کسی کا دل دکھائے، کسی کو تکلیف پہنچائے تو وہ دل کس شمار کے قابل ہے؟

آج خطرہ اندرونی ہے

بھائیو! خدا کا سارا معاملہ اس کے مخلوق کے ساتھ بتاتا ہے کہ خدا نسل انسانی سے مایوس نہیں، آپ کا واٹر ورکس پانی روک سکتا ہے، آپ کا پاور ہاؤس بجلی روک سکتا ہے، تو کیا خدا اپنی نعمتیں نہیں روک سکتا ہے؟ جس طرح یہاں کی میونسپلٹی بھوپال کے رہنے والوں کی صلاحیت سے مایوس نہیں اور ان کی خدمت کر رہی ہے، خدا اس طرح اس دنیا کو پانی بھی دے رہا ہے، اور روٹی بھی دے رہا ہے، اور سب کو حکم ہے کہ وہ انسان کی خدمت کریں۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند
تا تو نانِ بکف آری و بغفلت نہ خوری

پورا کارخانہ انسان کی خدمت میں لگا ہوا ہے، خدا اس سے مایوس نہیں ہوا ہے، لیکن ہم اپنے اخلاق سے کیا ثابت کر رہے ہیں؟ کیا ہم ثابت کر رہے ہیں کہ ہم انسان کو کوئی بڑی چیز سمجھتے ہیں؟ کوئی اونچی چیز سمجھتے ہیں؟ اپنے برابر کا سمجھتے ہیں؟ اپنے جسم کا ٹکڑا سمجھتے ہیں؟ ع

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند

یہ طرز عمل انسانی آبادی کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے، باہر سے کوئی خطرہ نہیں، وہ زمانہ بیت گیا جب قومیں دوسری قوموں پر چڑھائی کرتی تھیں، خطرہ اندرونی ہے، وہ ہے انسان دشمنی اور انسانیت کی پامالی کا خطرہ، انسانیت کی خیر خواہی سے آنکھیں بند کر لینا، اس خطرے سے ملک کو بھی اور قوم کو بھی بچانے کی ضرورت ہے۔

بارات ہے نوشہ نہیں

مجھے یہیں کے ایک بزرگ کی کہی ہوئی ایک کہانی یاد آگئی جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، وہ کہتے ہیں:

''ایک بارات بڑی دھوم سے جارہی تھی، بینڈ باجہ بھی تھا، روشنی اور مشعل بھی، بارات دیکھنے والوں کی بھیڑ میں ایک شخص بہت غور سے بارات دیکھ رہا تھا، کچھ دیر بعد اس نے کہا کہ نوشہ کہاں ہے؟ لوگوں نے کہا کہ کیا فضول بکتے ہو، بارات نہیں دیکھ رہے ہو، تماشا نہیں دیکھتے ہو؟ Enjoy نہیں کررہے ہو؟ فضول سوالات کرتے ہو، مگر وہ آدمی بڑا حقیقت پسند تھا، اس نے کہا: بارات تو بہت عمدہ ہے لیکن نوشہ نظر نہیں آتا، اس پر سب کو خیال ہوا کہ دیکھنا چاہیے نوشہ واقعی نہیں آرہا ہے، اب حقیقتاً جو تحقیقات شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ نوشہ صاحب گھوڑے پر سوار تھے، گھوڑے نے راستے کے کسی گڑھے میں انہیں گرادیا ہے، اور بارات اپنے شور و ہنگامہ میں بے نوشے کے آگے بڑھتی رہی، بارات کی دھوم دھام اور شور و پکار میں نوشے کا کسی کو ہوش ہی نہیں رہا۔''

مجھے یہ اندیشہ ہے کہ مشرق سے مغرب تک انسانیت کی جو بارات جدید تہذیب و تمدن کے ساتھ نکل رہی ہے، جس کے مناظر میں نے اس ملک میں بھی دیکھے ہیں اور یورپ و امریکہ میں بھی، کہیں یہ بے نوشہ کی بارات نہ ہو، انسانیت کی اس بارات کا نوشہ انسان ہے، انسانیت کی اس بے نوشہ کی بارات پر آنسو بہانے والا، اس کی فکر کرنے والا کوئی نہیں، اس شہر میں کتنے آدمی ہیں جو انسانیت کی بارات کے نوشہ کہلانے والے حقیقی انسان ہوں؟ ایسا انسان کہاں ہے جس کی نظر خالص انسانیت پر ہو، جسے کھو کر پانے کا مزہ آئے، جسے ہار کر جیتنے کا مزہ آئے، سب اپنی جیب، اپنا گھر بھرنے کی فکر میں ہیں، اور اپنی پارٹی کو نفع پہنچانے میں کوشاں ہیں، اور بہت ترقی کی تو قوم (Nation) کو فائدہ پہنچانے کی سوچنے لگے، نیشن بھی ایک کنبہ ہے، کنبہ چھوٹا بڑا ہوتا ہی ہے، نیشلزم بھی ایک قسم کی کنبہ پروری ہے، نیشلزم (قوم پرستی) کو شاید میں کسی وقت ضروری سمجھوں۔

میرا تعلق اس جماعت اور اس گروہ سے ہے جس نے آزادی کی جنگ میں بھرپور حصہ لیا، اور ملک و قوم کی آزادی کے لیے اس وقت جد و جہد شروع کی جب آزادی کا نام بھی کوئی نہیں لیتا تھا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ نیشلزم بھی ایک تنگ خیالی (Narrow Mindedness) ہے، انسانیت اس سے بھی زیادہ وسیع چیز ہے۔

اس شاخ کی فکر کیجیے جس پر آشیانہ ہے

تمام قومیتیں انسانیت کی شاخیں ہیں، اصل چیز انسانیت ہے، اس انسانیت کو تباہی اور ہلاکت سے بچانے کے لیے کتنے افراد اور کتنی پارٹیاں آدمیت کے نام سے سرگرم اور انسانیت کو بچانے کے کام میں مصروف ہیں؟

تہذیب وتمدن، سیاست وحکومت، ادب وفلسفہ اور علم وفن کے آشیانے انسانیت کی شاخ پر قائم ہیں، اگر انسانیت کی شاخ باقی ہے، تو آپ جیسا چاہیں ویسا نشیمن بنالیں، لیکن شاخ ہی نہ رہی تو نشیمن کا بقا کہاں؟ آج انسانیت کی شاخ پر کتنے تیشے چلائے جارہے ہیں، آگ لگائی جارہی ہے، ہر شخص اس کوشش میں مصروف ہے کہ آدمیت کی شاخ پر بڑے سے بڑا تیشہ چلائے۔

آج ہمارے ملک میں انسان کو انسان سے محبت اور ہمدردی نہیں رہی، پہلو میں وہ دل نہیں جو انسانیت کے سوز میں جلتے ہوں، اس کا درد محسوس کرتے ہوں، نفسا نفسی کا قیامت خیز منظر ہے، ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہے، قرآن مجید میں قیامت کی نفسا نفسی کا جو نقشہ کھینچا ہے ﴿یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِیهِ، وَأُمِّهِ وَأَبِیهِ، وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِیهِ، لِكُلِّ امْرِیءٍ مِّنْهُمْ یَوْمَئِذٍ شَأْنٌ یُّغْنِیهِ﴾ (سورۃ عبس: ۳۴-۳۷) یہی منظر آج پوری انسانی سوسائٹی میں نظر آرہا ہے۔

انسان کی حقیقت سے ناآشنا

ہمارے ملک میں جب ریل اور ہوائی جہاز کے حادثات ہوتے ہیں تو ہمارے سماج کی اخلاقی پستی عیاں ہو جاتی ہے، لوگ حادثہ کا شکار ہونے والے مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کے بجائے ان کی کلائی کی گھڑیاں، اور جیبوں سے پرس نکالتے ہیں، یہ خطرہ کا وہ سگنل ہے، وہ الارم ہے جس پر پوری سوسائٹی کو چوکنا ہو جانا چاہیے۔

فرقہ وارانہ فسادات ہندو مسلم مسئلہ نہیں، بلکہ انسانیت کی بے حرمتی کی علامت ہیں، اصل مرض انسانیت کی بے وقعتی ہے۔

ہم نے بعض اوقات درخت اور جانور کو انسان سے زیادہ وقعت دی ہے، ہم نے اکثر اوقات انسان کے مقابلہ میں پیسے کو ترجیح دی ہے، حالانکہ پیسہ انسانی ہاتھ کا میل ہے، ہم نے پیسہ کو انسان کے دل، اس کی روح، اس کی آتما سے زیادہ اہمیت دی، حالانکہ انسان کا درجہ خدا نے اپنی تمام مخلوقات میں افضل اور اشرف رکھا ہے، اس کے بلند مقام کی اس سے بڑھ کر اور دلیل کیا ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

انسان کی بھوک، پیاس، بیماری کو اپنا مسئلہ بتایا ہے، جیسا کہ ایک حدیث قدسی کا مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کسی بھوکے کو کھانا کھلانا، کسی پیاسے کو پانی پلانا اور کسی بیمار کی تیمارداری کرنا گویا میرے ساتھ حسن سلوک کرنا ہے۔ انسان کے مقابلہ میں دنیا کے تمام براعظم رکھ دیجیے تو انسان کا پلڑا بھاری ہوگا، تمام براعظم انسان کے لیے پیدا کیے گئے، انسان ان کے لیے نہیں پیدا کیا گیا۔

جس انسان کو راتوں کو جاگ جاگ کر، خون جگر پلا پلا کر پالا گیا ہے، جس سے اس کے ماں باپ نے، سارے خاندان نے امیدیں قائم کی ہیں، جو خدا کی امانت لے کر دنیا میں آیا ہے، جو دنیا کی اصل روح ہے، اس کو مارا جاتا ہے، یہ قاتل وہ لوگ ہیں جن کے سامنے انسان کی حقیقت، انسان کی تاریخ، ماں باپ کا پیار نہیں ہے، اس انسان کو بنانے کے لیے تعلیم گاہوں، دانشوروں، استادوں اور مربیوں نے جو محنت کی ہے، جتن کیے ہیں، وہ ان کے سامنے نہیں، اگر یہ حقائق سامنے ہوتے تو دنیا میں کوئی نہ ملتا جو اس کو مارنے کے لیے خم ٹھونکتا، سکندر و دارا، چنگیز و ہلاکو، ہٹلر و سیزر، انہوں نے انسانیت کی کھیتی کو آگ لگائی، یہ سب انسان کی حقیقت سے ناآشنا تھے، وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ انسان کے خلاف بگاڑ پیدا کرنے والوں پر خدا کو کتنا غصہ آتا ہے۔

نحیف آواز نے انقلاب برپا کر دیا

بھائیو! اگر آپ کے دل میں انسانیت کے احترام کا جذبہ، انسانیت کی محبت کا سوتا ہے، تو اسے حرکت میں آنا چاہیے، وہ لوگ جو اس ملک میں ہم سے زیادہ اثر رکھتے ہیں انھیں اپنی کرسیوں کو چھوڑ کر، چاہے وہ وزارت عظمیٰ کی کرسی ہو، یونیورسٹیوں اور عافیت کدوں کو چھوڑ کر اس ملک کو بچانے کے لیے میدان میں آجانا چاہیے، یہ ملک نہ بچا تو یونیورسٹیاں، حکومت، جمہوریت کہاں رہے گی؟ ان کی بقا کہاں رہے گی؟ اور ان کو پناہ کہاں ملے گی؟ ملک نہ رہے، انسانیت دم توڑ دے، تو اقوام متحدہ (U.N.O.) میں کیا جانور نمائندگی کریں گے؟ انسان ہونا شرط ہے، قوم میں قومیت کا احساس اور سیاسی شعور ہونا شرط ہے۔

چاہیے تو یہ تھا کہ اس ملک میں بڑی بڑی کرسیوں سے اور اونچے اونچے عہدوں سے اتر کر لوگ آتے اور انسانیت اور ملک کو بچاتے لیکن جب ہم نے دیکھا کہ کوئی نہیں آرہا ہے، تو ہم نے سوچا کہ ہم ہی چل پڑیں، دنیا کی تاریخ، قوموں کی تاریخ اور سماجی اور مذہبی اصلاحات کی تاریخ میں بعض مرتبہ کوئی نحیف صدا بلند ہوئی، اور اس کے بعد وہ سب کے دل کی آواز بن گئی، اور اس نے سماج میں انقلاب برپا کر دیا، اسی امید پر ہم آئے ہیں کہ ہم جگائیں، جاگنے کے بعد سب کچھ ہوسکتا ہے، اور

جگانے کے لیے نحیف سی آواز، بلکہ پتوں کے گرنے کی آواز بھی کافی ہوتی ہے۔

اس وقت کا سب سے بڑا کام

اس وقت سب سے بڑا کام یہ ہے کہ ہم اپنے اپنے مذہب کے دائرے میں انسانیت کا احترام پیدا کرنے اور انسانیت کو زندہ کرنے کی کوشش کریں، انسان انسان کی طرح ملے، اس کے بعد پھر مطالعہ، غور وفکر اور توفیق الٰہی سے اپنے لیے پسندیدہ طریقۂ زندگی منتخب کرلے، لیکن پہلے باہمی اعتماد ومحبت کی فضا تو پیدا کیجیے، انسان کو گلے لگائیے، تب آگے بات ہوگی، اگر انسانیت ہی نکل گئی تو کس سے بات کی جائے۔

انسان ہے کیا؟ اس کے اندر کیا صفات ہیں؟ انسان کا انسان پر کیا حق ہے؟ انسان کی حقیقت کیا ہے؟ انسان کو کس نے پیدا کیا ہے؟ کس لیے پیدا ہوا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں کہ جن پر انسانی سماج کے ایک ایک فرد کو غور وفکر کرنا چاہیے، اس ملک میں اتحاد ومحبت اور باہمی اعتماد کا ماحول پیدا کرنا چاہیے، اس طرح ظلم کے واقعات نہیں ہونے چاہئیں، جیسے حال ہی میں ہماری ریاست کے شہر بنارس میں ہوئے۔

میں ایک مذہبی انسان کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ ہمارے گناہ اور ظلم کے نتیجہ میں آسمانی آفتیں آتی ہیں، خدا یہ دکھاتا ہے کہ مارنے کا سامان ہمارے پاس تم سے زیادہ ہے، ہم نے آندھرا کے طوفان وسیلاب میں اس کا نمونہ دیکھا ہے، یہ واقعہ سبق دینے کے لیے ہوا ہے، جب بھی ظلم کا کوئی واقعہ ہوتا ہے تو میں ڈر جاتا ہوں کہ کوئی قدرتی تازیانہ انسانوں کی طرف نہ بڑھے، میں اس سے کسی کو مستثنیٰ نہیں کرتا، جہاں بھی ظلم کے واقعات ہوں گے، خدا وہاں اپنی قدرت دکھائے گا ع

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں [1]

---

(۱) ماخوذ از تحفۂ انسانیت، مرتبہ مولانا اسحاق جلیس ندوی (شائع کردہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، ۱۹۹۲ء، ص ۳۳-۴۵)۔

۴

ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا (۱)

زندگی کا دستور العمل

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ [سورة النحل: ٩٠]

بزرگو اور بھائیو! دوستو اور عزیزو!

میں نے قرآن مجید کی جو آیت تلاوت کی ہے، وہ نماز جمعہ کے خطبہ کا جزو ہے، ہر ہفتہ مسلمان اسے سنتے ہیں، پڑھتے ہیں، چونکہ ہم عربی زبان سے ناواقف ہیں، عام طور پر خطبہ اور نمازوں میں جو عربی میں پڑھا جاتا ہے، اس کو غور کرنے کی چیز نہیں سمجھتے، بلکہ عبادت کا ایک وظیفہ سمجھتے ہیں، اس میں کیا سبق ہے؟ کیا پیغام ہے؟ اس پر غور کرنے یا کسی جاننے والے سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، انہی میں یہ آیت بھی ہے جو دراصل پوری زندگی کا منشور ہے، (Manifesto) دستور العمل، ضابطہ، قانون، ہدایت نامہ (Directive) ہے، اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے عدل کا، احسان کا، یہ نہیں کہتا کہ کس کے ساتھ انصاف واحسان کرنا چاہیے، بلکہ مطلق انصاف اور احسان کا حکم دیتا ہے، ہر شخص کو انصاف، احسان اور نیکی کرنا چاہیے، اس کے بعد جب دینے دلانے کا ذکر آتا ہے تو اس میں تھوڑی سے تخصیص کرتا ہے، ﴿وَإِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى﴾ پھر اس میں بھی ذکر خونی رشتہ کا نہیں کہ چچا زاد بھائی ہوں، ماموں زاد ہوں، اولاد ہو، بلکہ کہتا ہے قربت والے لوگ، قربت کئی طرح کی ہوتی ہے، رشتہ کی قربت، پڑوس کی قربت، ہم وطنی کی قربت، پیشے کی قربت، قرآن مجید میں دوسری جگہ اس کی ذرا سی تشریح آئی ہے، زیادہ دور کے، زیادہ قریب کے، اس میں بھی کچھ گنجائش ہے، صرف یہی نہیں بلکہ خونی رشتے ہوں۔

---

(۱) ۴؍دسمبر ۱۹۷۷ء کو اُجّین میں پیام انسانیت کے ایک جلسہ میں کی گئی تقریر۔

پھر اللہ تعالیٰ بے حیائی کے کاموں، نامعقول باتوں اور نامناسب رویے سے روکتا ہے، تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

اُجّین شہر میں جس کی نسبت راجہ بکرماجیت کی طرف ہے، انصاف یاد آتا ہے، سنا ہے کہ وہ ایک منصف بادشاہ تھا، آج کی دنیا انصاف اور احسان کو بھول چکی ہے، جس چیز کا دنیا میں سب سے زیادہ کال ہے، وہ انصاف اور احسان ہے، انصاف دنیا سے بالکل ناپید تو نہیں ہوا، انصاف آج بھی کیا جاسکتا ہے،لیکن انصاف کے چھوٹے چھوٹے دائرے اور گھروندے بن گئے ہیں۔

آج انصاف صورت پہچان کر، ناپ تول کر، دیکھ بھال کر، سوچ سمجھ کر کیا جاتا ہے، معاملہ اپنے کسی عزیز، کسی ہم مذہب، ہم برادری، ہم قبیلے کا ہو تو انصاف کے لیے دل کھل جاتا ہے، تقاضا پیدا ہو جاتا ہے، انصاف کرنا آسان معلوم ہوتا ہے،لیکن انصاف کا معاملہ کسی ایسے فرد کا ہو جس سے کوئی خونی رشتہ نہیں، جس کے ساتھ انصاف کرنے میں کوئی خاص مادی فائدہ نہیں، تعریف و تحسین نہیں، بلکہ تنقید کا اندیشہ ہے، تو وہاں انصاف کے لیے قدم نہیں اٹھتا، قلم نہیں چلتا۔

انصاف کے لیے بھی کسی ٹریڈ مارک، برادری، خاندان، دیش اور قوم (Nation) کی ضرورت پڑتی ہے، مگر وہ انصاف جو برائے انصاف ہو، وہ انصاف جو خدا کا حکم سمجھ کر، کسی کا حق مان کر، کسی سچائی کو تسلیم کر کے کیا جائے، اور جو بے لاگ ہو، غیر جانبدار ہو، وہ انصاف بہت مشکل ہے، اور اس انصاف کے لیے وہی اللہ کے بندے تیار ہوتے ہیں جن کے دل میں خدا کا خوف اور انسانیت کا احترام ہوتا ہے، جو یہ سمجھتے ہیں کہ ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے۔

حدیث میں آتا ہے: اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللّٰهِ ، (١) ''ساری مخلوق اور جتنے انسان ہیں، وہ خدا کا کنبہ ہیں،'' یہ آخری بات اس مذہب نے کہی ہے جس کو عقیدۂ توحید پر ذرا سی آنچ گوارا نہیں، آپ جانتے ہیں کہ اسلام میں ہر وہ چیز جس سے توحید مجروح ہوتی ہو ناپسندیدہ ہے، یہاں تک کہ گنتی میں بھی وتر کو پسند کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت میں جو مذہب اتنا حساس (Sensitive) ہو، وہ مذہب تمام مخلوق کو خدا کا کنبہ کہتا ہے، یہ کتنی بڑی بات ہے، قرآن مجید کا تہائی حصہ عقیدۂ توحید پر مشتمل ہے، سورۂ اخلاص کو قرآن مجید کا ۱/۳ حصہ کہا گیا ہے، اس میں ہے: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ، اَللّٰهُ الصَّمَدُ، لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ، وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ﴾، (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! کہہ دیجیے اللہ ایک ہے، وہ بے نیاز ہے، سب اس کے ضرورت مند ہیں، اور اس کو کسی کی ضرورت نہیں،

(١) رواه البيهقي في شعب الإيمان، حديث رقم: ٧٠٤٥۔

نہ اس نے کسی کو جنم دیا نہ وہ کسی سے پیدا ہوا، اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔)

وہ اسلام جس نے سورۂ اخلاص کو ''قلب قرآن'' اور ''ثلث قرآن'' کہا ہے، خدا کی مخلوق اور خدا کے بنائے ہوئے انسانوں کو چاہے وہ کسی بھی مذہب وملت کے ہوں، چاہے وہ کسی بھی دیس اور ملک کے ہوں، چاہے وہ کسی بھی نسل یا رنگ کے ہوں، چاہے کسی بھی خاک وخون کے ہیں، اللہ کا کنبہ اور خاندان قرار دیا ہے، اللہ نے سب انسانوں کی پرورش اپنے ذمہ لی ہے۔

انسانوں میں خدا کا پیارا کون ہوگا؟ وہ نہیں جو بہت زیادہ عبادت کرے اور مالا جپے، بلکہ وہ زیادہ پیارا ہوگا جو اس کے کنبے کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے، تمام انسانوں کو خدا کا کنبہ کوئی اور مذہب قرار دیتا تو ذہن اسے قبول کرسکتا تھا، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ مذہب جو توحید کے بارے میں ایسا ذکی الحس ہے کہ دوسرا کوئی مذہب نہیں، وہ اسلام کہتا ہے کہ ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے، یہ آخری بات ہے جو اس مذہب نے کہی، اب کہنے کی کوئی بات باقی نہیں رہی۔

انصاف بے رنگ ہوتا ہے

انصاف واحسان کو اللہ تعالی نے کسی کے ساتھ مخصوص نہیں کیا، وہ تو آسمان سے برسنے والے پانی کی طرح بے رنگ ہوتا ہے، اگر آپ اس پانی کو کسی رنگین بوتل میں ڈالتے ہیں تو رنگین نظر آتا ہے، لیکن جب آسمان سے پانی برساتھا تو اس کا کوئی رنگ نہیں تھا، اسی طریقہ سے انصاف واحسان کا کوئی رنگ نہیں ہے، ہاں اگر انصاف کرنے والا مسلمان ہے تو اس کی نسبت سے کہا جائے گا کہ مسلمان منصف، اگر ہندو ہے تو کہا جائے گا کہ ہندو منصف، مسلمان اور ہندو یہ تو بوتلوں کے رنگ ہیں، لیکن انصاف اور احسان کا کوئی رنگ نہیں، یہ تو بے رنگ ہیں، بے رنگ رہیں گے، اور انھیں بے رنگ رہنا چاہیے۔

کہا گیا ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾ یہ عمومی حکم ہے، إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ مَعَ الْمُسْلِمِينَ، إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْإِحْسَانِ إِلَى الْمُسْلِمِينَ نہیں کہا گیا، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ کہا گیا ہے، دنیاؤں کا پالنے والا، رَبُّ الْمُسْلِمِينَ، رَبُّ الْمَسِيحِيِّينَ، رَبُّ الْعَرَبِ، رَبُّ الْعَجَمِ یعنی مسلمانوں کا رب، ہندوؤں کا رب، عیسائیوں کا رب، عربوں کا رب، عجمیوں کا رب نہیں کہا گیا۔

تمام جہانوں کا پالنہار، ستارے چاند، سورج، کہکشاں، نظام شمسی، دنیا کے تمام براعظم، نباتات، حیوانات، غرض پوری کائنات کے رب نے عدل وانصاف کو بالکل عام رکھا ہے، وہ قومی

انصاف، ملکی انصاف، خاندانی انصاف (Family Justice) نہیں، عام انصاف ہے، ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾ میں یہی عمومیت ہے۔

قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ فرمایا گیا: ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا اِعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى﴾ [سورة المائدة: ۸] کسی گروہ، کسی جماعت، کسی برادری سے اگر تم کو تھوڑی شکایت ہو، کدورت ہو، دل میں میل ہو تو یہ بات تمھیں اس حد تک نہ آمادہ کرے کہ تم ان کے ساتھ ناانصافی کرو، جب بھی موقع انصاف اور تول کا آئے تو ترازو جھکنے نہ پائے، پورا پورا حق دو، انصاف سے کام لو، کیونکہ یہ خدا کو خوش کرنے والی چیز ہے اور اس کی ہدایت پر عمل ہے۔

یاد رکھیے، عدل وانصاف اور احسان کو عام ہونا چاہیے، ہم سب کو، خواہ ہم کسی قوم، کسی مذہب کے ماننے والے ہوں، ہمارے پیدا کرنے والے نے ہمیں روزی پہنچانے والے، ہمارے مالک نے حکم دیا ہے کہ انصاف واحسان میں تفریق نہیں ہونی چاہیے، کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دینی چاہیے۔

میں مسلمانوں سے کہتا ہوں کہ اگر تم خدا کو ماننے والے ہو تو تم کو انصاف واحسان میں کوئی فرق نہیں کرنا چاہیے، کہ ہماری برادری، ہمارے مذہب، ہمارے عقیدہ کا ہے، اللہ تعالی کا معاملہ سب کے ساتھ یکساں ہے، اس کی محبت عام ہے، وہ سب سے پیار کرتا ہے، سب کو رزق دیتا ہے، سب کو خطرے سے بچاتا ہے، اپنی مخلوق سے ستر ماؤں سے زیادہ مامتا اور محبت رکھتا ہے، اس کی ہوا بے رنگ، اس کا پانی بے رنگ، اس کی نعمتیں عام، وہی خدا یہ چاہتا ہے کہ انصاف بے لاگ بے رنگ ہو، اس میں کوئی تفریق اور امتیاز نہ ہو، اپنے اپنے دور میں تمام اچھے لوگوں نے اس پر عمل کیا، اور تاریخ میں اپنا نام روشن کر گئے، ہم نے تاریخ میں پڑھا ہے کہ آپ کے شہر اجّین میں راجہ بکرماجیت کا راج انصاف کا راج تھا، اسی بادشاہ کے نام سے بکرمی جنتری چلتی ہے، خدا کو اس کی کوئی بات پسند آئی کہ اس کی جنتری آج تک زندہ ہے، اور نہ جانے کتنی جنتریاں ختم ہو گئیں، ہجری سن اور عیسوی سن دو پیغمبروں کے نام سے ہیں، ان پر تو ہمیں تعجب نہیں، ان کو تو زندہ رہنا ہی چاہیے تھا، اس لیے کہ ان کی تعلیمات، ان کے ماننے والے دنیا میں زندہ ہیں، لیکن بکرمی جنتری کیوں زندہ ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو اس کی کوئی بات پسند آئی، اور جیسا کہ مشہور ہے اور ہم نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ وہ انصاف کرنے والا تھا، کاش ایسا انصاف آج بھی ہوتا۔

عالمی بگاڑ کا سبب

دنیا میں اس وقت جو بگاڑ آیا ہوا ہے یہ انصاف اور احسان کے صحیح ناپ تول نہ ہونے کی وجہ

سے ہے، ترازو نہیں دیکھتی کہ تولنے والا کون ہے اور کیا رکھا گیا ہے؟ ترازو صحیح ہے تو صاف بتا دیتی ہے کہ یہ اتنے سیر ہے، اس کا اتنا وزن ہے، ترازو میں ایک رتی کا فرق نہ ہوگا، چاہے ہیرے جواہرات تُلیں۔

حکومت کرنے والوں، سیاست دانوں، دانشوروں، عالموں، شاعروں، فلسفیوں، مصنفوں، مفکروں، اور ادیبوں کو ترازو ہی کی طرح منصف ہونا چاہیے تھا، امریکہ میں انصاف ہوتا تو اسرائیل کا خنجر عربوں کے سینے میں نہ گھونپا جاتا، برطانیہ میں انصاف ہوتا تو سو برس ہمیں غلام نہ رہنا پڑتا، ہماری جائدادیں تباہ، ہماری صنعت مفلوج نہ ہوتی، اور ہمارے سر پر آرے نہ چلائے جاتے، نوآبادیاتی نظام دنیا میں قائم نہ ہوتا، اور اگر آج ہمارے ملک میں انصاف ہوتا تو فسادات نہ ہوتے، شکایتیں نہ ہوتیں، مقدمات عدالتوں میں نہ جاتے، اسٹرائیکیں اور مظاہرے نہ ہوتے، جب انصاف تھا تو شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے تھے۔

دو سبق آموز واقعات

انصاف کا ایک واقعہ سنیے، مصر کے گورنر حضرت عمروؓ بن العاص جو مصر کے فاتح بھی تھے، ان کی گورنری کے زمانہ میں ایک مرتبہ گھوڑ دوڑ ہوئی، اس ریس میں ان کا بیٹا بھی شریک تھا، اس کے گھوڑے سے آگے ایک قبطی کا گھوڑا بڑھنے لگا تو گورنر زادے نے اس قبطی کو ایک طمانچہ مارا، یہ کہتے ہوئے کہ لو شریف زادے کا تھپڑ ایسا ہوتا ہے، وہ معمولی شہری تھپڑ کھا کر سیدھا مدینہ پہنچا اور اس نے امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی، وہاں سے طلبی ہوئی کہ گورنر عمرو بن العاص مع اپنے بیٹے کے حاضر ہوں، دونوں پہنچے، ایک دربار سا لگا، اور حضرت عمر نے سب کے سامنے اس قبطی کو کہا کہ ایک تھپڑ اسی طرح تم گورنر زادے کو میرے سامنے مارو جیسا اس نے تمھیں مارا تھا، اس قبطی نے تھپڑ مارا، اس کے بعد جو الفاظ حضرت عمر نے کہے وہ ہم کو فخر کرنے کے لائق ہیں، انھوں نے کہا کہ ''تم نے کب سے لوگوں کو اپنا غلام بنا لیا، حالانکہ یہ اپنے ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے تھے''، ہمیں اس واقعہ پر اور حضرت عمر کے انصاف پر فخر کرنا چاہیے، ہم کو جیسے بکرماجیت پر فخر کرنے کا حق ہے کہ وہ انسان تھا، اور جس انسان سے اچھا کام ہو وہ ہم تمام انسانوں کی دولت اور ملکیت ہے۔

ایک واقعہ ہمارے ملک ہندوستان کا سنیے، جو ابھی سو برس کے اندر پیش آیا، کاندھلہ یا مظفر نگر کے کسی مقام پر ایک زمین کے سلسلے میں دو دعویدار پیدا ہو گئے، مسلمان کہتے تھے یہ مسجد ہے، ہندو

بھائی کہتے تھے یہ مٹھ ہے، مقدمہ جج کے پاس گیا، جج نے دونوں طرف کی شہادتیں سنیں، دونوں فریق بڑے ماہر وکیلوں کو لائے تھے، جج انگریز تھا، اور شاید شریف اور باہمت، اس نے کہا کہ کیا ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی ایسا آدمی بھی ہے جس پر دونوں فریق کو اتفاق ہو، ہندو بھائیوں نے کہا: ہاں ایک مسلمان مولوی صاحب محمود بخش ہیں (یہ بزرگ حضرت مولانا الیاسؒ بانی تبلیغی جماعت کے خاندان سے تھے جن کی تبلیغی دعوت آج پوری دنیا میں عام ہے) ہندوؤں نے کہا کہ اگر اس بستی میں کوئی سچ بول سکتا ہے تو وہ مولوی محمود بخش ہیں، انگریز جج کو تعجب ہوا کہ ہندو ایک مسلمان مولوی کا نام لے رہے ہیں، اور ان کی گواہی پر فیصلہ کو تیار ہیں، چپراسی بھیج کر مولوی صاحب کو بلوایا گیا، انھوں نے جواب دیا کہ میں نے آج تک انگریز کا منھ نہیں دیکھا، اور آئندہ بھی نہیں دیکھوں گا، انگریز جج بھی عجیب تھا، اس نے کہلایا کہ ان سے کہہ دینا کہ میرا منھ نہ دیکھیں، منھ پھیر کر کھڑے ہو جائیں، مگر بات کہہ دیں، اب ایسے انگریز اور حاکم کہاں ہوتے ہوں گے، چپراسی دوبارہ پیام لے کر گیا، مولوی محمود بخش آئے اور واقعی انگریز جج کی طرف پشت کر کے کھڑے ہو گئے اور اپنے کھرے لہجے میں کہا: پوچھ کیا پوچھے ہے؟ انگریز جج نے کہا کہ فلاں جگہ کے بارے میں ہندو اور مسلمان دو فریق ہیں، ایک اسے مٹھ کہتا ہے دوسرا مسجد، آپ بتلائیں کہ یہ جگہ کس کی ہے؟ مولوی محمود بخش نے کہا کہ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ مٹھ تھا، یہ مسجد نہیں تھی، مسلمان غلط کہتے ہیں۔

یہ ہے صحیح کردار، یہ ہے صحیح کیریکٹر، آج ہم سب اس راہ پر چلتے تو دنیا کی یہ حالت نہ ہوتی، روس اور امریکہ آج کی دنیا کے یہ دو چودھری پرلے درجہ کے ناانصاف، اول درجے کے بے ایمان، وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان کا فائدہ کس میں ہے، اسرائیل کا معاملہ لے لیجیے، اندھیر، بلکہ اندھیرے سے بڑھ کر کوئی اندھیر کہہ سکتے ہیں، بے چارے مسلمان عرب سیکڑوں برس سے جس خطۂ زمین پر آباد تھے، اور جس کا چپہ چپہ ان کا تھا، ان سب کو بے دخل کر کے امریکہ، افریقہ، آسٹریلیا، برطانیہ، جرمنی اور روس کے یہودیوں کو لا کر بسا دیا گیا، ان کی حکومت قائم کر دی گئی، یہ میں نے ایک مثال دی، ورنہ سب لوگ جانتے ہیں کہ کتنی ناانصافیاں، کتنی قوموں کا خون، کتنی سچائیوں کا خون اس دنیا میں ہو رہا ہے، اور سب کچھ ٹھیک ہے۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾ ''اللہ تعالیٰ عدل کا، انصاف کا، احسان کا حکم دیتا ہے''، کوئی بھوکا ہو تو کھانا کھلاؤ، کوئی پیاسا ہو تو پانی پلاؤ، کوئی بیمار ہو تو عیادت و تیمارداری کرو، چاہے وہ کسی بھی مذہب و ملت کا، کسی بھی رنگ و نسل کا ہو، تم جج ہو تو صاف فیصلہ کرو، حاکم ہو تو سب

کے ساتھ یکساں معاملہ کرو، دفتر کے ملازم ہو تو سب کی خدمت کرو، محلّہ دار ہو تو سب کی خبر گیری کرو، اگر شہری ہو تو سب کے دکھ درد میں شریک رہو، اگر تم ایسا کرو گے تو اپنے مذہب کی خدمت کرو گے، اپنے کو ایک اچھا شریف شہری ثابت کرو گے۔

آج اسی چیز کی کمی ہے، اگر حکومت کی سطح پر اس کے وسائل ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر، ہماری تعلیم گاہوں میں، مجلسوں سبھاؤں میں، مسجدوں میں، مندروں میں، مدرسوں میں، پاٹھ شالاؤں میں، شادیوں میں اور تقریبات میں اسی بات کا چرچا ہوتا تو ملک کی قسمت بدل جاتی، اور یہ ملک حقیقت میں جنت کا نمونہ بن جاتا۔ آج ہمارے ملک کا یہ حال ہے کہ ہر چیز کی بوتل دیکھی جاتی ہے کہ یہ کس رنگ کی ہے، یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اس میں کیا ہے اور کیا ڈالنا ہے۔

تمام دنیا کے انسان خدا کے لگائے ہوئے باغ کے پھول اور کلیاں ہیں، ہمارے ملک میں انسانیت کے باغ کے نہ جانے کتنے غنچے بن کھلے مُرجھا جاتے ہیں، بچے مارے جاتے ہیں، عورتوں پر ظلم ہوتا ہے، برسوں کی کمائی کو بھونک دیا جاتا ہے، یہ سب کون کراتا ہے؟ یہ ہمارے اندر بیٹھا راکشس کراتا ہے، ہمارا دل پاپی ہو گیا ہے، اسی لیے ڈاکٹر اشتیاق صاحب نے کہا کہ دلوں کو دھونے کی ضرورت ہے۔

ہندوستان کی زمین تیار کیجیے

بھائیو! ہمارا پیغام یہی ہے کہ آدمی بنو، کوئی زمین تو چاہیے جس میں بویا جائے، زمین تو پیدا کرو جس پر بیج ڈالا جائے، بیج اگر سڑا گلا ہو گا تو کچھ نہیں نکلے گا، ہندوستان کی زمین تیار کیجیے، تاکہ اچھے بیج ڈالے جائیں، دلوں کی زمین تیار کیجیے، تاکہ اچھی تخم ریزی کی جائے، دماغوں کو تیار کیجیے تاکہ اچھی بات سن سکیں، آج ہمارے پرائمری اسکولوں سے لے کر کالج، یونیورسٹی کی سطح تک کہیں اخلاقی تعلیم نہیں دی جاتی، آدمی بنانے کی کوشش کیجیے، لوگ جانور بننا چاہتے ہیں، انسانیت سے اُکتا گئے ہیں، آدمیت سے بیزار ہیں، پھر وحشت و بربریت کے دور، غاروں کی زندگی کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں، آپ انھیں آدمی بنانے کی کوشش کیجیے، اس کی سب سے بڑی ذمہ داری ہمارے مسلمان بھائیوں پر ہے، بڑی ذمہ داری اس لیے کہتا ہوں کہ یہ بڑا دعوی رکھتے ہیں، یہ دعوی بے جا نہیں، اس لیے کہ یہ اسی لیے پیدا کیے گئے ہیں، ان کی زندگی کا مشن ہی یہی ہے، ان کو خدائی پولیس ہونا چاہیے، مظلوم کی مدد، کمزور کی دستگیری، مخلوق کی خدمت ان کا شعار ہونا چاہیے۔

اُجّین کے لوگوں پر خاص طور پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ انصاف اور احسان کی قدر کریں، یہاں ایسا ماحول بنے جس میں ہر شخص کو پوری آزادی حاصل ہو اور اس کا حق ملے، اس کی صلاحیت کے مطابق وہ جہاں تک ترقی کرنا چاہے ترقی کر سکے، سارے ہندوستان میں اس کی کوشش کرنی چاہیے، جانوروں کی طرح بے حس زندگی میں بھی کوئی مزہ ہے؟

بس یہی ہمارا پیام ہے، اس کو بخوشی عبادت سمجھ کر، مذہب کا جوہر سمجھ کر، اس کی روح سمجھ کر کیا جائے، ہمیں اس کی کوئی سیاسی ضرورت نہیں، یہ خالص روحانی، اخلاقی، انسانی، ربانی، اور خدا پرستی کی مہم ہے، ہم مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم سچے مذہبی مسلمان بنو، تم نمازیں پڑھو، ہم نے جو کچھ کہا، یہ ہمیں نمازوں نے سکھایا، قرآن نے بتایا، ہم آپ سے بھی کہتے ہیں کہ قرآن مجید کا بغور مطالعہ کرو، نمازیں جاندار بناؤ، آپس میں محبت و اتحاد پیدا کرو، اس کے ساتھ ساتھ انصاف اور احسان سب کے ساتھ عام ہو، ایک شریف شہری، ایک خادم خلق کی حیثیت سے تمھیں دنیا میں رہنا اور نفع پہنچانا چاہیے، تمہارا فیض عام ہو، تم جس جگہ رہو وہاں رحمت کے فرشتے سمجھے جاؤ، اس جگہ کو چھوڑ کر جانا چاہو تو لوگ تمھیں جانے نہ دیں۔

دلوں میں جگہ پیدا کیجیے

اس ملک میں ایسے لوگ گزرے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں انھوں نے جانا چاہا تو غیر مسلموں نے ان کی جدائی گوارا نہیں کی، اور انھیں جانے نہیں دیا۔

پانی پت کے مولانا لقاء اللہ عثمانی بڑے فرشتہ خصلت، اللہ والے آدمی تھے، ۴۷ء میں سب لوگ چلے گئے، وہ اپنی جگہ پر رہے، عرصہ بعد ایک مرتبہ گھبرا کر کہنے لگے کہ یہاں کوئی مسلمان نہیں، اگر مر جاؤں گا تو مسلمانوں کی طرح دفن کرنے والا کوئی نہ ملے گا، اب مجھے اپنے رشتہ داروں اور ہم مذہبوں میں پاکستان جانے دو، وہاں کے ہندو اور سکھ شرنارتھیوں نے جواب دیا کہ مولوی صاحب یاد رکھو، جانے نہیں پاؤ گے، اگر تم جاؤ گے تو جس تانگہ پر بیٹھے ہو گے اس کے پہیوں کے سامنے ہم لیٹ جائیں گے، ہماری چھاتیوں پر سے گزر کر جا سکتے ہو، مگر ہم تمھیں چھوڑیں گے نہیں، یہیں جینا یہیں مرنا، ہم مسلمانوں کو کہیں سے لا کر بسا دیں گے، تمھارے آخری رسوم جو ہوتے ہیں وہ ادا کر دیے جائیں گے، غرض وہ ٹھہر گئے اور وہیں انتقال فرمایا۔

اس طرح ہونا چاہیے، اس میں زندگی کا لطف ہے، محبت و اخلاق سے بڑھ کر کسی چیز میں

لذت نہیں، جس نے محبت کرنا نہ سیکھا اسے زندگی میں کوئی مزہ نہیں آیا۔

میں نے اپنی بات کہہ دی، میرے بعد جو بھائی تقریر کریں گے وہ آپ کا دل خوش کردیں گے، اور آپ کی جھولی بھر دیں گے، اگر مجھ میں ہمت ہوتی اور صحت بہتر ہوتی تو میں بھی بیٹھتا اور فائدہ اٹھاتا، لیکن کل بہت دیر میں سونا ہوا، بھوپال میں بہت بڑا جلسہ تھا، جیسا کہ ڈاکٹر اشتیاق صاحب نے کہا ہے جو میرے معالج بھی ہیں کہ مسلسل جاگنے اور سفر سے کہیں میں بیمار نہ پڑ جاؤں، جس سے آپ ہی کو زحمت پیش آئے گی، میں اجازت چاہتا ہوں اور کہتا ہوں کہ کوئی صاحب اپنی جگہ سے نہ اٹھیں، ہمارے بھائی پاریکھ صاحب آئیں گے اور وہ آپ کو بتائیں گے کہ زندگی گزارنے کا انسانی، ایمانی، روحانی اور اخلاقی طریقہ کیا ہے؟

ہم نے جینے کا سلیقہ سیکھا ہی نہیں، اگر ہم جینے کا سلیقہ سیکھتے تو ہمیں دیکھنے کے لیے دور دور سے لوگ آتے کہ چلو زندگی کا مزہ تو وہاں ہے جہاں خدا کا نام لینے والے اچھے انسان بستے ہیں۔

میں آپ کے اس عظیم مجمع کو دیکھ کر جو بازار اور سڑکوں پر اتنے اطمینان سے ہماری بات سن رہا ہے، بہت خوش ہوں، یہ بڑی صحت منداور اچھی علامت ہے کہ ہمارے ملک میں خلوص، نیک نیتی، اور کھلے دل سے بات سننے کا شوق ہے، خدانخواستہ بار بار سیاسی تجربوں اور سیاسی لیڈروں کے وعدوں سے لوگ سب سے مایوس ہو گئے تو پھر خیر نہیں، یہ جان کر کہ یہ کوئی الیکشن کی بات نہیں کہیں گے، کسی پارٹی کے ایجنٹ نہیں ہیں، آپ نے سکون و خاموشی، تہذیب و شائستگی کے ساتھ ہماری بات سنی، اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں اجازت چاہتا ہوں، اور امید کرتا ہوں کہ زندگی میں کبھی آئندہ اُجّین کا سفر ہوا تو یہاں کا رنگ بہتر سے بہتر ہوگا۔ (۱)

(۱) ماخوذ از "تحفۂ انسانیت"، (صفحہ ۶۰ تا ۷۳)۔

۵

ذرائع کی افادیت نیک مقاصد پر منحصر ہے[1]

میں اپنی خوشی آپ سے چھپا نہیں سکتا

معزز حاضرین، دوستو اور بھائیو!

میں اس وقت اپنے سامنے ایسا تعلیم یافتہ اور چیدہ مجمع دیکھ کر بڑی مسرت اور خوشی محسوس کر رہا ہوں، اور میرے اندر ایک نیا حوصلہ، ایک نئی طاقت اور اُمنگ پیدا ہو رہی ہے، کسی شخص کو جو کچھ سوچنے سمجھنے کی عادت رکھتا ہے، اور پھر اس کی طبیعت میں، اس کے ذہن میں کچھ خیالات پیدا ہوتے ہیں، بعض چیزوں سے وہ خوش ہوتا ہے، بعض چیزوں سے وہ بے چینی اور خطرہ محسوس کرتا ہے، اس کو اپنے ملک سے، گھر سے سچی محبت ہوتی ہے، وہ ہر انسان کو محبت کی، پیار اور پریم کی نگاہ سے دیکھتا ہے، ایسے سننے والوں کو اپنے سامنے پا کر اور ان کو اس توجہ کے ساتھ اپنی طرف متوجہ پا کر اس کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے، یہ ایک ایسا ٹانک (Tonic) ہے، ایک ایسا انجکشن ہے جس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

انسان جب دنیا میں تنہائی محسوس کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے دل کی بات خلوص کے ساتھ کسی سے کہہ نہیں سکتا، لوگوں کو اس کی بات سننے کی فرصت نہیں ہے یا اس پر کوئی بھروسا، وِشواس واعتماد نہیں ہے، تو اس کا دل چکنا چور ہو جاتا ہے، اس لیے کہ انسان کے اندر جو کچھ طاقت ہے اور دنیا میں جو اس کا دل لگاتا ہے، جنگل میں کپڑے پھاڑ کر نکل جانے کو اس کا جی نہیں چاہتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ یہ اطمینان محسوس کرتا ہے کہ اپنے دل کی بات اپنے بھائیوں سے، دوستوں سے کہہ سکتا ہے، اور سب بھائی اور سب دوست اس کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔

یہی خیال اگر اس کو ہو جائے کہ ہر آدمی اس کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے، اور اس کا استقبال

---

(۱) ٹیگور ہال (اندور) میں ۵ر دسمبر ۱۹۷۷ء کو کی گئی تقریر۔

وہ بدگمانی اور شک کے ساتھ اور کچھ تردد کے ساتھ کر رہا ہے تو اس کے دل پر، اس کے جوش پر، اس کے جذبات پر اوس پڑ جاتی ہے۔

میں اپنی خوشی آپ سے چھپا نہیں سکتا کہ میں اپنے سامنے ایسے پڑھے لکھے چہرے دیکھ رہا ہوں، پڑھا لکھا آدمی پہچان لیا جاتا ہے، اگرچہ میرا تعارف آپ سے کرایا گیا، جو غیر ضروری رسم ہے، آپ کا تعارف مجھ سے نہیں کرایا گیا، یہ تو یک طرفہ کارروائی (One-way Traffic) ہوئی، میرا تعارف آپ سے کرایا گیا، آپ کا تعارف شاید اس لیے نہیں کرایا گیا کہ یہ ذرا مشکل کام ہے، ایک آدمی کا، دو آدمیوں کا، تین آدمیوں کا تعارف کرایا جا سکتا ہے، اتنے بڑے مجمع کو کیسے متعارف کرایا جا سکتا ہے، پھر اس میں یہ ہوتا کہ کوئی اگر رہ جائے تو اس کو شکایت ہوتی۔

لیکن میں اپنی زندگی کی بڑی مدت پڑھانے والا استاد (Teacher) رہا ہوں، تو ٹیچر کو خاص طور پر اس بات کی مشق ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے مخاطبوں کو، جن لوگوں کو وہ Address کر رہا ہے، جن لوگوں سے وہ بات کرنا چاہتا ہے، وہ ان کی پیشانی کی لکیروں کو پہچاننے لگتا ہے، وہ ان کے چہروں کے اتار چڑھاؤ کو پہچانتا ہے، وہ ان کی آنکھوں کی چمک کو دیکھتا ہے، اس لیے اور کوئی Distinction نہ ہو، کوئی اور میری Qualification نہ ہو، لیکن میں نے بچوں کو پڑھایا ہے، نوجوانوں کو پڑھایا ہے، اس لیے میں کسی حد تک آدمی کو پہچانتا ہوں، جب میں دیکھتا ہوں کہ سنجیدہ، باوقار، پُرسکون اور سوچنے والے، Intellectual Class سے تعلق رکھنے والی ایسی Gathering میرے سامنے ہے، تو میرے دل میں ایک طوفان، ایک جوش اٹھتا ہے کہ میں اپنا دل نکال کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔

اپنے ملک کی بپتا اپنے ملک کی کہانی

افسوس ہے کہ سائنس کی ساری ترقیوں کے باوجود ابھی تک سائنٹسٹ اس میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں کہ کوئی شخص اپنا دل نکال کر رکھ دے، دل نکال کر رکھ دینا تو آسان ہے، مگر اس کا واپس جانا مشکل ہے، یعنی آپریشن کے ذریعے دل نکال کر ٹیبل پر رکھا تو جا سکتا ہے مگر پھر وہ اپنی صحیح جگہ پر پہنچ جائے، یہ مشکل ہے۔

دل کے آپریشن کامیاب تو ہو رہے ہیں، لیکن ایسا کہاں ہو سکتا ہے کہ ہر مقرر اپنا دل نکال کر سامنے رکھ دے، اور پھر اس کے بعد وہ اس کو اپنی جگہ پر فٹ بھی کر دے۔

لیکن سب کو اس کی ضرورت نہیں، مجھے یہ اطمینان ہے، میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آپ

حضرات جب سردیوں کی اس رات میں ایک ایسے پردیسی آدمی کی بات سننے کے لیے جس سے آپ پہلے سے واقف نہیں تھے، آئے ہیں، تو آپ بہت Serious ہیں، آپ بہت سوچ سمجھ کر آئے ہیں، اس لیے مجھے اجازت دیجیے کہ میں اپنے دل کا درد، اپنی بپتا، اپنے گھر کی بپتا، اپنے ملک کی بپتا اور اس صدی، اس عہد (Era) یہ جو چل رہا ہے، اس کی ٹریجڈی آپ کے سامنے بیان کروں، اور اس کا زخم، اس کی المناک روداد اور اپنے دل کا زخم آپ کے سامنے رکھوں، اگر ایسا مجمع بھی اس کا حق نہیں رکھتا تو میں نہیں سمجھتا کہ وہ کون سا مجمع ہوگا جس کے سامنے دل کے درد کی کہانی سنائی جاسکے۔

ملک میں خطرے کی گھنٹی بج رہی ہے، اور ہماری سوسائٹی، دنیا کی سوسائٹی خطرہ میں ہے، لیکن دنیا تو بہت بڑی ہے، اور اس کی فکر کرنے والے بھی بہت ہیں، لیکن یہ دیس ہمارا دیس ہے، اس کی فکر کرنے والے امریکہ اور یورپ سے نہیں آئیں گے، روس سے نہیں آئیں گے، ہم ہی آپ ہوں گے، اس لیے میں آپ کے سامنے اپنے دل کا درد رکھنا چاہتا ہوں اور آپ کو بھی اس درد میں شریک کرنا چاہتا ہوں، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میرے دل میں زیادہ درد ہے، اور آپ کے دل میں درد نہیں ہے، لیکن سمجھتا ہوں کہ میں اپنا دردِ دل آپ سے کہوں، اور آپ اپنا دردِ دل مجھ سے کہیں، یہ بڑی اچھی علامت ہے، بہت اچھی Sign ہے ہماری اس سوسائٹی کی کہ اگر کسی کو کوئی دعوت دی جاتی ہے، Invite کیا جاتا ہے، اس میں کوئی سیاسی (Political) غرض نہیں ہوتی، کسی پارٹی کی طرف سے جلسہ نہیں ہوتا، جب کہ اتنے سنجیدہ مشغول لوگ جو کام میں مصروف ہیں، جنہوں نے دن میں محنت کی ہے، اور مطالعہ کیا ہے، پڑھا لکھا ہے، جو اسکالرس ہیں، اور شہر کے معززین ہیں، وہ جمع ہو جائیں، جب تک ہمارے ملک میں اتنی بات ہے، اس وقت تک اس ملک کی ناؤ ڈوبے گی نہیں، اگر کسی آواز پر خواہ اس آواز دینے والے کو نہ پہچانا جاتا ہو، پہچانتے ہوں جب تو کوئی بڑی تعریف کی بات نہیں ہے، اندور کے کوئی بڑے پروفیسر، بڑے مفکر، بڑے فلاسفر، بڑے اسکالر کے نام پر اگر آپ یہاں جمع ہوتے تو یہ کوئی زیادہ تعجب کی بات نہیں ہوتی، لیکن مجھ جیسے پردیسی اور ہمارے جیسے پردیسی بھائیوں کو سننے کے لیے آپ لوگ اپنے ضروری کام چھوڑ کر آگئے ہیں، یہ بڑی اچھی علامت ہے، اس وقت تک ہمیں اپنے ملک سے، اپنی سوسائٹی سے اچھی امید رکھنی چاہیے جب تک کہ ایک اجنبی آواز پر اتنے بھائی جمع ہو جائیں۔

ذرائع اور وسائل

میرے بھائیو اور دوستو! آپ سب پڑھے لکھے لوگ ہیں، آپ سب جانتے ہیں کہ دنیا میں دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک کو ذرائع وسائل کہہ سکتے ہیں، دوسرے مقاصد ہوتے ہیں، یعنی کرنا کیا ہے؟ ان ذرائع کو کس طرح استعمال کرنا ہے؟ ان کو ہم Ends کہہ سکتے ہیں، Purposes کہہ سکتے ہیں، تو انہی دو چیزوں پر ہمارا تمدن چل رہا ہے، اور دونوں چیزوں کے Co-ordination اور Co-operation سے، ان دونوں کے Balance سے اس وقت تک تمدن قائم رہا ہے، اور آئندہ بھی اس کے قائم رہنے کی، Civilization کے قائم رہنے کی، اخلاق کے قائم رہنے کی، سوسائٹی کے قائم رہنے کی امید کی جاسکتی ہے، دنیا میں جب کوئی Crisis پیدا ہوا ہے، کوئی انتشار پیدا ہوا ہے، تو ہمیشہ ان دونوں میں عدم توازن سے، یعنی ذرائع اور مقاصد دونوں الگ الگ ہوجائیں، دونوں میں بیر ہوجائے، دونوں میں تضاد ہوجائے، Frustration ہو، دونوں ایک دوسرے سے روٹھ جائیں، ذرائع مقاصد کو تلاش نہ کریں، مقاصد ذرائع کو ٹھکرادیں، بے پرواہ ہوجائیں، اس سے ہمیشہ انتشار اور بے چینی پیدا ہوئی ہے۔

ذرائع کی ترقی کا دور

ہم سب جانتے ہیں کہ یہ دور ذرائع کی ترقی کا دور ہے، یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے، جو سائنس کے براہ راست اسٹوڈنٹ نہیں ہیں، وہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارا یہ دور ذرائع کی پیداوار (Production) کا، ذرائع کی ترقی کا، انسان کی دسترس میں، انسان کے قبضہ میں، اس کے Disposal میں آجانے کا دور ہے، اس دور کے بہت سے نام رکھے جاسکتے ہیں، کوئی کہتا ہے یہ فولاد کا دور ہے، کوئی کہتا ہے ایٹمک انرجی کا دور ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو چیز سب کو Cover کرتی ہے، وہ یہ کہ یہ دور ہے ذرائع کی ترقی کا، اس میں ایٹمک انرجی بھی آجاتی ہے، اس میں لوہا اور فولاد بھی آجاتا ہے، اس میں سائنس اور ٹیکنالوجی بھی آجاتی ہے، تو زیادہ سے زیادہ جو چیز Cover کرسکتی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ دور ہے ذرائع کی ترقی کا، انسٹرومینٹ (Instruments) کی ترقی کا، ٹیکنالوجی کی ترقی کا، اور Means کی ترقی کا دور ہے، اور یہی دیکھیے کہ کل تک ہم کسی جلسے کو Address کرتے تھے تو بہت زور سے ہم کو بولنا پڑتا تھا، آواز کسی کو پہنچتی تھی، کسی کو نہیں

پہنچتی تھی، اب یہ خدا کی کتنی بڑی دین ہے، اور سائنس کا کتنا بڑا Contribution ہے، حالانکہ بہت ہی معمولی، بہت ہی حقیر اور بہت ہی چھوٹا سا Contribution مائک کی صورت میں ہمارے آپ کے سامنے ہے، مگر یہ بھی بڑی نعمت ہے، میں آسانی کے ساتھ آپ سے بات کر رہا ہوں، اور اگر اس سے دس گنا مجمع ہوتا تو میری آواز آسانی کے ساتھ وہاں تک پہنچتی، ایک روشنی کو دیکھ لیجیے کہ موم بتیاں جلائی جاتی تھی، پھر بہت ترقی کی تو لالٹینوں کا زمانہ آیا، پھر اور ترقی ہوئی تو گیسوں کا زمانہ آیا، مگر اب ایک سوئچ دبایا تو یہ سب کا سب ہال جگمگا اٹھا، یہ سب ذرائع ہیں، پھر اس سے اور کچھ ذرائع ہیں۔

ذرائع خدا کی نعمت ہیں

یہ سب ذرائع خدا کی نعمت ہیں، کوئی مذہبی انسان، جو شخص Extremist ہو، جو بالکل پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھا ہو، وہ بھی ان ذرائع کو ٹھکرا نہیں سکتا، اُن کی تحقیر نہیں کر سکتا، ان کو Deny نہیں کر سکتا، ذرائع اللہ کی نعمت ہیں، ہمارے مذہبی آدمی جو مذہبی طریقے پر سوچتے ہیں، Religious Mentality ہے، Religious Thinking ہے، وہ بھی اس کو مانتے ہیں، اور ہماری مذہبی کتابیں، آسمانی صحیفے، ان میں سے قرآن شریف کا میں نے کچھ زیادہ مطالعہ کیا ہے، اس میں خدا نے جگہ جگہ اپنے بندوں پر احسان رکھا ہے، جو کچھ دنیا میں ہے، وہ سب میں نے تمھارے لیے ہی پیدا کیا ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعاً﴾ (سورة البقرة: ٢٩) ''وہ ہے جس نے سب تمھارے لیے ہی پیدا کیا ہے''، وہ سب تمھارے Disposal میں دے دیا ہے، تمھارے ہاتھ، تمہاری مٹھی میں دے دیا ہے، اور وہ کہتا ہے: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ (سورة الإسراء: ٧٠) ہم نے انسان کی عزت، عظمت بڑھائی، خشکی اور تری پر اور فضا پر اس کو سوار کر دیا، ہم نے زمین کو بھی اس کی سواری بنایا، ہوا اور فضا اور سمندر کو بھی اس کو سواری بنایا، میں سمجھتا ہوں جو دوسری مذہبی کتابیں ہیں، ان سب میں ذرائع کو، Means کو، آلات اور خدا نے جو چیزیں پیدا کی ہیں، وہ خدا کی بہت بڑی نعمت ہے، اب یہی دیکھیے، فاصلے کیسے سمٹ گئے ہیں، میں لکھنؤ سے آپ کے یہاں اندور آیا ہوں، یہی فاصلہ شاید ایک مہینے میں طے ہوتا، کتنی بڑی نعمت ہے کہ ریل پر، ہوائی جہاز پر، کار پر کوئی آدمی بیٹھے، اور اس سواری کے حساب سے آدمی مہینوں کی منزل ہفتوں میں، ہفتوں کی منزل دنوں میں اور دنوں کی منزل گھنٹوں میں طے کر سکتا ہے، یہ سب خدا کی نعمتیں ہیں۔

صرف وسائل وذرائع ہی کافی نہیں

اب میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ نعمتیں، یہ ذرائع، یہ Means، یہ انسٹرومینٹ (Instruments) خودکافی نہیں ہیں، ان کی جو قدر و قیمت، ان کی جو Merit، ان کی جو افادیت ہے، وہ سب مقاصد پر منحصر ہے، کہ ان سے کیا کام لیا جاتا ہے، اگر ہمیں یہ نہ معلوم ہو کہ ہم ان سے کیا کام لے سکتے ہیں، تو یہ ہمارا منھ دیکھتے رہ جائیں گے، اور ہم ان کا منھ دیکھتے رہ جائیں گے، کوئی فائدہ نہیں اٹھائیں گے، اور اگر ہم ان سے کوئی غلط کام لیں تو یہ بھی ان کی ناقدری ہوئی اور گویا ہم نے ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ ان سے کام کئی طرح کے لیے جاسکتے ہیں، لیکن جو سب سے بہتر کام ہوسکتا ہے، سب سے Superior ہے، اس کو ہم چھوڑ دیں اور ان سے ہم ادنیٰ درجہ کا کام لیں، مثلاً میں یہ کرسکتا ہوں کہ میں اس مائک سے کچھ غلط باتیں کہنا شروع کردوں، آپ کی دل آزاری کی باتیں کہوں۔

ریڈیو سے کتنا بڑا کام لیا جاسکتا تھا، ہم کو یہ بتایا گیا تھا (اور یہ کوئی غلط بات نہیں تھی) کہ: جب ریڈیو عام ہوجائے گا تو سب Countries، تمام Nations ایک دوسرے سے بغل گیر ہوجائیں گے، اور سب ایک دوسرے کے چاہنے والے اور ایک دوسرے سے محبت کرنے والے بن جائیں گے، ہر طرح کی عداوتیں، غلط فہمیاں، شکایتیں رفع ہوجائیں گی، اس لیے یہ سمجھا جاتا تھا کہ دنیا کی سب سے بڑی بیماری یہ ہے کہ ایک دوسرے کو جانتا نہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ ایسا سمجھنے والے بڑے سادہ لوح، کم سمجھ تھے، ہمیں یہ بتایا جاتا تھا کہ دنیا میں جتنی لڑائیاں ہوتی ہیں، یہ سب نہ جاننے کی وجہ سے ہوتی ہیں، اگر ایک شخص دوسرے کی تہذیب سے واقف ہو، اس کی خوبیوں، کارناموں سے واقف ہو، اس کے ادب وشاعری اور لٹریچر سے واقف ہو، اس کے فنون لطیفہ (Fine Arts) سے واقف ہو، اس کے جذبات سے واقف ہو، اس کے (Architecture) فن تعمیر سے واقف ہو، تو پھر کبھی لڑائی کی نوبت نہ آئے۔

بہت دنوں تک یہ کہا جاتا اور لکھا جاتا رہا کہ دنیا کی ساری بیماریوں کا، سارے دکھوں کا علاج یہ ہے کہ ایک دوسرے کو جاننے لگیں، پہچاننے لگیں، اور Appreciate کرسکیں، ایک دوسرے کے دکھ درد کو معلوم کرسکیں، تو ہم بھی سمجھتے تھے کہ کہ بات دل کو لگتی ہوئی ہے ٹھیک ہے، ایک آدمی دوسرے آدمی سے بعض اوقات لڑ جاتا ہے کہ پہچانتا نہیں ہے، بھائی بھائی سے لڑ جاتا ہے، اب

جب ایک دوسرے کا Introduction ہوتا ہے، بتایا جاتا ہے کہ تمہارا بھائی ہے، تمھارے محلے میں رہتا ہے، ڈاکٹر ہے، انجینئر ہے، آدمی فوراً رک جاتا ہے، تو بات یہ غلط نہیں تھی، بہت Absurd نہیں تھی، سمجھ میں آنے والی Reasonable تھی، اور Common Sense کے مطابق تھی۔

لیکن ہم نے یہ دیکھا کہ یہ دریافت (Discovery) بڑی تکلیف دہ Discovery ثابت ہوئی، ریڈیو جتنا عام ہوا، بجائے اس کے کہ فاصلے کم ہوں، فاصلے بڑھتے چلے گئے، اور ریڈیو نے بجائے اس کے کہ ایک دوسرے کی خوبیاں بیان کی ہوتیں، اور ایک دوسرے کی محبت کے خوبی کے گیت گائے ہوتے، ایک دوسرے کو جوڑنے کی کوشش کی ہوتی، ریڈیو نے سیاسی پروپیگنڈا کرنا شروع کردیا، ہر ریڈیو کا کام یہ ہوگیا کہ وہ اپنے ملک کے قصیدے پڑھے، اس کی خرابیوں اور کمزوریوں کو بھی کمال بتائے، اور دوسرے ملک کی شکایت کرے، دوسرے ملکوں پر تنقید کرے۔

آپ دیکھیے کہ ریڈیو جیسی چیز جس سے بڑھ کر کوئی طاقت نہیں تھی، قوموں سے قوموں کو قریب کرنے کے لیے، ملکوں کو ملکوں سے قریب کرنے کے لیے، فاصلوں کو کم کرنے کے لیے، اور جو دیواریں کھڑی ہیں ان کو گرانے کے لیے، دلوں کو جوڑنے کے لیے اور قوموں کو ایک دوسروں سے بغل گیر کرنے کے لیے، ریڈیو سے بڑھ کر کون سی طاقت تھی جو اتنی آسانی کے ساتھ اور تھوڑے وقت میں یہ خدمت انجام دے سکتی تھی؟ Deputation جاتے اور Seminar, Conference, Symposium ہوتیں، یونائیٹڈ نیشن میں ایک دوسرے نیشن کا Representative یا ہر Country کا ممبر اپنی قوم کا تعارف کراتا، کتنی دیر لگتی، کتنا پیسہ خرچ ہوتا، گھر بیٹھے ہم ریڈیو سنتے ہیں، لیکن میں آپ سے پوچھتا ہوں، ہم آپ اسی دنیا میں رہتے ہیں، روز ریڈیو سنتے ہوں گے، کیا واقعی ریڈیو نے قوموں کو قریب کردیا ہے؟ کیا واقعی ریڈیو نے دُکھے ہوئے دلوں کو جوڑ دیا ہے؟ کیا واقعی ریڈیو نے ملکوں میں، قوموں میں، نیشن میں، Country میں یہ شوق پیدا کیا کہ وہ دوسرے قوموں کے لٹریچر کی Study کریں، اُن کی ہسٹری، ان کی تاریخ کا مطالعہ کریں، اُن کے ملکوں کو جا کر دیکھیں، اور اُن کو جو تکلیفیں ہیں، جو Harm ہیں، وہاں قحط پڑا ہے، وہاں کوئی طوفان آ گیا ہے، اس کی مدد کریں، کہاں تک ریڈیو نے یہ خدمت انجام دی، اور کہاں تک اس سے فائدہ حاصل ہوا؟ ایسا کیوں ہوا؟

وجہ یہ ہے کہ ذرائع اور وسائل اور مقاصد، مینس (Means) اور اینڈس (Ends) میں

(Co-ordination) نہیں ہے، ان دونوں میں وہ تناسب نہیں ہے، وہ اتحاد نہیں ہے، اور کوئی ایسی ہستی کوئی ایسا ادارہ (Institution)، کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو ان دونوں کو ملائے، جوڑے، متحد کرے۔

اخلاقیات سائنس کا موضوع نہیں

سائنس ایک آلہ، ایک فن ہے، بڑے سے بڑے سائنٹسٹ نے یہ دعویٰ، یہ Claim نہیں کیا کہ وہ اخلاقی تعلیم اور اچھے مقاصد، بہترین Aims آپ کو دے گا، وہ آپ میں احساس ذمہ داری (Responsibility) پیدا کرے گا، یہ تمام باتیں اس کے دائرہ سے خارج ہیں، نہ سائنس دانوں نے یہ دعویٰ کیا، نہ ہم اس پر ملامت یا شکایت کر سکتے ہیں، کسی سائنس داں سے یہ کہنا کہ تم نے بڑے ذرائع ہمارے سامنے رکھ دیے، ایٹم بم اور نیوکلیائی اسلحے بھی تیار کر لیے، لیکن تم ان کے استعمال پر نگرانی قائم نہیں کرتے، خدا کا خوف اور انسانوں سے ہمدردی کا جذبہ پیدا نہیں کرتے، تاکہ ہیروشیما اور ناگاساکی جیسا تباہ کن واقعہ پیش نہ آئے، سائنس اور سائنس داں کا یہ جواب ہوگا اور بجا جواب ہوگا کہ یہ ہمارا موضوع نہیں، یہ مذہبی آدمیوں، اخلاقیات کے ماہروں، Ethics کے یا Reform کے، یا Priesthood کلاس کے لوگوں کا کام ہے، یہ سوال ان سے پوچھو، سائنٹسٹ اس پر وقت صرف نہیں کریں گے، کیونکہ یہ ان کا کام نہیں ہے۔

آج کی دنیا کا سانحہ

آج کی دنیا کا سانحہ (Tragedy) یہ ہے کہ ذرائع میں تو برابر ترقی ہو رہی ہے، اور ہر روز نت نئے وسائل و ذرائع کا سلسلہ جاری ہے، ہم خود ذرائع کے متوالے ہو رہے ہیں، ہم پر ذرائع کا رعب طاری ہے، ہماری Mentality ایسی ہوگئی ہے کہ ہم یہ سوچتے بھی نہیں کہ مقاصد کی بھی ضرورت اور اہمیت ہے، یہ ذرائع ناکافی، نامکمل (Incomplete)، ادھورے بلکہ خطرناک ہیں، اگر ان کے ساتھ صحیح مقاصد نہ ہوں۔

ہمارا Mental Attitude صحیح نہیں ہے، اگر ہمارے اندر Civic Sense، Moral Sense نہیں ہے، اگر ہمارے دل میں انسانیت کا احترام، انسانیت کی عزت، انسان کی عزت، انسان کی محبت، انسانی جان کی قدر و قیمت، اور انسان کے بارے میں اعلیٰ تصور نہیں ہے، اگر ہم کوئی انسانی کلچر نہیں رکھتے، تو یہ تمام ذرائع اور وسائل بڑے خطرناک ثابت ہو سکتے

ہیں اور ہوئے، یہ ایک کھلی حقیقت ہے، یہ Common Sense کی بات، Practical چیز ہے، تجربات کی بات ہے۔

ذرائع اور مقاصد کی ہم آہنگی

وہ لوگ جو ذرائع میں بہت Advance ہیں، بہت ترقی کررہے ہیں، جو دنیا کو Lead کررہے ہیں، انسانیت کی قیادت کررہے ہیں، خود ان کا کیا حال ہے؟ ایک جنگ عظیم (Great War) ہوئی، پھر دوسری جنگ عظیم (Second Great War) ہوئی، اب دنیا تیسری جنگ عظیم (Third Great War) کے خطرات سے دوچار ہے، جس کے متعلق اندیشہ ہے کہ اگر یہ ہوئی تو پوری نسل انسانی تباہ ہوجائے گی، اس لیے کہ Means ہیں، لیکن وہ Aims نہیں ہیں جو کنٹرول کرسکیں، اور بریک لگاسکیں، یہ تو ایسا ہی ہے کہ کسی ناسمجھ بچے کے ہاتھ میں بلیڈ یا دیاسلائی دے دی جائے، یا کسی ایسے آدمی کو جس کا دماغی توازن بگڑ چکا ہو، Abnormal ہو، کوئی ایسی نازک چیز دے دی جائے جس سے خطرہ ہو۔

آج دنیا کی یہ حالت ہے کہ اسے سائنس Drive کررہی ہے، اور جو لوگ سائنس، تہذیب، تمدن، کلچر اور سیاست کی قیادت کررہے ہیں، ان میں توازن (Balance) نہیں ہے، ان میں ذرائع کے صحیح استعمال کا احساس وشعور نہیں ہے، انھیں کسی ملک، کسی قوم، کسی شہر، کسی فرد کی تباہی کی پرواہ نہیں، ذرائع اور مقاصد کے عدم توازن کے تباہ کن نتائج ہمارا دن رات کا مشاہدہ ہیں۔

انسانیت کی قسمت، انسانی تہذیب (Civilization)، سوسائٹی کا تحفظ؛ ذرائع اور مقاصد کی ہم آہنگی پر منحصر ہے، ان دونوں میں تعاون (Co-operation) ہو، ایک دوسرے کی خدمت کا جذبہ ہو، ایک دوسرے کو Favour کرے، طاقت پہنچائے، ذرائع آگے بڑھ کر کہیں کہ ہم خدمت کے لیے حاضر ہیں، اور مقاصد کے ہاتھ میں اپنی باگ دوڑ دے دیں۔

پھر خدا کا خوف، انسانیت کا احترام، انسانی جان کی قدر وقیمت کا احساس اور یہ شعور ہو کہ ذرائع انسان کے خادم ہیں، آقا نہیں، سُکھ پہنچانے کے لیے ہیں، دُکھ پہنچانے کے لیے نہیں، آدمی کے دل میں ایسا جذبہ، ایک ایسی کیفیت ہونی چاہیے کہ وہ ذرائع کو احساس ذمہ داری کے ساتھ اور بہتر سے بہتر مقاصد کے لیے استعمال کرنے پر آمادہ ہو، اگر یہ بات نہیں ہے تو یہ سب چیزیں نہ صرف بے کار رہوں گی بلکہ انسان کو تباہ کردیں گی۔

جب ذرائع کم تھے لیکن مقاصد اعلیٰ تھے

ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ جب ذرائع نہیں تھے، لیکن مقاصد اچھے تھے، نیتیں اچھی تھیں، دل اچھے اور پاک تھے، جب دماغ روشن تھے، جب خدا کا خوف غالب تھا، جب انسانوں کو انسانوں سے ہمدردی تھی، تو بہت تھوڑے ذرائع میں انسانوں نے وہ کام کیے جو آج تک تاریخ میں نقش ہیں۔

راجہ بکرماجیت جس کا دارالسلطنت اُجّین تھا، اور یہ پورا علاقہ اس کے زیرنگیں تھا، اس نے جو سماج بنایا، جیسے قوانین بنائے، اس کے ذرائع کیا تھے؟ ایران کا شہنشاہ نوشیرواں، اسلام کے خلفائے راشدین جن کے کارناموں نے انسانی تاریخ میں چار چاند لگائے، ان کا زمانہ آج جیسا ترقی یافتہ اور وسائل و ذرائع سے مالامال نہیں تھا، بادبانی کشتیوں، اونٹوں اور گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھ کر وہ طویل فاصلے طے کرتے تھے، بڑے بڑے لشکر اونٹوں اور گھوڑوں کے ذریعہ دوسرے ملکوں تک جاتے تھے، رسد وغیرہ کا کوئی معقول انتظام نہیں ہوتا تھا، لیکن انھوں نے انسانیت کی جو خدمت کی ہے، انصاف کیا ہے، ان کے دور میں عوام کو سکھ، اطمینان، عافیت اور خوشحالی نصیب تھی، دولت جیسی عام اور انسانی ذرائع کا حصول سب کے لیے جس طرح ممکن تھا، اس کی مثال اب نہیں ملتی، تاریخ میں ان کا یہ رکارڈ ہے کہ محدود ذرائع کے ساتھ انھوں نے کیسے اہم مقاصد پورے کیے، اور کتنی بڑی کامیابی حاصل کی۔

اگر ذرائع ہوں اور مقاصد نہ ہوں تو ذرائع بے کار، اور مقاصد ہوں اور ذرائع نہ ہوں تو مقصد بے کار، خدا نے جو چیزیں پیدا کی ہیں، ہم اس کو Discover کریں، اور جتنا Capture کرسکتے ہوں، کریں، کوئی مذہب اس سے نہیں روکتا، آدمی کے ارادے اچھے ہوں تو ذرائع پیدا ہوں گے، لیکن اگر اس کے اندر کسی نیک کام کی کوئی خواہش ہی نہ ہو، انسانی ہمدردی، انسان کی خدمت کا، سیوا کا جذبہ ہی نہ ہو تو یہ ذرائع کوئی نفع نہیں پہنچائیں گے، بجائے راحت کے نقصان پہنچائیں گے، جو ظلم پہلے بادبانی کشتی سے سفر کرتا تھا، جو سفاکی اور درندگی اونٹ اور گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر اور بیل گاڑیوں اور یکّوں سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی تھی، آج وہ سفاکی، وہ درندگی، وہ حیوانیت و بہیمیت، وہ خودغرضی (Selfishness) ہوائی جہازوں سے ایک ملک سے دوسرے ملک گھنٹوں میں پہنچ جاتی ہیں۔

پہلے ایک شخص کو ایک ملک سے دوسرے ملک پہنچنے میں مہینوں لگ جاتے تھے، سکندر کو یہاں پہنچنے میں مہینوں لگ گئے تھے، لیکن آج کوئی سکندر، کوئی چنگیز، کوئی نیرو ہوائی جہاز میں چند گھنٹوں میں پہنچ جاتا ہے۔

اگر دل اچھا نہیں، مَن پاپی ہے، دماغ میں تاریکی ہے، روح بیمار ہے، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ذرائع سے انسانیت کی تعمیر (Constructive Work) کے بجائے تخریب کا کام (Destructive Work) ہوگا، ہماری تمام کوششیں منفی (Negative) ہو جائیں گی۔

اس صدی کی سب سے بڑی ٹریجڈی

ہماری اس صدی کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ اس دنیا کو جنت بنانے کے تمام ذرائع ہمارے پاس موجود ہیں، ہمارا ملک آزاد ہے، اس کی باگ ڈور خدا نے ہمارے ہاتھ میں دی ہے، اس ملک میں کتنی یونیورسٹیاں ہیں، ۱۹۴۷ء کے بعد ہمارے یہاں کتنی یونیورسٹیاں، پاٹھ شالے، مدرسے قائم ہوئے، ریسرچ سینٹر اور لائبریریاں وجود میں آئیں، ان سب کے باوجود انسان برابر انحطاط کا شکار، معاشرہ اخلاقی زوال سے دوچار اور ملک انارکی میں مبتلا ہے، پوری دنیا کا یہ حال ہے، شیکاگو کی لائبریری میں مَیں نے پوچھا کہ یہاں کتنی کتابیں ہیں؟ تو لائبریرین نے کہا کہ پچاس لاکھ کتابیں، ہارورڈ یونیورسٹی جانے اور وہاں لیکچر دینے کا اتفاق بھی ہوا، وہاں معلوم ہوا کہ ایک کروڑ کتابیں ہیں۔

اس کے علاوہ امریکہ میں چپّے چپّے پر یونیورسٹی ہے، ایک ایک یونیورسٹی میں ایک ایک لاکھ طالب علم پڑھتے ہیں، لیکن کتابوں کی کثرت، یونیورسٹیوں کی بھرمار، لیبارٹریوں کی رونق، علم و سائنس کی ترقی؛ اس نے امریکہ کو کیا دیا؟ جب نیویارک کے پاور پلانٹ پر بجلی گری، اس وقت میں فلاڈیلفیا میں تھا، بجلی گری اور تین گھنٹے کے لیے پورا نیویارک شہر اندھیرے میں ڈوب گیا، لیکن ان تین گھنٹوں میں دنیا کے اس متمدن شہر میں کئی ارب روپیوں کی لوٹ ہوگئی، لوگ بھک منگوں، فاقہ کشوں اور وحشی جانوروں کی طرح دکانوں پر، تجارتی اداروں پر، سامان پر، کیش بکسوں پر ٹوٹ پڑے، اور انھوں نے نیویارک کو لوٹ لیا، تین گھنٹے تک نیویارک (Out of Control) ہوگیا تھا، وہاں کا انتظامیہ بے بس تھا، بتایئے! ان یونیورسٹیوں، لائبریریوں، لیبارٹریوں نے امریکہ کو کیا دیا؟ آج امریکہ ساری دنیا کے انسانوں کو بھولے بھالے بچوں کی طرح بہلا رہا ہے، جانوروں کے ریوڑ کی طرح ہانک رہا ہے، لیکن خود اس کا حال کیا ہے؟

تنہا ذرائع کچھ نہیں کر سکتے

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تنہا ذرائع کچھ نہیں کر سکتے، اگر اخلاقی طاقت، احساس ذمہ داری اور مذہب کی زبان میں خدا کا خوف نہ ہو تو بڑے بڑے سائنس داں، ریسرچ اسکالرز، یونیورسٹیاں، لائبریریاں، لیبارٹریز، عظیم الشان پروجیکٹ کچھ نہیں کر سکتے۔

یہ احساس ہونا چاہیے کہ کسی بھی انسان پر ظلم اور زیادتی خود اپنے پر ظلم ہے، تمام انسان ایک ہی جسم کے ٹکڑے ہیں، قرآن کے الفاظ میں ﴿مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾ (سورۃ لقمان:۲۸) ایک جان کا پیدا کرنا گویا پوری نسل انسانی (Mankind) کو پیدا کرنا ہے، پوری نسل انسانی ایک جسم ہے، گلستاں، بوستاں جیسی اخلاقی کتابیں جب بچپن میں پڑھائی جاتی تھیں تو ہم پڑھتے تھے:

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند
کہ در آفرینش زیک جوہراند

آدم کے بیٹے ایک ہی جسم ہیں، کیونکہ ایک ہی زمین، ایک ہی مادہ سے بنائے گئے ہیں، اسی کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "كُلُّكُمْ مِنْ آدَمَ وَ آدَمُ مِنْ تُرَابٍ" [1] اے انسانو! تم سب آدم سے بنے ہو، اور آدم مٹی سے بنا تھا، کسی عربی کو عجمی پر، کسی عجمی کو عربی پر، کسی گورے کو کالے پر، کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں، کسی بات پر فخر کرنے کا حق نہیں۔

سائنس کا مست ہاتھی

اس بات کی کمی نے آج روس اور امریکہ کو مست ہاتھی بنا دیا ہے، سائنس کو مست ہاتھی بنا دیا ہے، کسی کی خیر نہیں کہ کس بچہ کو کچل ڈالے اور کس غریب کے جھونپڑے کو گرادے۔

اس مست ہاتھی کو اگر کوئی چیز کنٹرول کر سکتی ہے، تو وہ خدا کا خوف ہے، خدا پر یقین اور اخلاقی طاقت ہے، اس نے بڑے بڑے طاقتوروں کو جن سے دنیا لرزتی، کانپتی تھی، پیٹ پر پتھر باندھنے، فاقہ کرنے اور راتوں کو بھیس بدل کر پہرہ دینے پر آمادہ کیا۔!!

میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں، اور اس کی معافی چاہتا ہوں کہ چونکہ میں اسلامک ہسٹری کا طالب علم ہوں، میں نے اس موضوع پر کتابیں بھی لکھی ہیں، میں نے اپنی تاریخ کا زیادہ مطالعہ

---

(۱) جامع الترمذي، أبواب المناقب، باب في الشام واليمن۔

کیا ہے، اس لیے اس وقت ذہن میں یہی واقعہ آ گیا، اور اسی کو مثال بنا سکتا ہوں، ورنہ ہندوستان میں بھی جب یہاں اخلاقی طاقت ہر چیز پر غالب تھی، ایسی مثالیں گزری ہوں گی، یہاں بھی بڑے بڑے لوگ گزرے ہیں۔

مثالی حکمراں

یہ واقعہ حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کا ہے جو پہلے خلیفہ تھے، ان کا پورا وقت خلافت وحکومت کے کاموں میں صرف ہوتا تھا، لہٰذا ان کے گزارے کے لیے بیت المال سے ایک معمولی رقم بطور وظیفہ ملا کرتی تھی۔

حضرت ابوبکرؓ بیت المال سے اپنے لیے جو وظیفہ لیتے تھے، اس کی مقدار کتنی تھی، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ایک مرتبہ ان کی اہلیہ کا جی چاہا کہ حلوہ کھائیں، شوہر سے فرمائش کی تو انھوں نے جواب دیا کہ گنجائش نہیں ہے، بیوی نے کہا کہ "اچھا! آپ روزمرہ کے خرچ کے لیے مجھ کو جو دیتے ہیں، اب میں اسی میں سے پس انداز کروں گی، یہاں تک کہ وہ حلوہ کی قیمت کے برابر ہو جائے۔" چند روز میں اتنا پس انداز ہو گیا کہ حلوہ بن سکے، خلیفۂ رسول کو اس کا علم ہوا تو فرمایا کہ "روزمرہ کا خرچ ان چند پیسوں کو کم دینے کے بعد بھی پورا ہوسکتا ہے، جو تم روزانہ پس انداز کرتی تھیں، اس لیے اب آئندہ تم کو گھر کا خرچ کم کر کے دیا جائے گا" اور جو رقم حلوہ کے نام سے پس انداز ہوئی تھی، وہ بیت المال میں داخل کر دی۔

یہ مثال اس انسان کی ہے جو مدینہ سے لے کر سیریا اور پورے جزیرۃ العرب کا حکمراں تھا، جس کا رقبہ سلطنت ہندوستان سے بھی زیادہ تھا۔

اصل ضرورت

اصل ضرورت ذرائع اور وسائل کو مفید بنانے اور اسے صحیح رخ دینے کی ہے، سائنس کی ترقی اور وسائل کی فراوانی سے سوسائٹی اس خطرہ سے محفوظ نہیں رہ سکتی جو اس کے سر پر منڈلا رہا ہے، خدا کا خوف، اخلاقی حس، انسانیت کا اکرام اور احساس ذمہ داری کے ذریعہ انسانی سماج کو خطرات سے بچایا جاسکتا ہے۔

یہ دنیا سائنس اور ٹیکنالوجی میں، مالیات (Finance) میں اور زندگی کے تمام مادی شعبوں میں ترقی کر رہی ہے، ہمارا ملک بھی ترقی کر رہا ہے، اور خود کفیل بنتا چلا رہا ہے، لیکن جو نہیں ہو رہا ہے، وہ اخلاق، انسان کی عزت و محبت اور پریم کو عام کرنے کی دعوت ہے، آدمی کو آدمی سے

ملانے، خود غرضی کو کم کرنے، خلوص کو پیدا کرنے، حب الوطنی اور وفاداری کے جذبات کو فروغ دینے اور ہر قسم کے کرپشن اور خرابیوں کو دور کرنے کے لیے عوامی سطح پر پرچار کا کام ہے۔

آج یورپ اور امریکہ کی سوسائٹی میں باوجود بہت سی خرابیوں کے یہ خوبی ہے کہ وہاں کرپشن، ملاوٹ اور وطن دشمنی آپ نہیں پائیں گے، دوا میں، غذا میں ملاوٹ کا تو وہاں کوئی تصور نہیں کرسکتا، اور ہمارے ملک میں یہ بھی ہوتا ہے اور بڑے پیمانہ پر ہوتا ہے۔

میں ترقی کا مخالف نہیں

میں کسی چیز کا انکار نہیں کرتا، کسی چیز کو Reject نہیں کرتا، جو تعلیم عام کی جارہی ہے، اس کے اور زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے، اگر یونیورسٹیاں اور قائم ہوں تو ہمیں فخر اور خوشی ہوگی، میں کسی چیز کو کم نہیں کہتا، میں صرف ایک اضافہ چاہتا ہوں، وہ یہ کہ اس ملک میں اخلاق کا پرچار کیا جائے، انسانیت کا احترام پیدا کیا جائے، اور یہ بات دل میں بٹھادی جائے کہ درخت، جانور، دریا، ستارے، چاند، سورج سب سے زیادہ قیمتی انسان ہے، یہ سب انسان کے لیے بنائے گئے ہیں، اور ہمیں انسان بننا ہے۔

اگر ہم ہوا میں بھی اڑنے لگیں، اور پانی میں پیر مارنے لگیں، لیکن ہمیں زمین پر آدمی کی طرح چلنا نہ آئے تو اس ملک کا اور انسانی سوسائٹی کا خدا حافظ، یہ ملک پھر بچ نہیں سکتا۔

یورپ اور امریکہ بھی خطرے میں ہیں، اس کے لیے کسی دوربین اور خوردبین کی ضرورت نہیں، صاف نظر آرہا ہے کہ یورپ وامریکہ ڈانواڈول ہورہے ہیں، اپنے دن پورے کررہے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ ہمارے دل میں یہ لگن لگ جائے کہ ہم اخلاق کا پرچار اور انسانیت کا احترام پیدا کریں، خدانے جو نعمتیں ہمیں دی ہیں، ان کے استعمال کا سلیقہ ہم میں ہونا چاہیے، ہمارے پاس صالح اور تعمیری مقاصد ہونے چاہئیں، ہمارے اندر (Good Will) کا جذبہ ہونا چاہیے۔

ہم وسائل کو انسانوں کے فائدہ کے لیے، ان کے دُکھ دَرد کو دُور کرنے کے لیے، دنیا میں محبت اور پریم پھیلانے کے لیے، دلوں کو جوڑنے کے لیے، فسادات روکنے کے لیے، انسان کشی ختم کرنے کے لیے استعمال کریں، مل جل کر انسانیت کی ڈوبتی کشتی کو بچانے کی ضرورت ہے، اور یہی ہمارا پیغام ہے۔

یہ ملک جن خطرات سے دوچار ہے، اور انسانیت جس زوال کی شکار ہے، اس کا احساس ہر

محبِّ وطن کے دل میں ہونا چاہیے۔

انسانیت کا سفینہ گرداب میں

انسانیت کی کشتی گرداب میں ہے، اس پر نسل انسانی کا صدیوں کا قیمتی سرمایہ ہے، تہذیب و ثقافت، ادب ولٹریچر، علوم وفنون سب خطرے میں ہیں، کشتی غرقاب ہوگی تو کچھ بھی نہیں بچے گا، ڈوبنے والے بحری جہازوں اور حادثہ کے شکار ہونے والے ہوائی جہازوں میں پڑھے لکھے اور قابل لوگ بھی ہوتے ہیں، اور وہ بھی لقمۂ اجل بن جاتے ہیں بھنور میں پھنسی ہوئی انسانیت کی کشتی کو بچانے کی ضرورت ہے، ہمارا یہی پیغام ہے، آپ حضرات سنجیدگی سے اس پر غور کریں، یہ نہیں کہ ایک قسم کی Curiosity آپ کو یہاں لے آئی ہو، محض تجسس، محض شوق آپ کو یہاں لے آیا ہو، کہ دیکھیں یہ مولوی لوگ ٹیگور ہال میں کیا تقریر کرتے ہیں، اور سُن کر سو جانا ہے۔

یہ تقریر نہیں بلکہ میری آپ کی کہانی ہے، یہ آپ بیتی ہے، جگ بیتی نہیں، یہ ہماری زندگی کا معاملہ ہے، تاریخ جغرافیہ کا مسئلہ نہیں، ہمیں نیک مقاصد مذہب سے، اخلاقیات سے ملتے ہیں، نیک ارادے نیک لوگوں سے ملتے ہیں، اگر ہمارے مقاصد نیک نہیں تو یہ چیزیں معدوم ہیں، یہ چٹکلے مفید نہیں، صرف وسائل حاصل کرنا اور اس سے کوئی بحث نہیں کہ ان سے کیا کام لینا ہے، بے معنی بات ہے، اگر اس مائک سے میں کوئی غلط بات کہہ دوں تو یہ جوں کا توں اسے پہنچا دے گا، قصور مائک کا نہیں، کہنے والے کا ہوگا، قصور سوچنے سمجھنے والوں کا ہے، ان جمادات کا قصور نہیں جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں، آج ملک میں ہر جگہ آگ لگی ہوئی ہے، اپنے ذاتی مقاصد اور ارادوں کے لیے نیند حرام کرنے والے، گھر بار چھوڑنے والے، وطن سے بے وطن ہونے والے موجود ہیں، لیکن کوئی ایسا نہیں جو آستین چڑھا کر اور خم ٹھونک کر میدان میں آجائے اور کہے کہ میری زندگی میں ملک تباہ اور انسانی معاشرہ برباد نہیں ہوسکتا، ہم پڑھے لکھے لوگ، دانشور انسان اگر یہ کام نہیں کریں گے، تو کیا آسمان سے دیوی دیوتا اصلاح کے لیے آئیں گے؟ جو لوگ رشوت لیتے ہیں، پیسے کی محبت میں، کسی لالچ میں اپنا گھر بھرتے ہیں، اور دوسروں کا گھر اُجاڑتے ہیں، ہم آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ روکیں، انھیں سمجھائیں، ان کو سنبھالیں، آج سارا ملک یا تو سیاست میں لگا ہوا ہے یا دولت کے حصول میں الجھا ہوا ہے، آج صرف دو زندہ حقیقتیں ہیں: طاقت اور دولت (Power And Wealth)۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے

طاقت اور دولت کی پوجا میں ملک تباہ ہو رہا ہے، یہ ملک طاقت اور دولت سے نہیں بچے گا، یہ ملک اخلاق، انصاف، شرافت اور خدا کے خوف سے بچے گا، آپ سب پڑھے لکھے لوگ ہیں، ہمارا کام تو صرف صدا لگانا ہے، آج یہاں صدا لگائی، کل کہیں اور یہ صدا لگائیں گے۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

ہم نے صدا لگا دی، آپ نے ساتھ دیا تو قافلہ بن جائے گا، ہم نے اپنی ذمہ داری محسوس کر کے خطرے کی گھنٹی بجائی، جھنجھوڑا، تاکہ ہم خدا کے سامنے کہہ سکیں کہ ہم نے آگاہ کر دیا تھا، یہ ملک تباہی کے کنارے پر ہے، اسے کوئی پالیٹکس، کوئی پارٹی، خواہ وہ کانگریس ہو، یا جنتا پارٹی، کوئی نہیں بچا سکتا، یہ ان کے بس کا کام نہیں، یہ ان کا Function نہیں ہے، ہاں گاندھی جی کو اس کا خیال تھا، لیکن بعد کے لوگ ملک کے مسائل اور انتظامی معاملات میں ایسے کھو گئے کہ اخلاقیات کا انھیں خیال نہیں رہا، پالیٹکس کے پٹے ہوئے راستے پر چل کر اور سیاسی پارٹیوں کے جتانے اور ہرانے سے کام نہیں چلے گا، بے غرض ہو کر خدا کی رضا اور انسان کی خدمت کے نیک مقصد کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے، ملک کے بچانے، انسانیت کے وقار کو بلند کرنے اور تہذیب و تمدن اور ادب و لٹریچر کو پروان چڑھانے کا کام انھیں بے لوث اور انجان لوگوں نے کیا جو تعریف سے بے نیاز رہے اور تنقید سے خائف نہ ہوئے، انھوں نے خاموش کام کیا اور اس دنیا سے چلے گئے، آج ہمیں پھر انتظار ہے اُن سعید روحوں اور بہادر انسانوں کا جو اس ملک کو تباہ ہونے سے پہلے بچالیں، ہمیں اندیشہ ہے کہ ان سیاسی لوگوں اور خود غرضوں کے ہاتھوں جو ہر مسئلہ کو اپنی پارٹی کے نقطۂ نظر سے سوچتے ہیں، ملک تباہ نہ ہو جائے۔

امید کی کرن

ہمیں امید ہے کہ خدا اس ملک سے بڑا کام لے گا، یہاں بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے، مسلمانوں میں بھی غیر مسلموں میں بھی، ان لوگوں نے دور دراز خطوں تک پریم راگ پہنچایا ہے، محبت کو عام کیا ہے، خدا اس ملک کو مہلت دے گا، اور موقع دے گا کہ یہ ملک زوال و پستی سے نکل آئے، یہ ملک اپنے کو بھی بچائے گا اور اس دنیا کو بھی بچائے گا جو ڈوبنے کو ہے۔

میں نے بے غرض ہو کر یہ باتیں پیش کی ہیں، امید ہے کہ آپ بھی اسے دل و دماغ میں جگہ دیں گے، تعلیم یافتہ لوگ بڑھیں، پہلے کشتی کو بچائیں، پھر اس کا فیصلہ کرلیں گے کہ کون سی چیز کہاں رکھی جائے۔

ایسا باوقار پڑھا لکھا مجمع دیکھ کر امید بندھتی ہے، خوشی ہوتی ہے، اور یہ ایک اچھی علامت ہے۔[1]

---

(۱) ماخوذ از ''تحفۂ انسانیت''، (صفحہ ۹۶-۱۱۹)۔

۶

انسانی معاشرہ کو تباہی سے بچائیں(۱)

میری زندگی کا تاریخ دن

میرے فاضل اور معزز دوستو! آج کا دن میری زندگی میں تاریخی دن ہے، اس لیے کہ میں اپنی زندگی میں دو مرتبہ کورٹ گیا ہوں، ایک مرتبہ تو ترجمان (Interpreter) کی حیثیت سے، بہت زمانہ ہوا ہمارے شہر لکھنؤ میں ایک صاحب ہمارے Colleague تھے، ان پر کسی ایسے بائیلاز (By Laws) میں جو میونسپلٹی کے ہوتے ہیں، کیس قائم ہوگیا، وہ عربی بولتے تھے، اور کوئی زبان نہیں جانتے تھے، تو میں Translator کی حیثیت سے کورٹ گیا تھا، لیکن اس دن مقدمہ نہیں ہوا اور خارج ہوگیا، اور میں پیش نہ ہوسکا، دوسری مرتبہ اپنی والدہ کی جائداد کی رجسٹری کے سلسلے میں کورٹ گیا تھا، اور آج کورٹ میں یہ تیسری حاضری میرے لیے Historical ہے، میں مدعی کی حیثیت سے نہیں آیا ہوں، اس میں تو بڑی زحمت ہوتی ہے، میں آیا ہوں اچھے اہل دماغ اور معزز شہریوں کے چیدہ مجمع سے ملنے اور ان سے گفتگو کرنے۔

لیڈر شپ قانون داں طبقہ کے ہاتھ میں

آپ یہ جانتے ہیں کہ ہندوستان کی رہنمائی قانون داں طبقہ نے کی اور آج بھی ہندوستان کی لیڈر شپ قانون دانوں (Lawyers) کے ہاتھ میں ہے، مہاتما گاندھی سے لے کر جواہر لال نہرو تک، سر علی امام، محمد علی جناح، سر تیج بہادر سپرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل، بیرسٹر آصف علی، ہندوؤں اور مسلمانوں کے اکثر لیڈر قانون داں طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، ہندوستان کی جنگ آزادی اسی طبقہ نے لڑی، انگریز جیسی قانونی اور Legal دماغ رکھنے والی قوم کا مقابلہ Legal

(۱) اندور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن میں ۸؍دسمبر ۱۹۷۷ء کو کی گئی تقریر۔

طریقے سے کرنا چاہیے تھا، انگریز اگر کوئی غلط کام کرنا چاہتا ہے تو اسے بھی قانونی اور Legal طریقہ پر کرنا چاہے گا، اور ٹھیک کام کرتا ہے تو وہ بھی دستوری اور قانونی انداز میں کرتا ہے، اس نے اپنے بڑے بڑے محسنوں مثلاً لارڈ اکلائیو وغیرہ پر جنھوں نے برٹش امپائر کا فاؤنڈیشن (Foundation) رکھا تھا، مقدمہ چلایا، اور برٹش پارلیمنٹ میں برکلے کی تقریریں آپ کو یاد ہوں گی، ہندوستان میں ان کے خلاف لڑائی بھی وہی لوگ کر سکتے تھے جو قانون کے ماہر تھے، اور قانون کا جواب قانون سے دے سکتے تھے۔

موت وحیات کی جنگ

اس لیے آپ حضرات اس وقت بھی ملک میں بہت اہم رول (Role) ادا کر سکتے ہیں، اس وقت ہمارا ملک ایک خاص اسٹیج (Stage) پر پہنچ گیا ہے، ایک بہت بڑے بحران (Crisis) کو Face کر رہا ہے، یہ Crisis قانون کا نہیں، بلکہ انسانیت (Humanity) کا ہے، یہ Moral Crisis اور Ethical Crisis ہے۔ اس وقت ملک لڑائی کے ایک دوسرے میدان میں داخل ہو رہا ہے، یہ لڑائی زندگی اور موت کی لڑائی ہے، اس لڑائی میں آپ حضرات کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔

میں History کا طالب علم ہوں، میرا مطالعہ یہ کہتا ہے کہ تہذیب (Civilization) اور سوسائٹی پر دو دَور آتے ہیں، ایک اس وقت جب سوسائٹی کا اعلیٰ دماغ، ذہین اور قابل طبقہ (Intelligentsia) اچھے رخ پر چلتا ہے، Constructive بن جاتا ہے، تو اس وقت تہذیب کی بہار آجاتی ہے، سوسائٹی اپنے نقطۂ عروج (Climax) پر پہنچ جاتی ہے، پھر ایک دور وہ آتا ہے جب یہ ذہانت Destructive بن جاتی ہے، وہ پروفیشنل (Professional) بن جاتی ہے، اور اس کو اس سے بحث نہیں ہوتی کہ سوسائٹی ڈوبے گی، یا پار اُترے گی، ہمارا سماج تباہ ہوگا یا پنپے گا، انھیں بس اپنی فیس سے مطلب ہوتا ہے، خوش قسمتی جب انسان اور انسانی سوسائٹی کو نصیب ہوتی ہے، تو جینیس لوگ، Intelligentsia جو ذہنی صلاحیت رکھتے ہیں، اور عام سطح سے بلند ہوتے ہیں، وہ سوسائٹی کو بچانے کی فکر کرتے ہیں، وہ اپنی ساری ہوشیاری، سارا Talent، سارا سائنس، اپنا پورا اسکیل، اپنا تمام Experiment اور جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے، سب کچھ داؤں پر لگا کر سوسائٹی کو تباہی سے بچاتے ہیں، اور اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ ان کا انجام کیا ہوگا، پیسہ ملے گا یا نہیں ملے گا، ہمارا پیشہ کامیاب رہے گا یا ناکام، وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ کسی

طرح سماج بچ جائے، سوسائٹی ڈوبنے نہ پائے۔

سب ڈوب جائیں گے

اس وقت ہندوستان کو آپ کی ذہانت، آپ کی قانون دانی، آپ کی محنت، آپ کی شرافت کی بے حد ضرورت ہے، یوں سمجھئے کہ ایک کشتی، ایک ناؤ طوفان میں پھنس گئی ہے، خوفناک لہریں منھ کھولے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہی ہیں، اس کشتی میں کچھ کمزور لوگ سوار ہیں، کشتی ڈوبنے کے بالکل قریب ہے، ایسے وقت میں کوئی ایسا ملاح، ایسا کھیون ہار آجائے جو اس کشتی کو پار لگا دے تو وہ بہت بڑا محسن ہوگا۔ آج ہمارا ملک جس پر ہم کشتی کی طرح سوار ہیں، اس میں سوراخ کیا جارہا ہے، اگر یہ کشتی ڈوب گئی، تو اچھے اور بُرے، پڑھے لکھے اور اَن پڑھ، غریب اور مال دار، چھوٹے اور بڑے، بچے اور جوان سب ڈوب جائیں گے، ہمارے پیغمبر ﷺ نے کشتی کی مثال دے کر یہ بات فرمائی ہے کہ اگر نیچے کے حصے کے لوگ اس میں سوراخ کریں تو اوپر کے لوگوں، Upper Class والوں کو تماشائی نہیں بننا چاہیے، اس لیے کہ کشتی ڈوبی تو وہ بھی نہیں بچیں گے۔

سوراخ ایک ہی طرح کا نہیں ہوتا، کوئی چھوٹا ہوتا ہے، کوئی بڑا، کوئی خوبصورتی سے ہوتا ہے، کوئی بدنما، کوئی ہتھوڑا مار کر سوراخ کرتا ہے، کوئی سائنٹفک ذریعہ سے سوراخ کرتا ہے، ہماری سوسائٹی کرپٹ (Corrupt) ہو رہی ہے، پوری سوسائٹی میں مختلف نشتر سے سوارخ کیا جا رہا ہے۔

اب آپ انصاف کیجیے، میں انصاف کا نام اس ہائی کورٹ میں لیتا ہوں، اور یہاں انصاف کی دہائی دیتا ہوں، آپ کے Common Sense کو اپیل کرتا ہوں، بتائیے نیچے سوراخ ہو گیا تو کیا ہم بچیں گے؟ آج یہی ہو رہا ہے، ہندوستان سے باہر بھی میں بار ہا گیا ہوں، تمام دنیا میں یہی ہو رہا ہے، ۱۹-۲۰ کا فرق ہے، کوئی ملک یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ہماری سوسائٹی Ideal Society ہے، پوری انسانی سوسائٹی کرپٹ ہو رہی ہے، اس میں بغاوت ہے، بے چینی ہے، Confusion ہے، Frustration ہے، سب پریشان ہیں، کوئی مطمئن نہیں، سُکھی نہیں، اس وقت تمام دنیا کا اور تمام طبقوں کا یہی حال ہے، اوپر کے طبقہ والے یہ نہیں سوچتے کہ ہماری قسمت نیچے کے طبقہ والوں سے وابستہ ہے۔

آپ میدان میں نکل آئیں

انسان اور جانوروں میں فرق ہے، جانور روز مارے جاتے ہیں، کوئی بغاوت نہیں ہوتی لیکن

ایک انسان مارا جائے تو کھلبلی مچ جاتی ہے، ایک آدمی کسی جرم میں گرفتار ہوتا ہے تو ساری سوسائٹی میں چرچا ہوتا ہے، ہماری فطرت میں، ہمارے Nature میں ایک دوسرے کا احساس، ایک دوسرے سے تعلق کا جذبہ قدرت نے رکھا ہے، احساس کی یہ دولت اس لیے دی گئی ہے کہ ہم اس سے صحیح کام لیں، اپنے ملک کو اور پورے انسانی سماج کو تباہی سے بچائیں، ایک دوسرے کے دُکھ درد میں کام آئیں۔

آپ حضرات اس بات کی سب سے زیادہ اہلیت رکھتے ہیں، قابلیت رکھتے ہیں، ملک کی ناؤ جو منجدھار میں گھر کر ڈانواں ڈول ہو رہی ہے، اس کو بچانے کے لیے اپنا کچھ وقت لگائیں، پیشے کا حرج کریں، اپنے پیسے کو خرچ کریں، اپنی خدمات کو پیش کریں، آپ میدان میں نکل آئیں، ملک کے کونے کونے میں پہنچیں، اور کہیں کہ یہ بداخلاقی، انسان دشمنی، کمزور کشی، بددیانتی، ملک دشمنی نہیں ہونا چاہیے، میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ آپ اپنی ذہانت اور صلاحیت کا رخ کچھ اس طرف بھی پھیریں۔

جنگ آزادی میں وکیل صاحبان جس طرح صف اول میں تھے، آج بھی ملک کو بنانے اور سنوارنے اور اس کی بے لوث خدمت کرنے کے لیے انھیں آگے بڑھنا چاہیے، آپ کا پیشہ ایک معزز پیشہ کہلاتا ہے، مجھے معلوم ہے کہ پہلے زمانہ میں اگر کسی شہر میں کوئی اچھا بیرسٹر، ایڈوکیٹ آتا تھا تو سارے شہر میں اس کی عزت ہوتی تھی، اس لیے کہ انھوں نے اپنی قابلیت اور خدمت کا سکہ ملک میں جما دیا تھا۔

میں اپنی عزت افزائی سمجھتا ہوں کہ آج آپ کے طبقہ سے، سوسائٹی کے دماغ سے مجھے کچھ عرض کرنے کا موقع مل رہا ہے، میں آپ سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ انسانیت کے احترام، آدمی کی عزت کے پرچار کے لیے میدان میں آئیں۔

ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں

خدا کے نزدیک انسان بڑا پیارا ہے، آدمی کا آدمی ہونا یہ سب سے بڑی Qualification ہے، اس کے علاوہ اسے اور کسی Qualification کی ضرورت نہیں، آدمی جس وقت ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا اسی وقت اس کے سر پر دنیا کی سلطنت کی ولی عہدی کا تاج رکھ دیا گیا، ہم انسان کو ہر چیز پر ترجیح دیں، ہم ایک دوسرے کی قدر کریں، ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں، ایک دوسرے کے لٹریچر (Literature)، کلچر (Culture)، سسٹم (System)،

سویلائزیشن (Civilization)، ریلیجن (Religion) کو ایمانداری کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں۔

ہزار برس سے ہندو مسلم بھائی اس دیش میں رہتے ہیں، پڑوسی ہیں، دیوار سے دیوار ملی ہوئی ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ایک دوسرے کی ابتدائی باتیں، بنیادی چیزیں بھی نہیں جانتے۔

اس کی ایک مثال دیتا ہوں، ایک مرتبہ میں ٹرین میں چند ساتھیوں کے ساتھ سفر کر رہا تھا، نماز کا وقت ہوا، ہم نے جماعت سے نماز پڑھی، جب ہم نماز میں رکوع اور سجدے میں جاتے ہیں تو ''اللہ اکبر'' کہتے ہیں، ہمارے ساتھ سفر کرنے والے ایک ہندو بھائی نے جو پڑھے لکھے آفیسر تھے، نماز کے بعد پوچھا: ''مولوی صاحب! آپ جب نماز پڑھتے تھے، تو کیا اکبر بادشاہ کو یاد کرتے تھے؟''۔

ملک میں ہر جگہ مسجدیں ہیں، ہر وقت اذان، نماز میں اللہ اکبر کی آواز آتی ہوگی، لیکن انھوں نے کبھی خیال نہیں کیا کہ پوچھیں: اللہ اکبر کا مطلب کیا؟ اسے کیوں بولا جاتا ہے؟ اسی طرح ہمارے ہندو بھائیوں کی بہت سے ایسی باتیں ہوں گی جن کی جانکاری ہمیں ہونی چاہیے، بغیر کسی اہانت کے یہ معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔

ہمارے اس سفر میں اس میٹنگ کی بڑی اہمیت ہے، کہ ہمیں موقع ملا کہ اپنے خیالات و احساسات (Feeling) آپ جیسے پڑھے لکھے لوگوں کے سامنے پیش کرسکیں، خدا کرے کہ اور شہروں میں بھی ایسے مواقع بار بار ہوں جس سے ہم ایک دوسرے کو سمجھیں، ہمدردی، محبت، تعلق پیدا ہو، ملنے جلنے سے بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں، اس میں بڑے فائدے ہیں، ہمارے درمیان سوشل تعلقات ہونے چاہئیں، مجھے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کیا سوچتے ہیں، آپ کا مذہب کیا کہتا ہے، آپ بھی میرے بارے میں جانیں، میرے مذہب کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

حیرت کی بات

یہ حیرت کی بات ہے کہ غیر ممالک میں ہم ہندوستانی بڑی محبت سے ملتے ہیں، لیکن اپنے وطن میں نہیں ملتے، میں جب امریکہ میں تھا، اور میری آنکھ کا آپریشن ہوا تھا، تو اس ہاسپٹل کے ایک ہندو ڈاکٹر میرا ہندوستانی نام دیکھ کر ملنے آئے، اور روزانہ بڑی محبت سے ملتے رہے، یہ صرف وطن کا رشتہ تھا، جو پردیس میں محبت کی سوغات بن گیا، یہ بات وطن میں تو اور زیادہ ہونی چاہیے، یہ بہت نامناسب بات ہے کہ آدمی دوسرے آدمی سے ڈرے یا اسے شک کی نگاہ سے دیکھے۔

اس کام میں آپ حضرات کی کوشش کی بڑی ضرورت ہے، آپ جو وقت کورٹ میں دیتے ہیں، اپنے موکلوں کو دیتے ہیں، اس میں سے تھوڑا سا وقت غلط فہمیوں کو دور کرنے اور Goodwill کی فضا پیدا کرنے، انسانیت کا احترام دلوں میں بٹھانے کے لیے صرف کریں، انسان انسان ہے، چاہے وہ کسی بھی مذہب وملت کا ہو، وہ ہمارا بھائی ہے، اس سے ہمیں محبت کرنی چاہیے، اس سے ساری مصیبت، سارے دکھ درد ختم ہو جائیں گے۔

ہم شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہمیں بلا کر اعتماد کا اظہار کیا، محبت کا مظاہرہ کیا، اور مل کر بیٹھنے کا موقع دیا۔ (۱)

---

(۱) ماخوذ از ''تحفۂ انسانیت'' (ص ۲۰۹-۲۱۶)۔

۷

جب پڑھے لکھے آدمی پر ہسٹیریا کا دورہ پڑتا ہے (۱)

میں اپنی خوشی ظاہر کرنا چاہتا ہوں

سب سے پہلے تو میں آپ کے سامنے اپنی اس خوشی کو ظاہر کرنا چاہتا ہوں، اور یہ انسان کی خوبی ہے، اس کی کمزوری نہیں ہے، انسانی فطرت ہے کہ وہ خوش ہوتا ہے تو اپنی خوشی ظاہر کرتا ہے، اور اس کو اپنی خوشی ظاہر کرنا چاہیے، یہ بالکل مصنوعی (Artificial) بات ہے کہ آدمی خوش ہو اور خوشی ظاہر نہ کرے، بعض مرتبہ یہ کہنا کہ ''ہم بہت خوش ہوئے ہیں''، یہ بہت چھوٹی بات سمجھی جاتی ہے، لیکن میں اس کو زندگی کی علامت سمجھتا ہوں، مردہ اپنی خوشی ظاہر نہیں کرسکتا، نہ اپنا رنج ظاہر کرسکتا ہے، لیکن جب تک انسان زندہ ہے، اور اس کی رگوں میں خون پھر رہا ہے، اور سانس آرہی ہے اور جارہی ہے، اس وقت تک وہ باہر کے حالات سے متاثر ہوتا ہے، جب روح نکل جاتی ہے، جسم و جان کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے، تو پھر باہر کے حالات کا کوئی اثر نہیں پڑتا، کوئی سایہ نہیں پڑتا، اس لیے میں آپ سے اپنی خوشی چھپا نہیں سکتا، اس پر میں کسی قسم کی شرمندگی محسوس نہیں کرتا کہ اس مجمع کو دیکھ کر بہت خوش ہوں۔

زندگی تکلیف دہ اور خوش کن واقعات کا مجموعہ ہے

انسان کے لیے بڑی دل توڑنے والی باتیں پیش آتی ہیں، اور زندگی نام ہی اس کا ہے، دل توڑنے والی باتیں بھی پیش آتی ہیں، دل کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے والے واقعات بھی پیش آتے ہیں، شیشہ کی طرح، کانچ کی طرح، دل کے سو ٹکڑے ہزار ٹکڑے ہوجاتے ہیں، اور دل کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑنے والے واقعات بھی پیش آتے ہیں، اور زندگی ان دونوں کا مجموعہ ہے، ان

(۱) سیوان (بہار) میں منعقد پیام انسانیت کے ایک جلسہ میں ۱۶/اپریل ۱۹۷۸ء کو کی گئی تقریر۔ اس جلسہ میں بیس ہزار سے زائد مسلم، ہندو، سکھ اور عیسائی خواص و عوام شریک ہوئے۔

ہی کے تال میل سے، انہی کے تانے بانے سے، تکلیف دہ اور خوش کرنے والے واقعات دونوں سے یہ زندگی بنی ہے۔

کسی انسان کے لیے سب سے زیادہ دل شکن اور حوصلہ شکن چیز

تو کسی انسان کے لیے اس سے زیادہ دل توڑنے دینے والی، اس سے زیادہ اس کا حوصلہ پست کر دینے والی بات، اس سے زیادہ اس کو بجھا ہوا بنا دینے والی بات نہیں ہے کہ اس کی بات کو سننے والا، اس کی بات کا کوئی سمجھنے والا نہ ہو، سب سے بڑی سزا انسان کے لیے یہ ہے کہ آپ اس کو کہیں جنگل میں ڈال آیئے، پہاڑ کی چوٹی پر بٹھا دیجیے، جہاں وہ روئے تو کوئی دیکھنے والا نہ ہو، وہ ہنسے تو کوئی دیکھنے والا نہ ہو، سوائے اس کے پیدا کرنے والے کے کوئی انسان نہ اس کی بات کو سننے والا ہو، نہ اس کا غم غلط کرنے والا ہو نہ اس کو تسلی دینے والا ہو، نہ اس کے درد کو سمجھنے والا ہو، اس سے بڑھ کر انسان کے لیے کوئی چیز دل خراش، دل شکن اور حوصلہ شکن نہیں ہو سکتی، اس کے مقابلہ میں آپ انسان سے سب کچھ چھین لیجیے، لیکن انسانوں کی ہمدردی اس کو حاصل ہو، انسان اس پر بھروسا کرتے ہوں، تو اس کو سب مل گیا، سب دولت مل گئی۔

یہ ہماری شعروشاعری، لٹریچر، پوئٹری، فنون لطیفہ، فائن آرٹس، ذہانت (Talent)، فلاسفی، اور ٹکنالوجی تک جو جمادات پر صرف ہوتی ہے، Instruments پر صرف ہوتی ہے، سب کا سرچشمہ، سب کو پیدا کرنے والی چیز امید ہے، انسان کو امید ہوتی ہے، میں ایک شعر کہوں گا تو اس کو کوئی سننے والا، سر دھننے والا ہوگا، آرٹسٹ تصویر بناتا ہے، بڑا مخلص (Sincere) ہے، اس کو اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے کہ لوگ تعریف کرتے ہیں یا تنقید کرتے ہیں، اس کو داد دینے والے ہیں یا اس کی محنت پر پانی پھیر دیتے ہیں، لیکن اگر اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ میری تصویر کا کوئی دیکھنے والا اور اس کے خط وخال کا کوئی سمجھنے والا نہیں ہے تو اس کا قلم، اس کا دماغ نہیں چلے گا، اس کے اندر جو قابلیت ہے تصویر بنانے کی، وہ بجھ کر رہ جائے گی۔

علم وادب کا سارا ذخیرہ اسی قدر دانی کا نتیجہ ہے

یہ جو کچھ ہمارے علم وادب کا ذخیرہ ہے، یہ لائبریریاں ہیں، یہ سب اسی قدر دانی کا نتیجہ ہیں، ہمارے صدر بھی ایک بڑے مصنف ہیں، مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان کی ہابی (Hobby) ان کا سب سے پسندیدہ مشغلہ لکھنا پڑھنا ہے، میں ان کو گواہ بناؤں گا اور آپ کے سامنے ان سے پوچھ سکتا

ہوں کہ ان کو معلوم ہو جائے کہ ان کی کتابوں کے پڑھنے والے نہیں ہیں، Admirers ہونا تو الگ بات ہے، کتابوں کے پڑھنے والے بھی نہیں ہیں، میں نہیں سمجھتا کہ ان کا قلم چلے گا، قلم کو جو چلانے والی چیز ہے، وہ مصنف کا یہ تصور ہے کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔

انسان کے لیے سب سے بڑی سزا

انسان کے لیے سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ وہ یہ سمجھنے لگے کہ میں اکیلا ہوں، اسی وقت اس کا دم گھٹنے لگے گا، انسان کو خدا نے اکیلا پیدا بھی نہیں کیا، اور اکیلا رکھا بھی نہیں، اور خدا کا یہ منشا بھی نہیں ہے کہ وہ اکیلا رہے، اگر خدا کو اس کو اکیلا رکھنا ہوتا تو اس کو پہاڑ بنا دیتا، پتھر بنا دیتا، ہیرا بنا دیتا، کان میں کتنے ہیرے پڑے ہوتے ہیں، جواہرات پڑے ہوتے ہیں لیکن انسان کو خدا نے انسانوں کے بیچ میں پیدا کیا، اور انسان کی فطرت کہ وہ آدمیوں میں رہنا چاہتا ہے، اس کو گھر کاٹنے دوڑتا ہے، جیل خانہ بن جاتا ہے، اگر وہ اس میں اکیلا ہو۔

جیل خانہ جیل خانہ کیوں معلوم ہوتا ہے؟

جیل خانہ کی کیا تعریف ہے؟ جیل خانہ میں کسی بات کی کمی ہے؟ ہمارے منسٹر صاحب بیٹھے ہوئے ہیں، ہماری حکومت ہے، ہمارے دیش کی حکومت ہے، آج کل جیل میں ساری آرام کی باتیں ہیں، اسپیشل کلاس ہوتے ہیں، وہاں پر بعض مرتبہ وہ آسائش، وہ اکرام میسر ہوتا ہے جو اچھے اچھے لوگوں کو اپنے گھر پر میسر نہیں ہوتا، لیکن جیل خانہ جیل خانہ کیوں معلوم ہوتا ہے؟ کیوں لوگ اس سے گھبراتے ہیں؟ قیدی ملنا چاہتا ہے، مل نہیں سکتا، وہ بات کرنا چاہتا ہے تو بات کرنے کے لیے اسے آدمی نہیں ملتے، اس کا دم گھٹنے لگتا ہے، کیوں؟ اس لیے کہ ع

یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

میں استاذ بھی رہا ہوں، اور اس پر فخر کرتا ہوں، بچے کی سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ اس سے کہا جائے: ”یہاں بیٹھے رہو، کہیں جانا نہیں، اٹھنا نہیں۔“ بچے کو آپ دو تھپڑ مار لیجیے، چار تھپڑ مار لیجیے، تھوڑی دیر، اس کے بعد خوش ہو جائے گا، لیکن بچے سے کہیے: دو گھنٹے یہاں بیٹھے رہو، تو بچے کو یہ معلوم ہوگا کہ بس اب جان نکل جائے گی، کیوں؟ اس کو کیا تکلیف ہے؟ وجہ یہ ہے کہ انسانی فطرت حرکت چاہتی ہے، بات کرنا چاہتی ہے، تو اگر انسان اپنے کو اکیلا محسوس کرے، اتنی ہی بات سے وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے، اس کا دم گھٹنے لگتا ہے، جیسے مچھلی کو آپ پانی سے نکال کر خشکی میں

ڈال دیجیے تو مچھلی کا دم گھٹنے لگے گا۔

میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ پڑھے لکھے آدمیوں، ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی بھائیوں کی اتنی صورتیں دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ میرا خون بڑھ گیا ہے۔

ہماری فطرت خراب نہیں اوپر کی چیزیں خراب ہیں

دنیا کا کارخانہ اعتماد اور بھروسے ہی پر چل رہا ہے، اتنے بھائی امید لے کر اور اطمینان کر کے آئے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری فطرت خراب نہیں ہوئی، ہمارے اوپر کی چیزیں خراب ہو گئیں، ہمارا (Conscience) اتنا خراب نہیں ہوا جتنی زبان خراب ہوئی ہے، اور مجھے کہنے کی اجازت دیجیے جتنا ہمارا دماغ خراب ہوا ہے، اور یہ جو کچھ خرابی آج دنیا میں دیکھ رہے ہیں، زیادہ تر دماغ کی خرابی کا نتیجہ ہے، ہم نے غلط پڑھا، غلط نتیجہ نکالا ہے، ہم نے دنیا کا غلط مطلب سمجھا ہے، ہمارا ضمیر سو گیا ہے، جگانے سے جاگ سکتا ہے۔

میں ابھی چار اسٹیٹس (States) کا دورہ کر کے آ رہا ہوں، میں نے دیکھا کہ خدا نے کتنا بڑا ملک ہم کو دیا ہے، اور کیسا سرسبز اور شاداب ملک دیا ہے، ہمارا سر اونچا ہے کہ ہمارا ملک کسی حیثیت سے کسی ملک سے کم نہیں ہے، کیسی ہریالی کیسی شادابی، کیسی پیداوار، کیسے خوبصورت مناظر، کیسا قدرتی حسن، کیسے اونچے پہاڑ، دنیا کا سب سے اونچا پہاڑ ہماری زمین پر ہے، بہت لمبے دریا، ہمارے ملک میں بہتے ہیں، اور غلہ کتنا پیدا ہوتا ہے، پھل کیسے کیسے خدا نے پیدا کیے، اور ان سب سے بڑھ کر آدمیوں کی آبادی، یہ آدمیوں کا جنگل ہے، کھوے سے کھوا چھلتا ہے، بازاروں میں نکلنا مشکل ہے، ٹریفک کنٹرول کرنا مشکل ہے۔

ملک میں احساس ذمہ داری اور محبت واعتماد کی کمی

ہمارے ملک میں کوئی کمی نہیں، لیکن ہمارے ملک کے اندر احساس ذمہ داری، شہریت کا احساس - یہ احساس کہ ہم ایک شریف اور ذمہ دار شہری ہیں - پورے طور پر نہیں ہے، محبت کی کمی ہے، اعتماد کی کمی ہے، لوگ ڈرے ہوئے سے ہیں، آدمی مطمئن نہیں ہیں، یہ اطمینان نہیں کہ کس وقت کیا ہو جائے، یہ بے یقینی کی حالت جو - معاف کیجیے گا - ہماری سیاسی پارٹیوں نے، پچھلی حکومتوں نے پیدا کی ہے، اس سے دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے، یہ ساری خرابی ہماری ہے، خدا کی طرف سے کوئی کمی نہیں، نہ آسمان نے کمی کی پانی برسانے میں، نہ زمین نے کمی کی غلہ اُگانے میں،

تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اور ایک حقیقت پسند انسان کی حیثیت سے میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہمارا ہندوستان اپنی ذہانت میں، اور اپنی Efficiency میں، اپنی کارکردگی کی صلاحیت میں، اپنی سوجھ بوجھ میں، اور اپنی طبعی شرافت میں دنیا کے کسی ملک سے کم نہیں، لیکن اس سے اتنا فائدہ نہیں اٹھایا جارہا ہے، جس حد تک اٹھایا جاسکتا تھا اور اٹھایا جانا چاہیے۔

کسی آدمی کے پاس کوئی چیز نہ ہو تو ذرا تسلی ہوتی ہے کہ بھئی نہیں ہے، خدا نے نہیں دی ہے، غریب آدمی ہے، اس کو تسلی ہے میں غریب گھر میں پیدا ہوا، میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں، میں ذہین بھی نہیں ہوں، میں نے محنت بھی نہیں کی ہے، وہ اپنی قسمت پر راضی ہوتا ہے، لیکن جس کو خدا نے سب کچھ دیا ہو، اور پھر وہ اس سے فائدہ نہ اٹھائے تو رہ رہ کر اس کو یہ خیال آتا ہے، دل مسوس کر رہ جاتا ہے، کہ میں کیوں نہیں فائدہ اٹھاتا؟ مجھے کیوں اس کا موقع نہیں ملتا؟ اس کا جو صحیح نتیجہ ہے، وہ مجھے کیوں نہیں حاصل ہوتا ہے؟ یہی احساس میرا ہے، میں ہندوستان میں آپ سب لوگوں سے زیادہ پھرنے والا آدمی ہوں، میرے ایسے ہی حالات ہیں، میں ہندوستان کے چپہ چپہ پر گھوما، اور کونہ کونہ تک پہنچا ہوں، کتنا دولت مند ملک، زمینی پیداوار سے بھی، معدنی پیداوار سے بھی، یہاں بہتر سے بہتر دھاتیں پائی جاتی ہیں، اور اس میں آپ کا اسٹیٹ بہار کا تو نمبر اول ہے، کوئلہ سب سے زیادہ یہاں نکلتا ہے، لوہا یہاں پیدا ہوتا ہے، کیسے بڑے بڑے کارخانے اور پھر ریفائنریز (Refineries) یہاں قائم ہیں، پٹرول چاہے باہر سے آئے، لیکن یہاں ریفائن ہوتا ہے، یہاں سے وہ تمام ہندوستان میں تقسیم ہوتا ہے، کسی چیز کی کمی نہیں۔

آخر انسان کو ہو کیا جاتا ہے؟

لیکن فسادات یہاں ہوتے ہیں، بھائی بھائی کا یہاں دشمن بن جاتا ہے، پاگل پن کی ایک لہر اٹھتی ہے، کوئی شریر آدمی ایک نعرہ لگا دیتا ہے، اور سارے کا سارا ملک اس وقت ایسا مست ہو جاتا ہے جیسے اس کو کسی نے انجکشن دے دیا، یا اس پر ہسٹیریا کا دورہ پڑ گیا، طالب علم طالب علم معلوم نہیں ہوتے، پروفیسر پروفیسر معلوم نہیں ہوتے، اسکالر اسکالر معلوم نہیں ہوتے، میں جمشید پور، راوڑکیلا، رانچی گیا ہوں، اور فسادات کے بعد گیا ہوں، یہ دیکھ کر مجھے دکھ ہی نہیں ہوا، حیرت بھی ہوئی کہ آخر انسان کو کیا ہو جاتا ہے؟ یہ انسان اتنی جلدی جانور کیسے بن جاتا ہے؟ ارے بھئی! جانور کو انسان بننے کے لیے بڑی مشکل پیش آتی ہے، لیکن انسان کو جانور بن جانے کے لیے کوئی مشکل نہیں، چاہیے تو

یہ تھا کہ جانور کے لیے انسان بننا آسان ہوتا، انسان کے لیے جانور بننا مشکل ہوتا، اس لیے کہ اگر جانور انسان بن جائے تو بڑی اچھی بات ہے، ہم نے کچھ Gain کیا، ہم نے کچھ پایا، لیکن انسان اگر جانور بن جائے اس سے بڑھ کر ہماری بدقسمتی نہیں ہو سکتی۔

انسان کی ترقی کے مدارج

ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تو انسان، ماں باپ نے انسان کا بچہ سمجھ کر پالا پوسا، ساری غذائیں انسانوں کی دیں، اور اس کے بعد جب پڑھنے کے قابل ہوا تو پڑھنے بٹھا دیا گیا، اس کے سامنے نمونے اچھے اچھے آئے، پرانی ہسٹری آئی تو اچھی آئی، پرانے واقعات آئے تو اچھے آئے، ہر ماں باپ، ہر خاندان کے والدین خواہ کم پڑھے لکھے ہوں، لیکن وہ اپنے بچے کو اچھے سے اچھا بنانا چاہتے ہیں، یہ انسانی فطرت ہے، اسی بنا پر انسان نے بڑی ترقی کی ہے، والدین کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی ہے کہ ہمارا بچہ ہم سے بڑھ جائے، انسان کسی کو اپنے سے بڑھا ہوا نہیں دیکھنا چاہتا، لیکن اپنے بچے کو اپنے سے بڑھا ہوا دیکھنا چاہتا ہے، یہ انسان کی فطرت ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک نسل پہلی نسل سے اچھی ہوتی ہے،، اور تیسری نسل دوسری نسل سے اچھی، تو انسان پیدا ہوا تو انسان تھا، اس کے بعد جب اس کو دودھ پلایا گیا تو انسان کے بچے کی طرح پلایا گیا، گودوں میں کھلایا گیا، تو انسان کے بچے کی طرح کھلایا گیا، گلاب کے پھول کی بھی وہ سیوا نہیں ہوتی جو انسان کے بچے کی سیوا ہوتی ہے، پھر اس کے بعد اس کو پڑھنے بٹھایا گیا، تو انسانوں کی طرح اس کے لیے کتابیں لکھی گئیں، اس کے لیے لائبریریاں تیار ہوئیں، اس کے لیے ادارے بنے، اس کے لیے تمام دنیا کے دانشوروں، فلاسفروں اور اسکالروں نے اپنا دماغ نچوڑ کر کے رکھ دیا، یہ سب انسان کی طرح ہوا، اب اسکول جانے کے قابل ہوا، تو انسان کے بچے کی طرح اسکول گیا، وہاں استادوں نے انسان کی طرح انسان پر شفقت کی، اپنی اولاد کی طرح سینہ سے لگایا، اور اچھی سے اچھی باتیں اس کو پڑھائیں، یہ ایجوکیشن منسٹر صاحب بیٹھے ہوئے ہیں، ہر سال کورس کو ترقی دی جاتی ہے، Improve کیا جاتا ہے، نئے نئے تجربے تعلیم میں کیے جاتے ہیں، نئی نئی Theories آتی ہیں، امریکہ سے، یوروپ سے، جو نئے نئے تجربے ہیں، وہ سب آزمائے جاتے ہیں، تا کہ تعلیم ترقی کر کے آسان ہو، یہ سب انسان کی خاطر ہے، اب اس نوجوان نے پڑھا، اس کے بعد وہ کالج سے نکلا، گریجویشن کیا، پھر اور ایم.اے.کیا، اگر وہ ریسرچ کرنا چاہتا ہے، پی.ایچ.ڈی.ہو جانا چاہتا ہے، پوسٹ گریجویٹ کا کورس وہ کر چکا ہے، باہر کی یونیورسٹیوں میں گیا، یہ سب انسان کے پروسیس (Process) ہیں۔

آج ایک غلط نعرہ ہم کو پاگل بنا دینے کے لیے کافی ہے

اس کے بعد میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا ہوتا ہے؟ لہر اُٹھتی ہے پٹنہ سے، مونگیر سے، کشن گنج سے یا ادھر یوپی کے بارڈر سیوان سے، یا اس کے آگے سے، اور یہ سب پڑھے لکھے آدمی نہ صرف یہ کہ پاگل ہو جاتے ہیں، بلکہ جانور بن جاتے ہیں، مجھے بتائیے، یہ میرے لیے ایک پہیلی ہے، جس کو بوجھنا چاہتا ہوں، ایسا کون سا اسکریو (Screw) ڈھیلا ہو جاتا ہے کہ یہ انسان جو اپنے سینہ میں اتنا علم لیے بیٹھا ہے، سمندر کا سمندر پی گیا، کسی کی فلاسفی، کسی کی منطق، کسی کا علم اخلاق، فن سیاست، ادب وحکمت، شاعری وفنون لطیفہ، انسانی نفسیات؛ یہ سب پڑھنے کے بعد مجھے آپ بتائیے کہ - کون سا دھماکہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے اچھا خاصا انسان جانور میں تبدیل ہو جاتا ہے، وہ اچھا خاصا خونخوار بھیڑیا ہو جاتا ہے، انسان اپنے آپے سے نہیں، بلکہ جامے سے باہر ہو جاتا ہے، طالب علم طالب علم کو مارتا ہے، پروفیسر پروفیسروں کی نشاندہی کرتا ہے، کہتا ہے کہ دیکھو میرا ساتھی یہاں چھپا ہوا ہے، جس نے دس برس تک لیباریٹری میں اس کے ساتھ کام کیا ہے، کاندھے سے کاندھا ملا کر لائبریری میں بیٹھا ہے، آج وہ اس کی جاسوسی کرتا ہے، یہ کیا ہو جاتا ہے؟ یہ انسانیت پر کیسی بجلی گرتی ہے؟

جانور بھی اتنی سمجھ رکھتے ہیں کہ ذی شعور ذمہ دار ہے

نیویارک کے پاور ہاؤس پر بجلی گری، میں اس وقت نیویارک کے قریب فلاڈیلفیا میں تھا، میری سمجھ میں آیا، پاور ہاؤس بھی عقل نہیں رکھتا، بجلی بھی عقل نہیں رکھتی، ایک بے عقل بے عقل پر گر گیا، لیکن یہ عقلمند عقلمند پر کیسے گرتا ہے؟ (مسلسل تالیاں) بجلی تو بجلی ہے، کسی کو بے عقل و بے شعور پر غصہ نہیں آتا، نہ کوئی اس کو ملامت کرتا ہے، یہ بات کتا بھی سمجھ سکتا ہے، آپ نے دیکھا ہوگا، کتے کو آپ ڈھیلا ماریے تو کتا ڈھیلے پر، پتھر پر نہیں دوڑتا، وہ آپ پر دوڑے گا، گویا کتے کو بھی یہ سمجھ ہے کہ پتھر کا قصور نہیں، انسان کا قصور ہے، آپ مار کے دیکھ لیجیے، کتے کی دم آپ کے پاؤں کے نیچے آجائے تو آپ بچ نہیں سکتے، لیکن اگر کتے کی دم کسی درخت وغیرہ سے پھنس جائے تو غصہ نہیں آتا، اس کو ذی شعور پر غصہ آتا ہے، اس کے اندر بھی خدا نے یہ شعور پیدا کیا کہ ذی شعور ذمہ دار ہے، ہمارے یہاں گدھے سے زیادہ کوئی بیوقوف جانور نہیں سمجھا جاتا، گدھا بھی یہ بات سمجھتا

ہے، لیکن ہم اور آپ کیوں نہیں سمجھتے؟

انسان انسان پر حملہ کیسے کر سکتا ہے؟

مجھے بتائیے کہ انسان انسان پر کیسے گرتا ہے؟ پہاڑ انسان پر گرے، معاف کر دیا جائے، دریا انسان پر گرے معاف کر دیا جائے، پتھر انسان پر گرے معاف کیا جا سکتا ہے، چھت گر جاتی ہے، معاف کی جا سکتی ہے، مگر انسان کو معاف نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ خدا نے اس کو عقل دی ہے، خدا نے اس کو شعور دیا ہے، خدا نے اس کو دل دیا ہے، خدا نے اس کو ضمیر دیا ہے، اور اس کو انسانو ں کی طرح پالا گیا، لیکن انسان انسان کو انسان نہیں سمجھتا۔

مجھے حیرت ہے، ایک شخص اپنے آفس میں بیٹھا ہوا ہے، اچھا خاصا پڑھا لکھا کوالیفائیڈ (Qualified) آدمی ہے، اور اس کام کے لیے بیٹھا ہے کہ جب کوئی اس سے خدمت لینے آئے، فائل نکلوانے آئے، جب کوئی کام کروانے آئے، یا کوئی آرڈر لے کر آئے، فوراً اس کی تعمیل کرے، وہ بے چارہ وہاں سے چلا، یہ آدمی اپنے ساتھی سے کہتا ہے: ''موٹا شکار ہے''، ''موٹی آسامی ہے''، گویا اس کے نزدیک ایک چوہا آیا، ایک موٹا سا چوہا، بلی جیسے چوہے کو آتا ہوا دیکھے، اس طرح یہ انسان انسان کو دیکھتا ہے، بڑا موٹا شکار ہے، بڑی موٹی آسامی ہے، خوب پیسہ اس سے وصول ہوگا، ارے خدا کے بندے! بے رحم انسان! تجھے تو دو قدم، چار قدم اٹھ کر جانا چاہیے تھا، اس کا Reception کرنا چاہیے تھا، اس کو گلے لگانا چاہیے تھا، کہ میں اسی سیوا کے لیے یہاں بیٹھا ہوں، خدا نے تم کو بھیجا ہے، تو تم خدا کی نعمت ہو میرے لیے، اگر تم یہاں نہ آؤ تو میں بے کار ہوں، میں نے کس لیے بھاڑ جھونکا، میں نے کس لیے آنکھیں پھوڑیں، میں نے اس لیے پڑھا تھا، اس لیے آنکھیں خراب کی تھیں کہ میں تم جیسے آدمیوں کی خدمت کروں، گھنٹہ بھر سے مکھی مار رہا تھا، گھنٹہ بھر سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا، میرا کوئی کام نہیں تھا، تم کو خدا نے بھیجا۔

پھر یہ آنے والا کون ہے؟ اپنی ماں کا لال، جب بیمار ہوا تھا تو اس کی ماں نے رو رو کر رات کاٹی تھی، اور ڈاکٹر کے گھر میں جا جا کر دہائی دی تھی، خدا کے لیے میرے اکلوتے بیٹے کو بچا لیجیے، اس نے روتے ہوئے کہا کہ اے خدا میری جان لے لیجیے اور میرے بچے کو بچا لیجیے، اس کی جان بچ جائے، یہ ایسا لاڈلا تھا، اپنے ماں باپ کی آنکھ کا تارا تھا، اب وہ آیا ہے تمھارے پاس تو گویا ایک چوہا آیا، گویا ایک بلی آئی ہے، ایک موٹا شکار آیا کہ تم اس کا خون چوس لینا چاہتے ہو، اس سے بڑھ کر انسانیت کا زوال کیا ہے؟!!

ایک پہیلی

بھیڑیا بھیڑیے کے یہاں چلا جائے، بھیڑیا اس کو مارتا نہیں ہے، کتا کتے کے پاس چلا جائے تو کتا اس پر حملہ نہیں کرتا، جب تک کہ وہ پاگل نہ ہو، ایک انسان ایک انسان پر کیسے حملہ کرسکتا ہے؟ یہ وہ پہیلی ہے جو آج تک کوئی بجھا نہیں سکا، میں آپ سے اس پہیلی کو بوجھنا چاہتا ہوں کہ یہ دورے کیسے پڑتے ہیں؟ اگر کسی ایک کے دماغ پر پڑ جائے تو پڑ جائے، اس کا سب پڑھا لکھا غارت، جو ماں باپ نے سکھایا سب بھول گیا، جو استادوں نے اسکولوں، کالجوں میں سکھایا وہ بھول گیا، جو کتابوں میں پڑھا تھا، بڑے شوق سے لائبریری میں جا کر مطالعہ کیا تھا، وہ سب بھول گیا، ایک منٹ میں یہ سب صفایا کیسے ہو جاتا ہے؟ اس کی وجہ کیا ہے کہ وہ پڑھا لکھا بن گیا، Educated بن گیا، Cultured ہو گیا، Well-read بھی اور بڑا لبرل (Liberal) بھی، اور بڑا تھنکر (Thinker) بھی، سب کچھ، لیکن آدمی نہ بن سکا؟

اگر تعلیم سب کچھ کرتی ہے مگر آدمی کو آدمی نہیں بناتی

اگر تعلیم سب کچھ کرتی ہے، لیکن آدمی کو آدمی نہیں بناتی، تو پھر یہ دو کوڑی کی، امریکہ کی تعلیم، یورپ کی تعلیم اگر انسان کو مہذب نہیں بنا سکتی، اگر انسانیت کا احترام نہیں پیدا کرا سکتی، اگر اس کے ضمیر کو نہیں جگا سکتی، اگر خدا کا خوف اس کے دل میں نہیں بٹھا سکتی، اگر انسان کی خدمت کا جذبہ اس کے اندر نہیں پیدا کرتی، اس تعلیم سے جہالت اچھی، جب انسان جاہل تھا، انسان کی حفاظت کرتا تھا، انسان کی عزت اور آبرو کے لیے جان دے دیا کرتا تھا، انسان انسان کے لیے پہرہ دیا کرتا تھا، وہ سوتا تھا اور یہ جاگتا تھا، تاکہ اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، وہ دور اچھا تھا اِس دور سے جس میں اتنی تعلیم ہے، گھر گھر تعلیم ہے، گاؤں گاؤں تعلیم ہے، مگر اس کا نتیجہ کیا ہے؟ کوئی دیوانہ، کوئی شریر، کوئی فسادی ایک نعرہ لگا دیتا ہے، خواہ وہ قوم پرستی کا نعرہ ہو، خواہ کمیونزم کا نعرہ ہو، وہ Riot کرا دیتا ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ملک کو کیسے مہذب کیا جائے جہاں دن رات Riot ہوں، تہذیب اور Riot دونوں جمع نہیں ہو سکتے، انسان انسان کا شکاری ہو، انسان انسان کے خون سے اپنی پیاس بجھائے، لعنت ہے ایسے انسان پر، وہ انسان نہیں، اس سے جانور بہتر ہیں، درندے بہتر ہیں۔

انسان اندر سے بنتا ہے باہر سے نہیں بنتا

بات یہ ہے کہ انسان اندر سے بنتا ہے، باہر سے نہیں بنتا، ہم نے اندر کو بھلا دیا، ہم نے اندر

کے انسان کو نہیں جگایا، ہمارے اس انسان کے اندر ایک اور انسان چھپا ہوا ہے، وہ اندر کا انسان ہے، وہ دل والا انسان ہے، وہ ضمیر والا انسان ہے، جب وہ انسان جاگ جاتا ہے، تو کیا ہوتا ہے؟ بڑی بڑی سلطنتیں، شہنشاہیاں (Empires) اس کے ہاتھ میں ہوتے ہیں، لیکن اس کا حال کیا ہوتا ہے؟ وہ قوم کے پیسے کو، ملک کے پیسے کو خدا کی امانت سمجھتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ پوری قوم مالک ہے اور میں اکیلا خادم ہوں، غلام ہوں۔

انسانیت کے بیش بہا نمونے

دو واقعے آپ کو سناتا ہوں، اور معافی چاہتا ہوں پروفیسر صاحب سے کہ میں ہسٹری کا طالب علم ہوں، اور میری پہنچ وہیں تک ہے، خلیفۂ اول کا ایک واقعہ سناتا ہوں، حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) جب خلیفہ ہوئے، یعنی جب مسلمانوں نے ان کو اپنے رسول ﷺ کی جگہ پر منتظم و رہنما مان لیا، اس وقت مسلمانوں کی فوجیں ایک طرف Roman Empire کی طرف بڑھ رہی تھیں، تاکہ وہاں بھی ظلم کو دور کریں اور انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکالیں، دوسری طرف Persian Empire کی طرف بڑھ رہی تھیں، اس وقت کتنا بڑا خزانہ ہوگا مسلمانوں کا، حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ان کی بیوی نے کہا: آپ جب سے خلیفہ ہوئے ہیں، مسلمانوں کو جو کچھ فائدہ ہوا ہو، ہم اس سے انکار نہیں کرتے، لیکن ہمارا بڑا نقصان ہوگیا، انھوں نے فرمایا: کیا نقصان؟ بیوی نے کہ آپ نے جو پیسے مقرر کرائے ہیں اور جو آپ کو مسلمانوں کے بیت المال (Treasury) سے ملتے ہیں، اس میں بس اتنا ہی ہوتا ہے کہ ہمارا اور بچوں کا پیٹ بھر جائے، کتنے دن ہوگئے آپ کو خلیفہ بنے ہوئے، ہم ابھی تک کوئی میٹھی چیز نہیں کھا سکے، ہمارے منھ کا مزہ خراب ہے، ہم کیا کریں، اس سے تو ہم اسی وقت مزے میں تھے جب آپ کپڑوں کی تجارت کرتے تھے، جب ہی ہم بھلے تھے، اب اس کے بعد آپ خلیفہ ہوئے، نام تو بہت اونچا لیکن ہمارا کوئی فائدہ نہیں۔

انھوں نے کہا: بی بی! میں کیا کروں، مسلمانوں کا مال اس لیے تو نہیں ہے کہ ابوبکر کے گھر والے اپنا منھ میٹھا کریں، مسلمانوں کے فنڈ میں اتنی گنجائش نہیں، بیوی نے کہا کہ اسی میں سے ہم کچھ بچالیں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟ کہا: اس پر کیا اعتراض؟ یہ تمہاری سلیقہ مندی کی بات ہے، دس دن، پندرہ دن، بیس دن اس بے چاری نے پیسے کاٹے، اس میں سے دو دو پیسے ایک ایک آنہ کم کیا، اور اس کے بعد بارہ آنے ایک روپیہ کچھ لاکر ان کو دیا اور کہا کہ لیجیے جو آپ دیتے تھے اسی

سے کاٹ کاٹ کر یہ رقم میں نے جمع کی، اسی سے اتنا گھی، اتنی شکر، اتنی سوجی منگوا دیجیے، آپ جانتے ہیں کہ انھوں نے کیا کیا؟ رقم مسلمانوں کے Treasury Officer یا بیت المال کے منتظم کو جا کر دے دی، اور کہا کہ یہ بارہ آنے پیسے بچے ہیں، ان کو مسلمانوں کے بیت المال میں داخل کر لیجیے، اور تجربہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ اتنے پیسے کم دیے جائیں جب بھی گزارہ ہو جائے گا، یعنی آپ دس آنے دیا کرتے تھے، تو اب آٹھ آنے دیا کیجیے، اس لیے کہ ہماری بیوی نے یہ ثابت کر دیا کہ اتنے پیسے کم دیے جائیں جب بھی گزارہ ہو جائے گا، کوئی مرے گا نہیں، گھر میں فاقہ نہیں ہوگا۔

بیوی نے کہا: واہ واہ! ہم نمازیں معاف کرانے گئے تھے، روزے گلے پڑ گئے، یعنی اس سے تو ہم پہلے ہی اچھے تھے کہ بارہ آنے روزانہ میں گزر ہوتا تھا، اب دو آنہ پیسہ کم کر کے ہم کو ملا کرے گا، انھوں نے کہ "مسلمانوں کا فنڈ اس لیے نہیں کہ اللے تللے مٹھائیاں بنیں اور حلوا پکے۔"

ایک واقعہ اور سناتا ہوں، یہ واقعات وہ ہیں جو ہماری آپ کی ملکیت ہیں، یہ کسی خاص کمیونٹی کی ملکیت نہیں، ان پر ہم کو آپ کو سب کو فخر کرنے کا حق ہے، اس لیے کہ یہ انسانوں کے واقعات ہیں، ہم بھی انسان ہیں، اور وہ بھی انسان تھے، ہمارا سر اونچا ہونا چاہیے کہ ہماری نسل میں، ہماری Race میں، Mankind میں ایسے لوگ ہوئے ہیں، جب پہلی کانگریس گورنمنٹ قائم ہوئی تھی، تو گاندھی جی نے کہا تھا: ہمارے منسٹروں کو وہ زندگی اختیار کرنی چاہیے جو حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ نے گزاری تھی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں اسلامک امپائر اتنا بڑھ گیا تھا کہ شام (Syria)، مصر (Egypt) اور عراق، اسپین تک پہنچ گیا تھا، اور شمالی افریقہ سارا فتح ہو گیا تھا، اس وقت کا ایک واقعہ سناتا ہوں، ایک دن رات کو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کام کر رہے تھے، اور آپ کی حکومت (State) کی شمع جل رہی تھی، بجلی اس زمانہ میں نہیں تھی، مشعل اور شمع جلتی تھی، اس کو سامنے رکھے ہوئے کاغذات، فائل دیکھ رہے تھے، دستخط کر رہے تھے کہ اتنے میں ان کے ایک دوست آئے، انھوں نے کہا کہ لو خوب آئے، آؤ بھئی! کہاں سے آئے، وہ جہاں سے آئے تھے، اس ملک کا نام لیا گیا، کہو بھئی، وہاں سب لوگ خوش ہیں؟ سب کو کھانے کو ملتا ہے؟ انھوں نے کہا: امیر المؤمنین! سب نے سلام کہا ہے اور سب خوش ہیں، سب بڑے مطمئن ہیں، کوئی کسی پر زیادتی نہیں کرتا۔ اس کے بعد آنے والے نے پوچھا: امیر المؤمنین! کہیے آپ کے گھر میں بھی خیریت ہے؟ آپ کے فلاں بچے کہاں ہیں؟ آپ کی فلاں لڑکی کہاں ہے؟ بچے کیا پڑھ رہے ہیں؟ یہ پوچھنا تھا کہ انھوں

نے پھونک مار کر شمع بجھا دی، انھوں نے کہا: خیریت؟ کیا بات؟ کیا بات؟ انھوں نے کہا: ابھی تک تو ہم پبلک انٹرسٹ (Public Interest) کی بات کر رہے تھے، اب تم نے ہماری گھریلو (Domestic)، ہماری پرائیویٹ باتیں پوچھنی شروع کیں، اس کام کے لیے یہ شمع نہیں ہے، میں اس کا پیسہ اس میں نہیں خرچ کرنا چاہتا، نوکر سے کہا: ہمارے گھر کا چراغ لاؤ، وہ لایا، کہا: اب بات کرو، وہ تو میں نے سرکاری کام کے لیے جلائی تھی، فائلیں دیکھ رہا تھا اور تم آ گئے، میں نے تمھارے ملک کی جہاں سے تم آئے ہو، خیریت دریافت کی جو سرکاری کام ہے، اب تم قصہ لے بیٹھے میرے گھر کا، ان قصوں کے لیے میں مسلمانوں کا پیسہ ان کے نیشنل فنڈ میں سے خرچ کرنا صحیح نہیں سمجھتا۔

آج دنیا میں ہے کوئی مثال اس کی؟ امریکہ کے President بھی ہیں، اور روس کے President بھی ہیں، اور بڑے بڑے ملکوں کے، عرب ملکوں کے President اور بادشاہ بھی ہیں، میں صاف کہتا ہوں کوئی اس معیار پر پورا نہیں اترتا، نہ سعودی عرب کا، نہ مصر کا، نہ عراق کا، یہ سب مسلم Majority کے ملک ہیں، لیکن کسی کو اس احتیاط کی ہوا بھی نہیں لگی، اس لیے کہ جو تربیت خدا کے پیغمبر، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابیوں کو دی تھی، وہ ان کو ہرگز میسر نہیں آئی، میں جانتا ہوں، میں ان سے ملتا ہوں، میں ان کا احترام بھی کرتا ہوں، اور میں وہاں آرام سے رہتا ہوں لیکن میں صاف صاف بات کروں گا۔

ہم نے جو کچھ کھویا ہے اندر کھویا ہے

اب آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں، آپ اس ملک کی خبر لیجیے، انسان کو انسان بنائیے، اپنے لال، اپنے جگر کے ٹکڑوں کو انسان بنائیے، ہم نے جو کچھ کھویا ہے اندر کھویا ہے، اور ہم تلاش کر رہے ہیں باہر، اس پر مجھے ایک کہانی یاد آ گئی، جو میں نے بچپن میں سنی تھی، کہ کوئی صاحب گھر کے باہر کچھ ڈھونڈھ رہے تھے، کوئی بڑے میاں تھے، قاعدہ ہے کہ ایسے موقع پر چلتے ہوئے راہ گیر رک جاتے ہیں کہ آپ کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟ کیا گرا ہے؟ انھوں نے کہا کہ ایک روپیہ گر گیا ہے، میں ڈھونڈھ رہا ہوں، یہ راہ گیر بھی ڈھونڈھنے میں لگ گئے، مگر وہ روپیہ مل نہیں رہا ہے، روشنی ہے اور مل نہیں رہا ہے، انھوں نے کہا کہ یہ تو بتائیے کہ کہاں گرا تھا؟ ہم خاص طور پر اسی جگہ تلاش کریں۔ انھوں نے کہا: بھائی! سچی بات تو یہ ہے کہ وہ گھر میں گرا تھا، گھر میں اندھیرا ہے، یہاں روشنی ہے، اس لیے

یہاں ڈھونڈ ھنے آیا ہوں، لائٹ نہیں کہ اندر ڈھونڈھوں۔ آج ہمارا آپ کا سب کا حال یہ ہے، چیز کھوئی کہیں اور ہے، ڈھونڈ ھ رہے ہیں کہیں۔!!

چیز جہاں کھوتی ہے وہیں ملتی ہے

چیز کھوئی ہے دل میں، اور ڈھونڈ ھ رہے ہیں کالجوں میں، لائبریریوں میں، امریکہ، یورپ میں، Political Parties میں، Parliament میں، Assemblies میں، اور خدا کا قانون یہ ہے، خدا کا قانون بدلا نہیں کرتا، کہ جو چیز جہاں کھوئی تھی وہیں ملے گی، یہ خدا کا قانون ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، کہ جو چیز جہاں کھوئی وہیں اس کو تلاش کرو، اگر اندھیرے ہی میں گری ہے تو روشنی وہاں لے جاؤ، یہ ہوسکتا ہے، لیکن اندھیرے میں گری ہے اس لیے وہاں نہیں تلاش کرتے ہو، روشنی میں تلاش کرنے آئے ہو کبھی نہیں ملے گی۔ (پر جوش تالیاں) تو بھائی وہ سیدھے سادے کوئی بزرگ تھے، بڑے میاں تھے، لیکن آج تو بڑے اسکالر، فلاسفر یہی کر رہے ہیں، چیز کھوئی ہے ہمارے دل میں، ہمارے ہِردے میں، ہمارے ہارٹ (Heart) میں، ہمارے Conscience میں، اور ہم اس کو تلاش کر رہے ہیں سیاست میں، ہم اس کو تلاش کر رہے ہیں لیڈر شپ میں اور مطالعے کی جگہوں پر۔

انسانیت مری نہیں سوئی ہوئی ہے

بس بھائی، وہ چیز کھوئی ہے، ختم نہیں ہوئی ہے، کھوئی ہوئی چیز مل جاتی ہے، مری ہوئی چیز زندہ نہیں ہوتی، میں انسانیت کو سویا ہوا سمجھتا ہوں، مرا ہوا نہیں سمجھتا، انسانیت سو بار سوئی، سو بار جگائی گئی، خدا کے پیغمبر آئے، بڑے بڑے علم رکھنے والے، بڑے بڑے وِدوان، خدا سے ڈرنے والے آئے، انھوں نے انسانیت کو جگایا، جاگ گئی، اگر مر گئی ہوتی تو کبھی زندہ نہ ہوتی۔

آج بھی انسانیت مری نہیں ہے، سوئی ہوئی ہے، آیئے ہم آپ سب مل کر سوئی ہوئی انسانیت کو جگائیں، پہلے اپنے اندر جگائیں، اس کے بعد باہر جگائیں، ہم اگر جاگے ہوئے نہیں ہیں، تو دوسروں کو بھی جگا نہیں سکتے، سویا ہوا سوئے ہوئے کو نہیں جگا سکتا، ایک جاگتا ہوا سینکڑوں سوئے ہوؤں کو جگا دیتا ہے، لیکن سو سوئے ہوئے ایک سوئے ہوئے کو بھی جگا نہیں سکتے، اگر ہم سب سو گئے ہیں، تو ہم سوتے رہیں گے، ہم ایک دوسرے کو جگا نہیں سکتے، ہم میں ایک آدمی بھی جاگ اٹھے تو ہزاروں، لاکھوں سوئے ہوؤں کو جگا دے گا۔

سب نارمل حالات میں ہوا ہے

اسی امید پر ہم لوگ پھر رہے ہیں، ہم اس ملک کو برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتے، ہمیں یہاں رہنا بھی ہے، سفر بھی کرنا ہے، پڑھنا لکھنا بھی ہے، اس ملک میں آپ جیسے مصنف اور مؤرخ بھی ہیں، اسکالر بھی ہیں، یہ جو کچھ رونق ہے، یہ سب امن وامان کی ہے، نارمل حالات کی ہے، نارمل حالات نہ ہوں، بارش کا زمانہ ہوتا، بجلی چمک رہی ہوتی، اور ذرا سا پانی برسنے لگتا، یا ایک کڑاکا ہوتا تو سارا مجمع منتشر ہو جاتا، اگر یہاں اس مجمع میں سانپ آجائے یا کوئی چھچھوندر ہی آجائے تو ابھی آپ سب تتر بتر ہونے لگیں گے، یہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں، یہ سب Normalcy کا نتیجہ ہے، نارمل حالات اگر ملک میں ہوں گے، تو آپ اس ملک کو جتنا اونچا کیجیے، جتنا بڑھایئے، علم وفن کی جتنی تحقیقات کیجیے، آپ اس کو ٹکنالوجی میں اور سائنس میں امریکہ بنا دیجیے، اس سے بھی آگے بڑھا دیجیے، لیکن سب نارمل حالات میں ہوا ہے، وہاں بھی نارمل حالات میں ہوا ہے، یہاں بھی نارمل حالات میں ہوگا، بس ہم اس کے لیے پھر رہے ہیں، ابھی ہم اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرتے ہیں، ہم اس کو تلاش کر رہے ہیں Parties میں، ہم اس کو تلاش کر رہے ہیں لائبریریوں میں، لیکن ہم اکیلے نہیں ہیں۔

مایوس ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں

جب اتنا بڑا مجمع سیوان جیسے شہر میں ایک ذرا سی آواز پر جمع ہو سکتا ہے، تو اس ملک سے مایوس ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، یہ ملک جاگتا ہے اور دوسرے ملکوں کو انشاء اللہ جگائے گا، مگر ضرورت تھوڑی سی محنت کرنے کی ہے، ہمارے لیڈروں نے Country Building کا کام تو کیا، لیکن Nation Building کا کام نہیں کیا، گاندھی جی کرنا چاہتے تھے، ان کو پورا موقع نہیں ملا، اور ان کے بعد جن لوگوں نے اس کام کا ارادہ کیا وہ سیاسیات میں پھنس کر رہ گئے، میں ان کی نیت پر حملہ نہیں کرتا، لیکن یہ کام رہ گیا، اب یہ کام ہمارے آپ کے جیسے آدمیوں کا ہے، سارے ملک میں آواز لگایئے، سارے ملک میں ایک مہم چلایئے، کہ اے آدمیو! اے انسانو! انسان بنو، ایک دوسرے کا احترام کرنا سیکھو، اور دیکھو لہریں اٹھیں گی، اور دیکھو لوگ تمھیں پاگل بنانا چاہیں گے، لوگ تم سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہیں گے، لوگ تمھیں Exploit کریں گے، لیکن تم ایکسپلائٹ نہ ہونا، آپ یہ کو بتانے کی ضرورت ہے کہ اب فسادات کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہونا

چاہیے، یہ بداخلاقی ہمیشہ کے لیے بند ہونی چاہیے، انسان انسان کو خدا کی نعمت سمجھے، اپنا بھائی سمجھے، سمجھے کہ اس کے بغیر تو زندگی کا لطف ہی نہیں، اگر یہ فن ہم سیکھ لیں گے تو گویا ہم نے سب کچھ سیکھ لیا۔ (۱)

(۱) ماخوذ از پندرہ روزہ ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۱۰/نومبر ۱۹۷۸ء)، یہ تقریر علاحدہ رسالہ کی شکل میں بھی شائع ہوئی۔

۸

دوراستے (۱)

بہت بڑا امتحان

بزرگو اور دوستو! سچی بات یہ ہے کہ کوئی سچی بات اچھی طرح کہہ دی جائے، پھر کوئی مشاعرہ نہیں کہ اس کے بعد غزل ضرور پڑھی جائے، محنت سے غزل لکھی ہے، ایک شاعر دور سے آئے ہیں فیس بھی ملے گی، اگر غزل نہیں پڑھیں گے تو فیس نہیں ملے گی، اس لیے کوئی اچھی سے اچھی کسی بڑے استاد کی غزل بھی ہو تو اس کے بعد غزل پڑھنا ضروری ہے۔

میرے دل میں کئی بار یہ بات آئی کہ میں چپکے سے یہاں سے چلا جاؤں اور اس کی بھی ایک نظیر قائم کردوں، ایک مثال قائم کردوں کہ ہم میں جو خدا کا بندہ بھی کوئی بات اچھے طریقے سے کہہ دے، اور وہ بات دل میں اتر جائے، اور اطمینان ہو جائے کہ جو ڈوز (Dose) دینا چاہیے تھا وہ ڈوز (Dose) دے دیا گیا تو پھر اس کے بعد ضرورت نہیں کہ تقریروں کا سلسلہ ضرور جاری رہے ـلیکن میرا نام اتنا لیا گیا شروع سے، اور مجھے ایک طرح کی شکایت ہے اپنے قابل احترام دوست مولانا باقر حسین صاحب سے کہ وہ جب تک تقریر کرتے رہے مجھ پر ایک رنگ آتا تھا، ایک رنگ جاتا تھا۔

سچی بات یہ ہے کہ انسان ہزار بے حیا ہو جائے، لیکن جب وہ اپنی تعریف مبالغہ کے ساتھ سنتا ہے تو آخر کچھ تو اس کو شرم آنی چاہیے۔ میرے لیے بڑی مشکل یہ تھی کہ میں ان کے گھر ٹھہرا ہوں، مدرسہ میں آیا ہوں تو میں ان کو کیسے روک دیتا، میں چاہتا تھا کہ کوئی ایسا اشارہ ان کو مل جائے جس سے وہ میرے لیے اتنا بڑا امتحان پیدا نہ کریں۔ انھوں نے (میں ان کے خلوص پر شبہ نہیں کرتا) میرے متعلق اتنا کہا، اتنا کہا کہ میرے لیے جلسہ سے اٹھ کر چلا جانا مشکل ہو گیا، ورنہ

(۱) مراد آباد میں ۲؍دسمبر ۱۹۷۸ء کو منعقد پیام انسانیت کے ایک جلسہ میں کی گئی تقریر۔

سچی بات یہ ہے کہ میرے لیے اتنی دیر تک اپنی ذات کے متعلق سننا بہت بڑا امتحان تھا، اور سب کے لیے ہونا چاہیے۔

میں یہ تصوف کے سلسلہ کی کوئی بات نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ انسانیت کی بات کہہ رہا ہوں۔ فارسی کی مثل ہے ''ایاز قدر خود را بشناس'' (ایاز اپنی قدر و قیمت خود پہچان لو) ہر آدمی اپنی زندگی سے، اپنی خامیوں سے واقف ہے، دوسرا واقف ہو نہ ہو، لیکن وہ تو جانتا ہے۔ اس لیے میرے لیے ایک بڑا امتحان یہ تھا کہ میرے متعلق اتنی لمبی چوڑی بات کہی گئی، لیکن اس سے میں نے یہ فائدہ اٹھایا کہ آئندہ ہمارے ''پیام انسانیت'' کے جلسوں میں یہ سلسلہ یا تو بالکل ختم کرا دیا جائے گا، میں اس کی اجازت نہیں دوں گا، یا بقدر ضرورت بتا دیا جائے۔

کھلا ہوا چمن

آپ حضرات بہت سے باغوں میں گئے ہوں گے، پہلے شہروں میں کمپنی باغوں کا رواج تھا، اور یوں بھی لوگوں کے یہاں اپنے ذاتی باغ بھی ہوتے تھے، آپ نے چمن کھلا ہوا دیکھا ہوگا، آپ خوش ہوئے ہوں گے، کیونکہ پیدا کرنے والے اللہ تعالیٰ نے سب کو خوبصورتی سے فائدہ اٹھانے کا ایک مادہ دیا ہے، لیکن جب میں اس چمن کو دیکھتا ہوں جو اس وقت میرے سامنے کھلا ہوا ہے، میں آپ کے کپڑوں کی ورائٹی کو نہیں کہہ رہا ہوں، یہ تو بہت معمولی درجہ کی بات ہے، لیکن جن جن طبقوں سے آپ کا تعلق ہے، جن جن مذاہب اور مکاتب خیال سے آپ کا تعلق ہے، ان کو جب میں دیکھتا ہوں کہ ایک بہار ہے، میرے سامنے پھولوں کا ایک گلدستہ ہے جس میں ہر رنگ کے پھول ہیں، تو میرا دل باغ باغ ہوتا ہے، اور مجھے اس باغ کا کھلنا اور اتنے پھولوں کا ایک ساتھ ہونا یہ بھی بھاتا ہے، خوش کرتا ہے، اور ان پھولوں کے رنگ کا جو اختلاف ہے یہ بھی مجھے خوش کر رہا ہے، میں اس کو بھی باغ کی ایک بہت بڑی خوبی سمجھتا ہوں کہ پھول بھی ہوں اور پھول مختلف رنگ اور خوشبوؤں کے ہوں۔ ذوقؔ نے کہا تھا ؎

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوقؔ اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے

میں اپنے سامنے انسانی باغ کھلا ہوا دیکھتا ہوں، یہ چمن اپنے سامنے دیکھتا ہوں تو میرا دل باغ باغ ہو جاتا ہے اور میں اس ملک کے متعلق مایوس نہیں ہوتا اور مجھے بڑی طاقت حاصل ہوتی ہے۔ اگر

آپ ایک آواز پر، ایک ایسے آدمی کے نام پر جس سے آپ واقف نہیں، آپ کے شہر کا نہیں، اس کا کوئی تجربہ نہیں، محض بھروسہ پر اور ایک انسان کے اندر دوسرے انسان کے ساتھ اچھا خیال قائم کرنے کی جو طاقت ہے اس کی بنا پر آپ سرد موسم میں آجاتے ہیں، اگر اس ملک میں اتنی بات بھی ہے تو اس ملک سے مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ بات بھی جس دن ختم ہوجائے کہ بلانے پر بھی آپ نہ آئیں جب تک کہ اس کے ساتھ کوئی مادی یا سیاسی فائدہ نہ ہو، اگر ملک کی یہ حالت ہوگئی (خدانہ کرے، ہماری زندگی میں تو نہ ہو) تو پھر اس ملک سے مایوسی ہے۔ لیکن جب تک یہ بات نہیں ہے، اور اتنے بھائی، اتنے بڑے بھائی، اتنے مصروف بھائی، اتنے سمجھدار بھائی ایک آواز پر جمع ہوجائیں، عربی مدرسہ میں (یہاں ہمارے غیر مسلم بھائی اور دوست بھی ہیں) محض اس خیال سے کہ کوئی اچھی بات کہی جائے گی، ہمارے ایک مہمان آئے ہیں ان کی بات سنی جائے گی، اس وقت تک اس ملک کے مستقبل کو تاریک نہیں کہا جاسکتا۔ یہ بات حوصلہ پیدا کرتی ہے اور اطمینان دلاتی ہے۔

اس دنیا میں دو راستے ہیں

میرے بھائیو! بات بہت ہوچکی اور رات بہت ہوچکی، اور آپ بہت دیر سے بیٹھے ہوئے ہیں، آپ کے سامنے مختصر طور پر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس دنیا میں دو راستے ہیں: ایک راستہ ہے محبت کا، خلوص کا، اعتماد کا، بے غرضی کا، اور ایک راستہ ہے نفرت کا، انتقام کا، بدگمانی اور خودغرضی کا۔ یہ دونوں راستے کوئی نئے نہیں ہیں۔ لاکھوں برس سے یہ دنیا قائم ہے، یہ دونوں راستے آزمائے جارہے ہیں۔ ان دونوں راستوں کے Records، ان دونوں راستوں پر چلنے کے نتیجے بھی ہمارے سامنے ہیں، تاریخ ان کا بہترین ریکارڈ ہے، لیکن افسوس ہے کہ دوسرے راستے کا ریکارڈ اتنا محفوظ نہیں ہے۔

ہماری تاریخیں بادشاہوں کی تاریخیں ہیں، طاقتوروں اور حکمرانوں کی تاریخیں ہیں، ان لوگوں کی تاریخیں ہیں جو آندھی پانی کی طرح اٹھے اور پوری دنیا میں پھیل گئے، یہاں سے وہاں کبڈی کھیلتے ہوئے گئے، کھیتوں کو جلاتے ہوئے، شہروں کو بے چراغ بناتے ہوئے، اور دکانوں اور تمدنوں کے ملبے بناتے ہوئے، وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ گزر گئے۔ ان کی تاریخ آج دنیا میں بہت محفوظ ہے۔ آپ کسی بادشاہ کے حالات تلاش کریں تو مل جائیں گے، اور ایسی تفصیل سے ملیں گے کہ ان کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، سب ملے گا: لیکن اہل درد کی باتیں، اہل محبت کی باتیں، خلوص والوں کی باتیں بہت کم محفوظ کی گئی ہیں، ان کا ریکارڈ بہت تھوڑا ہے، لیکن ہے، ایسا نہیں ہے کہ بالکل ناپید ہو۔

اب آپ دونوں راستوں کو دیکھ لیجیے، دوسرے راستے پر چلنے والوں کو اس کے نتیجے میں کیا ملا؟ اس کے نتیجے میں ان کو نفاق ملا، سازشیں ملیں، گالیاں ملیں، ایک غیر مختتم لڑائی ملی۔ یہ اس کی تاک میں جس کا بس چلے، جس کی بازی لگ جائے، بادشاہوں کا یہ حال تھا، ان سے بڑھ کر طاقت کس کے پاس تھی؟ تلوار کی طاقت ان کے پاس، فوج کی طاقت ان کے پاس، دولت کی طاقت ان کے پاس، عہدوں کی طاقت ان کے پاس، لیکن رات کو میٹھی نیند نہیں سو سکتے تھے۔ آپ یقین مانیے کہ شاید ہی کوئی خدا کا بندہ ایسا رہا ہو جو لمبی تان کر میٹھی نیند سوتا ہو، پاؤں پھیلا کر، بےفکر ہو کر۔ گھر والوں سے وہ ڈرتا تھا، اپنے بچوں سے وہ ڈرتا تھا، اپنے عزیزوں سے وہ ڈرتا تھا، اپنے وزیروں سے وہ ڈرتا تھا، اپنے عہدہ داروں سے وہ ڈرتا تھا، غریبوں سے وہ ڈرتا تھا، امیروں سے وہ ڈرتا تھا، ہر ایک کو بدگمانی سے دیکھنا، ہر ایک کو شک کے ساتھ دیکھنا، یہ کیا مصیبت ہے؟ آپ مجھے شک کے ساتھ دیکھیں، میں آپ کو شک کے ساتھ دیکھوں، لعنت ہے ایسی زندگی پر، زندگی کا مزہ کیا؟ باپ کو بیٹے پر بھروسا نہ ہو، بیٹے کو باپ پر بھروسا نہ ہو۔

زندگی کیا اسی کا نام ہے؟

میں ملکوں کا نام نہیں لیتا، اس لیے کہ میں سیاسی آدمی نہیں ہوں؛ لیکن دنیا کے کئی ملک ایسے ہیں جہاں کسی کو کسی پر بھروسہ نہیں، اور یہ کہتے ہیں ''دیوار ہم گوش دارد'' فارسی کی پرانی مثل تھی؛ لیکن کبھی اس کی ایسی تصویر سامنے نہیں آئی جیسی آج سامنے آئی ہے۔ بھائی بھائی سے دل کی بات نہیں کہہ سکتا۔ آدمی بات کرتا ہے تو چاروں طرف دیکھتا ہے کہ کوئی سن تو نہیں رہا ہے؟ بچے تو نہیں سن رہے ہیں؟ اور پھر اس کے بعد بھی اس کی بات سن لی جاتی ہے، لوگ گھڑیاں لگائے ہیں وہ ریکارڈ کرتی ہیں۔

آپ دیکھیے حکومتوں میں جو انقلاب آتے ہیں اور اب بھی آ رہے ہیں، آج بھی کتنے ملکوں میں رات کو سوئے تو کچھ حالت تھی اور صبح اٹھے تو کچھ نہیں، معلوم ہوا کہ تختہ الٹ گیا، فلاں جمہوریت کا تختہ الٹ گیا، فلاں حکومت کا تختہ الٹ گیا، فلاں پارٹی کا تختہ الٹ گیا، الیکشن کے راستے سے بھی یہی ہو رہا ہے، ایک پارٹی دوسری پارٹی کو برداشت نہیں کر سکتی اور ایک آدمی دوسرے کو برداشت نہیں کر سکتا۔

دنیا کیمپوں میں بٹی ہوئی، پہلوان اکھاڑے میں اترے ہوئے، بھائی زندگی کیا اسی پہلوانی کا نام ہے؟ کشتی لڑنے کا نام ہے؟ پوری زندگی اسی کشتی میں گزرے گی؟

ابھی ایک سال چند مہینے ہوئے کہ میں امریکہ کے سفر پر تھا، واشنگٹن میں میرا ایک پروگرام رکھا گیا وہاں کے اسلامک سنٹر میں۔ سچی بات یہ ہے کہ میرے دل میں ایک بخار تھا جیسا کہ دل میں بخار ہوتا ہے کہ خدا وہاں پہنچائے جہاں میں اپنے دل کی بات کہہ سکوں، اور جو اونچے سے اونچا ایوان ہے وہاں تک میری بات پہنچ سکے، میں جانتا تھا کہ صدر امریکہ میری بات نہیں سن رہے ہیں، ان کو کہاں فرصت؟ میری یہ حیثیت کہاں؟ مجھے تو اپنے دل کا بخار نکالنا تھا، وہ تقریر ریکارڈ ہے، انگریزی میں آگئی ہے اور اردو میں بھی آگئی ہے۔

خلوص سے خالی، خود غرضی پر مبنی

میں نے وہاں کہا: میں وہائٹ ہاؤس (White House) کی دیوار کے نیچے بیٹھ کر اس وقت کہہ رہا ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ خدا نے مجھے یہاں تک پہنچایا، میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ یہ کہوں (کوئی سنے یا نہ سنے) کہ امریکہ جو دنیا کے کتنے ملکوں کو کھلاتا ہے، پیٹ بھرتا ہے، اسلحہ الگ دیتا ہے، دشمن سے الگ حفاظت کرتا ہے، اس کا کوئی حقیقی دوست نہیں، اس لیے کہ اس کے اندر خلوص نہیں، جو کچھ کرتا ہے خدا کے لیے نہیں کرتا ہے، وہ اس لیے نہیں کرتا کہ مظلوموں کا ساتھ دے، اس لیے نہیں کرتا کہ ظالم کا ہاتھ پکڑے، اس لیے نہیں کرتا کہ اس کا اخلاقی فرض ہے، اس لیے نہیں کرتا کہ اس کا کچھ ثواب ملے گا، وہ اس لیے نہیں کرتا کہ شریعت کا تقاضا ہے، مردانگی کا تقاضا ہے، طاقت کا یہ ٹیکس ہے؛ بلکہ وہ اس لیے کرتا ہے، اس لیے کھلاتا ہے، اس لیے روپے پیسے کی ریل پیل کرتا ہے تاکہ اقوام متحدہ میں وہ قومیں اس کو ووٹ دیں، اس کا ساتھ دیں، اس کے حریف روس کے حملے سے اس کو بچائیں، دنیا میں اس کی جو بالادستی ہے وہ قائم رہے۔ میں نے کہا: کان کھول کر امریکہ سن لے کہ اس کا کوئی جگری دوست نہیں، کوئی اس کا مخلص دوست نہیں، کسی دل میں اس کے لیے مخلصانہ جذبہ یعنی سچی محبت نہیں، وہ عرب ہوں یا عرب کے باہر کی دنیا ہو، وہ مشرق وسطی کے ممالک ہوں یا مشرق بعید کے ممالک ہوں، یہ سب دھوکہ دیتے ہیں، سب آپ سے لیتے ہیں، مجلسوں میں ان کی باتیں سنیے، سو باتیں امریکہ کو سناتے ہیں۔ میں نے کہا: یہ کس کا نتیجہ ہے؟ یہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ خلوص سے خالی ہے اور خود غرضی پر مبنی ہے۔

خود غرضی کی بھی قسمیں ہیں

خود غرضی کی قسمیں ہیں، ایک معمولی بے پڑھے لکھے جاہل آدمی کی خود غرضی ہے، جس

حیثیت کا وہ ہے ایسی اس کی خودغرضی ہے؛ لیکن ایک سیاسی لیڈر کی خودغرضی ہے، ایک سیاسی پارٹی کی خودغرضی ہے، ایک جمہوریت کی خودغرضی ہے، ایک دنیا کی بڑی طاقت کی خودغرضی ہے، وہ اس کی سطح کی ہوگی؛ لیکن خودغرضی خودغرضی میں کوئی فرق نہیں، وہ بھی خودغرضی یہ بھی خودغرضی۔

خلوص کی جنتری چل رہی ہے

حضرت عیسی علیہ السلام نے دو ہزار برس پہلے خلوص کے ساتھ جو انسانوں کے ساتھ ہمدردی کی تھی، آج انھیں کی جنتری چل رہی ہے، آج انھیں کا نام لیا جارہا ہے۔ خدا کے پیغمبروں نے حضرت آدم سے علیہ السلام لے کر نوح علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک، انھوں نے بے غرض دنیا کی خدمت کی، انھوں نے دنیا کو محبت کا پیام دیا، انھوں نے دنیا کو دیا، اور لیا کچھ نہیں، اس کا نتیجہ ہے کہ سیکڑوں ہزاروں سال گزر جانے کے بعد بھی ان کا نام زندہ ہے، ان کا کام زندہ ہے، لوگوں کے دل میں ان کی محبت ہے، خواہ کوئی ان کے پورے راستے پر نہ چلے؛ لیکن عظمت کے ساتھ، عزت کے ساتھ ان کا نام لیتا ہے، اس لیے کہ ان کا کام بالکل بے غرض تھا۔

تو ایک راستہ تو ہے بادشاہوں کا، سیاست دانوں کا، حکمرانوں کا، طاقت رکھنے والوں کا اور خودغرض لیڈروں کا۔

اور دوسرا راستہ محبت، پریم، معاف کردینے کا راستہ، بےغرضی اور خلوص کا راستہ، آپ دیکھ رہے ہیں کہ سورج کی طرح وہ چمک رہے ہیں اور اس میں کوئی فرق نہیں ہے زمانہ کے انقلاب کا، زمانہ کتنا بدل گیا، کتنا آگے بڑھ گیا؛ لیکن ابھی تک اسی طرح سے ان کا ستارۂ اقبال بلند ہے، اور ان کی عزت، شہرت، مقبولیت کا سورج اسی طرح سے درخشاں ہے۔ ایک راستہ تو یہ ہے کہ برائی کا جواب برائی سے دیجیے، نفرت کا جواب نفرت سے دیجیے، اور ایک راستہ یہ ہے کہ نفرت کا جواب بھی آپ محبت سے دیجیے۔ پہلا راستہ سیاسی لوگوں کا اور مادہ پرستوں کا ہے، پہلا راستہ طاقت پر ایمان وعقیدہ رکھنے والوں کا ہے، اور دوسرا راستہ خدا کے پیغمبروں اور ان کے جانشینوں کا ہے۔

جو دشمنی کرے اس سے دوستی کر

اس ہمارے ہندوستان کے ایک بڑے بزرگ صوفی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا فقرہ میں نے ایک کتاب میں پڑھا، انھوں نے کہا کہ لوگوں کا کہنا ہے: "سیدھے کے ساتھ سیدھا اور

ٹیڑھے کے ساتھ ٹیڑھا''، لیکن میں کہتا ہوں کہ ''سیدھے کے ساتھ سیدھا اور ٹیڑھے کے ساتھ بھی سیدھا''، انھوں نے اس کی مثال دی کہ کانٹے ہوں تو اگر تم اس کے اوپر کانٹا ڈالو تو کانٹے ہی کانٹے ہوتے چلے جائیں گے، کانٹوں کا ڈھیر ہو جائے گا، نہیں کانٹوں کے مقابلہ میں پھول۔ چنانچہ ان لوگوں کا طریقہ تھا کہ جن لوگوں نے ان کو تکلیف پہنچائی، جن لوگوں نے ان کو ذلیل کرنے کی کوشش کی، ان کے پیچھے پڑے رہے، ان کے ساتھ انھوں نے ایسی ہمدردی کی، محبت کی کہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل محسن یہی تھے، بلکہ بعض لوگوں کو جو کمزور دماغ، کمزور عقیدے کے ہیں، ان کو خیال ہوتا تھا کہ بھائی دشمنی میں فائدہ ہے، ایسے لوگوں کے ساتھ دشمنی کرنی چاہیے، اس میں زیادہ فائدہ ہے، دشمن زیادہ نوازا جاتا ہے، محسنوں کو یہ بھول جاتے ہیں، اپنوں کو یہ بھول جاتے ہیں، جب نفع پہنچانے کا وقت آتا ہے تو دوسروں کو یاد کرتے ہیں۔

ایک بزرگ کے میں نے شعر پڑھے وہ کہتے ہیں: اے خدا! جو ہمارے راستے میں کانٹا ڈالے تو اس کی عمر کے باغ میں پھول ہی کھلاتا رہ، اس کے باغ عمر میں جو پھول کھلے وہ سدا بہار رہے، اور جو ہمارے ساتھ دشمنی کرے تو اس کے ساتھ ہمیشہ دوستی کر اور کبھی اس کا بال بیکا نہ ہو۔ اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر دشمنوں کے لیے دعائیں کرتے تھے، دشمنوں کے لیے ان کی دعاؤں کا جتنا حصہ وقف تھا، مجھے شبہ ہے کہ دوستوں اور ماننے والوں کے لیے اتنا ہی حصہ تھا یا اس سے کم تھا۔

بادشاہوں نے گردنیں جھکوالیں لیکن دل جھکانے میں کامیاب نہیں ہوئے

بادشاہوں نے ملک فتح کیے، اپنے لیے گردنیں جھکوالیں، لیکن ان کے سامنے دل نہیں جھکے، ایک دل کے بھی جھکانے پر وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ اگر کہا جائے کہ پورے پورے ملک میں ایک دل بھی ان کے سامنے جھکا ہوا نہیں تھا، ان کے لیے دعا کرنے والا نہیں تھا تو شاید غلط نہیں ہوگا، اور آج یہ زمانہ شخصی سلطنتوں کا نہیں، ایک دو چراغ جل رہے ہیں، ٹمٹماتے ہوئے، وہ بھی نہیں معلوم کہ کتنے دن کی ان کی زندگی ہے، آج سیاست کا دور ہے، آج جمہوریت کا دور ہے، آج سیاسی پارٹیوں کا دور ہے، کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان سیاسی پارٹیوں کے لیے، ان کے لیڈروں کے لیے ہمارے دل میں وہ محبت ہے، وہ اعتماد اور بھروسا ہے، ہم ان کے لیے جان قربان کرنا، جان تو بڑی چیز ہے، ہم ان کے لیے کسی ایک مفاد کو قربان کرنے کے لیے تیار نہیں، سب تجارت ہے، سوداگری ہے، سوداگری کے سوا کچھ نہیں کہ ہمیں ووٹ دو اور ہم تمہارا کام کریں، نہ وہ ووٹ خلوص سے ہے

اور نہ ان کا کام خلوص سے ہے۔

اور وہاں تو حال یہ تھا کہ پلکوں سے لوگ ان کی جگہ جھاڑتے، ان کے لیے رات رات بھر کھڑے ہوکر پہرہ دیتے اور جاگتے کہ ان کو تکلیف نہ ہو، شاید یہ پانی مانگ لیں، شاید ان کی آنکھ کھلے۔ آپ دیکھیے لوگوں کو بزرگوں کے ساتھ، صوفیائے کرام کے ساتھ، سنتوں اور فقیروں کے ساتھ کیسا خلوص ہے۔!!

خلوص دماغ کی چیز نہیں بلکہ دل اور روح کی چیز ہے

ایک راستہ تو ہے خود غرضی کا، مفاد پرستی کا اور سوداگری کا، دینے لینے کا، تم ہمیں یہ دو ہم تمھیں اس کے بدلے میں یہ دیں گے، وہ راستہ آپ آزمارہے ہیں، خلوص ناپید ہوتا چلا جارہا ہے، کسی کو کسی کے ساتھ خلوص نہیں، اس لیے کہ خلوص کا تعلق دل سے ہے اور دل سے ہم کام نہیں لے رہے ہیں، سارا کام ہم دماغ سے لے رہے ہیں، اور خلوص دماغ کی چیز نہیں، بلکہ دل اور روح کی چیز ہے، اور دل میں یہ چراغ بجھ گیا، یہ چراغ آندھیوں سے کب کا بجھ چکا ہے۔ اس جوت کو جلانے والا اب کوئی نہیں رہا۔

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

یہ خدا کے فقیر بندے جو صوفی کہلاتے تھے، سنت کہلاتے تھے، یہ کسی احسان کے، کسی مدد کے کبھی امیدوار نہیں رہتے تھے، یہ ان کا کام تھا، جو ان کے پاس آیا وہی جوت انھوں نے جلادی، وہی شعلہ انھوں نے بھڑکا دیا، ان کے اندر خلوص پیدا کردیا، ان کی دکانیں خلوص کی دکانیں تھیں، وہاں خلوص کا سودا ملتا تھا، کہنے والے نے کہا ہے۔

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

آج کہاں وہ دکان ہے جہاں وہ دوائے دل ملتی ہے؟ اور جس ملک میں، جس دنیا میں سب کچھ ملتا ہو، ہر سودا ملتا ہو؛ لیکن دوائے دل نہ ملتی ہو، وہاں کی زندگی میں کیا لطف ہے؟ میرے بھائیو! آپ زندگی کا لطف اٹھانا سیکھیے، ہم نے اتنی زندگی گزاردی لیکن زندگی کا حقیقی لطف نہیں اٹھایا۔

یہ ملک دوسرے ممالک کی رہنمائی کرسکتا ہے

میرے بھائیو! اس ملک میں اللہ نے سب کچھ دیا ہے، اتنا لمبا چوڑا ملک، جیسا بتایا میرے بھائی نے ۶۵ کروڑ کی آبادی، اور ملک بھی اتنا لمبا چوڑا، اس میں خدا کی دی ہوئی ہر نعمت موجود ہے،

اگر ہم میں سلیقہ ہو تو کسی چیز کے لیے باہر جانے کی ضرورت نہیں، ہم دوسروں کو کھلا سکتے ہیں، لیکن جو چیز کم ہوتی جا رہی ہے، وہ آپس کی محبت ہے اور ایک دوسرے پر بھروسا کرنا مل کر زندگی گزارنے کا سلیقہ، ساتھ رہ کر زندگی گزارنے کا سلیقہ، بھائی بھائی کی طرح، شہری شہری کی طرح، ایک خاندان، کنبے کے ممبر اور اس کے فرد کی حیثیت سے، یہ ہم بھول گئے ہیں، اس ملک میں اس کی ضرورت ہے، اگر یہ چیز اس ملک میں آجائے تو آج نہ صرف یہ کہ یہ ملک منزل پر پہنچ سکتا ہے؛ بلکہ دوسرے ملکوں کی رہنمائی بھی کر سکتا ہے۔

بڑی خوشی کی بات ہے، میں نے مرادآباد آکر یہ چیز دیکھی، میں سمجھتا ہوں کہ مرادآباد کا تجربہ بڑا ہمت افزا ہے۔ یہ مرادآباد کی خوش قسمتی ہے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے شہیدوں کی روح کی برکت ہے جن کا ذکر آپ نے سنا، میں اتنی صورتوں کو دیکھ رہا ہوں اس موسم میں، ایسے تھوڑے سے اعلان پر۔

آج کسی کے اندر کام کرنے کی امنگ نہیں

میں سمجھتا ہوں کہ مرادآباد اگر اس کام کو لے کر کھڑا ہو، اور ہندوستان میں یہاں سے یہ پیغام پہنچے، تو ہمیں امید ہے کہ ہندوستان اس وقت تباہی و بربادی کے جس غار کی طرف جا رہا ہے (جس کا بھیانک نقشہ کھینچا ہے ہمارے عزیز مولوی اسحاق جلیس صاحب نے) اس سے بچ جائے گا۔ آج حالت یہ ہے کہ کوئی کام کرنے کو تیار نہیں، کسی کے اندر کام کرنے کی امنگ نہیں، کسی کے اندر خدمت کا کوئی جذبہ نہیں، کسی کے اندر ہمدردی کا کوئی مادہ نہیں۔ میں نے بعض جلسوں میں کہا کہ دفتر میں جو آدمی بیٹھا ہوا ہے وہ ایسا ہے جیسے بلی چوہے کے انتظار میں ہو، اور جہاں کوئی اسامی کوئی کام کرانے والا پھنسا، اس نے اپنے ساتھی سے کہا کہ آیا ایک موٹا شکار، آئی ایک موٹی اسامی۔ سیوان کے جلسے میں میں نے کہا کہ اس شخص کو تو اٹھ کر، چند قدم چل کر آگے آنا چاہیے تھا کہ تم تو فرشتۂ رحمت ہو، تم کو تو خدا نے بھیجا، میں کس کام کے لیے بیٹھا ہوا تھا؟ کس بات کی تنخواہ پاتا ہوں؟ میں تو اسی لیے بیٹھا ہوا تھا کہ کوئی مجھ سے کام لے، تم تو میرے دل کی دوا ہو، تمہاری خدمت کے لیے میں نے پڑھا، اسکول میں پڑھا، کالج میں پڑھا، یونیورسٹی میں پڑھا، ڈگریاں حاصل کیں تاکہ میں تمہاری کچھ سیوا کروں، اگر تم نہیں تو میں بیکار ہوں۔

آج دو چیزیں زندہ ہیں

آج دو چیزیں زندہ ہیں: ایک پیسہ کی محبت اور وقعت، اور ایک نفرت، فرقہ وارانہ منافرت۔

اخلاق، انسانیت، شرافت، جذبۂ خدمت، ہمدردی؛ سب چیزیں مرچکی ہیں، یہ کسی ملک کے لیے کوئی اچھی تصویر نہیں ہے، بس بھائیو! بہت وقت لیا اور جو بات مجھ سے پہلے کہی گئی بالکل جامع اور مکمل تھی، بڑے درد وخلوص کے ساتھ کہی گئی تھی۔

اہل مرادآباد کو مبارک باد

اب میں اپنی خوشی کا اظہار کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ آپ کو دیکھ کر میرے دل میں ایک طاقت پیدا ہوگئی۔ میں اہل مرادآباد کو مبارک باد دیتا ہوں، اور اس مدرسہ کے منتظمین کو بھی مبارک باد دیتا ہوں کہ وہ آپ کو یہاں بلانے میں کامیاب ہوئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے تعلقات ہیں اور شہری زندگی میں وہ حصہ لیتے ہیں۔ یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ مدرسہ والے آپ کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ آپ نے اپنے اخلاق کا اور اپنی شرافت کا نقش قائم کردیا۔ اب میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اس کی نظیریں زیادہ سے زیادہ قائم ہوں۔ جب کوئی ایسی بات کہی جائے، ایسا اعلان کیا جائے تو اس پر شوق کے ساتھ بڑی تعداد میں لوگ جمع ہوں۔

اصل قیمت دل کی بات کی ہے

میں اس پر اپنی تقریر ختم کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ یہ جو بات کہی گئی یہ صرف میری اور میرے چند ساتھیوں کی بات نہیں ہے؛ بلکہ یہ آپ کی بھی اسی طرح بات ہے جس طرح میری ہے، شاید آپ کی کچھ زیادہ ہو۔ بعض لوگ اپنی بات کہتے ہیں بہت تفصیل سے؛ لیکن بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی بات نہیں کہہ سکتے ہیں، ہر شخص مقرر نہیں ہوتا لیکن اس کے دل کی بات ہوتی ہے۔ اصل قیمت دل کی بات کی ہے، زبان کی نہیں، میں نے اپنی زبان سے یہ بات کہی ہے، لیکن میرا یقین ہے کہ یہ آپ کے دل کی بات ہے، اس کا کریڈٹ (Credit) مجھے آپ سے زیادہ نہیں پہنچتا، اس میں میں کسی تعریف کا مستحق نہیں، میں نے آپ سب کے دل کی بات کہی اور آپ کی ترجمانی کی۔

ظلم ظلم ہے چاہے کسی کے ساتھ کیا جائے

مجھے واقعی شکایت ہے اپنے ملک کے رہنماؤں سے کہ انھوں نے بہت وقت کھویا، سچی بات یہ ہے کہ میں اپنے کو بھی اس میں مجرم گردانتا ہوں، کاش کہ ہم نے جب ۵۰-۵۲ء سے یہ کام شروع کیا تھا۔ اسی وقت سے ہم اسی سرگرمی سے یہ کام کرتے تو آج ملک کی یہ فضا نہ ہوتی۔ میں

اونچے ایوانوں تک اپنی آواز نہیں پہنچا سکتا، آپ کے ذریعہ اگر پہنچ جائے تو یہ بھی اچھی بات ہوگی کہ میدان میں آنا چاہیے اس ملک کے بچانے کے لیے، ایک ایک آدمی کا گریبان نہیں، دامن پکڑ کر یہ کہنا چاہیے کہ اس ملک کو سنبھالو، اس ملک کو بچاؤ جس میں ہم رہتے ہیں، آدمی جس برتن میں کھاتا ہے اس میں چھید نہیں کرتا، ہم اس برتن میں نہیں بلکہ اس کشتی میں سوراخ کررہے ہیں جس میں ہم سوار ہیں، اگر یہ کشتی ڈوبی تو ہم کہاں جائیں گے؟ اور یہ ہمارے ادارے، ہمارے سب آپس کے اختلافات، سیاسی پارٹیاں کہاں جائیں گی؟ بہت سے ملک ڈوب چکے، سمندر کی تہہ میں ہیں، آج کہیں ان کا پتہ نہیں، آج اس دنیا میں ان کا کہیں وجود نہیں، اور کس چیز نے ان کو ڈبویا؟ کسی دشمن نے ان کو نہیں ڈبویا، بلکہ ان کے اعمال نے ڈبویا، ان کے گناہوں نے ڈبویا، ظلم نے، پاپ نے ڈبویا۔

ہمارا اور ہر مذہب پر یقین رکھنے والے کا یقین ہے کہ خدا کو جو چیز سب سے زیادہ ناپسند ہے وہ ظلم ہے، بس اس ظلم سے ہم کو بچنا چاہیے، خواہ وہ ہم کسی فرقہ کے ساتھ کریں، ظلم ظلم ہے، چاہے کسی کے ساتھ کیا جائے۔ (۱)

(۱) ماخوذ از پندرہ روزہ "تعمیر حیات" لکھنؤ (شمارہ ۲۵/جنوری ۱۹۷۹ء)۔

۹

دنیا میں آنے والے انسان چمن کے کانٹے یا پھول؟ (۱)

نئے مہمانوں کی آمد

دنیا میں انسانوں کی آمد کا سلسلہ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں سال سے جاری ہے، اور کوئی دن نہیں کہ دنیا کی تاریخ میں نئے مہمان نہ آتے ہوں، صرف آج کا دن اور صرف ہمارا اور آپ کا یہ شہر مرادآباد جس میں ہم سب جمع ہیں، اگر آپ ٹوہ لگائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ شہر کی آبادی میں آج بھی اضافہ ہوا ہے، یہ شہنائیاں جو بج رہی ہیں، (ایک قافلہ اس وقت شہنائیاں بجاتا سڑک سے گزر رہا تھا) یہ لوگ جو اپنی خوشی کا اظہار کر رہے ہیں، یہ سب علامتیں ہیں اس بات کی کہ دنیا کی رونق ابھی قائم ہے، دلوں میں اُمنگیں ہیں، اور انسان اس دنیا میں ہنسی خوشی رہنا چاہتا ہے۔

جو بچہ بھی اس دنیا میں آتا ہے، جو نیا مہمان بھی ہماری آپ کی اس محفل میں داخل ہوتا ہے، وہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اس دنیا کا پیدا کرنے والا خدا انسان سے ابھی روٹھا نہیں ہے، انسان پر سے اس کا اعتماد اور بھروسا ابھی اٹھا نہیں ہے، وہ انسان سے مایوس نہیں ہوا، اگر ایسا ہوتا تو خدا کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے، وہی بھیجتا ہے، وہی بھیجنا بند کر دیتا، ہم نے آپ نے جلسہ کیا ہے، ایک چھوٹی سے کوشش، جو آرہے ہیں، ان کو آنے دے رہے ہیں، ہم ان کو آدمی سمجھتے ہیں، انھیں

---

(۱) ٹاؤن ہال، مرادآباد میں انصاف کونسل کے زیر انتظام ۲۳ رد سمبر ۱۹۷۸ء کو منعقد جلسہ میں کی گئی تقریر، ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا تھا، سامعین میں بڑی تعداد غیر مسلم برادرانِ وطن کی تھی، شہر کے مدارس اسلامیہ کے اساتذہ وطلبہ، وکلاء، ڈاکٹر، تجار بڑی تعداد میں شریک ہوئے، یہ تقریر ان دنوں ہوئی جب علی گڑھ میں فسادات ہو رہے تھے اور اطراف میں کشید گی تھی۔

کے لیے ہم نے یہ محفل سجائی ہے، آپ کا یہ ہال تنگ پڑ رہا ہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ بلانے والے بھی خوش ہیں اور آنے والے بھی خوش ہیں، آنے والے شوق سے آ رہے ہیں، اور بلانے والے ان کو جگہ دے رہے ہیں، اگر بس چلے تو آنکھوں میں جگہ دیں۔

خدا انسانوں کو دنیا میں مجبوری سے نہیں بھیج رہا ہے، ہم نے خود اپنے مہمانوں کو مجبوری سے جگہ نہیں دی ہے، شوق سے جگہ دی ہے، شہر میں اعلان کیا، کارڈ تقسیم کیے، ہم نے خود بلایا ہے، یہ بن بلائے نہیں آئے، جب یہ ہمارے بن بلائے نہیں آئے تو خدا کی مخلوق دنیا میں بن بلائے کیسے آسکتی ہے؟

خدا نسل انسانی سے مایوس نہیں

تو جو بچہ بھی اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے، وہ چاہے کسی براعظم میں پیدا ہو، ہندوستان میں پیدا ہو، یورپ وامریکہ میں، مشرق وسطی میں پیدا ہو، یا مشرق بعید میں، وہ اس بات کا اعلان کرتا ہے (اور ایسا صاف اور ایسے پیارے طریقے پر اعلان کرتا ہے کہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے) کہ ابھی اس سنسار کا پیدا کرنے والا انسانوں سے مایوس نہیں ہے، وہ ان کو بسانا چاہتا ہے، وہ ان کی مدد کرتا ہے، خود ہماری پیٹھ پر، ہماری کمر پر اس کا ہاتھ ہے، اگر اس کا ہاتھ نہ ہوتا تو کتنے پھول بے کھلے مرجھا جاتے، لیکن یہاں کا اتنا لمبا سفر کر کے جو مہمان یہاں آرہا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا اس دنیا سے ابھی مایوس نہیں ہے، اگر خدا اس دنیا سے ناراض ہو جائے تو اس کو ابھی توڑ پھوڑ کے رکھ سکتا ہے، کتنی لڑائیاں ہوئیں، انسانوں نے اس دنیا کو تباہ کرنے کی کتنی کوشش کی؛ لیکن کامیاب نہ ہوئے۔

یہ جو دو عالمی جنگیں (First and Second World Wars) ہوئیں، اس لڑائی کی آگ بھڑکانے والوں نے اپنی پوری ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ یہ دنیا ختم ہو جائے؛ لیکن دنیا پھر بھی قائم ہے اور اس کی رونق باقی ہے۔

نوشتۂ دیوار

اگر خدا کا ہاتھ اس دنیا کی پیٹھ پر نہ ہوتا، انسانوں کے سر پر نہ ہوتا، خدا کی حفاظت نہ ہوتی، خدا ابھی اس دنیا سے خوش نہ ہوتا اور انسان اس کو پیارا نہ ہوتا، تو یہ جو یورپ وامریکہ کے جادوگر جو ہماری قسمت کے مالک بنے بیٹھے ہوئے ہیں، یہ کب کا اس سنسار کو ختم کر چکے ہوتے، مگر ان کی اتنی منظّم سائنٹفک آرگنائزڈ کوششوں کے باوجود جس کی پشت پر سائنس تھا، ٹکنالوجی تھی، اور اب ایٹامک انرجی بھی آگئی ہے، اس کے باوجود یہ اس سنسار کو تباہ کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ یہ

دیوار کا نوشتہ ہے کہ خدا اس دنیا سے مایوس نہیں ہے، ابھی خدا اس دنیا سے مایوس نہیں ہوا کہ یہ فرش جو بچھایا گیا ہے، یہ شامیانہ جو لگایا گیا ہے، اسے تہہ کر کے رکھ دے، ورنہ ایک منٹ نہیں، سکنڈ نہیں، سکنڈ کے بھی ہزارویں حصے میں اس دنیا کو ختم کرسکتا ہے، ہم کو قرآن میں بتایا گیا ہے: ﴿إِنَّمَآ أَمْرُهُۥٓ إِذَآ أَرَادَ شَيْـًٔا أَن يَقُولَ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ﴾ (سورة يس: ۸۲) کہ اس کے ارادے کی دیر ہوتی ہے، اس نے ارادہ کیا اور کام ہوا، ارے بھائی ہم ٹیلیفون کرتے ہیں، اٹھایا ریسیور، نمبر ملایا، فوراً بات ہوگئی، تو خدا کو کیا دیر لگ سکتی ہے؟

کیا آپ خدا کا منشا نہیں سمجھتے؟ خدا کو ابھی دنیا باقی رکھنا ہے، مگر ہمارا آپ کا طرزِ عمل کیا ثابت کرتا ہے؟ خدا بھلے اس دنیا سے خوش ہو اور پیار کرے، مگر ہم اس دنیا سے خوش نہیں، خدا تو مہمان پر مہمان بھیجے، اور جب مہمان آتا ہے تو اپنی روزی لے کر آتا ہے، یہ تو ہماری نالائقی ہے کہ اس کو وقت پر کھانا نہ ملے، پیٹ بھر غذا نہ ملے، باقی خدا جو مہمان بھیجے گا اس کی روزی بھی بھیجے گا، مگر ہم کیا ثابت کر رہے ہیں؟ ہم یہ ثابت کر رہے ہیں کہ انسان سے بڑھ کر کوئی چیز قابلِ نفرت نہیں ہے۔

راوڑ کیلا، جمشید پور، علی گڑھ جہاں جہاں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ہیں، وہاں کے ان شریف آدمیوں نے کتنے سانپ بچھو مارے ہوں گے، اگر اس کا کوئی دفتر ہوتا تو میں وہاں جا کر پوچھتا، اس کے اعداد و شمار دیکھتا کہ بھائی ہر شخص بتائے کہ اس نے کتنے بچھو مارے، کتنے سانپ مارے، کتنے بھیڑیے، چیتے اور شیر مارے؟ ان میں بعض لوگوں کی زندگی گزر جاتی ہے، اور موذی جانور مارنے کی توفیق نہیں ہوتی، مگر انسان انسان کو کس طرح مارتا ہے؟ دیکھیے خدا اور انسان کے کام میں ایک ٹکراؤ اور تضاد ہے، خدا چاہتا ہے یہ دنیا پنپے، پھلے پھولے، سرسبز و شاداب ہو، بارونق ہو، یہاں اس کی رحمت کی، محبت کی ہوائیں چلیں، یہاں محبت کی اور پریم کی بانسری بجے، یہاں محبت کی خوشبو پھیلے، وہ دیکھ کر خوش ہوتا ہے، میں خوش ہو رہا ہوں یہ صورتیں دیکھ کر، کس طرح اپنا دل دکھاؤں کہ کتنا خوش ہو رہا ہوں، تو خدا کیا جو اس دنیا کا باغبان ہے، پالنہار ہے، انسان کو بنانے والا ہے، خوش نہیں ہوتا؟ اپنی بنائی ہوئی چیز پر سب خوش ہوتے ہیں۔

نگاہوں کا جادو

مراد آباد والوں کو اگر اپنے برتنوں پر ناز ہے تو خدا کو اپنی بنائی ہوئی چیز پر ناز نہیں ہوگا؟ مراد آباد کا رہنے والا جب کہیں جاتا ہے، تو کہتا ہے: میں اس جگہ کا رہنے والا ہوں جہاں سے بہترین برتن کہیں نہیں بنتے، ٹھیک ہے، ہم بھی مانتے ہیں، ہمیں آپ کا یہ دعویٰ تسلیم ہے، مگر کیا ہم

اور آپ کو ناز کرنے کا حق ہے؟ برتن بنالیا تو اس پر خوش، ایک مشین بنالی تو اس پر خوش، ایک کپڑا سی لیا تو اس پر خوش، اور خدا نے یہ گلدستہ بنایا، یہ چمن کھلایا، انسان کو پیدا کیا، جس کی وجہ سے ہر چیز میں قیمت پیدا ہوئی، اسے اپنی پیدا کی ہوئی چیز پر خوش ہونے کا حق نہیں؟

کہاں کا سونا، کہاں کی چاندی، کہاں کا مرادآباد کا برتن اور کہاں کا امریکہ کا کمپیوٹر، اور کہاں کی مشنری، سب ہماری اور آپ کی نگاہوں کا جادو ہے، ہم نے آپ نے سونے کو دیکھا قدر کی نگاہ سے، سونا ہو گیا، اگر ہم اور آپ آج کوئی انٹرنیشنل کنونشن (International Convention) کر لیں یا ہم کہیں طے لیں کہ ہمیں سونے سے کوئی مطلب نہیں، سونا ہمیں پسند نہیں، تو سونا اور مٹی برابر ہو جائے، سونا خود کوئی چیز نہیں، نگاہوں کا کھیل ہے، آپ کی نگاہیں دھات پر پڑیں تو سونا بنا دیا، آپ کی نگاہیں ٹوٹ جانے والے شیشے پر پڑیں تو وہ ایسا ہوا کہ اس کو دل کی طرح عزیز رکھنے لگے، کوئی توڑ نہیں سکتا، پھول اور کانٹے میں فرق کیا ہے؟ آپ نے پھول کہا تو پھول ہو گیا، آپ نے کانٹا کہا تو کانٹا ہو گیا، تو ہم اور آپ طے کر لیں کہ آج سے پھول کانٹا ہے اور کانٹا پھول ہے، تو پھول کانٹا ہو جائے گا اور کانٹا پھول ہو جائے گا، یہ سب ہماری اور آپ کی نگاہ کا کھیل ہے، دل کی توجہ کا، دل جدھر جھکا بس اسی چیز میں قیمت پیدا ہو گئی۔

بازار میں بھاؤ کیوں بڑھتا ہے؟ آپ سب کاروباری آدمی ہیں، بھائی! بھاؤ کیوں بڑھا، کل وہی چیز تھی، آج وہی چیز ہے، لیکن کل اس کے دام کچھ اور تھے، آج اس کے دام کچھ ہیں، کیا فرق ہوا؟ کہاں سے فرق آیا؟ صرف آپ کو خواہش زیادہ ہوئی، آپ کو زیادہ چاہت ہوئی، آپ اسے زیادہ خریدنے چلے گئے، دام بڑھ گئے، اگر آپ کہیں کہ کل سے ہم فلاں کپڑا نہیں خریدیں گے تو وہ کپڑا بے قیمت ہو جائے گا، کپڑوں کے جو نئے نئے فیشن نکلتے ہیں، ان کی حقیقت کیا ہے؟ یہ فیشن پیرس سے نکلا ہے، لندن سے نکلا ہے، لوگوں نے پسند کیا اور فیشن بن گیا، اور ساری دنیا میں پھیل گیا، اور پھر اس کے بعد اس کو ایسا بھول جاتے ہیں کہ اگر کوئی اس فیشن میں نکلے تو اسے دیوانہ سمجھیں اور آؤٹ آف ڈیٹ سمجھیں۔

اپٹوڈیٹ (Up to Date) اور آؤٹ آف ڈیٹ (Out of Date) کی حقیقت کیا ہے؟ آپ ہیں سب کچھ، آپ نے کہا: یہ چیز اچھی ہے، زمانہ کے مطابق ہے، وہ اپٹوڈیٹ ہو گئی، آپ نے کہا: یہ پرانے زمانے کی چیز ہے، ہمیں پسند نہیں تو آؤٹ آف ڈیٹ ہو گئی۔

تو آپ ہی اس دنیا میں سب کچھ ہیں، مگر آپ کا طرز عمل یہ بتاتا ہے کہ آپ خدا کی مرضی پر خوش نہیں

ہیں، خدا کچھ چاہتا ہے، آپ کچھ چاہتے ہیں، خدا بنانا چاہتا ہے، آپ بگاڑنا چاہتے ہیں، خدا سرسبز وشاداب رکھنا چاہتا ہے، آرام پہنچانا چاہتا ہے، آپ کہتے ہیں: ہم آرام نہیں پہنچنے دیں گے۔ یہ ہمارا طرزِ عمل ہے، گویا ہمیں خدا سے لڑائی ہے، معاف کریں ہمارے ہندو مسلمان بھائی، ہم سب مذہبی لوگ ہیں، ہم سب یقین کرتے ہیں مذہب کی حقیقتوں میں، اس کی سچائیوں میں لیکن ہم اپنے طرزِ عمل سے ثابت کرتے ہیں جیسے ہم کو خدا سے ضد ہو، وہ دن کہے تو ہم رات کہیں، وہ رات کہے تو ہم دن کہیں، وہ اچھا کہے تو ہم برا کہیں، وہ برا کہے تو ہم اچھا کہیں، وہ کہے کہ مل کر رہو، محبت سے رہو، ہم کہیں کہ ہمیں منظور نہیں۔

خدا کی بُردباری دیکھیے

ایک دکان پر آپ چلے جایئے اور دو ایک برتنوں پر ہاتھ صاف کر دیجیے، بے قرینہ کر دیجیے، توڑنا پھوڑنا نہیں، اس کا ذکر کیا، بے قرینہ رکھ دیجیے، تو دکان والا خواہ آپ کا کیسا دوست ہو، کیسا شریف آدمی ہو، وہ بگڑ جائے گا اور آستین چڑھالے گا کہ آپ کو کیا حق ہے؟ ہماری دکان کا انتظام کرنے کیوں آئے؟ خدا کی بردباری دیکھیے کہ برابر انسانوں کو بھیج رہا ہے، برابر روزی دے رہا ہے، زمین غلہ اگا رہی ہے، آسمان پانی برسا رہا ہے، کسی چیز میں کوئی ہڑتال، کوئی اسٹرائک نہیں کہ خدا نے وہ چیز روک دی ہو ہماری نالائقی سے، لیکن ہمارا کیا طرزِ عمل ہے؟ ہم خدا کو برابر غصہ دلانا چاہتے ہیں، شکر ہے، اسی کی تعریف ہے کہ وہ بچوں کی طرح غصہ میں نہیں آتا، ورنہ اگر ہمارے کرتوتوں سے وہ غصہ میں آجاتا تو کب سے یہ دنیا لپیٹ کر رکھ دی جاتی، یہ اس بات کی علامت ہے کہ خدا اتنے دنوں سے برداشت کر رہا ہے، خدا ابھی اس دنیا سے مایوس نہیں ہے، خفا نہیں ہے، اور ہم بات بات پر خفا ہوتے ہیں، ہمیں چاہیے تھا کہ خدا کا ہمارے ساتھ جو معاملہ ہے، کم سے کم اپنے ساتھیوں کے ساتھ، اپنے بھائیوں کے ساتھ وہ معاملہ کرتے۔

خدا تو ایسا کہ جو چاہو کر گزرو، اور وہ خفا نہیں ہوتا، یعنی اس طرح سے ناراض نہیں ہوتا کہ دنیا کو تہہ کر کے رکھ دے، اُلٹ کر رکھ دے کہ بس ختم، وہی زمین و آسمان، چاند سورج، بارش و ابر، وہی قانونِ قدرت (Cosmic Law) برابر چلے آرہے ہیں ہزاروں لاکھوں برس سے، مگر ہمیں کچھ تو سوچنا چاہیے کہ آخر یہ کب تک ہوتا رہے گا؟

علم نے کیا فائدہ پہنچایا؟

آج دنیا میں علم کا کتنا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے، ڈنکا بجایا جا رہا ہے، لیکن کیا اس علم نے ہمیں

فائدہ پہنچایا؟ کیا ہم کو آدمی بنا دیا؟ علم کا فائدہ تو ہم نے یہ اٹھایا کہ جو کام ہم بھدے طریقے پر کرتے تھے، دیر میں کرتے تھے، اس کو ہم بہت سلیقے کے ساتھ ٹیکنیکل (Technical)، خوبصورت (Beautiful)، ترقی یافتہ (Advanced) طریقے پر اور بہت جلدی ہم اسے کر لیتے ہیں، یعنی پہلے ہلاکت بیل گاڑی پر بیٹھ کر آتی تھی، بیل گاڑی دیر سے پہنچے گی تو ہلاکت بھی دیر سے پہنچے گی، پھر وہ گھوڑے سے جانے لگی، پھر ریل گاڑی سے، پھر ہوائی جہاز سے جانے لگی، اور اب ایٹمک انرجی (Atomic Energy) اور اس کی سرعت اور اس کے زور سے جانے لگی، بتایئے کہ یہ انسانوں کے لیے اچھا ہوا؟ پہلے ہی غنیمت تھا کہ ایک بادشاہ ملک فتح کرنے چلتا تھا، گھوڑوں پر، اونٹوں پر، ہاتھیوں پر، اتنی دیر میں دوسرے لوگوں کو خبر ہوتی وہ تیاری کر لیتے تھے، اب تو سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ایک منٹ کی بھی مہلت نہیں مل پاتی، ہیروشیما میں، ناگاساکی میں کیا ہوا؟ کیا ان کو کچھ مہلت ملی؟ علم تو حاصل کر رہے ہیں، لیکن یہ ایسا بن گیا ہے جیسے کہ کسی شرابی کے ہاتھ میں، بدمست کے ہاتھ میں تلوار آجائے، تیز دھار کی کوئی چیز آجائے، وہ تو شرابی بدمست ہے، کسی کا گلا کاٹ دے گا، بھائی کا گلا کاٹ دے، بچہ کا گلا کاٹ دے، ایسے ہی آج بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا ہے۔

خطرہ مول لینا پڑتا ہے

میرے بھائیو اور دوستو! ابھی خدا نے ہمیں مہلت دی ہے، اور دیکھیے اب بھی آواز میں، سچائی میں، خلوص میں، سادگی میں اثر ہے، درد میں اثر ہے کہ اتنے آدمیوں کو یہ درد بلا سکتا ہے، تڑپنے والے، سوچنے والے دل ودماغ ہمارے ملک میں بڑی تعداد میں موجود ہیں، لیکن قصہ یہ ہے کہ کوئی ہمت نہیں کرتا، جو فسادات ہوتے ہیں، اس میں سب لوگوں کو ہسٹیریا کا دورہ نہیں ہوتا، سب پاگل نہیں ہو جاتے، مگر ہوتا یہ ہے کہ چند بدمعاش، خدا سے نہ ڈرنے والے، انسان کو کوئی چیز نہ سمجھنے والے میدان میں آجاتے ہیں، اور ہر شریف آدمی اپنی خیر منانے لگتا ہے کہ ان غنڈوں اور بدمعاشوں کے کون منہ آئے؟ ان کے کون سامنے آئے، اپنی عزت بھی خاک میں ملائے، شریف لوگ اپنے گھروں میں بیٹھ جاتے ہیں، اور اپنی خیر منانے لگتے ہیں، ورنہ کوئی شہر، کوئی گاؤں بھلے شریف آدمیوں سے خالی نہیں ہے، لیکن وہ ڈرتے ہیں، ہچکچاتے ہیں، ان کا زور جادو چل جاتا ہے جو بدمعاش ہیں، خدا سے نہیں ڈرتے، شریف آدمی اپنے کونوں میں بیٹھ جاتے ہیں، وہ کہتے ہیں: بھائی! ان رذیلوں، کمینوں، خونخواروں کے کون منہ آئے؟ کون ان کے سامنے آئے؟ لیکن اگر اس دنیا میں ایسا ہی ہوتا رہے تو یہ دنیا چل نہیں سکتی، اس میں تو خطرہ مول لینا پڑتا ہے۔

ایک بلیغ مثال

میری معلومات زیادہ تر مذہبی ہیں، ہمارے پیغمبر صاحب نے ایک مثال دی، اس سے بہتر مثال مجھے اب تک نہیں ملی، میں اس لیے بھی اسے بیان کرتا ہوں کہ ایسی تصویر کھینچ دینے والی مثال مجھے نہیں ملی۔ ظلم وستم، انارکی، بدنظمی، فتنہ وفساد یہ اگر دنیا میں آئے تو اس کو روکنا چاہیے ہمت کر کے، چاہے اس میں کتنا نقصان ہو جائے، اگر نہیں روکو گے تو تم بھی نہیں بچو گے، اس کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مثال دی کہ (۱) ایک کشتی ہے، اس پر لوگ جا رہے ہیں، دریا کا سفر ہے، اس میں ایک اَپر کلاس ہے، ایک لُوور کلاس ہے، ایک اوپر کا حصہ ہے جیسے کہ آج کل فرسٹ کلاس ہوتا ہے، اور نیچے ڈیک ہوتا ہے، کچھ مسافر ڈیک پر ہیں، اور کچھ مسافر فرسٹ کلاس میں ہیں، پانی کا انتظام اتفاق سے اوپر ہی ہے، کشتی تو دریا میں چل رہی ہے، لیکن دریا سے پانی لینا ہر ایک کے بس کا کام نہیں، ڈول ہو، رسی ہو۔ تو یہ نیچے والے پانی لینے اوپر جاتے ہیں، پانی کی فطرت یہ ہے کہ وہ گرتا ٹپکتا ہے، جب پانی لے کر آئے تو کشتی ملنے والی تھوڑا اِس پر ٹپکا تھوڑا اُس پر ٹپکا، صاحب لوگوں نے، اَپر کلاس والوں نے آستینیں چڑھا لیں کہ صاحب پانی کی ضرورت آپ کو، پانی کی غرض آپ کو اور پریشان ہم ہوتے ہیں، دیکھیے ہم نے کپڑا بچھا رکھا تھا، فرش بچھا رکھا تھا، آپ نے اس کو بھگو دیا، دیکھیے ہمارے اوپر چھینٹے پڑ گئے، ہم آپ کو پانی نہیں لے جانے دیں گے۔

انھوں نے کہا: پانی کے بغیر کیسے رہا جا سکتا ہے؟ انھوں نے کہا: چاہے جو ہو ہم آپ کو پانی نہیں لے جانے دیں گے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نیچے والوں نے سوچا کہ پانی تو ہم ضرور لیں گے پانی کے بغیر گزارہ نہیں، ایسا کرو کہ نیچے سوراخ کر لو، اور وہیں سے اپنا ڈول، لوٹا ڈال کر پانی نکال لیا کرو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر ان لوگوں میں سمجھ ہے اور ان کو زندگی پیاری ہے کچھ ہوش گوش ہے تو یہ خوشامد کریں گے، ان کے پاس جائیں گے کہ تم پانی لینے آتے تھے اور ہم ناراض ہوتے تھے، ہم خود پانی پہنچا دیں گے، لیکن خدا کے لیے ہمارے اوپر رحم کھاؤ، کشتی میں سوراخ نہ کرو، اور اگر انھوں نے کہا کہ ہماری بلا سے، ارے بھائی! سوراخ تو نیچے ہو رہا ہے، اوپر تو نہیں ہو رہا ہے، ہم تو اوپر رہتے ہیں، ہم تو بالانشین ہیں، ہم تو اپر کلاس کے لوگ ہیں، اور یہ لوور کلاس کے ذلیل لوگ ہیں، سوراخ کر رہے ہیں تو نیچے کر رہے ہیں، ہم تو آرام سے رہیں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب سوراخ ہوگا تو نہ لوور کلاس والے بچیں گے اور نہ اپر کلاس والے بچیں گے، کشتی ڈوبے گی تو سب کو لے ڈوبے گی۔

(۱) صحیح البخاري، کتاب الشرکة، باب هل یقرع في القسمة والاستهام فیه؟۔

آج ہماری سوسائٹی میں ،صرف ہندوستان کو نہیں کہتا، ہمارا یہ موجودہ بیسویں صدی کا سماج ایسی ہی کشتی بن گیا ہے کہ اس میں اپر کلاس والے بھی ہیں، اور لوور کلاس والے بھی ہیں، اپر کلاس والوں کی پیشانی پر بل آتے ہیں، اور یہ بات بات پر اپنا امتیاز ثابت کرتے ہیں، اور احساس برتری میں مبتلا ہیں، نیچے والے کہتے ہیں (نیچے اوپر کا فرق یوں سمجھئے کہ جس کو ضرورت پڑتی ہے اس کو آپ لوور کلاس سمجھ لیجیے، اور جسے ضرورت نہیں پڑتی اسے اپر کلاس) کہ ہمیں کام سے کام ہے، ہم کچھ نہیں دیکھتے ہمارا کام تو نکلنا چاہیے، کرپشن ہے، ذخیرہ اندوزی ہے، بلیک مارکیٹنگ ہے، بے ایمانی ہے، کام چوری ہے، مزدور کام نہیں کرتا، مزدوری زیادہ لینا چاہتا ہے، اور جو مالک ہے مل اور کارخانے کا، وہ چاہتا ہے کہ یہ کام تو کرے پورا سولہ آنے، اور اگر کوئی ایسا قانون ہو کہ ایک آنہ ہم دے سکیں تو ایک ہی آنہ دیں، نتیجہ یہ ہے کہ ہر ایک کام نکالنا چاہتا ہے، سب لوگ اِن ڈائرکٹ (Indirect) طریقے پر سوراخ کر کے پانی بھر رہے ہیں، پوچھنا پاچھنا کچھ نہیں، اپنا کام ہے، اللہ نے ہم کو ہاتھ دیے ہیں، پاؤں دیے ہیں، سمجھ دی ہے، جو کچھ ہماری سمجھ میں آئے گا کریں گے، اب سماج میں جو لوگ سمجھ دار ہیں، دانش ور ہیں، اسکالر ہیں، محبّ وطن اور ملک کو چاہنے والے ہیں، اگر انھوں نے کہا: ہماری بلا سے یہ جانیں ان کا کام جانے، ہم آنکھیں بند کر لیتے ہیں، یہ چاہیں مریں، جئیں، تو نتیجہ کیا ہوگا؟

کشتی میں پانی بھرے گا، کشتی ڈوبے گی، اور بھائی جب کشتی ڈوبے گی تو امتیاز نہیں کرے گی، آگ جب کسی گاؤں میں لگتی ہے تو وہ امتیاز نہیں کرتی کہ یہ مسلمان کا گھر ہے، یہ ہندو کا گھر ہے، یہ شریف آدمی کا گھر ہے، یہ خاں صاحب کا گھر، یہ شیخ صاحب کا گھر، یہ پنڈت جی کا گھر، یہ فلاں کا گھر، کچھ نہیں، آگ تو اندھی بہری ہوتی ہے، جب لگتی ہے تو سب جلا کر خاک سیاہ کر دیتی ہے، سیلاب آتا ہے تو وہ امیر غریب، اونچے نیچے میں کوئی فرق نہیں کرتا۔

ہمارا سماج ڈانواں ڈول

میں آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آج سماج کی کشتی ڈانواں ڈول ہو رہی ہے، اور اس میں بہت سے مسافر ایسے ہیں جو اس میں سوراخ کیے ہوئے ہیں اور سوراخ سے اپنا ڈول ڈال کر پانی بھر رہے ہیں، دفتروں میں کیا ہو رہا ہے؟ اسٹیشنوں پر کیا ہو رہا ہے؟ اور ہمارے محلوں میں کیا ہو رہا ہے؟ آدمی کو بس اپنے کام سے مطلب ہے اور کسی چیز سے مطلب نہیں، ہمارا الوسیدھا ہونا

چاہیے، (ہماری زبان کا بہت پھوہڑ سا محاورہ ہے کہ ہمارا اُلو سیدھا ہونا چاہیے) باقی ہم کو مطلب نہیں کہ کس پر کیا گزرتی ہے، اس فلسفہ پر سب کا عقیدہ ہے، نتیجہ یہ ہے کہ سارا ملک اپنا فائدہ دیکھ رہا ہے۔

وہی بات ہوئی کہ ایک بادشاہ تھا، اس نے ایک تالاب بنایا اور اعلان کیا کہ ہمیں دودھ کا حوض چاہیے، سب لوگ اس میں دودھ ڈالیں، ایک ایک بالٹی دودھ لائیں اور ہم سے پیسے لے لیں، ہر شخص نے یہ سوچا، میں نے سوچا، آپ نے سوچا کہ ارے بھائی! سب لوگ تو دودھ کی بالٹیاں لائیں گے، ایک میں نے اگر پانی کی بالٹی ڈال دی تو کیا پتہ چلے گا؟ کون اس کو کیمیاوی طریقہ پر دیکھے گا کہ دودھ کی بالٹیوں میں کتنی پانی کی بالٹیاں ہیں، اور کون لایا تھا؟ ایک شخص چلا، وہ پانی کی بالٹی لے چلا، اور اس نے پانی کی بالٹی ڈال دی، ہر ایک نے ایسا ہی کیا، ہر آدمی نے اسی ذہن سے سوچا، اور اتفاق سے دودھ کی بالٹی والوں نے بھی یہی سوچا کہ پانی کی بالٹی ڈالیں، نتیجہ یہ ہوا کہ صبح بادشاہ سلامت آئے خوش وخرم کہ حوض لبالب سفید دودھ سے بھرا ہوگا، اور ہم اس پر فخر کریں گے کہ ہم نے دودھ سے حوض بھر دیا، دیکھا کہ وہاں تو پانی بھرا ہوا ہے، ارے یہ کیا غضب ہوا؟ معلوم ہوا کہ پورے شہر نے ایک ہی دماغ سے سوچا۔

آج مشکل یہ ہے کہ ہر شخص کا دماغ ایک طرح کا ہو رہا ہے، کچھ لوگوں کا استثناء تو آپ کو کرنا ہوگا، خدا نے پانچ انگلیاں برابر نہیں کیں، لیکن پانی کی بالٹی والا رجحان (Trend) بڑھ رہا ہے، اور یہ خیال کہ ہمیں پیسے لینے ہیں، ہمیں خدا سے شرم آنی چاہیے اور کوئی بات ایمانداری کے خلاف نہیں کرنی چاہیے، یہ چیز سکڑتی اور سمٹتی چلی جا رہی ہے، ہم یقین کرتے ہیں فوری فائدہ میں۔

ہماری سوسائٹی کی بیماری یہ ہے کہ ہر ایک اپنی مٹھی فوراً گرم کرنا چاہتا ہے، بھائی! ایک دو، دو چار ہزار کی مٹھی گرم ہونے سے کچھ نہیں ہوتا، اس سوسائٹی کا کیا ہوگا جس میں مٹھی تو گرم ہوگئی، لیکن سوسائٹی بجھتی جا رہی ہے، ٹھنڈی پڑتی چلی جا رہی ہے، آج ہمارا عقیدہ جمتا چلا جا رہا ہے کہ جس کام سے چار پیسے ملیں وہی کام عقلمندی کا ہے، ہرگز وہ عقل مندی کا نہیں ہے، مَن ماریے پھر آپ کا مَن خوش ہوگا، آپ کے مَن کو آسودگی اور اطمینان حاصل ہوگا، لیکن سب جلد سے جلد اگر مَن خوش کرنا چاہیں تو پھر کسی کا مَن خوش نہیں ہوگا، پھر آپ دیکھیے گا کہ یہ سوسائٹی، یہ دنیا وبال بن جائے گی اور لوگ پناہ مانگیں گے، اور کہیں گے خدا موت دے۔

ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

ایسے سماج میں موت کی خواہش ہوتی ہے، اور آج اگر آپ لوگوں کو تلاش کریں گے تو کتنے بھائی آپ کو ایسے ملیں گے جو مرنا پسند کرتے ہیں، اس جینے سے تو مرنا اچھا، ہم نے شاعروں کا کلام پڑھا ہے، ادیبوں کی تحریریں دیکھی ہیں کہ جب یہ لالچ کی بلا، یہ پیسے کی محبت بڑھ گئی، سب نے اپنی مٹھی گرم کرنی چاہی، سب نے اپنے دل کو خوش کرنا چاہا، پھر نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح مچھلی کو پانی سے نکال کر آپ باہر ڈال دیجیے اس کا دم گھٹنے لگتا ہے، اسی طرح پوری سوسائٹی کا دم گھٹنے لگا، پوری سوسائٹی ایسی ہو رہی ہے کہ جو پاک ہے، قانون پر چلنے والا ہے، اس کا گزر نہیں، اور جو قانون کو پاؤں کے نیچے مسل دینے والا ہے، اس کی جیت ہے، اس کا بول بالا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اس راستہ پر چلنا چاہتے ہیں، وہ بھی تھوڑے دنوں کے بعد وہ راستہ چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔

سوسائٹی کے زوال کا آخری نقطہ

ہمارے پاس بہت سے لوگ آتے ہیں، مولوی سمجھ کر، اور کوئی مشورہ کے لیے، ہمیں کتنے آدمیوں نے بتایا کہ ہم رشوت نہیں لیتے، ہم سے برا کوئی محکمہ میں نہیں ہے، یعنی رشوت لینے والے کو جس نظر سے دیکھنا چاہیے تھا آج رشوت نہ لینے والے کو اس نظر سے دیکھا جا رہا ہے، ارے اس کو نکالو، یہ ایک گندی مچھلی ہے جو ہمارے یہاں آئی ہے، اس کو نکالو، ارے بھائی! ہم تمہارا کیا بگاڑتے ہیں؟ نہیں صاحب! نیک آدمی ہم کو گوارا نہیں، اس لیے کہ ہمارا ضمیر کسی وقت تو ہم کو ملامت کرتا ہے، چٹکیاں لیتا ہے کہ ایک یہ آدمی ہے جو رشوت نہیں لیتا، ہم یہ بھی برداشت نہیں کرنا چاہتے، ایک فرد بھی ایسا نہ رہے جسے دیکھ کے ہمیں شرم آئے۔

سوسائٹی کے زوال کا یہ آخری نقطہ ہے کہ سوسائٹی ایسی ہو جائے جس میں نیکی کے قانون پر چلنے کی گنجائش نہ رہے، اور جو قانون پر چلنا چاہے، انسان کو انسان سمجھے اور ڈرے، اس کا دم گھٹنے لگے۔

ہم اور آپ ایک ہی کشتی کے سوار ہیں

میرے بھائیو! ہم اور آپ ایک کشتی کے سوار ہیں، ایک نیّا کے مسافر ہیں، ہماری نیّا میں کچھ لوگوں نے بہت بڑا سوراخ کرنے کا ارادہ کیا ہے، ہمارے ہی سماج کے بہت سے لوگوں نے، چھوٹے سوراخ تو بہت سے ہیں اور بہت دنوں سے ہیں، پانی تھوڑا تھوڑا آ رہا تھا، لیکن یہ کشتی چونکہ

بہت بڑی ہے، اور بڑی کشتی دیر سے ڈوبتی ہے، چھوٹی ناؤ ہوتو فوراً ڈوب جائے، ہمارے دیش کی کشتی ذرا بڑی ہے، اس لیے ابھی آپ کو نظر نہیں آرہا ہے کہ اس میں کتنا پانی آ گیا، ایک جگہ آیا ہے، دوسری جگہ نہیں آیا، کئی منزلیں ہیں، اور بہت بڑی بڑی، اس کا کوئی اور چھور نہیں، یہ ۶۵ کروڑ کی آبادی کا ملک ہے، اور بہت بڑا ملک ہے، کہتے ہیں ہاتھی کو مرتے مرتے دیر لگتی ہے، ایک چڑیا ہے، اس کو آپ انگلی میں لیجیے اور مسل ڈالیے، اس کا گلا گھونٹ دیجیے، لیکن ہاتھی تو دیر میں مرے گا۔

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

سنیے! یہ ہمارا ملک بہت بڑا ملک ہے، اور خدا کا شکر ہے کہ بڑا ملک ہے، ہم کو آپ کو اس کی قدر نہیں ہے، میرے ایک دوست ہیں حیدر آباد کے، وہ پیرس میں رہتے ہیں، وہاں بہت بڑے مصنف اور عالم مانے جاتے ہیں، جنیوا میں ایک کانفرنس تھی، اس میں ہم دونوں شریک ہوئے، ہم لوگ وہاں کے ہوائی اڈے پر سیر کرنے لگے، میرے پاس انٹرنیشنل پاسپورٹ تھا، اور ہر جگہ جاسکتا تھا، جرمنی کا بھی میرے پاس ویزا تھا، اور فرانس کا بھی، میرے دوست یک بیک رک گئے اور کہنے لگے کہ اگر میں یہاں قدم رکھ دوں (ایرپورٹ ہی کا ایک حصہ تھا) تو میں جرمنی پہنچ جاؤں گا، اور پھر اس کے بعد بغیر ویزا کے نہیں آسکوں گا، تو یورپ میں ایسے چھوٹے چھوٹے ملک ہیں کہ اگر آپ تیز موٹر چلائیں تو باؤنڈری (Boundary) کراس (Cross) کر جائیں، اور دوسرے ملک میں پہنچ جائیں، یہاں یہ حال ہے کہ تین راتیں تین دن چلیے، بنگلور جائیے، کالی کٹ جائیے ختم ہی نہیں ہوتا، بھائیو! یہ خوشی کی بات ہے مگر یہ بات بڑی ذمہ داری کی بھی ہے، اس ملک کو سنبھالیے، اب اس ملک میں اس بات کی زیادہ گنجائش نہیں ہے کہ جو لوگ سوراخ کر چکے ہیں یا سوراخ کرنے پر کمر بستہ ہیں، ہم ان کو ڈھیل دیں، چھوٹ دیں کہ یہ جانیں ان کا کام جانے۔

اب تو ہم کو اور آپ کو مل کر اس کشتی کو سنبھالنا ہے، اور اس دیش کی خبر لینی ہے، ورنہ پھر بھائی ”تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں“۔

ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں

ظلم کے بعد کوئی ملک پنپ نہیں سکتا، جو کسی نے کہا تھا۔

ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں\
ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں

ہم نے بچپن میں یہ سبق پڑھا تھا، اور آج بڑے بڑے منتریوں کو، بڑے بڑے پروفیسرز اور لیڈرز کو پھر آج سنانے کی ضرورت ہے کہ "ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں"۔

ہم نے دیکھا کہ کتنی حکومتیں یہاں آئیں اور چلی گئیں، انگریز جانے والے تھے؟ انگریز کوئی معمولی لوگ تھے؟ معمولی حکومت تھی؟ جس کی حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا، لیکن انھوں نے ظلم کیا تھا، یہی آپ کا شہر مراد آباد ہے، کہتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے یہاں کے سیکڑوں آدمیوں کو پھانسی پر چڑھا دیا تھا، اور پھر ایسا بوریا بستر ان کا بندھا جیسے کہتے ہیں کہ گدھے کے سر سے سینگ غائب۔

ظلم کو خدا برداشت نہیں کرتا

بھائی! کوئی مذہب ہو، کوئی پارٹی ہو، کوئی فرقہ ہو، کوئی سماج ہو، ظلم کو خدا برداشت نہیں کرتا۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں، کوئی فرقہ، کوئی طبقہ، کوئی کلاس یہ سمجھتا ہے کہ ہم ظلم کر کے، بے گناہوں کا خون کر کے، اور بچوں کو دیواروں پر پٹک کر کے، اور بھٹی میں ڈال ڈال کر ہم اپنا سکہ بٹھا لیں گے، ہم اپنے لیے اس ملک کا پٹہ لکھوا لیں گے، تو وہ بھول میں ہے، اس کو اپنی بھول سے نکلنا چاہیے، خدا اس طرح کرنے تو دیتا ہے، لیکن کرنے کے بعد پنپنے نہیں دیتا، یہ جینے کے لچھن نہیں ہیں، جو ہم ہندوستان میں کر رہے ہیں، ارے بھائی انسان کے معنی تو یہ ہیں کہ انسان، انسان کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے، بچھو اور سانپ بھی مل جاتے ہیں، بھیڑیے بھی ساتھ چلتے ہیں، لیکن یہ کس طرح کا انسان ہے کہ یہ انسان کو برداشت نہیں کر سکتا، کیا دورہ اس پر پڑتا ہے؟

قصور کرے کوئی مارا جائے کوئی!!

کوئی مسافر بے چارہ کہیں سے آیا، آپ کے مراد آباد کے اسٹیشن سے کہیں نکلا تھا، کچھ نہیں دیکھنا کہ یہ کون ہے؟ اپنی ماں کی خبر لینے جا رہا ہے، یا اپنی بیوی کے منھ میں کچھ رکھنے کہ بیچاری بھوکی ہے، بمبئی سے کما کر آ رہا ہے، اور اس نے اپنا پسینہ بلکہ خون بہا کر کچھ پیسے جمع کیے، کسی ظالم نے خنجر نکالا اور اس کے گھونپ دیا۔

ارے تو نے کس کو مارا؟ خدا کے بندے ذرا دیکھ، تو نے کس کو مارا؟ اس کو مارا جس کو ماں نے دودھ پلا پلا کر، چھاتی سے لگا لگا کر راتوں کو نیند حرام کر کے پالا تھا، اور خدا نے اس کی روزی بھیجی تھی! کتنے دور سے اس کی روزی بھیجی تھی! بیمار ہوا تو کیسے کیسے اس کے علاج ہوئے تھے!!

کس کس طرح سے پڑھایا گیا!! اور جب یہ جوان ہوا، کھانے کمانے کے قابل ہوا، تو نے اے ظالم! اے دشمن! اے خدا اور انسان کے دشمن! اے اندھے انسان! تو نے کس کے چھرا گھونپا؟ اگر تجھے معلوم ہو جائے تو ہزار بار مرنا تو گوارا کرے اور کبھی نہ مارے، اس کے مرنے سے کیا اثر ہوگا؟ جب اس کے گھر خبر پہنچے گی، لاش پہنچے گی، تو کیا ہوگا؟ تو خدا کو منھ دکھانے کے قابل ہے؟ ظلم اندھا اور بہرا ہوتا ہے، چھرا نکالا اور کسی کو گھونپ دیا، میں ہندو مسلمان کسی کو نہیں کہتا، اس چھرا مارنے والے کو نہ میں مسلمان سمجھتا ہوں نہ ہندو، میں اسلام کی بھی توہین سمجھتا ہوں، ہندو مذہب کی بھی توہین سمجھتا ہوں، ہزار بار ان کا مذہب ان سے بیزار ہے، اور وہ ہزار بار اپنے مذہب کی کتاب اپنے سر پر رکھ کر قسم کھائیں کہ ہم مسلمان ہیں، ہندو ہیں، تو خدا کی لعنتیں برستی ہیں ان کے اوپر، خدا بیزار ہے ایسے لوگوں سے، مذہب؟ مذہب یہ تربیت دیتا ہے؟ یہ سمجھاتا ہے؟ قصور کرے کوئی مارا جائے کوئی!!

ہزار چیتوں سے زیادہ خونخوار

وہ بے چارہ ابھی اسٹیشن سے باہر ہی آیا تھا، کیسے کیسے ارمان لے کر آیا تھا، گھر جاؤں گا، ماں کی باچھیں کھل جائیں گی، ماں آگے بڑھے گی کہ میرا لال آ گیا، بیوی خوش ہو جائے گی، اس کا چہرہ دمکنے لگے گا، بچے آ کر پاؤں سے لپٹ جائیں گے، میں بمبئی سے تحفے لے کر آیا ہوں، میں کسی کے لیے روپے لے کر آیا ہوں، کسی کے لیے کرتا لایا ہوں، کسی کے لیے جوتا لایا ہوں، کسی کے لیے مٹھائی لایا ہوں، یہ سارے ارمان اس کے دل میں رہے، اور اس ظالم نے، اس قاتل نے، اس خونخوار نے، ہزار چیتوں سے زیادہ خونخوار، ہزار بچھوؤں سے اور سانپوں سے زیادہ لعنتی، اس نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ، نہ یہ دیکھا کہ کہاں سے آیا ہے؟ کتنی دور سے آیا ہے؟ کیسے کیسے سہانے خواب دیکھتے ہوئے آیا ہے؟ اور چھرا گھونپ دیا، دنیا میں کون سا مذہب ہے جو اُس کو سینے سے لگائے اور پیار کرے؟ جوتوں سے مارے جانے کے قابل ہے، جوتوں کی توہین ہے، جوتوں کے تلووں کی توہین ہے، پاک ہاتھ اس پر پڑ کر ناپاک ہو جائے گا۔

کیا زمانہ میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

میرے بھائیو! یہ پنپنے کی باتیں ہیں؟ یہ خدا کے پیار و محبت کو کھینچنے والی باتیں ہیں؟ یہ دنیا میں ترقی کرنے والی اور ملک کو نیک نام کرنے والی باتیں ہیں؟ جب ہم باہر جاتے ہیں تو ہمارا سر جھک

جاتا ہے، میں دوسرے ممالک میں جاتا ہوں، لوگ پوچھتے ہیں کہ بھائی تمھارے ملک میں روز فساد ہوتا ہے، روز ایک قصہ ہوتا ہے، ہنگامہ ہوتا ہے، کیا جواب ہے اس کا سوائے اس کے کہ سر جھکالوں، اور کہوں کہ بھائی جہالت کا کرشمہ ہے، جب تہذیب آئے گی، علم آئے گا، خدا کا خوف ہوگا تو یہ سب نہیں ہوگا، کب ہوگا وہ؟ اس سے پہلے تو قیامت آجائے گی، اتنے دنوں سے تو ہم دیکھ رہے ہیں، کچھ نہیں ہوا، کیسے کیسے تمھارے یہاں ریفارمر (Reformer) پیدا ہوئے، اور اسی نواح کے رہنے والے محمد علی، شوکت علی نے کس طرح ہندو مسلم ایکتا کا نعرہ لگایا، سارے ملک میں ایک نشہ سا چھا گیا، میں نے دیکھا ہے اور حضرات نے بھی دیکھا ہوگا، میں دس گیارہ سال کا تھا، خدا کی شان ہے، اگر کہیں ہندوستان ویسے رہ جاتا تو کیا ہوتا، یعنی دل سے دل ملے ہوئے تھے، ہندو مسلم گلے ملتے تھے، کیسا اچھا زمانہ تھا، لیکن انگریز کی چال چل گئی، لارڈ ہارڈنگ نے یہاں ایک کھیل کھیلا، اس نے لڑا کے دکھا دیا، اور پھر اس کے بعد آج تک وہ منظر نہیں آیا، کہیں کہیں ہم نے اس منظر کی جھلک دیکھی ہے، اور اس کی جھلک یہاں بھی نظر آتی ہے کہ آج آپ لوگ بلاتفریق مذہب وملت اتنی تعداد میں جمع ہوئے ہیں، ایک ایسے شخص کی بات سننے کے لیے جس کو آپ جانتے نہیں، پہچانتے نہیں، اور اس کی شخصیت کچھ نہیں۔

یہ لمبی نیند ہے

مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں، خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ملک سویا ہے، مرا نہیں، سویا ہوا جگایا جاسکتا ہے، لیکن مرا ہوا جلایا نہیں جاسکتا، ہم سوئے ہیں، مرے نہیں، خدا کا شکر ہے، رب کا شکر ہے، پیدا کرنے والے کا شکر ہے ہم کئی بار سوئے، کئی بار جاگے، یہ انسانیت کئی بار سوئی، کئی بار جاگی، اور جاگی تو ایسی جاگی کہ اپنے سونے کی سب تلافی کردی، ہمیں امید ہے کہ ہمارا ملک جب جاگے گا تو اس سونے میں جو جو حرکتیں ہوئیں، وہ جو سوتے ہوئے اس کا ہاتھ کسی پر پڑ گیا تھا، کسی کو تکلیف ہوئی تھی، سب کی معافی مانگ لے گا، یہ سونے والا جب جاگے گا تو سب کی معافی مانگے گا، سب کے پاؤں پکڑے گا کہ سونے میں اگر کوئی بات ہوئی ہو تو ہمیں معاف کیجیے، ہمیں خبر نہ تھی، یہ سب ایک لمبی نیند ہے جس کو آپ دیکھ رہے ہیں۔

میں ان فسادیوں کو سویا ہوا انسان سمجھتا ہوں، ان کو راکشس نہیں سمجھتا، ان کے اندر کا انسان سو گیا ہے، اور ان کے باہر کا حیوان جاگ گیا ہے، اور چاہیے یہ کہ ان کے باہر کا حیوان سو جائے اور ان کے اندر کا انسان جاگ جائے۔

کیا ہم فسادات کی خبریں ہی سننے کے لیے زندہ رہ گئے؟

ہمیں اپنے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں، اپنے متعلق ہمیں کوئی دھوکہ نہیں کہ ہم دنیا میں کوئی بڑا انقلاب لے آئیں گے، ہمیں اپنی حقیقت خوب معلوم ہے، مگر کیا کریں بیٹھا نہیں جاتا، ہم اخبار ہی دیکھنے کے لیے زندہ رہ گئے؟ ہم فسادات کی خبریں ہی سننے کے لیے زندہ رہ گئے؟ ہم انسانیت کی تذلیل دیکھنے کے لیے ہی زندہ رہ گئے؟ ہم سے زیادہ بدقسمت کون ہے؟ ارے بھائی! بجائے اس کے کہ ہم اخبار میں پڑھیں، ہم سے جو کچھ ہوسکتا ہے ہم وہ کریں۔

میں نے ۵۱-۵۲ء سے یہ کام شروع کیا تھا، جب میں ہندوستان کے باہر سے آیا اور یہاں دیکھا تو مجھ سے رہا نہیں گیا، میں نے اس وقت پکار لگائی، میرے جو مضامین ہیں ''مانوتا کا سندیش''[1] وغیرہ اسی زمانہ کے ہیں، مگر اس کے بعد میں دوسرے کاموں میں لگ گیا، خدا مجھے معاف کرے، میرا مالک مجھے معاف کرے، مجھے اس کام کو سب پر مقدم رکھنا چاہیے تھا۔

بس میں اپنی بات ختم کرتا ہوں، میں نے آپ کا بہت وقت لیا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں نے یہاں جو بات کہی، وہ خدا لگتی بھی کہی اور آپ کی اپنی کہانی سنائی آپ کو۔[2]

---

(۱) جنوری ۱۹۵۴ء میں مخلوط اجتماعات میں کی گئی پانچ تقریروں کے مجموعہ ''پیام انسانیت'' کا ہندی ترجمہ۔

(۲) یہ تقریر پہلے پندرہ روزہ ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۱۰/اپریل ۱۹۷۹ء) میں اور اس کے بعد متعدد بار علاحدہ رسالہ کی شکل میں بھی شائع ہوئی۔

۱۰

اس ملک کو تباہی سے بچائیے![1]

حضرات! ہمارے قدیم و فاضل دوست جناب نسیم قریشی صاحب نے اپنی محبت سے آپ سب کی جانب سے میرا خیر مقدم کیا ہے، اور یہ کہہ کر مجھے شرمندہ کیا ہے کہ آپ حضرات کی خوش نصیبی ہے کہ میں آپ کے درمیان ہوں، لیکن اگر آپ حضرات کی خوش نصیبی فرداً فرداً ہے تو میرے حصے میں یہ خوشی اسی تعداد میں آئی ہے جو تعداد آپ کی ہے، اس لیے کہ آپ ایک سے مل رہے ہیں اور میں آپ سب سے مل رہا ہوں، اس لیے کہ اگر آپ میں سے کوئی صاحب ایک بار خوش نصیب ہیں تو میں کم سے کم دو سو بار خوش نصیب ہوں، اس لیے کہ ایک جگہ پر مجھے اتنے فاضل دوستوں سے اور ایسی دانش گاہ کے محترم اساتذہ، مسلمانوں بلکہ ہمارے ملک کے نئی نسل کی تعلیمی وفکری رہنمائی کرنے والوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔

تشویش کی اصل بات

حضرات! فرد کا معاملہ ہو یا کسی جماعت کا، معاشرہ کا مسئلہ ہو یا کسی ملت کا، میرے نزدیک یہ قطعاً تشویش کی بات نہیں ہے کہ وہ فرد کسی بحران سے گزر رہا ہے یا جماعت گزر رہی ہے، یا وہ فرد اور معاشرہ دورِ ابتلا سے گزر رہا ہے، اس لیے کہ یہ زندگی کی علامت ہے۔

انسان جب دنیا میں آتا ہے تو اپنی بے پایاں صلاحیتوں کے ساتھ کچھ فطری کمزوریاں بھی لاتا ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ انسانی زندگی کا عیب نہیں بلکہ اس کی خوبی ہے اور زندگی کی علامت

(۱) ۱۷ر اپریل سے ۲۷ر اپریل ۱۹۸۰ء تک حضرت مولاناؒ نے تحریک پیام انسانیت کے سلسلے میں علی گڑھ، دہلی، مرادآباد اور رامپور کا سفر کیا تھا، اسی سلسلے میں مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) کے گیسٹ ہاؤس میں منعقد ایک جلسہ میں یہ تقریر کی گئی، اس جلسہ میں اس دانش گاہ کے تقریباً ڈھائی سو اساتذہ اور مختلف شعبوں کے صدور موجود تھے، جلسہ کی صدارت ڈاکٹر نذیر احمد صاحب (صدر شعبۂ فارسی) نے کی۔

بھی کہ وہ خارجی اثرات سے متاثر ہوتا ہے، اس کے اندر جو متضاد طاقتیں کام کرتی ہیں، ایک طاقت دوسری طاقت پر غلبہ پالیتی ہے، پھر دوسری طاقت ایک طاقت پر غلبہ پالیتی ہے، اس لیے بیماریاں، کمزوریاں، آزمائشیں اور زندگی کے نشیب و فراز یہ بالکل کسی تشویش اور پریشانی کا باعث نہیں۔

آپ میں سے اکثر کی نظر تاریخ پر ہے، اور میرا بھی پسندیدہ موضوع انسانی تاریخ ہے؛ بلکہ اسلامی تاریخ جو کہ ایک بہتر انسانی تاریخ بھی ہے، اس لیے میں تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ کسی معاشرہ، ملک اور کسی دور کا کسی اخلاقی کمزوری میں مبتلا ہو جانا یا کسی آزمائش سے اس کا عہدہ برآ نہ ہو سکنا، کسی فتنہ کا شکار یا کسی اندرونی خواہش سے مغلوب ہو جانا، یہ قطعاً کسی استعجاب یا اس سے بڑھ کر اضطراب کا مستحق نہیں، یہ انسانی زندگی کی ایک ایسی حقیقت ہے جس سے تاریخ کا ہر طالب علم نہ صرف اچھی طرح واقف ہوتا ہے، بلکہ قوموں، تہذیبوں کے زوال، فلسفہ، معاشرہ اور اخلاقیات کے انحطاط اور اسلامی تحریکات کی ناکامی جیسے پریشان کن واقعات سے باخبر ہوتا ہے اور ان سے وہ قطعاً مضطرب اور متاثر نہیں ہوتا، ایک حساس، دردمند دل اور ضمیر رکھنے والے انسان کی حیثیت سے مجھے بالکل پریشانی نہیں ہے کہ ہمارا معاشرہ، ملک اور ہماری ملت اسلامیہ کچھ بیماریوں کی شکار ہے، اور اس میں بعض غیر صحت مند چیزیں پائی جاتی ہیں۔

بلکہ اصل تشویش کی بات یہ ہے کہ اس کا مقابلہ کرنے والی کوئی جماعت، اس سے نبرد آزما ہونے والی کوئی طاقت موجود نہیں، انسانی زندگی بلکہ انسانی تقدیر کے لیے سب سے زیادہ پریشان کن اور اضطراب انگیز یہ ہے کہ بیماری ہو اور اس کا علاج کرنے والا کوئی نہ ہو، سیلاب آرہا ہو اور اس پر کوئی بند باندھنے والا نہ ہو، زلزلہ آنے والا ہو، اور اسے محسوس کرنے والا نہ ہو، آگ لگی ہوئی ہو اور اس کا کوئی بجھانے والا یا کم سے کم بے قراری کے ساتھ چیخنے والا نہ ہو کہ ''آگ لگی ہے!''، ''آگ لگی ہے!''، جو کہ انسانی زندگی کی بالکل ابتدائی اور ادنیٰ علامت ہے۔

انسان کے زندہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ ایسے پریشان کن حالات سے متاثر ہوتا ہے اور اس کے اندر کے احساسات اور اس کا باطن اس کے خلاف احتجاج کرتا ہے، اور مختلف شکلوں میں اپنے ردعمل کا اظہار کرتا ہے، اور آئینہ کی طرح وہ عکس بھی دکھاتا ہے، مگر گردوپیش کے واقعات کا آئینہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس لیے اس کی کوئی قیمت بھی نہیں ہوتی، میرے لیے صرف یہ پریشانی کی

بات نہیں ہے کہ ہمارے معاشرہ میں کچھ خرابیاں پائی جاتی ہیں، ہماری موجودہ نسل کسی غلط راستہ پر پڑ گئی ہے، یا اس کی منزل کا کوئی سراغ نہیں لگ رہا ہے، اور اقبالؔ کی زبان میں "متاعِ کارواں بھی نہیں ہے اور احساسِ زیاں بھی نہیں ہے"۔

میرے نزدیک پریشانی کی اصل بات یہ ہے کہ اس صورت حال کو ناپسند کرنے، اور اس سے تکلیف محسوس کرنے، اور اس چیلنج کو قبول کرنے، اور اس کے خلاف صف آرا ہونے والا کوئی نہیں ہے، اور یہ تو حالات کے مطابق ہوتا ہے کہ کیا کوئی فرد یہ خدمت انجام دے سکتا ہے یا جماعت، بہر حال جیسے بھی ہو، اس صورت حال کو محسوس کر کے اس کے خلاف میدان میں اترنے والا اور اس سے آنکھیں ملانے والا کوئی نہیں۔

حضرات! جن لوگوں کی فلسفۂ تاریخ پر نظر ہے، اور آپ لوگوں میں کافی حضرات ہوں گے؛ جن کا یہ موضوع ہوگا، اور انھوں نے انسانی تہذیب کے ارتقاء اور اس کی داستان پڑھی ہے، اور مختلف ملکوں میں اس کے نشیب و فراز کا مطالعہ کیا ہے، وہ حضرات تو اس سے پورے طور پر واقف ہوں گے کہ ایسا ہوتا ہے، ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا، لیکن جو چیز ایک طرف انسان کو فرشتوں سے ممیّز کرتی ہے اور دوسری طرف حیوانات و نباتات سے، وہ یہ چیز ہے کہ انسان خارجی حالات سے متأثر ہوتا ہے، لیکن میرے کہنے کی بات یہ ہے کہ صورت حال خواہ تشویش ناک ہو، لیکن کوئی تشویش محسوس نہ کرے، حالات کا مقابلہ کرنے والا، خم ٹھونک کر میدان میں آنے والا، اور اس کے لیے اپنے ذاتی یا جماعتی مفادات کو خطرے میں ڈالنے والا کوئی موجود نہ ہو، یہ وہ چیز ہے جو کسی قوم و ملت کے بارے میں گہری مایوسی یا کم از کم گہری تشویش تک پہنچا دیتی ہے، ایسا بہت ہوا ہے کہ قومیں جانکنی میں مبتلا ہو گئی ہیں، اور ان کے دن گنے جانے لگے ہیں، اور زمانہ کے تیمارداروں اور نبض شناسوں کا ان کے نبض پر ہاتھ رہا ہے، لیکن ہم نے بارہا تاریخ میں دیکھا ہے کہ قوم اس نزع کی حالت سے نکل آئی ہے، اور بالکل جواں سال زندہ اور تازہ دم قوم کی حیثیت سے میدان میں آ گئی ہے، وجہ یہی ہے کہ کوئی ایسا عنصر اس ملت میں ابھر کر آ گیا جس نے یہ فیصلہ کیا کہ اس صورت حال کو زیادہ دنوں تک جاری رہنے کی اجازت نہیں دے گا۔

یا جاں زتن برآید یا تن رسد بجاناں

جب اس نے اپنی زندگی اور اپنے مفادات کو داؤں پر، اور اپنے تعلقات کی دنیا کو صبر و ثبات پر لگا دیا، کہ قوم و ملت کو دم توڑنے نہ دیا جائے گا، اور اس معاشرے کو دم توڑنے، اور اس شہر کو فنا اور خاکستر نہ ہونے دیا جائے گا۔

ملک وملت اور تہذیب وتمدن کو تباہی سے صرف دو طبقے بچا سکتے ہیں

یہ اصل میں کسی ملت، معاشرہ اور کسی تہذیب کی سب سے بڑی طاقت ہوتی ہے کہ اس کے اندر ایک صالح عنصر ایسا ہو جو ایسے موقعوں پر اپنی زندگی کو ملت کی زندگی پر اور انفرادی مفاد کو اجتماعی مفاد پر قربان کر دینے کے لیے تیار ہو، اور عام طور پر ہم نے دیکھا ہے اور تاریخ کے مطالعہ سے بھی اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایسے موقعوں پر دو طبقے ہوتے ہیں جن سے توقع کی جاتی ہے، اور وہی انسانوں کی امیدوں کے پناہ گاہ ہوتے ہیں، اور یہی ایسے موقعوں پر سر سے کفن باندھ کر آتے ہیں اور زمانے کی کلائی موڑ دیتے ہیں، تاریخ کے دھارے اور حالات کے رخ کو تبدیل کر دیتے ہیں، اور کاتب تقدیر کے لیے ایک نیا مواد فراہم کرتے ہیں، پھر ملت یا معاشرہ کی زندگی میں ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔

یہ دو طبقے ہیں جو کسی ملت، کسی معاشرہ، کسی تہذیب وتمدن اور ملک کی آخری پناہ گاہ ہوتے ہیں، ایک دانشور کا طبقہ اور دوسرا مذہبی طبقہ، یہ دو طبقے ایسے ہیں جنھوں نے ڈوبتی ہوئی کشتیوں کو بچالیا ہے، اور ساحل تک پہنچا دیا ہے، اور ان تہذیبوں کو جو دم توڑ رہی تھیں، ان کے اندر زندگی کا نیا خون دوڑا دیا ہے، اور جب بھی ایسا کوئی دور آتا ہے ملت یا معاشرہ کی زندگی میں، تو اس کی نظر ہمیشہ ان دو طبقوں پر جاتی ہے، ایک دانشوروں کا طبقہ اور دوسرا مخلص مذہبی انسانوں کا طبقہ، میں "مخلص" کا لفظ جان بوجھ کر استعمال کر رہا ہوں، بے لوث، بے غرض، غیر پیشہ ور مذہبی انسان، عیسائیت کی تاریخ میں اس کا بار بار نام آتا ہے اور اس کے بغیر یورپ کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی، میری مراد یہ نہیں کہ کوئی ایسا مذہبی طبقہ جو مذہب کا اجارہ دار ہو، یعنی علماء مشائخ کا کوئی نسلی موروثی طبقہ؛ بلکہ بے لوث، غیبی حقائق، ایمانیات اور خدا کے پیغمبروں کی لائی ہوئی حقیقتوں اور صداقتوں پر ایمان رکھنے والا طبقہ جو اس کو ہر چیز پر ترجیح دیتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ یہی اصل حقیقت اور یہی بنیاد ہے۔

یہ دو طبقے جو عام طور سے سب سے آخر میں گراوٹ کا شکار ہوتے ہیں، اور جب ان میں بھی خرابی آجاتی ہے، تو پھر اس ملت اور تہذیب کو بچانے والی دنیا میں کوئی طاقت نہیں رہ جاتی، بڑی سے بڑی شہنشاہیاں اور طاقتور حکومتیں اگر چاہیں کہ اس تہذیب اور اس معاشرہ کو بچالیں تو وہ نہیں بچا سکتیں، اس لیے کہ یہ دو طبقے ہیں جن سے ملت یا معاشرہ کا اعتدال قائم رہتا ہے، اور زندگی کے جو اصول ہیں وہ صحیح طور پر گردش کرتے ہیں، اور فطرت صحیح طور پر کام کرتی ہے، اگر خدانخواستہ یہ بھی

اپنا مقام چھوڑ دیں اور اپنے منصب سے ناآشنا ہو جائیں اور یہ بھی ساز باز کرلیں (مجھے معاف کیا جائے یہ لفظ ذرا سخت ہے) یا کم سے کم سمجھوتہ کرلیں، یہ بھی اپنی جگہ تلاش کرنے میں لگ جائیں کہ اس بگڑے ہوئے ماحول میں ہماری جگہ کیا ہے، اور یہ سمجھ کر کہ اس ملت یا اس تہذیب کی قسمت میں تباہی تو لکھی ہی ہوئی ہے اور اب یہ کشتی ڈوب کر رہے گی ہی، اس لیے ڈوبنے سے پہلے کچھ فائدہ اٹھالیں اور اپنی خواہشات پوری کرلیں، یہ دُھن کسی قوم کے لیے بس قیامت ہوتی ہے، پھر اس قوم کو کسی مصنوعی تدبیر یا دنیا کی کسی بڑی طاقت سے بچایا نہیں جا سکتا، اگر دنیا کے سارے مصنف اور تمام فلاسفر جمع ہو جائیں، اور حکومت کے سارے وسائل موجود ہوں، تو بھی اس ملت یا تہذیب کو کوئی بچا نہیں سکتا، یہی دو طبقے ہیں جن سے انسانیت کی آس لگی رہتی ہے، اور ہمیشہ ان دونوں نے ایسے نازک اور آڑے وقت میں دستگیری کی ہے، اور ڈوبتی ہوئی کشتی کو ساحل مراد تک پہنچا دیا ہے۔

دانشور طبقہ کی خصوصیت

کیوں؟ اس لیے کہ دانشور طبقہ ان خطرات سے آگاہ ہوتا ہے، مفاد پرستی، نفس پرستی، مادیت پرستی، تنگ نظری، نسلی و خاندانی عصبیت، اقربا نوازی، کنبہ پروری، اور اپنے ذاتی اور قریبی مقاصد کو سامنے رکھ کر اجتماعی مقاصد کو نظر انداز کر دینے کے خطرات سے واقف رہتا ہے، اور اس طبقہ کا مطالعہ، ذہانت، قوت فکر اور پھر اس کے علم کا شغف، اپنے مقصد سے عشق، یہ چیزیں ان کو ایسے موقعوں پر دوسروں کے بیدار ہونے سے بہت پہلے بیدار کر دیتی ہیں، اس لیے کہ اس نے انسانی تاریخ کو پڑھا ہے، اور وہ قوموں کے عروج و زوال کے فلسفہ سے باخبر ہے، یہ طبقہ خوش قسمتی سے ملت اسلامیہ سے تعلق رکھتا ہے، جس نے قرآن مجید کا گہرا، وسیع اور عمیق مطالعہ کیا ہے، اس نے قرآن مجید کے آئینے میں قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل معلوم کیے ہیں، اس کو معلوم ہے کہ قومی خرابیاں جب کسی معاشرہ اور کسی اجتماعی نظام میں پیدا ہوتی ہیں تو اس کے نتیجہ میں کیا تباہیاں آتی ہیں۔

قرآن مجید نے کہا ہے: ﴿وَإِذَآ أَرَدْنَآ أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا۟ فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا ٱلْقَوْلُ فَدَمَّرْنَٰهَا تَدْمِيرًا﴾ (سورة الإسراء:١٦)

دوسری جگہ قرآن مجید میں ہے: ﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا فِى كُلِّ قَرْيَةٍ أَكَٰبِرَ مُجْرِمِيهَا لِيَمْكُرُوا۟ فِيهَا، وَمَا يَمْكُرُونَ إِلَّا بِأَنفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُونَ﴾ (سورة الأنعام:١٢٢)۔

وہ جانتا ہے کہ کسی قوم میں نفس پرستی کا مرض جب پیدا ہو جاتا ہے، یا ذاتی اغراض دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں، اور انسان بالکل اندھا بہرا بن جاتا ہے، اور وہ صرف اپنے اندر کی پیاس بجھانا

چاہتا ہے، اپنے محدود مفادات کے لیے پوری ملت، تہذیب اور پورے معاشرہ کو قربان کر دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے، تو پھر کس طرح اس معاشرہ اور تہذیب کو ختم کر دینے کا فیصلۂ خداوندی ہوتا ہے، اگر وہ ایمان کی روشنی رکھتا ہے اور قرآن مجید سے اس کا تعلق ہے تو اس کی تاریخ کا مطالعہ قرآن مجید کے مطالعہ سے مل کر ان دونوں کے اتحاد سے اس کے اندر ایک نئی روشنی پیدا ہوتی ہے، اور وہ سمجھ لیتا ہے کہ اب اس ملت یا اس معاشرہ کو بچانے والی کوئی طاقت نہیں، اس لیے کہ وہ ذہنی طور پر یہ سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے کہ اس وقت کیا آثار ہیں، اور کون سا طوفان آنے والا ہے، وہ بہت پہلے سے یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس معاشرہ میں بگاڑ شروع ہو گیا ہے، اور اس بگاڑ کا سرچشمہ کیا ہے، اسی لیے وہ سب سے پہلے بے چین ہوتا ہے، اور پھر اگر اس میں ہمت ہے تو وہ بے چین دوسروں کو بناتا ہے، اس لیے کہ بے چین ہونے کی فطری صورت میں اس کا جو رجحان ہے وہ یہ کہ بے چینی اسی کی ذات تک محدود نہ ہو، بلکہ وہ دوسروں کو بھی بے چین بنائے، اور اگر اس کے بس میں ہو تو اس کو جھنجھوڑ دینے کے لیے کسی پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہو جائے اور صور پھونک دے، اس کے اندر ذہنی طور پر وہ صلاحیت ہوتی ہے جو عام لوگوں میں نہیں ہوتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس میں ان مفادات سے بالاتر ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے، اس کا مطالعہ اس کے اندر وہ صلاحیت پیدا کر دیتا ہے کہ جن داموں عام افراد بک جاتے ہیں وہ ان داموں میں نہیں بک سکتا۔

علم کی فطرت

اگر علم یہ بات بھی پیدا نہ کرے تو پھر وہ علم حقیقت میں علم کہلانے کا مستحق نہیں ہے، اگر علم وسعت شناسی پیدا نہ کرے، اور اگر علم انسان کی حقیقت کو اس پر واضح نہ کرے تو وہ علم کہلانے کا مستحق نہیں۔

علم کی تو فطرت ہی یہی ہے کہ وہ انسان اور اس کی نگاہ کو بلند کرتا ہے، اور یہ بتاتا ہے کہ مطالعہ میں کیا لذت ہے، اور اپنے مطالعہ کے گوشے میں بیٹھ کر ایک انسان کس طرح بادشاہی کرتا ہے، اور وہ کس طرح آسانی کے ساتھ تخت و تاج کو قربان کر سکتا ہے، اور وہ کہتا ہے:

بر و ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

وہ دانشور طبقہ جو کسی ملت یا معاشرہ کا سب سے بڑا حصار ہوتا ہے

میرے سامنے ایسے فضلاء، مصنفین اور محققین موجود ہیں جو اس منزل سے گزر چکے ہیں، اور مجھے یقین ہے اور میں ایک ادنی طالب علم کی حیثیت سے بھی کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ علم اس کے لیے کوئی کاروباری پیشہ نہیں، اس کے نزدیک کوئی معاملہ لین دین کا نہیں، بلکہ وہ علم کا صحیح معنی میں محرم اور قیافہ شناس ہے، اور بعض وقت ایسا گزرتا ہے کہ علم وتحقیق کی کسی گم شدہ کڑی کے مل جانے سے انسان کو وہ سرور حاصل ہوتا ہے جس کے سامنے ہفت اقلیم کی دولت بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتی، میں سمجھتا ہوں کہ جن کو خدا نے علم کا ذوق عطا فرمایا ہے اور جنھوں نے دل لگا کر تحقیق کا کام کیا ہے وہ چاہے اپنی ذات سے کتنی ہی کم حیثیت کا انسان ہو؛ لیکن علم کی لذت اور تحقیق کی کامیابی کے سامنے وہ بڑی سے بڑی چیزوں کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔

یہ دو چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق دانشور طبقہ کے متعلق جو امید کی جاتی ہے یا زیادہ محتاط انداز میں امید کی جانی چاہیے کہ وہ سب سے آخر میں آزمائشوں کا شکار ہوگا، اور اس سیلاب میں تنکے کی طرح نہ بہنے لگے گا جو سیلاب بلا قوموں اور تہذیبوں کو بہا کرلے جاتا ہے، پھر اس کا پتہ نہیں چلتا، تاریخ کے ملبہ میں بڑی جستجو کے بعد ان قوموں کا نشان ملتا ہے کہ یہ قومیں (مثلاً رومی تہذیب، یونانی تہذیب، ہماری قدیم ہندوستانی تہذیب، قدیم ایرانی تہذیب) کسی زمانے میں تھیں، اور انھوں نے کیا فتوحات حاصل کیں، علم وتحقیق کے میدان میں انھوں نے نسل انسانی کی کیا خدمت انجام دی، اور تمدن کی کیا تشکیل کی، اور اپنے زمانے کے انسانوں کی کیا رہنمائی کی، اور کس طرح انسانی شیرازہ بندی کی، وہ کیا حقائق اور بنیادیں فراہم کیں جن سے صالح تمدن وجود میں آتا ہے، بعض اوقات تاریخ کی تاریکی میں صدیوں تک دور چلے جائیے، مگر قوموں اور ان کی تہذیبوں کا سراغ تک نہیں ملتا۔

دانشور طبقہ علم کی جس بلندی پر ہوتا ہے اور ایسے مقام پر بیٹھا ہوتا ہے کہ پورے ملک کا نقشہ اس کے سامنے ہے، اور وہ دیکھتا ہے کہ لوگوں کو بڑے بڑے اعزاز مل رہے ہیں، بڑے بڑے تحفے مل رہے ہیں، دولت میں اضافہ کرنے کے بڑے مواقع حاصل ہو رہے ہیں، تو آپ اس کو کبھی ہنستا ہوا دیکھیں گے کبھی روتا ہوا دیکھیں گے، اور بعض اوقات اس کو شاید روتا ہوا زیادہ، ہنستا ہوا کم پائیں گے، کبھی کبھی انسانوں کی ارزاں فروشی اور اس طرح نیلام کی منڈی میں چڑھ جانے اور بڑے بڑے رشی انسانوں کے اتنے سستے بک جانے، اور اس طرح انسانی ضمیروں کا سودا ہونے اور انسانی

اصولوں کے قربان ہونے پر اس کو کبھی ہنسی آتی ہے اور کبھی رونا آتا ہے، اور بعض اوقات ہنسنے اور رونے کا ایک ایسا ''مجموعہ'' بلکہ ''آمیزہ'' ہوتا ہے کہ اندازہ نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں ہنسنے کا عنصر زیادہ ہے یا رونے کا عنصر، ایسا دانشور طبقہ کسی ملت یا معاشرہ کا سب سے بڑا احصار ہوتا ہے۔

روشن ضمیر مذہبی دانشوروں کی بے لوث قیادت

انگریزوں کے تسلط اور ان کے اقتدار سے پہلے جب ہندوستان میں اخلاقی اور سیاسی انتشار پیدا ہوگیا تو ہندوستان کا دانشور طبقہ شاہ ولی اللہؒ کی قیادت میں سامنے آیا، میں اپنے محدود مطالعہ کی بنا پر کہوں گا کہ ہندوستان کے مذہبی طبقہ کی قیادت کا دور تھا، اور وہ مذہبی طبقہ دانشور بھی تھا، وہ اعلی درجہ کا علم بھی رکھتا تھا، لیکن اس تبدیلی میں اس کی روحانیت اور اس کی مذہبی حیثیت کو زیادہ دخل تھا۔

مجدد صاحب نے جو انقلاب برپا کیا، اس انقلاب کا سہرا روحانیت، روحانی تربیت، عزم و یقین، توکل علی اللہ اور بے لوثی و بے غرضی کے سر باندھا جانا چاہیے، وہ ایک مستحکم انسانیت، ایک بے لوث دینداری، ایک مخلصانہ خدمت کے جذبہ کا کارنامہ تھا۔

لیکن اٹھارویں صدی کے انقلاب میں جو انتشار پیدا ہوا اور اس انتشار میں جو مسلمانوں کی فطری قیادت کی گئی، اور مسلمانوں کو ان خطرات سے بچالیا گیا اور ان کو سیاسی استحکام بھی عطا کیا گیا، اس موقع پر میرے نزدیک مذہبی طبقہ سے زیادہ دانشور طبقہ کا ہاتھ تھا، اور جس طرح اس میں علم کا حصہ شامل تھا، لیکن وہاں مذہب غالب تھا، یہاں دانش غالب تھی۔

شاہ ولی اللہؒ نے حجة الله البالغة میں جو نظام پیش کیا ہے اور اس سلسلے میں جو سراغ لگایا اور تجزیہ کیا ہے، اور اسلام کے دینی نظام کو جس طرح زندگی سے مربوط کیا ہے، اور حالات کو بھی مربوط کرنے کی کوشش کی ہے، نیز اسلام کے سیاسی، تربیتی اور فطری نظام اور حدیث سے اس کا رابطہ جس طرح حجة الله البالغة میں پیش کیا گیا ہے، (اس کی نظیر اسلامی کتب خانوں میں نہیں ملتی)، اس میں دانش کا عنصر بھی شامل ہے۔

سیاسی طرز فکر اس فساد کا سب سے بڑا ذمہ دار

ایک مرتبہ ہندوستان کے مذہبی عنصر نے ہندوستان کو یا کم از کم ملت اسلامیہ کو ہمیشہ کے زوال سے بچالیا، اور دوسری مرتبہ دانشور طبقہ نے ملت اسلامیہ کو بچالیا، اب اس وقت ہمارے

سامنے جو حالات ہیں آپ ان کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں، ان حالات کو دور کرنے کی کیا تدبیریں ہیں، اور اس سلسلے میں جو مختلف نظریات پیش کیے جاتے ہیں، ان کی کیا نوعیت ہے؟ اس وقت اس کی تردید یا تنقیص نہیں کرنا چاہتا؛ لیکن تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں آپ کے سامنے اپنے مطالعہ کا نچوڑ رکھنا چاہتا ہوں کہ اس وقت یہی دو طبقے (دانشور طبقہ اور مذہبی طبقہ) ہندوستان کو بچا سکتے ہیں، اس وقت ہندوستان میں جو اخلاقی زوال (اور میں تو اسے انسانی زوال کہوں گا) جس بھیانک شکل میں لاوا کی طرح پھوٹ گیا ہے، اور یہ آتش فشاں جیسے اپنی لپیٹ میں سارے ہندوستان کو لے لینا چاہتا ہے، اور کہیں روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی، سب سے زیادہ مایوس کن صورت حال سیاسی پارٹیوں کی ہے، اور حقیقت میں سیاسی پارٹیاں اور سیاسی طرز فکر اس فساد کا سب سے بڑا ذمہ دار ہے۔

نازک صورت حال

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہندوستان کو تو ڈوبنا ہے ہی، اس کو تو اب کوئی بچا نہیں سکتا، لیکن یہ گائے جو مر رہی ہے، مجھے معاف کیجیے، میں نے ایک ایسے جانور کا نام لیا جو کچھ لوگوں کے نزدیک مقدس ومحترم ہے، لیکن میں اسے صرف مثال کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہوں) یہ گائے جو جاں بلب ہے اس کا جتنا دودھ دوہا جا سکتا ہے، (اور دودھ دینے کے لیے اس سے عمدہ جانور کوئی نہیں)، اس کے دودھ کا آخری قطرہ بھی جو ہم حاصل کر سکتے ہیں حاصل کر لیں۔

مجھے معاف کیا جائے یہ صورت حال ہمارے ملک کی ہے، کسی خدا کے بندے کو خاص طور سے سیاسی جماعت میں جانے کے بعد تو گویا دروازے بند ہو جاتے ہیں، میں ''ضمیر'' کو نہیں کہتا کہ مجھے اس میں شبہ ہے کہ وہاں ضمیر بھی ہوتا ہے کہ نہیں، اور ضمیر حجاب بھی ہے اور ضمیر مفید سمجھا جاتا ہے سیاسی پارٹیوں کی کامیابی کے لیے یا حارج سمجھا جاتا ہے، اس لیے میں ضمیر کا نام نہیں لوں گا، البتہ دماغ کو کہتا ہوں کہ کم از کم دماغ تو سیاسی پارٹیوں کے لیے ضروری ہے، بغیر دماغ کے تو ان کا کام نہیں چل سکتا، تو مجھے شبہ ہوتا ہے کہ دماغ کے سارے دروازے بھی بند ہو جاتے ہیں کہ ملک کی صورت حال کو سنجیدگی کے ساتھ ایک محبّ وطن کی حیثیت سے، کم سے کم خاک وطن کے ایک فرزند کی حیثیت سے بھی غور کیا جائے کہ اس ملک کا کیا بنے گا؟

سیاسی پارٹیوں کا اس ملک کے بگاڑ میں نوے فیصدی حصہ ہے، دس فیصدی میں اور سب جماعتیں ہوں گی۔

ڈوبتی کشتی کے آخری ملاح

اس حالت میں صرف دو ہی طبقے ہیں جو اس ملک کو تباہی سے بچا سکتے ہیں، مجھے اس پر اصرار ہے کہ دو ہی طبقے اس ملک کو بچا سکتے ہیں، ایک دانشور طبقہ جس کی نمائندگی آپ کرتے ہیں، اور ایک مذہبی طبقہ جس کی ذمہ داری تھوڑی سی مجھ پر بھی عائد ہوتی ہے، اگر خدانخواستہ اس طبقے کے اندر بھی فساد پیدا ہو جائے گا، تو پھر دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت اس ملک کو تباہی سے نہیں بچا سکتی، اس لیے کہ کشتی کے یہی آخری ملاح ہیں جو کشتی کو کنارے لگا سکتے ہیں، ورنہ باقی جتنے بھی ہیں وہ اس بات کے کوشاں ہیں کہ کشتی کے ڈوبنے کا سہرا کس کے سر بندھتا ہے؟

اصل کشمکش

اور جیسا کہ میں نے اپنی بعض تقریروں میں کہا ہے کہ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ملک میں بدامنی و بداخلاقی ہے، اور جرائم بڑھ رہے ہیں؛ بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ وہ کس کی نگرانی اور کس کے اقتدار میں ہے؟ کرپشن بالکل پانی اور ہوا کی طرح عام ہے، نہ اس سے دانش گاہیں بچی ہیں نہ کوئی مرکز بچا ہے، اور نہ اس سے محکمے بچے ہیں، اسی طرح اس بات سے کسی کو پریشانی نہیں کہ تعلیم کا معیار گر رہا ہے، نوجوانوں کے اخلاق کا کوئی معیار ہی نہیں؛ بلکہ اخلاق نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔

بین الاقوامی میدان میں بھی ساری کشمکش بڑی طاقتوں کے درمیان اس بات پر ہے کہ دنیا کا جو فساد ہے اس پر ہماری مہر لگتی رہے، ہمارے Certificate اور ہماری تصدیق کے ساتھ ہو، روس کہتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے ہوتا رہے، اس پر ہماری مہر لگتی رہے، ہماری طرف سے یہ جعلی سکے جاری ہوں، امریکہ کا اصرار ہے کہ نہیں! یہ کھوٹے سکے ہماری ٹکسال سے جاری ہوں اور ان پر ہماری مہر لگتی رہے، ان طاقتوں کو اس کی ذرہ برابر پرواہ نہیں کہ انسان انسان کو مار رہا ہے، قومیں دوسری قوموں کی غلام بن رہی ہیں (جیسا کہ افغانستان کا معاملہ ہے)۔

حضرات! یہ ہے عالم گیر صورت حال جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، اب آپ ہی بتائیں کہ اس ملک کو تباہی و بربادی سے کون بچا سکتا ہے؟ ہماری سیاسی پارٹیوں کے منشور میں ملک کے اس اخلاقی بگاڑ اور سماجی گراوٹ پر کسی تشویش کا اظہار نہیں کیا جاتا، اور نہ اس کی اصلاح کی طرف رہنمائی کی جاتی ہے، یہاں بھی یہی مسئلہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہوتا رہے؛ لیکن اس پر ہماری مہر لگتی رہے۔

حضرات! اب میں انسانی تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ اس زرخیز

بلکہ مردم خیز ملک کو اگر کوئی تباہی سے بچا سکتا ہے تو یہی دو طبقے ہیں جنھوں نے ہندوستان کی تاریخ میں اہم رول ادا کیا ہے۔

نازک دور میں ہندوستان کی قیادت اور اس کے روشن کارنامے

آٹھویں صدی کے بعد سے پورے عالم اسلام پر زوال کے جو سیاہ بادل چھائے تھے اس نازک دور میں بھی ہندوستان تفکر، علم، دانش، فلسفہ، تمدن اور فکر انسانی کے ایسے نمونے پیش کر رہا تھا کہ ہمارے وہ عرب ملک جنھوں نے ہندوستان کو توحید، اسلام اور مساوات انسانی کا پیغام دیا تھا، اس زوال کا شکار تھے، آپ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ آٹھویں صدی کے بعد سے پورے عالم اسلام پر مشرق سے لے کر مغرب تک زوال محیط نظر آتا ہے، یہ تو میں ایک مسلمان کی حیثیت سے کہتا ہوں، ایک محبّ وطن کی حیثیت سے بہت کچھ کہہ سکتا ہوں کہ اس ہندوستان نے دنیا کو کیا دیا؟ اس نے سیاسی شعور اور محبت کا تحفہ دیا، فلسفہ و شاعری دی، فکر کی گہرائی اور حقائق اشیاء کے سراغ لگانے کا شوق دیا، میں سمجھتا ہوں کہ میرا مذہب، میرا مطالعہ کوئی چیز بھی اس اعتراف سے مانع نہیں ہے؛ بلکہ میرا فرض ہے کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے اس کا اعتراف کروں؛ لیکن یہ ملک جس حالت کو آج پہنچ گیا ہے، آپ ہی بتائیے کہ اس کو کون بچا سکتا ہے؟ کس کو بچانے کی فکر ہے؟

صرف سیاسی جوڑ توڑ اور دَل بَدلی

میں آپ سے عرض کروں گا کہ صرف ایک مہینہ آپ اس مشہور انگریزی کے اخبارات اول سے آخر تک پڑھ جائیں اور غور کرتے جائیں کہ کس دن آپ نے کسی لیڈر، دانشور اور فلسفی، کسی محبّ وطن اور کسی سوشل ورکر کا بیان پڑھا جس سے یہ پتہ چلتا ہو کہ موجودہ صورت حال پر اس کو سخت اضطراب ہے، وہ بے چین ہے، اس کی راتوں کی نیند اڑی ہوئی ہے، اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ وہ کیا کرے؟ آپ کو سوائے سیاسی جوڑ توڑ اور دَل بدلی کے کچھ نظر نہ آئے گا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سیاسی طور پر ایک ریس ہے جس میں بڑے سے بڑے آدمی، بڑے سے بڑے پہاڑ اپنی جگہ سے جنبش ہی نہیں کر رہے ہیں بلکہ دوڑ رہے ہیں، مقابلہ اس میں ہے کہ در دولت پر حاضری سب سے پہلے کس کی ہوتی ہے، یہ اس ملک کا حال ہے تو آپ ان سیاسی پارٹیوں سے کوئی امید رکھ سکتے ہیں؟ یہ تو وہ پارٹیاں ہیں کہ اگر آگ لگی ہوئی ہو تو اس میں تھوڑا سا پٹرول اور ڈالنے کے لیے تیار ہو جائیں، اگر ان کو حقیر اور موہوم فائدہ معلوم ہو جائے کہ زیادہ آگ لگنے سے ان کو روٹی زیادہ مل جائے گی تو میں سمجھتا ہوں کہ دو

بالٹیاں پٹرول کی اور ڈال دیں، اصل پیمانہ ان کے نزدیک ووٹر لسٹ کا ہوتا ہے کہ کون کتنے ووٹرس حاصل کرسکتا ہے، ان کے نزدیک اخلاقیات، اصول اور ضمیر سب بے معنی الفاظ ہیں، بلکہ یہ سب مضحکہ خیز الفاظ ہیں، اور جو یہ سب بولے اس کی طرف لوگ دیکھتے ہیں کہ کس دنیا کا آدمی آ گیا ہے۔

ملک کے لیے منحوس ترین دن

میں پھر کہوں گا کہ اس ملک کو تباہی سے صرف دانشور طبقہ بچا سکتا ہے جس کا سب سے بڑا مرکز میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہے، جس کی نمائندگی آپ کرتے ہیں، یہ طبقہ اور مذہبی طبقہ، یہ طبقہ اور مذہبی طبقہ، اگر خدانخواستہ علماء کے اندر بھی یہ بات پیدا ہو جائے، اور اور ان کے اندر بھی دوڑ شروع ہو جائے کہ وہ کس طرح سیاسی کامیابی حاصل کرسکتے ہیں، اور کس طرح فلاں پارٹی کو فلاں پارٹی کے مقابلہ میں جتا سکتے ہیں، جس دن علماء کے اندر یہ ذہنیت پیدا ہوگی، وہ دن صرف دین وملت کے لیے نہیں، بلکہ ملک کے لیے بھی منحوس ترین دن ہوگا۔

کسی ملک، کسی سوسائٹی اور کسی تہذیب کو صرف وہ لوگ بچا سکتے ہیں جو ان چیزوں اور اس سطح سے بلند ہوں، اور جن کو یہ (حقیر اور ذاتی) مقاصد کے لیے کوشش کرنے والے، ذاتی اعزاز اور ذاتی منصب حاصل کرنے کے لیے کوشش کرنے والے بالشتیے معلوم ہوں، ان کی نگاہوں سے وہ اس قدر گر جائیں کہ ان سے بات کرنا مشکل معلوم ہو، اگر یہ واقعہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ضرور واقعہ ہے، میں نامیدی کے اس درجہ تک نہیں پہنچا ہوں، اس لیے کہ اس ملک میں دانشور کا طبقہ موجود ہے، اور خدا کے فضل سے علماء کا طبقہ موجود ہے، اور میں یقین کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ میں قریبی تعلق رکھتا ہوں اور اس قریبی تعلق کی بنا پر مجھے حق ہے کہ اس بات کا اعتراف کروں کہ مذہبی طبقہ بھی موجود ہے، ایسے مذہبی انسان موجود ہیں جن کو ہم بھی نہیں جانتے۔

عصر حاضر کی ذہنیت

لیکن اب بھی اللہ کے ایسے بندے ہیں جو ایسے موقعوں پر میدان میں آ جائیں گے، اور کم سے کم جو کچھ ان سے ہو سکے گا وہ خدا لگتی بات کہیں گے، اور خدا کے فضل وکرم سے اب بھی اس طبقہ میں خدا لگتی بات کہنے کی طاقت موجود ہے، اور جب وہ عام سطح سے بلند ہو کر بات کرتا ہے تو لوگ قوم شعیب کی زبان اور الفاظ میں - کبھی زبان حال اور اکثر زبان قال سے - کہنے لگتے ہیں کہ کہاں تک آپ حق و باطل، جائز و ناجائز، معیاری و غیر معیاری، اور حلال و حرام کے پیچھے پڑے رہیں

گے؟ کہاں تک آپ خدا کی خوشی وناخوشی اور مفید ہونے کا اعلان کرتے رہیں گے؟ زمانۂ حال کی اصطلاح میں بات کیجیے تو ہم سمجھیں، معلوم نہیں کس زبان کی باتیں ہیں: ﴿قَالُوا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفًا﴾ (سورة هود: ۹۱)

ایک تو آپ کی بات سمجھ میں نہیں آتی، نہ تو وہ لفظ سمجھ میں آتے ہیں اور نہ لفظوں کا وہ مجموعہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس سے کیا مطلب نکلتا ہے، دوسری بات یہ کہ آپ کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ آپ کے ساتھ مجمع نہیں، (بالکل عصر حاضر کی ذہنیت)، آدمی وہ ہے جس کے ساتھ ہزاروں آدمی ہوں، آدمی تو وہ ہے جس کی ہر بات پر نعرے لگ رہے ہوں، اور جس کی تقریر پر نعرہ نہیں، جس کی بات بات پر نعرہ نہیں، وہ آدمی نہیں، نہ اس کا وزن ہے، اور نہ وہ کچھ کرسکتا ہے، اس کو تو مسجد کے کسی کونے میں بیٹھے رہنے دیجیے۔

اسی دریا سے اُٹھتی ہے وہ موج تند جولاں بھی

لیکن اب بھی خدا کے فضل سے ہر ملک میں مذہبی طبقہ موجود ہے، اور ایسے موقعوں پر مذہبی طبقہ سامنے آیا ہے، مجھے مصر کی اور اسلام کی تاریخ معلوم ہے، آپ کو بھی اسلام کی تاریخ معلوم ہے، میرے سامنے مصر کی تاریخ کا وہ حصہ بھی ہے جب آج سے صرف نصف صدی پہلے حسن البناؒ کے نام سے مصر میں اچانک ایک شخصیت نمودار ہوتی ہے، اور جو پورے مصر پر ہی نہیں پورے مشرق وسطی پر اتنا گہرا اثر ڈالتی ہے کہ ادھر پچھلی تاریخ میں کسی شخصیت کا اتنا گہرا اثر نہیں پڑا، ایک مصری عیسائی صحافی نے لکھا تھا کہ اگر قاہرہ میں کسی کو چھینک آجائے تو اسکندریہ میں یرحمک اللہ کی ہزاروں آوازیں اٹھ جائیں، ہماری بدقسمتی سے اس وقت کی حکومت نے ناقۂ ثمود کی طرح ﴿فَعَقَرُوهَا فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوَّاهَا﴾ (سورة الشمس: ۱٤) ان کو شہید نہ کردیا ہوتا تو یقیناً آج مشرق وسطی کا نقشہ دوسرا ہوتا، آج کبھی ہم فلسطین کے قضیہ سے دوچار نہ ہوتے، اور کبھی مصر و اسرائیل کی اتنی گر کر گفتگو اور مصالحت کی کوشش نہ ہوتی اگر تنہا وہ شخص رہ جاتا اور اس کو قیادت کا موقع مل جاتا، ایک مذہبی انسان نے نہ صرف پورے معاشرے بلکہ پورے منطقہ اور پورے مشرق وسطی پر اتنا گہرا اثر ڈالا جو آج بھی باقی ہے۔

اسی دریا سے اُٹھتی ہے وہ موج تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہہ و بالا

اور میں بھی مایوس نہیں ہوں کہ۔

نہیں ہے نا امید اقبالؔ اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

بس اتنی ضرورت ہے کہ کوئی مخلص آنکھ ایک آنسو اس پر بہائے، یہ زمین اب بھی زر و جواہر اگلنے کے لیے تیار ہے، اور ہوگا تو اسی دانشور طبقہ کی طرف سے ہوگا یا مذہبی طبقہ کی طرف سے ہوگا۔

حرف آخر

اب آخر میں مسلمانوں ہی کی طرف سے نہیں بلکہ ملک کی طرف سے اور اس کے ضمیر کی ترجمانی کرتے ہوئے یہ درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس وقت ملک کو سنبھالنے کی کوشش کریں اور اپنی ترقیوں پر سوچنا کم کر دیں۔

اور اگر آپ مجھے آپ معاف فرمائیں، مجھے معلوم نہیں کہ انگریزی میں یہ لفظ جو میں نے استعمال کیا ہے: ''Careerism'' کا، یہ ڈکشنری میں ہے یا نہیں، اگر نہیں ہے تو ہونا چاہیے، ہمارے اس طبقہ کی جو سب سے بڑی کمزوری ہے، وہ ہے: ''کیریرزم''، یعنی ہم میں سے ہر شخص اپنے مستقبل کے بنانے کی فکر میں لگا ہوا ہے، لیکن اگر آپ اس سے کچھ دن کے لیے آنکھیں بند کر لیں تو یہ بہتر ہے، یہ ملک خطرے کے آخری نشان پر پہنچ رہا ہے، اخلاقی انتشار، سیاسی انتشار، اجتماعی انتشار، اقتصادی انتشار، اور آخری درجہ کی جو چیز ہے وہ امن کا انتشار ہے، اس وقت دانشور اور مذہبی طبقے دونوں کو میدان میں آنا چاہیے۔

حضرات! یہ یونیورسٹی جس وقت قائم ہوئی تھی، اس وقت اس نے مسلمانوں کی اقتصادی کشتی کو ڈوبنے سے بچا لیا تھا، آج بھی یہ یونیورسٹی اپنے فرض کو اگر پہچان لے تو یہ ملک کی کشتی کو بچا سکتی ہے، آپ میدان میں بے لوث اور بے غرض ہو کر، منصبوں اور عہدوں سے بے نیاز ہو کر اس ملک کی خدمت کریں، اس کے نوجوانوں کے اندر کیرکٹر پیدا کریں، اور خدا نے جو خزانہ نوجوانوں کی صورت میں آپ کو عطا کیا ہے اس خزانہ کو بچائیں، اور ان کے اندر زمانہ کی جو دلفریبیاں اور مادیت کی جو فریب کاریاں ہیں، اس کے اندر ان کا مقابلہ کرنے کی قوت پیدا کریں۔

خدا کرے جو میں نے کہا ہے، وہ آپ کے دل و دماغ تک پہنچ گئی ہوں۔ (۱)

(۱) پندرہ روزہ ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۱۰ و ۲۵ مئی ۱۹۸۰ء)۔

۱۱

ہمارا ملک جل رہا ہے![1]

گذشتہ اور تا قیامت آنے والے دوروں کی صحیح عکاسی اور تصویر کشی

حمد وصلوۃ کے بعد!

﴿فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُوا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ﴾ (سورة هود: ۱۱٦)

ترجمہ: ''پس کیوں نہ ہوئے ان جماعتوں میں- جو تم سے پہلے تھیں- کچھ صاحب شعور، جو منع کرتے ملک میں بگاڑ پیدا کرنے سے، مگر تھوڑے کہ جن کو ہم نے بچالیا اُن میں سے۔''

حضرات میں نے آپ کے سامنے جو آیت پڑھی ہے، وہ ایک دور نہیں بلکہ گذشتہ دوروں کے لیے اور قیامت تک آنے والے دوروں کی صحیح عکاسی اور تصویر کشی کرتی ہے، لیکن اس آیت میں جو تڑپ اور جو ایک خاص تاثیر ہے، اور اس میں جو بجلیاں کوندرہی ہیں، افسوس ہے کہ کسی دوسری زبان میں اس کا ترجمہ پورے طور پر ممکن نہیں ہے۔

قرآن مجید کہتا ہے: ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس سے پہلے جو نسلیں اور جو دور گزرے ہیں، ان میں وہ لوگ ہوتے جن کا ضمیر آخری طور پر مردہ نہیں ہوا تھا، اور جن کے دلوں پر انسانیت کی کچھ چوٹ تھی، انھوں نے کیوں ہاتھ پاؤں نہیں مارے؟ ﴿يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ﴾ وہ لوگ کیوں نہیں کھڑے ہوگئے اس عالم گیر فساد کے مقابلہ میں جس کا لاوا پھوٹ رہا تھا؟ کیا اتنی بڑی انسانی آبادی میں ایسے چند انسان بھی نہیں جن کے اندر ابھی کچھ رہا سہا انسانیت کا درد ہو، اور

---

(۱) جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) کی نو تعمیر مسجد میں اساتذہ وطلبہ اور وہاں کے دانشوروں اور فضلاء کے سامنے ۲۳/اپریل ۱۹۸۰ء کو کی گئی تقریر۔

حالات سے صحیح نتیجہ نکالنے کی صلاحیت، اور خطرات کو دیکھ کر پیشین گوئی کرنے اور انسانی تہذیب و ثقافت کے بچے کھچے سرمایہ کی حفاظت کا جذبہ باقی ہو؟ وہ کچھ ہاتھ پاؤں مارتے، کچھ ڈراتے، روتے اور خوشامد کرتے، کچھ لوگوں کا ہاتھ پکڑتے، کچھ سامنے میدان میں آجاتے، یہ سب کچھ اس قرآنی آیت کی سلوٹوں میں کہہ دیا گیا ہے، اور جو لوگ عربی زبان سے کچھ ذوق رکھتے ہیں، وہ حقیقی لطف لے سکتے ہیں کہ کس انداز سے اس کو کہا گیا ہے۔

﴿أُولُوا بَقِيَّةٍ﴾ کا مفہوم

قرآن مجید نے أُولُوا بَقِيَّةٍ کا جو لفظ استعمال کیا ہے (عربی زبان سے شُد بُد ہونے کے باوجود) اس لفظ کا پوری طرح ترجمہ کرنے سے قاصر ہوں، وہ لوگ جن کے اندر ابھی فکر اور احساس کی شمع پورے طور پر بجھی نہیں ہے، اور جن کے ضمیر نے ابھی آخری ہچکی نہیں لی ہے، جن کے اندر ابھی کچھ حقیقت شناس موجود تھے، اور پیغمبروں کی محنتوں کا اثر ابھی باقی تھا، اور جنھوں نے قوموں کا انجام دیکھا تھا، اور یہ بھی دیکھا تھا کہ اعمال کیا نتیجہ پیدا کرتے ہیں، اور اخلاق کا بگاڑ کیا مصیبتیں سامنے لاتا ہے، اور جب یہ سیلاب آتا ہے تو کس طرح ہر ایک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، اور یہ تحقیق نہیں کرتا کہ غریب کا جھونپڑا ہے یا کسی امیر کا ایوان، کسی مجرم کا گھر ہے یا عشرت کدہ، یا کسی یتیم و بیوہ کے سر چھپانے ٹھکانا ہے، جب سیلاب آتا ہے تو سب کو بہالے جاتا ہے، اسی طرح جب آگ لگتی ہے تو کوئی تمیز نہیں کرتی بلکہ مسجد و مے خانہ میں بھی کچھ فرق نہیں کرتی، اور پھر اس کی لپیٹ میں اچھے اچھے لوگ آجاتے ہیں، سواد اعظم جسے کہتے ہیں (یعنی آبادی کا بڑا حصہ) اس کا شکار ہو جاتا ہے، اس موقع پر معدودے چند آدمی ہوتے ہیں جو اس سیلاب کے مقابلہ کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، وہ اس منطق کو بالکل تسلیم نہیں کرتے کہ جب صورت حال اتنی بگڑ گئی ہے تو ہم کیوں اس چکر میں پڑیں، اب فلاں ملک اور فلاں قوم کو تو تباہ ہونا ہی ہے، اس لیے جو کچھ فائدہ اٹھانا ہو اٹھالیا جائے، یہ وہ منطق ہے جو ہر زمانے میں سحر کا اثر رکھتی ہے، اور بہت آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجاتی ہے کہ آدمی سے یا کسی جماعت سے کہا جائے کہ ذرا تم اپنی حقیقت پر نظر ڈالو، تمہاری طاقت اور بساط ہی کیا ہے جو تم اس سیلاب کا مقابلہ کرنے نکلے ہو، کہ اس منطق میں کبھی خاندان پر رحم کرنے کی اپیل کی جاتی ہے، اور کبھی اپنے مستقبل کی ترقی کا حوالہ دیا جاتا ہے، غرض کہ ہر زمانے کے مطابق الفاظ اور اسلوب مختلف ہوتے ہیں، لیکن قدر مشترک اور ذہنیت یکساں ہوتی ہے، جیسا

کہ قرآن مجید میں ایک جگہ قوم شعیب کی اس ذہنیت کی ترجمانی کی گئی ہے:

﴿قَالُوا يٰشُعَيْبُ أَصَلاَتُكَ تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَن نَّفْعَلَ فِيٓ أَمْوَالِنَا مَا نَشَآءُ إِنَّكَ لَأَنتَ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ﴾ (سورة هود:۸۷)

(انہوں نے کہا: شعیب! کیا تمہاری نماز تمھیں یہ سکھاتی ہے کہ جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں ہم ان کو ترک کر دیں، یا اپنے مال میں جو تصرف کرنا چاہیں تو نہ کریں، تم تو بڑے نرم دل اور راست باز ہو۔)

﴿قَالُوا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيراً مِّمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفاً﴾ (سورة هود: ۹۱)

(انہوں نے کہا کہ شعیب! تمہاری بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، اور ہم دیکھتے ہیں کہ تم ہم میں سے کمزور بھی ہو۔)

تشویش ناک صورت حال

حضرات! وباؤں کا پھیل جانا مستبعد واقعہ نہیں ہے، لیکن اس وبا کے زمانے میں کسی کا گھر میں بند رہنا یہ تشویشناک واقعہ ہے، اس وقت بھی ہمارے ملک میں جو انحطاط ہے وہ اپنی آخری سرحدوں کو چھو رہا ہے، بالفاظ دیگر یہاں کی قومی اور انفرادی زندگی کا پیمانہ بلکہ تہذیب وتمدن کا جام لبریز ہو چکا ہے، بس اتنی سی کسر ہے کہ پورا ملک انسان کشی اور برادر کشی کی لہر کا شکار ہو جائے۔

ہمارے ملک میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت مند بن جانے کا بھوت سوار ہے، بلکہ راتوں رات لکھ پتی اور کروڑ پتی بن جانے کا مرض اس کے اندر پیدا ہو گیا ہے جو ہمارے معاشرے کو بڑی بے رحمی کے ساتھ جاں بلب کر رہا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جرائم بڑھتے چلے جا رہے ہیں، وہ وقت قریب ہے کہ دن کی روشنی میں راستہ چلنا مشکل ہو جائے گا، اور آدمی اپنے گھر سے اپنی ذاتی حفاظت کا سامان کیے بغیر نکل نہیں سکے گا، ریلوں پر ڈاکے ڈالے جا رہے ہیں، دفتروں اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں دولت ستانی کا بازار گرم ہے، ایک شہری دوسرے شہری کو انصاف دینے اور ضرورت مندوں کو حق پہنچانے میں محض اپنے فائدے کے لیے دیر کر رہا ہے، اور لوگوں کی نگاہیں نہ دلوں پر ہیں نہ دماغوں پر، اور نہ ان کی ضرورتوں، کمزوریوں اور مجبوریوں پر ہیں،

بلکہ صرف ضرورت مند کی جیب پر ہیں، کہ اس کی جیب میں کیا ہے؟ یہ صورت حال اگر کسی متمدن ملک کی ہو جائے، اور اس وقت کسی کی پیشانی پر شکن نہ آئے، اور کسی کے دل پر چوٹ نہ پڑے، اور کوئی تحریک و جماعت پورے ملک میں اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے وجود میں نہ آئے، تو اس ملک کا کیا حشر ہوگا؟

انبیاء کے جانشین یہی ﴿ أُولُوا بَقِيَّةٍ ﴾ ہیں

حضرات! میں جب بھی یہ آیت پڑھتا ہوں: ﴿فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِن قَبْلِكُمْ أُولُوا بَقِيَّةٍ يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ﴾ تو دل پر چوٹ پڑتی ہے، قرآن مجید نے يَنْهَوْنَ عَنِ الشِّرْكِ نہیں کہا، اور نہ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْصِيَةِ، بلکہ ﴿يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ﴾ کا لفظ استعمال کیا ہے، یہ چند آدمی ہوتے ہیں جو ہتھیلیوں پر سر رکھ کر آجاتے ہیں، اور زمانہ کلائی موڑ دیتے ہیں، دعوت و عزیمت کی تاریخ یہ نہیں بتاتی کہ اخلاقی بگاڑ اور فساد کو دور کرنے کے لیے ستر اور اسی فیصد لوگ میدان میں آئے ہیں، آپ کسی دور کی بھی تاریخ دیکھ لیجیے، یہ معلوم ہو جائے گا کہ جب فساد پھیل گیا اس وقت اللہ کے کچھ بندے۔جن کی حیثیت آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہوتی۔میدان میں آئے ہیں، پھر ان کے ساتھ اور لوگ شامل ہو گئے اور کارواں بنتا گیا، اور انہوں نے پھر ایک طاقت بنالی، اور اپنا ایک مقام بنالیا، انبیاء (علیھم السلام) کی دعوت تو بہت وسیع و عمیق اور آخری چیز ہے، لیکن ان کے جانشین وہی أولو بقيّة ہیں، یہ لوگ ہر دور میں فساد کے مقابلہ کے لیے میدان میں آئے ہیں، اور جس شکل میں بھی یہ فساد آیا ہے یہ لوگ اس کے مقابلہ کے لیے کھڑے ہو گئے ہیں، اگر دولت پرستی کا بت ہوتا ہے تو وہ ان کو پاش پاش کرتے ہیں، اور اگر نفس پرستی اور خواہش پرستی کا بت ہوتا ہے تو اس کو توڑنے کے لیے میدان میں آجاتے ہیں۔

حضرت سیدنا عبد القادر جیلانیؒ کی خدمات

حضرات! سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی (رحمۃ اللہ علیہ) کا نام مصلحین اور مجددین امت میں روشن حرفوں سے لکھا جاتا ہے، ان کے خطبات کو لوگوں نے مِن وعَن محفوظ کر دیا ہے، آج بھی آپ ان خطبات کو پڑھیں تو ایسا محسوس ہوگا جیسے ایک شخص گرز لیے کھڑا ہے اور گھما رہا ہے، جس کو بھی لگ جائے، اس زمانہ کے کتنے فتنے اور کتنے بت تھے، دولت کا بت، طاقت کا بت، اقتدار کا بت، خوشامد اور اور چاپلوسی کا بت، شخصی جاہ جلال کا بت، خواہشات نفسانی کا بت، سب پاش پاش ہو رہے ہیں،

معلوم ہوتا ہے جیسے بجلیاں کوندرہی ہیں، اور بادل گرج رہے ہیں، یا ایک شیر ڈکار رہا ہے جس سے سارا جنگل سہما ہوا ہے، میں تاریخ کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ تاریخ اسلام کے پورے دور میں ہجری تقویم کا ایک سال بھی ایسا نہیں گزرا جس میں عالم اسلام کے کسی مرکزی مقام پر دعوت واصلاح کا کام نہ ہو رہا ہو، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ صدیوں تک عالم اسلام پر تاریکی طاری رہی، یا تو وہ غلط بیانی کرتے ہیں یا وہ تاریخ سے ناواقف ہیں۔

مذہبی طبقہ کا صرف ذاتی عبادات میں ہی مشغول رہنا کافی نہیں

حالات انتہائی سنگین اور غیر معمولی طور پر خطرات سے پر ہیں؛ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس صورت حال کے سلسلے میں دانشور اور مذہبی طبقہ کا موقف کیا ہے؟ اگر دانشور طبقہ نے مایوس ہو کر حالات سے صلح کر لی ہے، تو پھر خطرہ ہی خطرہ ہے، اور اگر آخر میں مذہبی طبقہ بھی خاموش ہو گیا ہے تو وہ اپنا فرض نہیں پہچان رہا ہے، اور حق نہیں ادا کر رہا ہے، خواہ وہ کتنے ہی ذاتی عبادتوں میں مشغول اور علم وتفسیر اور تحقیق کا دریا بہا رہا ہو؛ لیکن اگر اس کے گرد جو فساد کا چشمہ بہہ رہا ہے، اور جو مسموم ہوائیں اور آندھیاں چل رہی ہیں، اگر اس کے خلاف اس کی پیشانی پر کوئی شکن نمودار نہیں ہوتی اور اس کے دل پر چوٹ بھی نہیں لگتی، تو سمجھئے کہ نہ اس ملک کی خیر ہے اور نہ اس معاشرہ اور تمدن کی خیر ہے۔

موجودہ حالات میں آپ کا فرض

حضرات! میں اس وقت ایک ایسی جگہ سے خطاب کر رہا ہوں جہاں دانشور اور مذہب دونوں کے دھارے ایک ساتھ بہے ہیں، جس درس گاہ کی بنیاد حضرت شیخ الہند نے رکھی اور جس کا تخیل مولانا محمد علی جوہر کے ذہن میں پیدا ہوا، وہاں دانش ومذہب دونوں آ کے مل جاتے ہیں۔

حضرت شیخ الہند کی درسگاہ کے طالب علم کی اور استاذ کی حیثیت سے اور مولانا محمد علی جوہر کے نام لینے والوں کی حیثیت سے بھی، ایک ہندوستانی شہری اور مسلمان کی حیثیت سے بھی آپ پر چہار گونہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ آج ہندوستان جل رہا ہو تو ہمارا کیا فرض ہے؟

میں نہیں کہتا کہ آپ ترک موالات کریں، میں یہ بھی نعرہ نہیں دیتا کہ آپ اپنے کلاسوں کو چھوڑ دیں اور اپنی درسگاہ اور اپنی تعلیم کو ترک کر دیں، اب اس کا وقت نہیں ہے؛ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ آپ اس کام کے ساتھ اس کام کو بھی جمع کریں، اور ہندوستان میں جو کوہ آتش فشاں پھٹا ہوا ہے اس سے لوگوں کو بچانے کی کوشش کریں۔

اور اگر آپ اپنی دانش گاہ میں باہمی (فرقہ وارانہ) تعلقات ہی کو درست کرلیں تو یہ بھی بڑا کام ہوگا، جیسا کہ میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نوجوانوں سے کہا تھا کہ مسلمان نوجوانو! مسلم یونیورسٹی کے طالب علمو! تمھیں خدا نے ایک ایسا نادر موقع دیا ہے جو صدیوں میں کبھی کسی کو ملتا ہے، میں نہیں سمجھتا کہ یہ موقع تمھارے علاوہ کسی اور کو ملا ہو کہ نوجوان اور ذہین غیر مسلم نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد تمھارے یہاں آ گئی ہے، جو دوش بدوش اور پہلو بہ پہلو زندگی گزارتی ہے، تمھارے اقامت خانوں میں رہتی ہے، تمھیں قریب سے دیکھتی ہے، تم ان پر اسلامی اخلاق کا سکہ بٹھا کر اور اسلامی زندگی کا صحیح مظاہرہ کر کے، اپنی انسانیت دوستی اور سچی حب الوطنی کا ثبوت دے کر ان کے دلوں کو جیت لو، اس طرح تم اپنی ملت کی بھی خدمت کرو گے، اور اپنے ملک کی بھی خدمت کرو گے، یہی وہ نوجوان ہیں جو کلیدی جگہیں سنبھالیں گے اور ہندوستان کا قانون بنائیں گے، اور انھیں سے ہندوستان کے شہریوں کو واسطہ پڑے گا، افسر کی حیثیت سے، جج کی حیثیت سے، ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے، اور آئی. اے. ایس. کے کارپردازوں کی حیثیت سے۔ اگر تم نے ان کے اوپر اسلام اور مسلمانوں کی شرافت کا نقش قائم کر دیا، اور انھوں نے یہ تجربہ کرلیا کہ مسلمان سانپ اور بچھو نہیں ہوتا، مسلمان کوئی خونخوار جانور نہیں ہوتا جس کے سایے سے بھی بھاگا جانا چاہیے، مسلمان شریف اور شفیق ہوتا ہے، اپنے پہلو میں ایک دردمند دل رکھتا ہے، انسانیت کے سوز میں جلتا ہے، اور وہ پڑوسی کی مدد کرنا چاہتا ہے، وہ اچھی چیزوں سے لطف اندوز ہوتا ہے، اور اچھی چیز کی تعریف کرتا ہے، وہ ہر نیک کام میں تعاون کرتا ہے، اگر یہ غیر مسلم نوجوان یہ اثر لے کر یہاں سے گئے تو سمجھو کہ فرقہ وارانہ مسئلہ حل ہے۔

آج میں جامعہ ملیہ کے طالب علموں سے بھی یہی کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی یہ موقع دیا ہے اسلام اور ملک کی خدمت کا، اگر کچھ نہیں تو کم از کم آپ کے اخلاق کو دیکھ کر ان کے اندر اگر اسلام کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو گیا اور انھوں نے کہا کہ ہمیں قرآن مجید پڑھنے دو جو ایسے اچھے آدمی بناتا ہے، ہم کو سیرت رسول پڑھنے کو دو جس نے ایسی امت کی تربیت کی ہے، ہمیں بتاؤ کہ اسلام کی تعلیمات کیا ہیں؟ اس صورت میں آپ ایسے ہزار مبلغوں سے زیادہ کامیاب ہیں جو علم اور منطق کے زور پر اسلام کی دعوت غیر مسلموں کو دیتے ہیں، اس کا اثر بھی زیادہ دنوں تک نہیں رہتا، اگر آپ کے پاس دو چار برس رہ کر کوئی ہندو، سکھ، عیسائی بھائی ذرا بھی متاثر نہیں ہوا اور اس نے اسلامی زندگی اور اسلامی اخلاق کا کوئی نمونہ نہیں دیکھا تو آپ بالکل ناکام ہیں، اور آپ سے خدا کے یہاں سوال ہوگا۔

ایک بڑی خدمت وسعادت

عزیز نوجوانو! اس ملک میں دونوں فرقوں کے درمیان جو خلیج پڑ گئی ہے وہ غلط فہمیوں اور جہالت پر مبنی ہے، ہمارے غیر مسلم بھائی نہیں جانتے کہ قرآن کی تعلیم کیا ہے؟ حدیث کیا بتاتی ہے؟ سیرت کس طرح کے انسان پیدا کرتی اور کس طرح کے انسان ڈھالتی ہے؟ آپ بہت بڑی خدمت انجام دیں گے ایک طرف دین وملت کی، دوسری طرف ملک کی، اگر آپ نے دونوں فرقوں کے درمیان حائل خلیج کو کم کرنے کی کوشش کی۔ یہ موقع ہمارے عربی مدارس کو نہیں ملا، یہ سعادت جامعہ ملیہ اور علی گڑھ کے طلبہ اور اساتذہ کو حاصل ہے کہ اپنے عمل سے ان غیر مسلم بھائیوں کے دلوں کو تسخیر کر لیں، وہ جب یہاں سے جائیں اور ان کے سامنے کوئی مسلمان کی برائی بیان کرے تو بپھر جائیں اور کہیں کہ تم ناواقفیت کی وجہ سے برائی کرتے ہو، میں چار برس ایک مسلمان دانش گاہ میں رہا ہوں جہاں اکثریت مسلمانوں کی تھی، میں نے مسلمانوں کے یہ اخلاق دیکھے ہیں، میں نے ان کو غریبوں کی مدد کرتے ہوئے دیکھا ہے، میں نے اپنے ممتحنین کو دیکھا ہے کہ وہ ہندو مسلمان میں کوئی فرق نہیں کرتے، میں نے اقامت خانوں اور ہوسٹلوں میں دیکھا ہے کہ ہمارے وارڈن اور ہمارے نگراں ہم کو اپنا بچہ سمجھتے تھے، اور اس میں ہندو مسلمان کا کوئی فرق نہیں کرتے تھے، ان کی یہ شہادت ہندوستان کے سیاسی مسئلہ پر اثر انداز ہوگی اور بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے۔

تحریک پیام انسانیت انھی ﴿أُولُوا بَقِيَّةٍ﴾ کی تلاش میں ہے

حضرات! ہماری پیام انسانیت کی تحریک- اگرچہ اس کو تحریک کہنا بھی درست نہ ہوگا، اور میں بغیر کسی انکسار کے یہ عرض کرتا ہوں کہ ابھی اس میں بھی شک ہے کہ اس کا وجود بھی ہوا ہے یا نہیں- یہ انھیں (أُولُوا بَقِيَّةٍ) صاحب شعور کی تلاش میں ہے، وہ صاحب شعور کہاں پائے جاتے ہیں جن میں ابھی انسانیت اور اپنے ملک کا درد موجود ہے، میں نہیں عرض کر سکتا کہ قرآن مجید نے چند لفظوں میں کیا کہہ دیا ہے، اور اس کے اندر کیسا درد ہے: ﴿فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُوا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ﴾ یہ صاحب شعور بلا تفریق مذہب وملت کھڑے ہو جاتے ہیں کہ ہم کسی پر ظلم نہیں ہونے دیں گے۔

ہم ظالم کی مدد کیسے کریں؟

''حماسہ'' کا نام آپ نے سنا ہوگا، یہ سب سے مستند عربی شاعری کا مجموعہ ہے، (ماقبل اسلام

اور مابعد اسلام) اس میں پہلی نظم میں ایک شعر ہے:

لَا يَسْأَلُونَ أَخَاهُمْ حِينَ يَنْدُبُهُمْ

فِي النَّائِبَاتِ عَلَى مَا قَالَ بُرْهَانَا

شاعر ایک قبیلہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب کوئی اس کا بھائی مدد کے لیے آواز دیتا ہے تو یہ نہیں پوچھتے کہ دلیل کیا ہے اور تم حق پر ہو یا باطل پر، اسی طرح ایک عربی مثل تھی "أُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا"، یہ نہیں دیکھنا ہے کہ بھائی ظالم ہے یا مظلوم، بس اپنے بھائی کی مدد کرنا ہے۔

ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو مخاطب کر کے فرمایا: "أُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا"، (۱) (اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے ظالم ہو یا مظلوم)، جاہلیت کا جو ذہن بنا ہوا تھا اگر وہ ہوتا تو سب کے سب خاموش ہو جاتے، اس لیے کہ یہ ان کی جانی بوجھی بات تھی، جو ان کی زندگی میں داخل اور ان کی رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی، لیکن اب صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کی زندگی میں اتنا بڑا انقلاب آ چکا تھا جس کی نظیر نہیں ملتی، یہ انقلاب صرف حسی اور اخلاقی نہیں تھا، بلکہ ذہنی انقلاب بھی تھا، صحابہ کرامؓ جن سے زیادہ تابعدار، وفا شعار، فداکار اور جاں سپار کوئی نہیں ہو سکتا، تاب نہ لا سکے؛ حالانکہ صحابہ کرامؓ یہ جانتے ہیں کہ اس زبان مبارک اور لبوں سے سوائے وحی الٰہی کی ترجمانی کے اور کچھ نہیں نکل سکتا، لیکن جہاں فرماتے ہیں: "أُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا"، تو صحابہ کرام تاب نہ لا سکے اور انھوں نے سوال کر دیا کہ یا رسول اللہ! کوئی مظلوم ہو تو ہم اس کی مدد کریں، ظالم ہو تو اس کی مدد کیسے کریں؟ میں تو اس سوال پر تعجب کرتا ہوں کہ دیکھیے! معاملہ کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا کہ جو چیز بچپن سے انھوں نے سنی تھی، بلکہ ان کی گھٹی میں پڑی تھی کہ بھائی کی مدد تو کرنی ہے، بھائی کی آواز آئے تو کوئی پوچھنے کی بات نہیں کہ کیا کرانا چاہتے ہو، کسی کو بیوہ کرانا چاہتے ہو، کسی یتیم پر ظلم کرانا چاہتے ہو، مقصد کیا ہے؟

اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریح فرمائی کہ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کا ہاتھ پکڑ لو اور اس کو ظلم نہ کرنے دو، اب صحابہ کرام کو تسکین ہوئی، یہ مکالمہ جو حدیث نے محفوظ کر دیا ہے، کتنی حقیقتوں پر روشنی ڈالتا ہے۔!!

صحابہ کرام کی زندگی، ان کے طرز فکر اور احساسات میں کتنا عظیم انقلاب ہوا تھا کہ اللہ اور اس

(۱) صحيح البخاري، كتاب المظالم، باب أعن أخاك ظالما أو مظلوما۔

کا رسول ﷺ، جس سے بڑھ کر کوئی ذات نہیں تھی، اور انھوں نے اس تاریخ سے جب وہ ایمان لائے تھے، یہی تجربہ کیا تھا کہ آپؐ جو فرماتے ہیں وہ حق ہوتا ہے، اور اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، لیکن جب آپؐ فرماتے ہیں کہ "اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم" تو تاب نہ لا سکے اور برداشت نہ کر سکے۔

مجھے معاف کیا جائے کتنے مشائخ اور پیر ہیں جن سے ان کے مریدین پوچھنے کی ہمت کرتے ہیں کہ حضرت یہ بات سمجھ میں نہیں آئی، کتنے شاگرد ہیں جو اپنے استاد سے یہ پوچھیں کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی، لیکن دنیا میں محبت و قربانی اور جان دینے کا سب سے بڑا مظاہرہ مذاہب، اخلاق، تحریکات، فلسفوں اور انسانیت کی تاریخ میں صحابہ کرام نے بدر و حنین اور اُحُد میں کیا، وہی جاں نثار صحابہ جب یہ سنتے ہیں کہ بھائی کی مدد کرنی چاہیے خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، تو وہ پوچھتے ہیں کہ ہم ظالم کی کیسے مدد کریں؟

وہ کیریکٹر جو اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے

آپ ہمیں بتائیے کہ کتنے ایسے عقیدت مند لوگ ہوں گے جنھیں یہ مجال ہو کہ پوچھ سکیں کہ حضرت! آپ کیا فرما رہے ہیں؟ لیکن صحابہ کرام نے پوچھا اور جواب ملا ان کو، اور پوری خوش دلی کے ساتھ جواب دیتے ہیں کہ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم نہ کرنے دو، سب سے بڑی مدد اس کی یہ ہے کہ اس کا ہاتھ پکڑ لو، آپ ہمارے بھائی ہیں اور ہم کو عزیز ہیں، لیکن ہم آپ کو ظلم نہیں کرنے دیں گے، ابھی وہ ناراض ہوگا، اس کی پیشانی پر بل پڑیں گے، لیکن کل وہ شکر گزار ہوگا اور کہے گا کہ تم نے مجھے بہت بڑے خطرے سے بچالیا، یہ وہ کیریکٹر ہے جو اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے، بلاتفریق مذہب و ملت، بغیر کسی طبقہ واریت اور رنگ و نسل کے فرق کے وہ مظلوم کا ساتھ دینا اور ظالم کو ظلم سے روک دینا چاہتا ہے۔

آپ ہمیں بتائیے کہ آج اگر مسلمان ہندوستان میں اس پر عمل کرتے تو ہمارا اخلاقی وقار کیا ہوتا؟ ہم پر کتنا اعتماد کیا جاتا، اور ہم کس طرح اس ملک کو ان خطروں سے بچا لیتے جو ننگی تلوار کی طرح اس پر مسلط ہیں، یہ خطرات جانب داری، اقربا پروری اور قومی و فرقہ وارانہ جانب داری کا نتیجہ ہیں، اس کی وجہ سے پورا ملک کھوکھلا ہو رہا ہے،، اور اس نے چھوٹی بڑی سیاسی پارٹیوں سے لے کر ایوان حکومت تک اور بڑے بڑے ذمہ داروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے اہلکار تک سب کا ذہن مسموم کر دیا ہے۔

پورا ملک زیروزبرہورہاہے

حضرات میں جس جگہ بیٹھا ہوں وہ منبر ومحراب اور مسجد کی جگہ ہے، یہاں پر وہ باتیں کہہ سکتا ہوں جو سیاسی اسٹیج پر نہیں کہہ سکتا، ہمارے ادارے تباہ ہورہے ہیں، اور ہماری حکومت کا ڈھانچہ ہل گیا ہے، اور پورا ملک زیروزبر ہورہا ہے، کسی کو کسی پر اعتماد نہیں رہا، انصاف کی امیدیں ججوں، عدالتوں اور قانون سے منقطع ہوگئیں، میں یہاں تک کہوں گا کہ قانون ساز اداروں سے بھی انصاف کی امیدیں ختم ہوگئیں، اب آپ ہی بتائیے پھر ایسی صورت میں ایک دکھ کا مارا بیکس انسان کہاں جائے اور کس کا دروازہ کھٹکھٹائے؟ بے انصافی کا یہی روگ ہے جو ملک کو کھائے جارہا ہے، فیصلہ کرنے والا یہ دیکھتا ہے کہ وہ کس فرقے کا آدمی ہے، اور کس خاندان کا ہے، اور یہ فیصلہ جو میں کرتا ہوں کس کے حق میں جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "اُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُوْمًا"، یہ نہیں دیکھنا ہے کہ کس کی مدد ہورہی ہے، یہ دیکھنا ہے کہ کس بات پر مدد ہورہی ہے، بس یہ ہے اخلاقی معیار، اگر اس پر ہم سچے اور مخلص ثابت ہوں تو آج ہم اس ملک کو بچاسکتے ہیں، اور میں اس پر یقین رکھتا ہوں کہ اس وقت ملک کو نہ کوئی سیاسی جماعت بچاسکتی ہے اور نہ حکومت اور نہ بڑے بڑے ادارے بچاسکتے ہیں، اس کو وہ دانشور اور مذہبی انسان بچاسکتے ہیں جو ﴿أُولُوا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ﴾ کے صحیح مصداق ہوں، وہ بچے کھچے انسان، وہ گرے پڑے انسان جن کو لوگ نہیں جانتے، اور جن کے نام اخباروں میں چھپتے ہیں اور نہ ہی ان کی عظمت کا اعلان ریڈیو اور اخبارات میں ہوتا ہے، لیکن یہ وہ باشعور لوگ ہیں جن کے دل پر انسانیت کے درد کی چوٹ ہے۔

خدا رحم کرتا نہیں اس بشر پر
نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر

وہ لوگ جن کے جگر پر درد کی چوٹ ہے، وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ہندو ہیں یا مسلمان، یہ کس فرقہ اور خاندان کا ہے، بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ معاملہ کیا ہے، حق کس کے ساتھ ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا اِعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى﴾

(سورة المائدة: ۸)

ترجمہ: اے ایمان والو! تم خدا کے لیے انصاف کی گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جایا کرو، اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو، انصاف کیا کرو، کہ یہی پرہیز گاری کی بات ہے۔

اے ایمان والو، تم اللہ کے لیے کھڑے ہو جانے والے بن جاؤ، قَوَّام کا لفظ استعمال کیا ہے، جلدی جلدی کھڑے ہونے والے، اور عزم کے ساتھ کھڑے ہونے والے، اور حق وانصاف کی گواہی دینے والے، اور تمھیں کسی قوم کا بغض اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف کا دامن چھوڑ دو، کسی فرقہ اور قوم سے کتنی ہی نفرت ہو تمھیں، کسی فریق سے کتنی ہی نفرت ہو، تم اس کی صورت نہ دیکھ سکو، لیکن یہ بھی تم کو آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف کا دامن چھوڑ دو، اس کے معاملہ میں انصاف کرو، وہ انصاف سے زیادہ قریب ہے۔

پیامِ انسانیت

حضرات! اگر پیامِ انسانیت کا کہیں وجود ہے یا وجود ہونا چاہیے، تو پیامِ انسانیت کا پیام یہ ہے کہ (أُولُوا بَقِيَّةٍ) کچھ صاحبِ شعور انسان کھڑے ہوں، ابھی ہندوستان ایسے لوگوں سے بالکل خالی نہیں ہوا ہے، اس لیے کہ یہ سرزمین روحانیت اور دَرد و محبت کی سرزمین ہے، یہاں اگر (أُولُوا بَقِيَّةٍ) نہ پائے گئے تو کہاں پائے جائیں گے؟

اصل تشویش اور فکر کی بات

میں خالص مسلم اکثریتی ملکوں میں بھی یہ آواز لگا آیا ہوں کہ لوگو! فساد کے مقابلہ میں کھڑا ہونا چاہیے، میں نے سعودی عرب میں ایک تقریر میں کہا تھا کہ میں بیماری سے نہیں ڈرتا، میں ڈرتا ہوں کہ طبیب نہ ہو، میں اس سے نہیں ڈرتا کہ وبا پھیل رہی ہے، اس سے ڈرتا ہوں کہ اسپتال نہ ہو، اور کوئی طبی امداد پہنچانے والا نہ ہو، قوموں کی تقدیر اور اس کی تاریخ کے لیے یہ خطرناک بات نہیں ہوتی کہ بیماری پھیلی، خطرناک بات یہ ہوتی ہے کہ بیماری کا احساس کرنے والا کوئی نہیں، جیسا کہ اقبالؔ نے کہا تھا:

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

متاعِ کارواں بار بار لٹی، بار بار گئی، لیکن احساسِ زیاں کبھی نہیں گیا، دعوت و عزیمت کی پوری تاریخ بتاتی ہے کہ احساسِ زیاں ہر زمانہ میں رہا، بس وہ دن ہے تشویش اور فکر کا جب احساسِ زیاں جاتا رہے۔

دو باتیں

بس اب میں صرف دو باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں:

۱- ایک تو یہ کہ ملک کی بگڑی ہوئی اخلاقی حالت کو درست کرنے اور ملک کے سامنے صحیح اخلاقی کردار لانے کے لیے ہم آپ کھڑے ہوں۔

۲- دوسری بات میں یہاں کے طلبہ سے کہنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالی نے آپ کو ایک ایسا موقع دیا ہے جس کے لیے عربی مدارس ترستے رہتے ہیں، اور یہ موقع بظاہر ان کو بہت دنوں میں ملے گا، کہ کچھ سعید روحیں آپ کے پاس آئی ہیں، غیر مسلم نوجوان آپ کے یہاں پڑھنے کے لیے آئے ہیں، آپ ان کو فریق نہ بنائیے، اور آپ بات بات پر ان کے ساتھ دوسرے فریق جیسا معاملہ نہ کریں، آپ ان کے دلوں کو اپنے ہاتھ میں لیں، آپ ان کے ساتھ انصاف کریں، خدا لگتی بات ان کے معاملے میں بھی کریں، آپ ان کے ساتھ بھائیوں اور انسانوں کی طرح رہیں، ان کی خدمت کرنے کی کوشش کریں، ان کی تکلیف کو دور کرنے کی کوشش کریں، اس سے نہ صرف اس ادارہ کا مسئلہ حل ہوگا؛ نہ صرف دلی (دہلی) کا مسئلہ حل ہوگا، بلکہ پورے ملک کا مسئلہ حل ہوگا۔ وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.[۱]

---

(۱) پندرہ روزہ "تعمیر حیات"، لکھنؤ (شمارہ ۱۰ و ۲۵ رجون ۱۹۸۰ء)۔

۱۲

ملک کا حقیقی مسئلہ اور اس کے لیے اصل خطرہ[1]

تعمیری کاموں اور خدمت انسانی کا سب سے بڑا محرک اور راز

حضرات! انسانیت کے حال و مستقبل اور سارے تمدنی، معاشی، سیاسی، حتی کہ اخلاقی اور مذہبی مسائل کا انحصار، اور تمام فلسفوں و افکار و نظریات کا دار و مدار تمام تر اس پر ہے کہ انسان موجود اور محفوظ ہے، اس کو اپنی زندگی کی طرف سے اطمینان، انسانی زندگی کی قدر و قیمت کا احساس اور اس کے تقدس پر غیر متزلزل عقیدہ ہے، اس عقیدہ نے کہ انسان ہی اس دنیا کی پیدائش کا مقصود اور اس کائنات کا سب سے بیش قیمت وجود ہے، اور اس کے اندر بہتر سے بہتر بننے کی صلاحیت موجود ہے، دنیا کے ذہین ترین، شریف ترین اور لائق ترین انسانوں کو انسانوں پر محنت صرف کرنے پر آمادہ کیا، اور انھوں نے ان کی ذہنی صلاحیتوں اور ان کے ذہن و دماغ کے سوتوں کو چھیڑا، اور وہ تمام اصلاحی، تعمیری، تخلیقی، علمی، ادبی، تمدنی اور روحانی شاہکار وجود میں آئے جن پر قدیم و جدید دنیا کو فخر ہے۔

انسان کی فطرت سلیم پر یقین و اعتماد

تاریخ کے قدیم ترین دور سے لے کر ہمارے زمانہ تک جس چیز نے انسانیت کی شمع مسلسل طور پر روشن رکھی، وہ خدا کی یہ نعمت ہے کہ اچھے انسان انسان سے مایوس نہیں ہوئے، انھوں نے اس کو ناقابل علاج مریض اور ناقابل اصلاح حیوان نہیں سمجھا، وہ کبھی اس کے وجود سے ایسے متنفر نہیں ہوئے کہ اس کی صورت دیکھنے تک کے روادار نہ ہوں، انھوں نے کبھی اس کے زندہ رہنے کے استحقاق کا انکار نہیں کیا، انسانیت کا چراغ بے تیل بتی کے جل سکتا ہے، وہ ہوا کے تیز جھونکوں اور طوفان کے تھپیڑوں میں روشن رہ سکتا ہے، اور انسانیت کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہمت والوں اور

(۱) بارہ دری، قیصر باغ لکھنؤ میں ۲۷–۲۸/اکتوبر ۱۹۸۰ء کو منعقد پیام انسانیت کنونشن کا خطبۂ صدارت۔

انسانیت کا درد رکھنے والوں نے برسوں پیٹ پر پتھر باندھ کر اور مسلسل فاقہ کر کے جنگلوں اور بیابانوں، کڑاکے کے جاڑوں کی راتوں اور تپتی ہوئی دوپہر میں انسانیت کی خدمت کی، ان میں سے کوئی چیز ان کی ہمت توڑنے اور ان کو ان کے مقدس کام سے روکنے کے لیے کافی نہ تھی۔ ان کی نہ ختم ہونے والی قوت مقابلہ کا راز، اور ان کی حیرت انگیز قوت عمل کی بنیاد یہ تھی کہ وہ انسان کو دست قدرت کا شاہکار (Master Piece) سمجھتے تھے، ان کو انسان کی فطرت سلیم پر یقین واعتماد تھا، ان کو یقین تھا کہ انسان کے لیے برائی عارضی، اور بھلائی اصلی اور فطری ہے، ان کو یقین تھا کہ وہ انسان پر جو محنت کریں گے، وہ کبھی نہ کبھی رنگ لائے گی، ان کے عقیدہ میں اس باغ کی ہر کلی کو کھلنا اور حسین بننا چاہیے۔

عالم انسانی میں سب سے زیادہ خطرناک اور تشویش انگیز بات

عالم انسانی میں کوئی چیز اس سے زیادہ خطرناک اور تشویش انگیز نہیں کہ انسان انسان سے ناامید ہو جائے، اور اس سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ وہ اس نفرت و یاس کے جنون میں بے زبان عورتوں اور معصوم بچوں پر دست درازی کرے، اور غنچوں کو کھلنے اور مسکرانے سے پہلے ہی مسل کر رکھ دے۔ تعلیم و تربیت ہو یا اصلاح و ترقی، معاشی خوش حالی ہو یا سیاسی استحکام، یہ نشیمن جس شاخ پر قائم ہے اور ہمیشہ جس شاخ پر قائم رہے گا، وہ انسانی زندگی کے تحفظ اور امن و امان کی فضا ہے، اس لیے نشیمن کو سجانے اور بنانے کے منصوبوں اور اس کی ترتیب و تنظیم کی بحثوں سے پہلے اس شاخ کی حفاظت ضروری ہے۔

ظلم ملک و معاشرہ کے لیے سب سے بڑا خطرہ

بے گناہ کمزور، بے بس اور نہتے انسانوں، عورتوں اور بچوں پر ظلم اور دست درازی خواہ وہ کسی مذہب وملت سے تعلق رکھتے ہوں، اور خواہ یہ اقدام کسی صحیح یا غلط اشتعال کی بنا پر، یا انتقامی جذبہ کے ماتحت ہو، وہ عمل ہے جس نے بڑے بڑے طاقت ور، ترقی یافتہ، وسیع اور زرخیز ملکوں اور سلطنتوں کو بے چراغ اور تاراج کر دیا ہے، اور تاریخ میں صرف ان کا نام باقی رہ گیا ہے، خدا کے وجود کے بعد جس حقیقت پر تمام مذاہب، فرقوں اور مکاتب خیال کا اتفاق ہے، وہ یہ ہے کہ ظلم (خواہ کسی سے سرزد ہو) بڑا گناہ (مہا پاپ) اور ملکوں اور قوموں کے حق میں سم قاتل ہے، اور اس کا نتیجہ دیر یا سویر نکل کر رہتا ہے، اور اس کی موجودگی میں کوئی ملک یا قوم (خواہ اس کے پاس کیسے ہی قدرتی وسائل،

جنگی طاقت، عددی کثرت، شاندار تاریخ اور علم و ادب اور فلسفہ کے خزانے ہوں) پھل پھول نہیں سکتی۔

مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس موقع پر اردو کا وہ سیدھا سادا شعر پڑھوں جو بچپن میں ہمیں یاد کرایا جاتا تھا، اور ہماری تختیوں اور کاپیوں پر لکھا جاتا تھا، اور وہ اپنی سادگی کے باوجود اب بھی اس قابل ہے کہ ایوان حکومت اور قصر عدالت سے لے کر لوح دل تک پر لکھا جائے:

ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں
ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں

اس لیے ہر زمانہ میں ملک کے سچے بہی خواہوں اور صاحب ضمیر اور دانشور انسانوں نے جن کی خدا کے بے لاگ قانون اور تاریخ انسانی کے مسلسل تجربوں، اور متواتر شہادتوں پر نظر تھی، اپنے ملک اور معاشرہ کے لیے ہر اندرونی اور بیرونی خطرہ سے بڑھ کر اس کو خطرہ سمجھا، اور اپنے ملک کے اندر ظلم کرنے والوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، ظلم سے روکنے اور ظلم کی آگ نہ پھیلنے دینے کے لیے انھوں نے اپنی جان کی بازی لگا دی، اور اس کو ملک کی سب سے بڑی خدمت اور حقیقی حب الوطنی قرار دیا۔

اندر کا ظلم وزیادتی باہر والوں کے ظلم وزیادتی سے زیادہ تباہ کن اور خطرناک

اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ اندر کا ظلم و زیادتی باہر والوں کے ظلم و زیادتی اور ان کی ظالمانہ حکومت سے زیادہ ملک کے حق میں تباہ کن اور خطرناک ہے، بیرونی ظلم کی صورت میں ملک اور قوم مظلوم ہوتی ہے، خدا کی مدد، اچھے انسانوں کی دعائیں اور مظلوموں کی آہیں اس کے ساتھ ہوتی ہیں، اور اندرونی ظلم کی صورت میں وہ ملک خدا کی مدد سے محروم، اور خود مظلوموں کی آہوں اور دکھے دلوں کی کراہوں کا نشانہ بنتا ہے، جن کی تاثیر پر تمام مذاہب، اخلاقی فلسفوں اور صحت مند و صالح ادب و شاعری کا اتفاق ہے، اور جنھوں نے کبھی کبھی (بلا امتیاز مذہب وملت) صدیوں کی وسیع اور مستحکم سلطنتوں کا چراغ گل کر دیا، اور ان تہذیبوں اور تمدنوں کو ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دیا، جن کا کسی زمانہ میں دنیا میں ڈنکا بجتا تھا، اور جس کی مثالیں اس مادی اور مشینی دور میں بھی خاندانوں اور محلوں، برادریوں اور بستیوں کے محدود دائرے میں اب بھی علم میں آتی رہتی ہیں، اور خدا کی یہ لاٹھی جس میں آواز نہیں، حقیقت بیں نگاہوں کو اب بھی دنیا کی ان بڑی طاقتوں کے جاہ وجلال کے مرکزوں میں بھی اپنا کام کرتی ہوئی نظر آجاتی ہے، جو اپنے سامنے کسی کی حقیقت نہیں سمجھتے۔

ملک کی طاقت کا حقیقی سرچشمہ

حاضرین کرام! ملک کی طاقت کا حقیقی سرچشمہ اور جینے اور پھلنے پھولنے کے لیے اس کا سب سے بڑا سہارا ایسے حق گو اور بے لاگ انسانوں کا وجود ہے جو بڑے سے بڑے نازک اور جذباتی موقع پر ظلم کو ظلم، ناانصافی کو ناانصافی، اور غلطی کو غلطی کہہ سکتے ہیں۔ اگر آپ واقعی کسی قوم کی بیداری اور اس کی زندگی کی صلاحیتوں کو جانچنا چاہتے ہیں، اور یہ اندازہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ قوم یا ملک انسانیت اور اخلاق اور علم وفن کی امانت کی حفاظت کی کہاں تک اہل ہے، تو یہ دیکھیے کہ اس میں کتنے ایسے افراد پائے جاتے ہیں جو تنقید کے موقع پر اپنے پرائے کی تمیز نہ کرتے ہوں، جو صریح غلطی کے موقع پر بڑی سے بڑی اکثریت اور بڑی سے بڑی طاقتور حکومت کو برملا ٹوک دیتے ہوں، جو مظلوموں اور کمزوروں کے لیے سینہ سپر بن جاتے ہوں، اور بگڑے ہوئے حالات میں عیش کے ایوانوں کو چھوڑ کر دیوانوں کی طرح پھرنے لگتے ہوں، اور کسی ملامت کرنے والے کی پرواہ نہ کرتے ہوں، جن کو آئندہ کے فوائد اور وقت کے مصالح سچی بات کہنے سے باز نہ رکھتے ہوں، جو حق کی حمایت اور اعلان میں اپنی قوم کا معتوب بننے کو اپنی قوم کا محبوب بننے پر ہزار بار ترجیح دیتے ہوں، جب سارے ملک میں زیادتی، حق تلفی، جانب داری اور مصلحت پرستی کی ہوا چل رہی ہو تو وہ اپنا کھانا پینا بھول جائیں اور حالات کو درست کرنے کے لیے کوئی کوشش اٹھا نہ رکھیں، جو وقت کے مسئلہ کے سامنے تمام مسائل کو بالائے طاق رکھ دیں، ہر طرح کے اختلافات کو بھلا دیں، بلاتمیز قومیت وملت انسانی جان وآبرو کی حفاظت کے لیے جان کی بازی لگا دیں، اگر ایسے افراد اس قوم کی تعداد کے مناسب اور ضرورت کے مطابق پائے جاتے ہیں تو اس قوم اور اس کے مستقبل کی طرف سے مایوس وہراساں ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، اس کی ہر پریشانی دور ہو جائے گی، ہر کمی پوری ہو جائے گی، پتھر موم اور دشمن دوست بن جائیں گے، اس کی اخلاقی برتری کا ساری دنیا میں آوازہ بلند ہوگا، اس کے ملک میں خوش حالی، سرسبزی اور شادابی، محبت والفت کا دور آ کر رہے گا، اس کی بین الاقوامی حیثیت اچانک بلند ہو جائے گی، قومیں اور ممالک نازک حالات میں اور بین الاقوامی گتھیوں کے سلجھانے کے لیے اس کی مدد کے طالب ہوں گے۔

ہمارے ملک نے ہر دور میں معلم و مصلح اور روحانی لوگ پیدا کیے

ہمارا عقیدہ ہے کہ ہمارے اس ملک نے ہر دور میں حق کی حمایت کرنے والے، مظلوم کا

ساتھ دینے والے، ظالم کا گریبان پکڑنے والے، اوراس کا ہاتھ روک دینے والے معلم و مصلح اور روحانی لوگ پیدا کیے، یہاں کی سرزمین نے ساتویں صدی ہجری اور تیرہویں صدی مسیحی میں نیم وحشی تاتاریوں، اور جہاں سوز چنگیز خان اور ہلاکو کے ستائے ہوئے اوران کے وحشیانہ حملوں سے سہمے ہوئے لٹے پٹے انسانی قافلوں کو پناہ دی، اور پھر وہ ہمیشہ اس ملک میں امن وامان کے ساتھ رہے، اور انھوں نے یہاں سکون واطمینان بلکہ خوداعتمادی اور عزت وسربلندی کے احساس کے ساتھ (جوانسانی ذہانتوں اور علم وفن کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے سب سے بڑی محرک طاقت ہے) اپنی ذہانت، صلاحیت کار، ایجادواختراع، خوش مذاقی، زندہ دلی، حسن تعمیر، اور انسانی جینیس (Genius) کے وہ نمونے پیدا کیے، اور علم وفن اور ادب وشاعری کے وہ گل کھلائے جن سے صرف ہندوستان ہی نہیں وسط ایشیا کا پورا علاقہ اور مغربی ایشیا اور مشرق وسطی کے ممالک مہک اٹھے، اور انھوں نے اسلامی علوم وفنون اور عربی زبان وادب میں بھی اس نئی نسل کا لوہا مان لیا، جو ترکستان اور ایران، عرب وعجم اور ہندوستان کی بہترین خصوصیات کی حامل تھی، اور جس کے کارناموں سے اب بھی دنیا کے ایک بڑے حصہ میں ہندوستان کا نام روشن ہے، اور وہاں کے علمی و ادبی حلقوں میں وہ اس کے تعارف کا ذریعہ اوراس کی عزت واحترام کا باعث ہے۔

ہندوستان کسی دور میں بھی ایسے انسان دوست، حق گو، جری اور جانباز لوگوں سے خالی نہیں رہا، جوظلم وبدی کوروکنے کے لیے سینہ سپر ہوجاتے تھے، اوراس کے لیے جان کی بازی لگادیتے تھے، ملک کی تقسیم کے فیصلہ سے کچھ پہلے ہمارے ملک میں فرقہ وارانہ منافرت اور وحشیانہ قتل وغارت گری کے واقعات کا سلسلہ شروع ہوگیا اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد یہاں فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوئے، ان موقعوں پر ملک کے متعدد دانشوروں، عالموں اور سیاسی رہنماؤں نے اپنے اندرونی کرب وبے چینی کا اظہار کیا، اور بے باکانہ طریقہ پراس رجحان کی مذمت کی، اور اپنے اپنے انداز بیان اور لب و لہجہ میں اس کے خلاف اظہار خیال کیا، آج بھی اگر آپ ان کے بیانات پڑھیں تو آپ کو لفظوں کی صورت میں خون کے آنسو، اور سطروں اور پیراگراف کی شکل میں دل وجگر کے ٹکڑے نظر آئیں گے۔

ہندوستان کے روشن دماغ اور بیدار ضمیر کی آواز

مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس موقع پر ملک کے چوٹی کی تین شخصیتوں کی تقریروں اور تحریروں کے تین اقتباسات آپ کے سامنے پیش کروں، اس لیے کہ میں کتنی ہی کوشش کروں ان

سے بہتر لفظوں میں آج کی صورت حال کی مصوری اور عکاسی نہیں کرسکتا، جس سے ہر محبّ وطن کو بے چین ہونا چاہیے، یہ ہندوستان کے روشن دماغ اور بیدار ضمیر کی آواز اور اس کے دکھے ہوئے دل کی پکار ہے جو وقت پر بلند ہوئی، اس کو کوئی انشاء پرداز و مؤرخ، خواہ وہ اپنی تحقیقی و تصنیفی سرگرمیوں کے لیے کتنا ہی مشہور ہو، اور تحریر و انشاء کے میدان کا کتنا وسیع تجربہ رکھتا ہو اس سے بہتر طریقہ پر ان احساسات اور جذبات کو پیش نہیں کرسکتا۔

میں پہلا اقتباس مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے (جو بعد میں ہمارے ملک کے صدر جمہوریہ ہوئے) اس خطبۂ استقبالیہ کا پیش کروں گا جو انھوں نے شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) کی حیثیت سے ۱۷/نومبر ۱۹۴۶ء کو جامعہ اسلامیہ، دہلی کی سلور جوبلی میں پڑھا تھا، مجھے وہ منظر ابھی تک یاد ہے کہ کرسی صدارت پر ہز ہائنس نواب سر حمید اللہ خاں (نواب صاحب بھوپال) رونق افروز ہیں، سامنے کی قطار میں ایک طرف اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو، صدر کانگریس مولانا آزاد، ارکان کابینہ سردار پٹیل، مسٹر راج گوپال اچاریہ اور سید آصف علی بیٹھے ہیں، سامنے کی صف میں مسٹر جناح اور عبوری حکومت کے دوسرے مسلم وزراء نواب لیاقت علی خاں، سردار عبدالرب نشتر، اور نواب غضنفر علی خاں موجود ہیں، ڈائس کی پچھلی صفوں میں ہندوستان کے چوٹی کے دانشور، عالم و ادیب، ماہر تعلیم اور سوشل ورکر تشریف رکھتے ہیں، وقت وہ تھا کہ دہلی میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا تھا، اور چاقو زنی کی کچھ وارداتیں پیش آئی تھیں، پانچ بجے شام سے صبح کے سات بجے تک کرفیو تھا، باہر سے آنے والے معزز مہمان بھی بڑی حفاظت اور احتیاط کے ساتھ اپنی قیام گاہ پہنچائے گئے، اس صورت حال کی فریاد کا اس سے بہتر موقع نہ تھا کہ ہندوستان کے چوٹی کے دانشور عالم و فاضل، جنگ آزادی کے سالار و سپاہی موجود تھے، جواب ہندوستان کی قسمت کے مالک اور امن و امان کے ذمہ دار بھی تھے۔

آگ لگی ہوئی ہے اسے بجھائیے!!

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

> ''آپ سب صاحبان آسمان سیاست کے تارے ہیں، لاکھوں نہیں، بلکہ کروڑوں آدمیوں کے دل میں آپ کے لیے جگہ ہے، آپ کی یہاں کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر میں تعلیمی کام کرنے والوں کی طرف سے بڑے ہی دکھ کے ساتھ چند لفظ عرض کرنا چاہتا ہوں، آج ملک میں باہمی منافرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے، اس

میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے، یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے، اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں گے؟ حیوانوں سے بھی پست تر سطح اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنوار سکیں گے؟ اس کے لیے خدمت گزار کیسے پیدا کر سکیں گے؟ جانوروں کی دنیا میں انسانیت کو کیسے سنبھال سکیں گے؟ یہ لفظ شاید کچھ سخت معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان حالات کے لیے جو روز بروز ہمارے چاروں طرف پھیل رہے ہیں، اس سے سخت لفظ بھی بہت نرم ہوتے، ہم جو اپنے کام کے تقاضوں سے بچوں کا احترام کرنا سیکھتے ہیں، آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے جب ہم سنتے ہیں کہ بہیمیت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی محفوظ نہیں، شاعر ہندی نے کہا تھا کہ ''ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے، اپنے ساتھ یہ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا'' مگر کیا ہمارے دیس کا انسان اپنے سے اتنا مایوس ہو چکا ہے کہ ان معصوم کلیوں کو بھی کھلنے سے پہلے ہی مسل دینا چاہتا ہے؟ خدا کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیے اور اس آگ کو بجھائیے، یہ وقت اس تحقیق کا نہیں کہ آگ کس نے لگائی؟ کیسے لگی؟ آگ لگی ہوئی ہے، اسے بجھائیے، یہ مسئلہ اِس قوم اور اُس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے، مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ زندگی میں انتخاب کا ہے، خدا کے لیے اس ملک میں مہذب زندگی کی بنیادوں کو یوں کھدنے نہ دیجیے۔''

ملک کی داخلی کمزوری اس کے لیے ہلاکت آفریں ثابت ہوسکتی ہے

دوسرا اقتباس ملک کے عظیم قائد اور آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی اس تقریر کا ہے جو انھوں نے جون ۶۴ء کی کسی ابتدائی تاریخ میں بھوپال میں کی تھی، اس وقت جبل پور اور بعض دوسرے شہروں میں سخت فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تھے، اور ان سے پوری دنیا میں ملک کی ساکھ اور اس کے سیکولر کردار کو دھکا لگا تھا، انھوں نے اس تقریر میں فرمایا:

''مجھے بڑا دکھ ہے کہ فسادات کے دوران ایک کانگریسی کے بھی خراش تک نہیں آئی، وہ عام طور پر جرأت و بہادری سے حالات کا مقابلہ نہ کر سکے، اور پردہ نشین عورتوں کی طرح گھروں میں چھپے رہے، ہمارے ملک کو کسی بھی بیرونی طاقت سے کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا، مگر اس کی داخلی کمزوری اس کے لیے ہلاکت آفریں ثابت ہوسکتی ہے۔

کانگریس کے اندر جو بزدل لوگ ہیں، وہ سب سے زیادہ نقصان پہنچا سکتے ہیں، ان المناک واقعات کی ذمہ داری اکثریت پر عائد ہوتی ہے، یہ کہنا سفید جھوٹ ہے کہ اقلیت فسادات کی ذمہ دار ہے، یہ کہنا بھی ایک غلط بیانی اور انتہائی کمینگی ہے کہ جبل پور میں ہندوؤں نے جو کچھ کیا، وہ اپنی حفاظت کے لیے کیا، وہاں جو کچھ ہوا وہ فرقہ پرستوں کی پہل ہی سے کی ہوئی سازشوں کا نتیجہ تھا، جو اطلاعات ملی ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ ان فسادات میں سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو پہنچا ہے، میں نہیں سوچ سکتا کہ مصیبت زدہ جارح اور حملہ آور بھی ہو سکتا ہے۔

جبل پور یا دوسرے شہروں میں جو کچھ ہوا وہ محدود واقعہ نہیں ہے، ان واقعات سے پورا ملک متأثر ہوتا ہے، بارہ برس کے بعد بھی اس قسم کے فرقہ وارانہ فسادات کا برپا ہونا ایک خطرناک رجحان ہے جس کی وجہ سے ملک کی ترقی رک جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔

یہ اکثریت کا فرض ہے کہ وہ اقلیت کے مفادات اور حقوق کی حفاظت اور نگہداشت کرے، اقلیتوں کے دبانے اور کچلنے سے سماج میں پس ماندگی اور کمزوری پیدا ہوتی ہے، اور یہ بات کسی قیمت پر گوارا نہیں کی جا سکتی۔''

تنہا تعلیم درندگی اور مجرمانہ حرکتوں کی طرف میلان کا تدارک نہیں

تیسرا اقتباس جے پرکاش نرائن جی کے اس تاریخی خط کا ہے جو انھوں نے جمشید پور اور راوڑ کیلا کے فسادات (مارچ ۱۹۶۴ء) کے بعد ہندوستانی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں (لوک سبھا اور راجیہ سبھا) کے صدر اور سیاسی جماعتوں کے نام لکھا تھا، اس خط میں وہ فرماتے ہیں:

''جہاں تک مظالم کا تعلق ہے میرے خیال میں کوئی حد باقی نہیں رہی، ہر نفرت انگیز اور شرمناک حرکت کی گئی، عام طور پر جو کچھ ہوا وہی عبرتناک تھا، لیکن بعض معاملوں میں تو بے رحمی اور گراوٹ کا اندازہ کرنا محال ہے، ایسی ایسی ہیبت ناک باتیں کی گئی ہیں جن کے بارے میں دہلی یا ملک کو قطعی علم نہیں ہے کہ کس پیمانہ پر کیا ہوا۔''

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

''مجھے کامل یقین ہے کہ اب بزدلانہ سرگرمیوں کو ایک مشترکہ مرکز سے منظّم کیا

گیا، افواہوں کے گڑھنے، ان کو پھیلانے، مالی امداد کے ساتھ منظّم اقدام کرنے کی خاطر سارے ہنگامہ کے لیے ایک سیاسی اور فلسفیانہ جواز فراہم کیا گیا، .... یہ بھی ثابت ہو گیا کہ تعلیم درندگی اور مجرمانہ حرکتوں کی طرف میلان کا تدارک نہیں، اور یہ بھی کہ حکومت کی انتظامی مشینری کس قدر ناکافی اور نااہل ہے۔"

اسی خط میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

"حکومت اور ملک کے دوسرے حلقوں اور جماعتوں کی طرف سے ان فسادات کی لرزہ خیز نوعیت پر پردہ ڈالنے کی جو کوشش کی جارہی ہے، وہ خود ملک کے لیے نہایت خطرناک ثابت ہوسکتی ہے، اگر عوام کو اس بات سے تاریکی میں رکھا گیا کہ ملک کے اندر کیا ہو رہا ہے، تو وہ ذہنی طور پر اس انقلابی علاج کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں گے جو شاید ضروری بات ہو۔"

صاحبو اور دوستو! ہمارا یقین ہے کہ اب بھی اس ملک میں ایسے صاف ذہن دردمند اور بیدار ضمیر انسان پائے جاتے ہیں جن کے دل و درد کی ترجمانی ان تینوں اقتباسات میں بڑی کامیابی کے ساتھ کی گئی ہے، اس سلسلہ میں شانتی سینا کے رہنما شری بابا کرشنا چودھری (سابق وزیر اعلیٰ اڑیسہ)، شری من موہن چودھری اور بابو آگم پرشاد ورما کو بھلایا نہیں جاسکتا، جنھوں نے مارچ ۱۹۶۴ء کے فسادات میں کئی بار اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر مظلوموں اور بے بس انسانوں کی جان بچانے کی کوشش کی، اور جنھوں نے اس موقع پر وہ کتاب شائع کی جس کا نام تھا "میں خاموش نہیں رہ سکتا"، اور ایسے کثیر التعداد شریف اور دلیر انسانوں کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا جنھوں نے اپنا فرض ادا کیا۔

اپنے فرقہ اور اپنے ساتھیوں کا بے لاگ اخلاقی محاسبہ کرنے اور ان کی خبر لینے کے بجائے دوسرے فرقہ کو وعظ و نصیحت

یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ عام طور پر جو لوگ اس صورت حال میں کچھ کرنے کے لیے کھڑے بھی ہوتے ہیں، وہ اپنے فرقہ یا جماعت کی اصلاح و تربیت کے پرمشقت اور محنت طلب کام کو چھوڑ کر دوسرے فرقہ اور جماعت کو وعظ و نصیحت، اس کو اخلاقی و علمی درس دینے، اور کسی دوسرے گروہ یا عنصر پر واقعات کی ذمہ داری عائد کرنے کے آسان کام کو اختیار کر لیتے ہیں،

قوموں کی جدید ذہنی تعمیر و تشکیل مختلف عناصر میں دیانت دارانہ اور مساویانہ طریقہ پر ہم آہنگی پیدا کرنے اور ملک کو اس خطرے سے بچا لینے کے لیے جو ننگی تلوار کی طرح اس کے سر پر لٹک رہا ہے، فرہاد کا جگر اور قیس کا جنون چاہیے، حیرت اور اس سے زیادہ حسرت کی بات ہے کہ اپنے ساتھیوں کا بے لاگ اخلاقی محاسبہ کرنے اور تمام مصلحتوں اور خطروں سے بے نیاز ہو کر طاقت اور اکثریت کے منہ پر کلمۂ حق کہنے والے افراد بہت کم نظر آتے ہیں، اور یہ کسی ملک کا سب سے بڑا خلا اور خطرہ کی نشانی ہے۔

اب معمولی اخلاق اپیلوں یا حکومتی انتظامات سے کام نہیں چل سکتا

خاص طور پر موجودہ حالات اتنے غیر معمولی، اتنے تشویشناک اور اتنے مہیب ہیں کہ اب معمولی اخلاق اپیلوں یا حکومتی انتظامات سے کام نہیں چل سکتا، اس کے لیے تو ملک کے ضمیر کو جھنجھوڑنے، اس کی روح کو چیخ کر پکارنے، اور انسانی شرم وحیا، انسانیت دوستی اور خوف خدا کے آخری رمق سے کام لینے کی ضرورت ہے، جس سے یقیناً ابھی تک اس قدیم مذہبی ملک اور یہاں کا نرم اور پریمی دل خالی نہیں ہوا ہے، اس کے لیے چند آدمیوں کو اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر نکلنے کی ضرورت ہوگی، اس کے لیے کچھ مدت کے لیے اپنے تمام کاموں کو ملتوی اور بالائے طاق رکھنے کی ضرورت ہوگی۔

ایک جھوٹا سچا نعرہ ہزاروں انسانوں کو پاگل بنا سکتا ہے

حالیہ واقعات نے جن کی ابتدا مراد آباد میں عید کے دن کے واقعہ سے ہوئی، یہ ثابت کر دیا ہے کہ ابھی اس ملک میں اس سلسلہ میں کوئی ٹھوس، گہری، پائیدار اور قابل اعتبار تبدیلی نہیں آئی، یہاں انسان کا احترام ابھی پورے طور پر پایا نہیں جاتا، یہاں انسانی جان کی قیمت پورے طور پر نہیں سمجھی گئی، ایک جھوٹا سچا نعرہ ہزاروں انسانوں کو پاگل بنا سکتا ہے، ایک صحیح یا مبالغہ آمیز روایت ہزاروں انسانوں کو ردعمل اور انتقام پر آمادہ کر سکتی ہے، کسی اخبار یا آتش بیاں مقرر کی تقریر اچھے اچھے سمجھ دار انسانوں کے دماغی توازن کو درہم برہم کر سکتی ہے، اور اس کے نتیجہ میں بستیاں لوٹی جا سکتی ہیں، محلے کے محلے ملبوں میں تبدیل کیے جا سکتے ہیں، برسوں کے تعلقات پر دم کے دم میں پانی پھر سکتا ہے، اور ایک جگہ کے سینکڑوں برس کے ہمسایوں کا خون پانی کی طرح بہایا جا سکتا ہے، اس حالت میں اس ملک میں کسی تعمیری فکری کام کی گنجائش نہیں، اور اس کو نئے نئے مصائب اور مسائل کا سامنا کرانا ہوگا، میں نے ملک کے تین دانشوروں اور رہنماؤں کے جو اقتباسات پیش

کیے ہیں، وہ ان حالات پر پورے طور پر منطبق ہوتے ہیں، اگر وہ زندہ ہوتے تو اس سے زائد کچھ نہ کہہ سکتے، آج بھی ان بیانات میں کسی ایک لفظ کی ترمیم کی بھی ضرورت نہیں۔

قوم کی تعمیر اور شعور وضمیر کی تربیت میں مجرمانہ کوتاہی

ہمیں اپنے گریبانوں میں منھ ڈال کر دیکھنا چاہیے کہ ہم نے اس ملک کا انسانی شعور بیدار کرنے کے لیے، اور انسان کو انسان سے محبت کرنے کا سبق سکھانے کے لیے، اور انسانی جان، انسانی ناموس کی قیمت ذہن نشین کرنے کے لیے کہاں تک اور کتنی جدوجہد کی ہے، اور اس کے لیے کب کوئی ہمہ گیر مہم چلائی ہے؟ ہم نے حصول آزادی کے لیے یقیناً جان کی بازی لگادی، اس کے لیے ایک طویل مہم چلائی جس میں ایک طرف ہر ہندوستانی کے دل میں آزادی کی آگ لگادی، دوسرے طرف اس سے برطانیہ کا قصر استعمار تزلزل میں آ گیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ناممکن بات ممکن ہوگئی، اور ہندوستان کو آزادی مل گئی، لیکن ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ہم نے ملک کو آزاد کرانے کے لیے جتنی کوشش کی، قوم کے ضمیر کو آزاد کرانے کی کوشش نہیں کی، ہم نے اس کو برطانیہ کے ظلم سے متنفر بنایا، لیکن ظلم کی ہر شکل سے متنفر بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی، آج بھی ہم ملک کی تعمیر کی جتنی کوشش کر رہے ہیں، قوم کی تعمیر کی اس کی آدھی اور چوتھائی کوشش بھی نہیں کر رہے ہیں، اس کا نتیجہ ہے کہ ملک موجود اور قوم موجود نہیں، ہم اپنی زمین کا ایک انچ بھی دوسرے کے قبضہ میں دینے کے لیے تیار نہیں، (اور یقیناً ایسا ہی ہونا چاہیے) لیکن ہم بے تکلف اپنے ہی جسم کو زخمی کرتے ہیں، اپنا ہی بازو کاٹنے کے لیے تیار نظر آتے ہیں، اپنے ہی ہاتھوں اپنا گھر ڈھاتے ہیں، اور ایک بھائی دوسرے بھائی کا گلا کاٹتا ہے۔

ہندوستان تاریخ کے ایک نازک موڑ اور فیصلہ کن دوراہے پر

دوستو اور بزرگو! کوئی کام شدید جدوجہد، خطرات اور قربانیوں کے بغیر نہیں ہوسکتا، قوم کی صحیح تعمیر اور انسانیت کا احترام اور باہمی اعتماد و محبت پیدا کرنے کے لیے ہم کو ایک مجنونانہ اور سرفروشانہ جدوجہد کی ضرورت ہے، ہندوستان تاریخ کے ایک نازک موڑ اور فیصلہ کن دوراہے پر کھڑا ہے، ایک راستہ ہمیشہ کی تباہی، نہ مٹنے والے انتشار اور نہ ختم ہونے والے زوال کی طرف جاتا ہے، ایک راستہ ہمیشہ کے امن وامان، اتحاد و یک جہتی کی طرف لے جاتا ہے، ہر ایسے موڑ پر کچھ ایسے لوگ سامنے آجاتے ہیں جو تاریخ کا رُخ اور واقعات کا دھارا بدل دیتے ہیں، ان کی دلیری، ان کی

صاف گوئی اور ان کی جانبازی پورے پورے ملک اور قوم کو بچالے جاتی ہے، یہی لوگ ملک کے معمار ہوتے ہیں، اکثر ایسے لوگ سیاست اور حکومت کے ایوانوں سے باہر ملک کے بے لوث خادموں اور سچے روحانیوں اور دانشوروں میں پائے جاتے ہیں، جن کی نیتوں پر شبہ نہیں کیا جاسکتا، جن کی صداقت اور بے غرضی مسلم ہوتی ہے، اور ان کا ماضی ہر داغ سے پاک ہوتا ہے۔

انسانیت کا آخری سہارا دو طبقے ہیں

تاریخ کے مطالعہ سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایسے موقعوں پر دو طبقے ہوتے ہیں، جن سے توقع کی جاتی ہے، اور وہی انسانوں کی امیدوں کی پناہ گاہ ہوتے ہیں، اور یہی ایسے موقعوں پر سر سے کفن باندھ کر آتے ہیں اور زمانہ کی کلائی موڑ دیتے ہیں، تاریخ کے دھارے اور حالات کے رخ کو تبدیل کر دیتے ہیں، اور تاریخ نگار کے لیے ایک نیا مواد فراہم کرتے ہیں، پھر ملک و معاشرہ کی زندگی میں ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے: ایک بے لوث دانشوروں کا طبقہ اور دوسرا مخلص مذہبی انسانوں کا طبقہ، میں ''بے لوث'' اور ''مخلص'' کا لفظ جان بوجھ کر استعمال کر رہا ہوں، بے لوث، بے غرض، غیر پیشہ ور، غیر مفاد پرست۔

یہ دو طبقے عام طور سے سب سے آخر میں گراوٹ کا شکار ہوتے ہیں، اور جب ان میں بھی خرابی آجاتی ہے تو پھر اس ملت اور تہذیب کو بچانے والی دنیا میں کوئی طاقت نہیں رہ جاتی، بڑی سے بڑی شہنشاہیاں اور طاقتور حکومتیں اگر چاہیں کہ اس تہذیب و معاشرہ کو بچالیں تو وہ نہیں بچاسکتیں، اس لیے کہ یہی دو طبقے ہیں جن سے ملک یا معاشرہ کا اعتدال قائم رہتا ہے اور زندگی کی چول صحیح طور پر بیٹھتی ہے، اگر خدانخواستہ یہ بھی اپنا مقام چھوڑ دیں اور اپنے منصب سے نا آشنا ہو جائیں، یہ بھی اپنی جگہ تلاش کرنے میں لگ جائیں کہ اس بگڑے ہوئے ماحول میں ہماری کیا جگہ ہے، اور یہ سمجھ کر کہ اس ملک یا اس تہذیب کی قسمت میں تباہی تو لکھی ہی ہوئی ہے، اور اب یہ کشتی تو ڈوب کر ہی رہے گی، اس لیے ڈوبنے سے پہلے کچھ فائدہ اٹھالیں، اور اپنی خواہشات پوری کر لیں، تو یہ تبدیلی کسی قوم کے لیے بس قیامت ہوتی ہے، پھر اس قوم کو کسی مصنوعی تدبیر یا دنیا کی کسی بڑی طاقت سے بچایا نہیں جاسکتا، اگر دنیا کے سارے مفکر اور تمام فلاسفر جمع ہو جائیں اور حکومت کے سارے وسائل موجود ہوں تو بھی اس ملک یا تہذیب کو کوئی بچا نہیں سکتا۔

اس لیے کہ دانشور اور مذہب کا صحیح علم رکھنے والا اور اس پر عمل کرنے والا طبقہ ان خطرات سے آگاہ ہو جاتا ہے جو برادر کشی، انسان دشمنی، مردم آزاری، سفاکی اور سنگدلی سے پیدا ہوتے ہیں،

انھوں نے مذہبی کتابوں میں خدا کا ان کے ساتھ معاملہ اور تاریخ میں ان کا انجام پڑھا ہوتا ہے، وہ قوموں کے عروج وزوال کے فلسفہ اور ان کے حقیقی اسباب وعلل سے باخبر ہوتے ہیں، ان کو معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ خرابیاں کسی معاشرہ یا اجتماعی نظام میں پیدا ہوتی ہیں تو اس کے نتیجہ میں کیا تباہیاں آتی ہیں؟ اس لیے وہ اس صورت حال سے سب سے زیادہ تشویش اور خطرہ محسوس کرتے ہیں، ہر طبقہ سے زیادہ ان کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے، اور وہ اس موقع پر میدان میں آجاتے اور ملک، قوم اور معاشرہ کو ہلاکت سے بچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگادیتے ہیں، میں اس موقع پر بلا کسی معذرت کے قرآن مجید کی ایک آیت پڑھوں گا جس میں ماضی کے آئینہ میں حال کی بولتی ہوئی تصویر موجود ہے، اور اس کی اصلاح کے لیے ایسے ہی لوگوں سے توقع ظاہر کی گئی ہے جن کے دماغوں میں کچھ بچی کھچی روشنی اور دلوں پر انسانیت کا رہا سہا صدمہ اور اثر ہو:

﴿فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُوا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ أُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ﴾ (سورة هود: ١١٦)

"تم سے پہلے کے انسانی نسلوں اور گروہوں میں کچھ ایسے صاحب شعور لوگ کیوں نہ ہوئے جو ملک میں فساد اور بگاڑ کو منع کرتے، ان میں تھوڑے ہی لوگ ایسے ہوئے جو ان خصوصیات کے حامل تھے اور ہم نے ان کو (اس عام تباہی سے) بچالیا، باقی جنھوں نے اسی زیادتی اور ظلم کا راستہ اختیار کیا، وہ انہیں آسائشوں اور لطف وعیش کے راستہ میں پڑ گئے جن کے ذرائع ومواقع ان کو مہیا کیے گئے تھے اور وہ مجرم تھے۔"

چار نکاتی (ہمہ گیر اور طویل المیعاد) پروگرام کی ضرورت

اس صورت حال کی اصلاح کے لیے جو ملک کے لیے تباہ کن، اس کو بدنام کرنے والی اور بیرونی دنیا کی نگاہ میں اس کو غیر وقیع، بے اعتبار، غیر متمدن اور غیر ترقی یافتہ ثابت کرنے والی ہے، اور جس کی اصلاح یا تدارک میں ملک کے ذی شعور دردمند اور انسان دوست طبقہ کی بہترین توانائیاں اور صلاحیتیں صرف ہوتی ہیں، ایک ہمہ گیر طویل المیعاد پروگرام کی ضرورت ہے، جس پر ملک کے دانشوروں، اصلاحی اور تعلیمی کام کرنے والوں اور سیاسی رہنماؤں کو جلد توجہ کرنی چاہیے۔

میں اس سلسلہ میں ان چار نکات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں جو میرے

نزدیک فوری طور پر مؤثر اور مفید ہو سکتے ہیں:

۱: خالص مذہبی، اخلاقی، انسانی بنیاد پر عوام سے براہ راست رابطہ قائم کرنے کی کوشش، اور دوروں، وفود، ملاقاتوں، محلوں، بستیوں، گاؤں اور قصبات کی سطح پر جلسوں اور خطابات کی تنظیم، جن میں انسان کی جان، اس کی عزت آبرو، مال و املاک کی قدر و قیمت ذہن نشین کرنے کی کوشش کی جائے، ان کے احترام و تحفظ کی ذمہ داری کا احساس دلایا جائے۔

مذہبی، اخلاقی و انسانی بنیاد پر یہ کام اس لیے مفید اور مؤثر ہے کہ اس ملک کے باشندوں کا مزاج فطرتاً مذہبی امن پسند، محبت آشنا اور انسان دوست واقع ہوا ہے، وہ اسی زبان کو زیادہ سمجھتے ہیں، اور اسی راستے سے ان کے دل و دماغ تک پہنچنا آسان ہے، اور اسی کا اثر مستقل اور دیرپا ہوتا ہے، دوسرے اس لیے کہ (افسوس و شرم کے ساتھ یہ بات کہی جاتی ہے) بار بار تجربوں کے بعد عوام کا سیاسی پارٹیوں اور الیکشن کے موقع پر منشور اور اعلانات پر سے بھروسا اور عقیدہ اٹھتا جا رہا ہے، اور وہ اس سے متاثر نہیں ہوتے۔

۲:- پرائمری کے مرحلہ سے لے کر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیمی مرحلہ تک نصاب تعلیم بالخصوص تاریخ کے مضامین اور اس کے نصاب کی اصلاح، جو ملک کے دو بڑے فرقوں (مسلمانوں اور غیر مسلموں) کے دل و دماغ میں منافرت کے بیج بونے کا ذمہ دار ہے، چونکہ تعلیم و تلقین کا یہ سلسلہ بچپن کے ابتدائی دور سے شروع ہو جاتا ہے، اور کتاب میں پڑھی ہوئی باتوں کا یقین (بالخصوص جب ان کو واقعات، قصوں اور کہانیوں سے مستحکم کیا جائے اور استاد بھی اس کے پرجوش مبلغ و داعی ہوں) طالب علموں کے دلوں میں پیوست ہو جاتا ہے، اور وہ ہر لکھی اور چھپی ہوئی بات کو ادب و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، تو ان کا ذہن و دماغ اسی میں ڈھل جاتا ہے اور ان کی پوری زندگی اسی کے سائے میں گزرتی ہے، یہی زہر ہے جو آج ہمارے پورے معاشرہ میں پھیلا ہوا ہے، اور کسی وقت وہ ہانڈی کا اُبال اور جذباتی اشتعال بن کر فرقہ وارانہ فسادات اور عملی تصادم کی شکل اختیار کر لیتا ہے، جب تک اس نصاب تعلیم کی - جس کی داغ بیل انگریزوں نے اپنے سامراجی مقاصد اور پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو (Divide and Rule) کے اصول کے ماتحت ڈالی تھی- اصلاح نہیں ہوگی، اس امن و آشتی، باہمی اعتماد اور دونوں فرقوں کے درمیان خوش گوار تعلقات کی امید نہیں کی جا سکتی۔

۳:- ہندوستانی پریس میں اپنی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنے کی مؤثر اور طاقتور اور منظم اور

مخلصانہ کوشش، یہ اخبارات اپنے ہیجان انگیز مضامین، سنسنی خیز خبروں اور تصویر کا بالعموم ایک رُخ پیش کرنے اور ایک فرقہ کے ظلم اور ایک فرقہ کی مظلومیت ہی کو نمایاں کرنے کے ذریعے لاکھوں انسانوں کے دل میں نفرت وعداوت کی آگ بھڑکا دیتے ہیں، اور کسی فرقہ، جماعت یا آبادی کے ایک عنصر کی طرف سے شکوک وبدگمانیوں کا ایک بادل بنا دیتے ہیں۔

میں نے کچھ عرصہ ہوا اسی شہر لکھنؤ میں مدیران جرائد کی ایک معقول تعداد کے سامنے جو ایڈیٹرس کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے، فارسی کا ایک مشہور شعر کا ایک مصرعہ پڑھا تھا ع

زیرِ قدمت ہزار جان است

شاعر محبوب کو مخاطب کر کے کہتا ہے: تمہارے قدم کے نیچے ہزاروں جانیں ہیں، اس لیے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس مصرع میں صرف ایک حرف کی ترمیم کے ساتھ میں نے اس کو اس طرح پڑھا تھا:

زیرِ قلمت ہزار جان است

"تیرے قلم کے نیچے ہزاروں انسانی جانیں ہیں۔"

واقعہ بھی یہی ہے کہ قلم کی ایک لغزش ہزاروں، لاکھوں انسانوں کی ہلاکت اور شہروں اور بستیوں کی تباہی کا ذریعہ بن جاتی ہے، مجھے معاف کیا جائے، ایسی حالت میں میں ایسے ملک کے سرے سے اخبارات سے محروم رہنے اور اس طعنہ کو سننے کو کہ وہ اخبارات اور پریس کے میدان میں دوسرے ملکوں سے پیچھے ہے اور وہ ایک پس ماندہ اور غیر ترقی یافتہ ملک ہے، اس پر ترجیح دیتا ہوں کہ لاتعداد اخبارات جو مختلف زبانوں میں نکلتے ہیں، اپنے ہی ملک کے باشندوں اور اپنے ہی پڑھنے والوں کی قسمتوں اور جانوں سے کھیلتے رہیں، اور ہم اس پر فخر کرتے رہیں کہ ہمارے ملک میں پریس بالکل آزاد ہے، اور وہاں سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں مختلف زبانوں میں اخبارات نکلتے ہیں اور ان کا حلقۂ اشاعت بہت وسیع ہے۔

میرے خیال میں ملک کے دانشور اور بہی خواہ حکومت کی مشینری کی مداخلت کے بغیر بھی اخبارات کے ذمہ داروں اور لکھنے والوں کو اپنا پورا اخلوص دے کر اور تعلقات کی پوری طاقت صرف کر کے اس پر آمادہ کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داری کا زیادہ احساس کریں اور اپنے فرائض اور یگانہ قابلیت وذہانت کو تخریب وانتشار انگیزی میں صرف کرنے کے بجائے تعمیر اور اتحاد پروری میں صرف کریں، یہ کام ملک کے دانشور، ادیب، اہل قلم (جن میں خود ممتاز صحافی اور جرنلسٹ اور کالم

نویس ہیں) بہتر طریقہ پر انجام دے سکتے ہیں، اور ان کو اس میں زیادہ تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔

۴:- برطانوی حکومت نے اپنی اس کمزوری اور اس حقیقت کا احساس کر کے کہ اس کے نمائندے ہندوستان میں بہت تھوڑی تعداد میں ہیں، اور وہ سات سمندر پار سے اس ملک اور اہل ملک کی مرضی کے خلاف اس پر اپنا قبضہ اور اقتدار قائم کیے ہوئے ہے، ہندوستان میں اپنے اور پبلک کے درمیان ایک ایجنسی کی ضرورت سمجھی تھی جو اس کا پبلک پر رعب وداب قائم رکھے، اور جس سے یہاں کے عوام دہشت زدہ اور مرعوب رہیں، اور جس کے سہارے وہ یہاں اپنے جابرانہ قوانین نافذ اور حالات کو کنٹرول کر سکے، یہ پولیس کا ادارہ تھا، اور چونکہ بدیسی حکومت میں اس کی بنیاد اسی نظریہ پر پڑی تھی، اس لیے اس نے اس کی تربیت دہشت انگیزی پر کی تھی، اس کو جان بوجھ کر ہر طرح کی اخلاقی تربیت، ہم وطنوں کے احترام اور لطیف و بلند انسانی احساسات و جذبات سے الگ رکھا تھا، اس کا نتیجہ اس کیریکٹر کی شکل میں ظاہر ہوا جو اس ادارہ کا نہ صرف امتیازی نشان بلکہ قابل تعریف اور باعث افتخار بن گیا۔

لیکن اب جب کہ ہندوستان آزاد ہے اور ہمارے منتخب کیے ہوئے بھائیوں کا کام اس ملک پر حکومت کرنا نہیں بلکہ اس کا انتظام سنبھالنا اور پبلک کی خدمت کرنا ہے، پولیس کا معیار اور اس کے بارے میں نقطۂ نظر بدلنا چاہیے، اور اس مفید ادارہ کی تربیت (جو ملک کی آبادی کا ایک اہم جزو اور قابل احترام عنصر ہے) بالکل دوسرے نہج پر ہونی چاہیے، اس میں اخلاقی تربیت، ہندوستانی شہریت، اور انسانی احساسات، دوسروں کی مدد کا جذبہ، کمزوروں پر رحم، چھوٹوں پر شفقت، اور پاکباز انسانوں کا احترام اور اپنے فرائض کو بہتر سے بہتر طریقہ پر ادا کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، تا کہ وہ اس طرح سے اہل ملک اور اپنے ہم وطنوں کی نظر میں مونس وغم خوار اور معاون و مددگار نظر آئیں، دوسرے ملکوں میں حتی کہ خود برطانیہ میں ان کو اسی نظر سے دیکھا جاتا ہے، یہ صرف اس تحتی براعظم کی خصوصیت ہے جس پر سو برس تک انگریزوں نے حکومت کی ہے، کہ پولیس کو خوف و دہشت اور اجنبیت و بے گانگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

اسی طرح اس کی بھی ضرورت ہے کہ پولیس میں اکثریتی فرقہ کے علاوہ دوسرے فرقہ کے بھی بالخصوص مسلم اقلیت کی متناسب نمائندگی ہو، اس سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ اس تنظیم کے مختلف اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ رہنا سہنا سیکھیں گے، ایک دوسرے کی خوبیوں سے واقف ہوں گے، دوسرے ایسے فرقہ وارانہ فسادات کے موقع پر وہ یک طرفہ کارروائی نہیں کر سکیں گے، اس

حقیقت پر اکثریتی فرقہ کو وسیع ذہن اور ٹھنڈے دل کے ساتھ، اور حکومت کو حقیقت پسندی اور سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے اور اس کے لیے جلد اور مؤثر اقدام کرنے کی ضرورت ہے۔

انوکھی معذرت

حضرات! میں نے اور ''پیام انسانیت'' کے داعیوں اور کارکنوں نے آپ کو اسی توقع پر یہاں آنے اور ایک جگہ جمع ہو کر ملک کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لینے اور اس کو تبدیل کرنے کی تدبیروں پر غور کرنے کے لیے زحمت دی ہے، میں نے آپ کے سامنے ملک کی موجودہ صورت حال کا جو مہیب نقشہ پیش کیا ہے، اس میں قطعاً مبالغہ اور رنگ آمیزی نہیں ہے، اور اس پر جس تشویش اور خطرہ کا اظہار کیا ہے، اس میں تخیل آرائی یا بدشگونی سے کام نہیں لیا ہے، میں آپ سے اپنی صاف گوئی اور تلخ نوائی کی معافی مانگتے اور اس پر معذرت کرتے ہوئے غالب کا یہ شعر پڑھنے کے بجائے کہ

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

اِس پر متاسف اور نادم ہوں کہ میں اس سے بڑھ کر صاف گوئی اور اس سے زائد تلخ نوائی کی جرأت نہ کر سکا، اور میری زبان و قلم نے میرے دردِ دل کا ساتھ نہیں دیا، اور اسی شہر لکھنؤ کے قدیم شاعر امیر مینائی کا شعر پڑھ کر رخصت ہوتا ہوں کہ

امیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے (۱)

(۱) یہ خطبۂ صدارت پندرہ روزہ ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۱۰؍نومبر ۱۹۸۰ء) میں، اور علاحدہ رسالہ کی شکل میں بھی شائع ہوا۔

۱۳

مختلف مذاہب اور تہذیبوں کے دیس میں زندگی گزارنے کا طریقہ[1]

عشق ہے پیارے کھیل نہیں ہے

حضرات! میں اپنی تقریر کا آغاز حضرت جگر مرادآبادیؔ کے ایک شعر سے کروں گا، وہ کہتے ہیں۔

عشق ہے پیارے کھیل نہیں ہے
عشق ہے کار شیشہ و آہن

پیام انسانیت کی آواز پر آپ حضرات ہندوستان کے مختلف حصوں سے یہاں تشریف لائے، مجھے اس بات کا اقرار ہے اور میرے ساتھیوں کو بھی کہ ہمیں بہت تھوڑا وقت ملا، اس سے کہیں زیادہ مجمع ہوسکتا تھا، اور چوٹ کھائے ہوئے دل جو ہندوستان کے گوشے گوشے میں رہتے ہیں اور جن کے لیے ہندوستان ہمیشہ مشہور رہا ہے، وہ اتنی بڑی تعداد میں یہاں جمع ہوسکتے تھے کہ لکھنؤ جیسا وسیع شہر بھی شاید ان کے کافی نہ ہوتا، ہمارا دل تو کافی ہوجاتا کہ دل میں بڑی گنجائش ہوتی ہے، لیکن شاید شہر میں گنجائش نہ ہوتی، لیکن بہت تھوڑے وقت میں ہم نے یہ دعوت ملک کے مختلف حصوں میں پہنچائی، اور وہ لوگ آسکے جن کو خدا نے اس کی توفیق دی، ان کے لیے آسانیاں تھیں اور وہ بے چین ہوگئے، آپ حضرات نے کل سے اس وقت تک جو منظر دیکھا ہے اس کی وجہ سے مجھے یہ شعر پڑھنا پڑا۔

---

(۱) بارہ دری، قیصر باغ، لکھنؤ میں ۲۷-۲۸/اکتوبر ۱۹۸۰ء کو منعقد پیام انسانیت کنونشن کی الوداعی تقریر، جو ۲۸/اکتوبر کو شب میں قیصر باغ بارہ دری میں کی گئی، اور اس پر جلسہ کا اختتام ہوا۔

شاید آپ نے انسانوں کی طرح اس ملک میں رہنے اور بسنے کو بہت آسان کام سمجھ لیا، جلسے میں آپ آئے، بڑے سکون واطمینان کے ساتھ آپ نے تقریریں سنیں، اب اپنے اپنے گھر خیر و عافیت کے ساتھ واپس جائیں گے، شاید آپ یہ سمجھیں کہ ''پیام انسانیت'' کوئی الہ دین کا چراغ ہے جہاں رگڑا کام بنا، یہ نہیں، یہ اسی ملک کی بات نہیں ہے، میں کہتا ہوں کہ دنیا کے ہر ملک، ہر شہر میں بلکہ یہاں تک کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مکہ اور مدینہ میں بھی جو مسلمانوں کے لیے مقدس ترین شہر ہیں، اور ہمارے ہندو بھائیوں کے لیے بھی اس ملک میں کچھ شہر ہیں، ان شہروں میں رہنے کے لیے شیشہ و آہن کی طرح ساتھ رہنا پڑے گا، یہ الہ دین کا چراغ نہیں، آپ نے سمجھا کہ پیام انسانیت کی صدا لگائی گئی اور اتنی دور دور سے لوگ اپنا کرایہ خرچ کر کے یہاں جمع ہو گئے، معاملہ بہت آسان ہے، اب اس ملک میں محبت کی، بھائی چارے کی ہوائیں چلیں گی، اب کسی فساد کی خبر سننے میں نہیں آئے گی، میں آپ کو دھوکہ میں رکھنا نہیں چاہتا، زندگی زندگی ہے، انسان وہی انسان ہے، فطرت انسانی وہی فطرت انسانی ہے، جو لاکھوں برس سے خدا نے اس انسان کی نسل میں ودیعت فرمائی ہے، اور زندگی اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ ہے، ہم فرشتے نہیں ہیں، اور اسی لیے ہم کو فرشتوں سے زیادہ اجر ملے گا، اور خدا کے یہاں ہم کو شاباشی ملے گی اور پیٹھ ٹھونکی جائے گی، اور ہم کو وہ انعام ملے گا جس کو شاید فرشتے بھی رشک کی نگاہ سے دیکھیں، کہ ہم گر سکتے ہیں، فرشتے گر نہیں سکتے، ہم ٹھوکر کھا سکتے ہیں، فرشتے ٹھوکر نہیں کھا سکتے، ہم کو غصہ آتا ہے اور سو بار آئے گا، ہزار بار آئے گا، لیکن ہم اپنے غصہ کو دبانا جانتے ہیں، اپنے غصہ کو پی جانا جانتے ہیں، اپنے غصہ پر پشیمان ہونا جانتے ہیں، ہمیں اسی زندگی کے ساتھ، زندگی کی ان ہی خصوصیات کے ساتھ، ایک ملک میں نہیں، ایک شہر میں نہیں، ایک محلے میں نہیں، گھر گھر رہنا ہے، اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اب غلط فہمیاں نہیں ہوں گی، اب شکر رنجیاں نہیں ہوگی، اب تلخیاں نہیں آئیں گی، اب ہماری تیوری نہیں چڑھے گی، اب ہمارے دماغ پر کوئی ضرب نہیں لگے گی، تو وہ اس غلط فہمی کو دور کر لے، ہمیں اس دنیا میں سب کچھ دیکھنا ہے، سب کچھ سننا ہے، اور سب کچھ سہنا بھی ہے، اور پھر بھی ہم نہ انسان سے مایوس ہیں، نہ اپنی فطرت سے، نہ اپنے اس ملک سے، ہم اگر کہیں جانا بھی چاہیں تو نہیں جا سکتے، سیاروں پر ہمارے لیے جگہ نہیں ہے، اور اب آپ یہ سمجھ لیجیے کہ کسی دوسرے ملک میں بھی جگہ نہیں ہے، ہمیں اس ملک میں رہنا ہے، روٹھنا ہے اور منا ہے، گرنا ہے اور اٹھنا ہے، الجھنا ہے اور سلجھنا ہے، ہمیں یہ سب کام کرنے ہیں، سارے پاپڑ بیلنے ہیں، مگر ہم یہاں رہیں گے اور اسی طرح سے رہیں گے، شہریوں کی طرح، شریفوں کی طرح، بھلے مانسوں کی طرح۔

ہمارے اندر اخلاق کی جہانگیری ہونی چاہیے

تو اگر آپ اس جلسے کی یہ پرسکون فضا دیکھ کر اور یہ تقریریں جو آپ نے سنی ہیں، ان کو سن کر، یہ خیال لے کر یہاں سے جا رہے ہیں کہ اب سب دلدّر دور ہوئے، اور سب رنج کافور ہوئے، اور نہ کسی کی نکسیر پھوٹے گی نہ کسی کو خراش لگے گی، نہ کسی کا دل ٹوٹے گا، نہ کسی کو کوئی پریشانی لاحق ہوگی، تو اس خواب وخیال کو دور کر دیجیے، اس ملک میں سب کچھ ہوسکتا ہے اور ہوگا، اور پھر جب کہ پنبہ و آتش کی بات یعنی آگ بھی ہے اور روئی بھی ہے، دونوں رہ سکتے ہیں، لیکن اگر آگ کو ہوا دینے والا کوئی ہے اور روئی کو قریب لانے والا کوئی ہے تو پھر اس کا اطمینان نہیں کہ روئی میں آگ نہ لگے گی، ہمارے اس ملک میں جہاں تعمیری طاقتیں ہیں، جہاں خیر سگالی اور خیر خواہی کی طاقتیں ہیں، وہاں مختلف اسباب کی بنا پر تخریبی طاقتیں بھی ہیں، وہ اپنا کام کریں گی، جیسا کہ ہمارے دوست مولوی عبدالکریم پاریکھ صاحب نے شیطان کا کردار بتایا کہ شیطان دیوار پر گڑ کی ایک انگلی لگا کر کے الگ ہو جاتا ہے، ایسی انگلی لگا کر الگ ہو جانے والے بھی اس ملک میں ہیں اور رہیں گے، لیکن ہمیں اپنے دماغی توازن کو درہم برہم نہیں ہونے دینا ہے، ہمیں بچوں کی فطرت اختیار نہیں کرنی ہے، ہمارے اندر صبر وضبط کی طاقت ہونی چاہیے، ہمارے اندر اخلاق کی جہانگیری ہونی چاہیے، ہمارے اندر یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ دل پر پتھر رکھ سکیں، اپنی اس خودداری کو قائم رکھتے ہوئے جس کا اظہار بعض تقریروں سے ہوا، وہ بھی انسانی جذبات تھے، میں ان کی بھی گنجائش سمجھتا ہوں، لیکن بہر حال ہمیں اپنے دل پر پتھر رکھنا پڑے گا اور پھر اس کے بعد ہمیں ان پتھروں کو موم بنانے کی کوشش کرنی پڑے گی۔

اس دنیا میں جو کچھ خیر ہے وہ سب پیغمبروں کا صدقہ ہے

ہمارے سامنے اس سلسلہ میں سب سے اونچا نمونہ خدا کے پیغمبروں کا ہے، وہ کس حال میں اور کس زمانہ میں آئے، ایک آدمی ان کی بات سننے کا روادار نہیں تھا، ایک آدمی ان کی بات سمجھنے کے قابل نہیں تھا، معلوم ہوتا ہے جنگل میں آ گئے ہیں، درندوں میں آ گئے ہیں، کوئی ان کی بولی سمجھنے والا نہیں، چنانچہ قرآن شریف میں ہے کہ ایک پیغمبر کو خطاب کر کے ان کی قوم نے کہا کہ ﴿قَالُوا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرَاكَ فِينَا ضَعِيفًا﴾ (سورۃ ھود: ۹۱) اکثر آپ کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، ہمارے پلے کچھ نہیں پڑ رہا ہے، ہم نہیں جانتے آپ کیا کہہ رہے

ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ہمارے درمیان سب سے کمزور آدمی ہیں، پھر ہم آپ کی بات کیوں سنیں؟ لیکن انھوں نے کیا کہا؟ پارس کی بھی کیا حقیقت ہے کہ پتھر کو چھوجاتا ہے تو سونا بنادیتا ہے!! کیمیا کی بھی کیا حقیقت ہے کہ مٹی کو وہ سونا بنادیتی ہے!! انھوں نے انسانوں کو فرشتوں سے اونچا کردیا، انسانوں میں وہ صبر وضبط پیدا کیا کہ اگر تاریخ کی متواتر شہادتیں نہ ہوتیں تو یقین کرنا مشکل تھا کہ انسان اتنا صابر وضابط ہوسکتا ہے، آپ دیکھیں گے کہ جوان کے خون کے پیاسے تھے، ان کو انھوں نے سینے سے لگایا، دل میں جگہ دی، اس کے بعد وہ ان پر اپنی جان نچھاور کرنے لگے، لوگ ان کو مارنے کے لیے آتے تھے لیکن ان کا کلمہ پڑھتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوتے تھے، جنھوں نے خون کیے تھے اور جن کی آنکھوں سے اب بھی خون ٹپک رہا تھا، انھوں نے ان کو محبت کا پیغام دیا، انھوں نے ان کو اپنے سینے سے لگایا، پھر دنیا کیا ہوگئی، دنیا میں کیسی ہوائیں چلنے لگیں، خزاں کے بعد بہار کا دور آیا، بادسموم کے بعد نسیم جانفزا کے وہ جھونکے چلے، آج تک وہ ہم کو محسوس ہورہے ہیں، میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں بغیر کسی معذرت کے کہ اس وقت بھی جو کچھ دنیا میں خیر ہے، اس وقت بھی دنیا میں محبت کا جو کچھ مادہ ہے، اس وقت بھی انسانوں کے دلوں میں جو کچھ روشنی ہے، اس وقت بھی انسانوں کے دلوں پر درد کی جو چوٹ ہے، وہ سب ان پیغمبروں کا صدقہ ہے، ہم کتنی ہی ترقی کرجائیں، ہم آسمان پر پہنچ جائیں، لیکن پیغمبروں کی سطح، پیغمبروں کے صبر وضبط کی سطح، پیغمبروں کی انسانیت کی سطح، پیغمبروں کی رحمت ومحبت کی سطح سب سے اونچی ہے، اور وہاں پر آسمان سے اوپر ایک نیا آسمان نظر آئے گا۔

مجھے فسادات کے پیچھے بھی پیسے کی محبت ہی نظر آتی ہے

دوستو اور بھائیو! تھوڑی دیر میں ہم آپ رخصت ہوجائیں گے، جیسے رات کے ستارے ڈھل جاتے ہیں، اور شمع کے پروانے ایک دوسرے سے رخصت ہوجاتے ہیں، لیکن یہ پیغام لے کر جائیے کہ آپ کو اس ملک کی تخریب کو تعمیر سے، نفرت کو محبت سے، عداوت کو دوستی سے، بداخلاقی کو اخلاق سے بدلنا ہے۔

یہاں دولت پرستی کا جو روگ لگ گیا ہے، اور ہمارے اس درخت کو جو گھن کھاتا چلا جارہا ہے، پیسے کی حد درجہ بڑھتی ہوئی محبت، اس کے لیے آدمی سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہے، مجھے ان فسادات کے پیچھے بھی پیسے کی محبت ہی نظر آتی ہے، اس کو میری نظر کی کوتاہی کہیے یا کچھ کہیے، مجھے ان فسادات کے پیچھے حسد نظر آتا ہے، تنگ نظری نظر آتی ہے۔

حقائق کا سامنا کرنا چاہیے

ہمیں ان حقیقتوں کو سامنے رکھنا ہے، خواب وخیال کی دنیا میں، احمقوں کی جنت میں رہنا نہیں ہے، حقائق کا سامنا کرنا چاہیے، اس ملک میں بیماریاں ہیں، اس ملک کو روگ لگ گیا ہے، اس ملک کے درخت کو گھن کھاتا چلا جارہا ہے، اس ملک کا معاشرہ فاسد (Corrupt) ہے، اس میں بیسیوں ایسی بیماریاں ہیں کہ باہر سے کسی خطرہ کا کوئی خطرہ نہیں، یہ اس کو اندر سے چاٹ جانے کے لیے کافی ہے، برگد کا درخت دور سے کھڑا نظر آتا ہے، بڑا شاندار بڑا عظیم، بڑا مہیب، لیکن اندر سے اس کو دیمک چاٹ رہی ہے، ہوا کا ایک جھونکا اس کو گرا سکتا ہے، ہمارا معاشرہ ویسے ہی گھن کھائے ہوئے برگد کے درخت کی طرح ہے، مجھے کہنے کا حق ہے، میں اسی ملک کا رہنے والا ہوں، اور بظاہر میری عمر یہیں گزرے گی، میں ایک بار نہیں، دس بار نہیں پچاس بار کہوں گا، اس ملک کے معاشرے کو گھن لگ گیا ہے، اس ملک کو دیمک اندر سے چاٹتی چلی جارہی ہے، میں نے لکھنؤ میں اسی بارہ دری کے ایک جلسہ میں کہا تھا: ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ساری حقیقتیں، سب صداقتیں مرچکی ہیں، دو حقیقتیں زندہ ہیں: ایک پیسے کی محبت اور ایک فرقہ وارانہ منافرت۔''

آج ہمارا ملک سخت خطرے سے دوچار ہے

میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں، اور یہ بھی ایک ڈنکا ہے، میرے پاس اگر اس سے زیادہ بلند آواز کا ڈنکا ہوتا تو میں اس سے زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ کہتا کہ اس وقت ہمارا ملک سخت خطرے سے دوچار ہے، قدم قدم پر رشوت دینی پڑتی ہے، قدم قدم پر بداخلاقی کرنی پڑتی ہے، قدم قدم پر انسان کو اپنی خودداری کو پامال کرنا پڑتا ہے، قدم قدم پر غلامانہ ذہنیت اور سیرت کا اظہار کرنا پڑتا ہے، انگریزوں کے زمانہ میں ہم اتنے غلام نہ تھے، انگریزوں کے زمانے میں ہمارے جسم غلام تھے، آج ذہن غلام ہے، ہمارا ضمیر غلام ہے، غلامی کی بدترین اور خلاف فطرت قسم وہ ہے کہ بھائی بھائی کا غلام ہو، ایک ملک میں رہنے والے ایک دوسرے پر حکومت کرنے لگیں، اور یہ سمجھیں کہ جس کو جو موقع مل جائے، اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے، وہ اپنے بھائی کے ساتھ وہ معاملہ کرے جو بدیشی حاکم ہندوستانی کے ساتھ کرتے تھے، آج ہندوستانی ہندوستانی کے ساتھ وہ معاملہ کررہا ہے، کچہریوں میں وہ معاملہ ہورہا ہے، کوتوالیوں میں وہ معاملہ ہورہا ہے، اور افسوس کی بات یہ ہے مجھے معاف کیا جائے کہ دانش گاہوں اور یونیورسٹیوں میں یہی معاملہ ہورہا ہے، جو غلامانہ ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔

آج سارا ملک دو کیمپوں میں تقسیم ہے

آج سارا ملک دو کیمپوں میں تقسیم ہے، لوگ کہتے ہیں: ہندو اور مسلمان، میں کہتا ہوں: ایک حاکم ایک محکوم، ایک بیچنے والا ایک خریدنے والا، حاکم اور محکوم کی مثالیں ہم نے تاریخ میں اتنی پڑھی ہیں کہ ہم بے حیا ہو گئے ہیں، دل سخت ہو گیا ہے، لیکن جب ہم ملک میں دیکھتے ہیں کہ ایک شہری دوسرے شہری پر حکومت کرنا چاہتا ہے، اس کو اس طرح ذلیل کرنا چاہتا ہے جس طرح انگریزوں نے بھی نہ کیا ہوگا، آج جس کی بن آتی ہے، جس کی کمان چڑھی ہوتی ہے، جس کے نشانے پر کوئی آجاتا ہے، تو وہ کسر نہیں رکھتا، آپ ریلوں کا سفر کریں، ہوائی جہاز کا سفر کریں، پلیٹ فارموں پر انتظار کریں، پارکوں کی بنچوں پر بیٹھیں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کریں، ہر جگہ آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ آزاد نہیں ہیں، اس ملک میں عزت کے ساتھ نہیں رہ رہے ہیں، اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ہم کسی ملک سے آئیں، اپنے ملک کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اپنی ذلت کا احساس ہوتا ہے، اس سے بڑھ کر ڈوب کر مرنے کی کوئی بات نہیں کہ میں یو.کے.(U.K.) میں اپنے کو آزاد محسوس کروں، عزت والا محسوس کروں، امریکہ میں اپنے کو عزت والا انسان محسوس کروں، سعودی عرب میں اپنے کو عزت والا انسان محسوس کروں، اور اپنے دیس میں آکر پہلے ہی جو واسطہ پڑتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم غلام ہیں، ہم صبر کیے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے، ہم کو آج سب کچھ سننا پڑے گا، سب کچھ برداشت کرنا پڑے گا، ایرپورٹ پر دیکھیے، پلیٹ فارموں پر دیکھیے، کوتوالیوں میں دیکھیے، جہاں جہاں ضرورت پڑتی ہے، وہاں آپ دیکھیے، ہر جگہ ہندوستانی کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ابھی آزاد نہیں ہوا، اپنے بھائی سے، اپنے جسم کے ایک ٹکڑے سے، اپنے ایک ساتھ رہنے والے شہری سے بات نہیں کر رہا ہے، بلکہ اس سے بات کر رہا ہے جو آسمان سے اترا ہے، یہ صورت حال طبعی وقدرتی (Natural) نہیں ہے، اس کو بدلنا چاہیے۔

وہ فساد جو گھر گھر ہو رہا ہے

یہ ''پیام انسانیت'' اسی کے اندر محدود نہیں کہ فرقہ وارانہ فسادات نہ ہوں، یہ فسادات تو کبھی کبھی ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ہی ہو سکتے ہیں، لیکن جو فساد گھر گھر ہو رہا ہے، وہ فساد جو قدم قدم پر ہو رہا ہے، وہ فساد جو ہمارے اندر برپا ہے، وہ فساد جس سے ہمیں چوبیس گھنٹے واسطہ پڑتا ہے، وہ بھی فساد ہے، ہمیں اس فساد سے بھی بچنا چاہیے اور اس فساد کو روکنا چاہیے۔

یہ راستہ کوئی پھولوں کی سیج نہیں ہے

میرے بھائیو اور دوستو! راستہ بڑا لمبا ہے اور یہ پھولوں کی سیج نہیں ہے، یہ کانٹوں اور انگاروں کی چتا ہے جس پر سے آپ کو گزرنا ہے، میں آپ کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا کہ جب یہاں سے آپ جائیں گے تو محبت کی ہوائیں چل رہی ہوں گی ممکن ہے یہاں سے نکلتے ہی آپ کو کوئی ایسا تلخ تجربہ ہو جہاں آپ کہیں کہ کہاں آگئے؟ قدم قدم پر اس کا تجربہ ہو رہا ہے، اور یہ سب ہمارا اور آپ کا کیا دھرا ہے، قرآن نے کہا ہے:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ (سورة الروم: ٤١)

خشکی اور تری میں بگاڑ پھیل گیا، کرپشن (Corruption) پھیل گیا ہے خشکی اور تری میں، سمندروں کو دیکھیے، پہاڑ کی چوٹیوں پر دیکھیے، غاروں کے اندر دیکھیے، کرپشن پھیل گیا ہے، کہ انسان کی فطرت کا خالق، انسان کو بنانے والا کہتا ہے کہ ﴿بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ﴾ لوگوں کے اعمال کی وجہ سے، لوگوں کے کرتوتوں کی وجہ سے، ہمارے اعمال میں یہ پیسے کہ حد سے بڑھی ہوئی محبت، یہ خون کا سفید ہو جانا، خدا سے نہ ڈرنا، انسانیت کا احترام نہ کرنا، انسان کی قدر و قیمت کا نہ پہچاننا، ہر انسان کو گاہک سمجھنا۔

اس انسانیت میں کوئی مزہ ہے؟

میں کہتا ہوں، دفتروں میں لوگ بیٹھے ہوتے ہیں، جہاں کوئی آدمی کام سے آیا، انھوں نے کہا: بڑی موٹی آسامی ہے، بس اب اس سے سب وصول کرلیا جائے گا، چاہیے تھا کہ اٹھ کر استقبال کیا جاتا اور کہا جاتا کہ میں یہاں اس لیے بیٹھا تھا کہ تمہاری سیوا کروں، تمہاری خدمت کروں، میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا، کس مصرف کا تھا، تم آئے، تم نے مجھے باکار اور قیمتی بنا دیا، کہیے کیا حکم ہے؟ ہم آپ کی کیا سیوا کرسکتے ہیں؟ آدمی کے دھڑکتے ہوئے دل پر اس کی نظر نہیں ہوتی، اس کے مضطرب دماغ پر نظر نہیں ہوتی، اس کی پیشانی پر پسینہ کے قطرے پر نظر نہیں ہوتی، اس کے چہرے پر جو زردی چھائی ہوئی ہے، اس پر نظر نہیں ہوتی، اس کی جیب پر نظر ہوتی ہے، دیکھا جاتا ہے کہ کوئی بڑا نوٹ جھانک رہا ہے کہ نہیں، اور ہوشیار آدمی جب اپنا کام کرانے جاتے ہیں تو نوٹ اس طرح رکھتے ہیں کہ کچھ دکھائی دیتا ہے، کچھ چھپا ہوا کچھ نکلا ہوا، تاکہ معلوم ہو جائے

کہ میرے پاس ''مشکل کشا'' موجود ہے، یہ ''قاضی الحاجات'' موجود ہے، یہ کیا انسانیت ہے؟ اس انسانیت میں کوئی مزہ ہے؟

انسانیت کا انتہائی زوال

حضرات! آپ کا کام بہت مشکل ہے، آپ یہاں سے جائیں گے، شربت کے گھونٹ نہیں، بڑے کڑوے گھونٹ آپ کو پینے پڑیں گے، بڑے صبر وضبط سے کام لینا پڑے گا، میں کیا کہوں، جو کچھ مجھے کہنا تھا، میں نے اپنے ناچیز خطبہ میں کہہ دیا، کہ انسان میں تو خود ہی کمزوریاں تھیں، ان کمزوریوں کو ہوا دینے کی کیا ضرورت تھی؟ ہمارے اخباروں کو کیا ضرورت تھی، ہمارے مضمون نگاروں، کالم نویسوں کو کیا ضرورت تھی، ہماری سیاسی پارٹیوں اور لیڈروں کو کیا ضرورت تھی کہ اس مادہ کو (جو تناسب کے ساتھ رکھا گیا ہے) بھڑکاتے اور اس کو مشتعل بناتے؟ بھائیو! انسانوں کو اپنی فطرت پر چھوڑ دو، ان کو غصہ بھی آئے گا، لیکن تم غصہ دلانے کی بات کیوں کرتے ہو؟ ان کے اندر کا غصہ، ان کے اندر کا لاوا کیا کم ہے کہ تم باہر کا لاوا لاتے ہو؟ ہمیں اس ملک میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑے گا، ہمیں، ہمارے اخبار نویسوں کو، ہمارے سیاسی لیڈروں، ہماری تعلیم گاہوں کے استادوں، ہمارے دفتروں کے افسروں کو، سب کو یہ سمجھنا ہوگا کہ ہمارا واسطہ ہمارے بھائیوں سے، بیٹوں سے، جگر کے ٹکڑوں سے ہے، باہر کے لوگوں سے نہیں ہے، ہمیں کیا شکایت دوسروں سے ہو سکتی ہے، جب ہم ایک دوسرے کو ذلیل کرتے ہیں، نوٹ انسان کی عزت بچائے، تف ہے ایسی زندگی پر، لعنت ہے ایسی زندگی پر، کاغذ کا ایک ٹکڑا، یہ پیسہ جس کو ہم نے ڈھالا ہے ہماری عزت بچائے، یہ تو انسانیت کا انتہائی زوال ہے کہ ہمیں اپنے دل کے بجائے جس پر کہ خدا کی تجلیاں نازل ہوتی ہیں، اس دماغ کے بجائے جس نے دنیا کو روشنی سے بھر دیا ہے، دھوکہ اور چالاکی سے، رشوت اور بے ایمانی سے کام لینا پڑے۔

جو چیز رہنے والی ہے اس سے رشتہ جوڑو

میں تاریخ کا طالب علم ہوں، میں نے سیکڑوں ہزاروں حکومتوں کے چراغ گل ہوتے دیکھے ہیں، میں نے ہزاروں طاقتوں کو دم توڑتے دیکھا ہے، کون سی طاقت ہمیشہ رہی ہے جو آج کسی کی طاقت ہمیشہ رہے گی؟ کس کا جادو چلا ہے اور چڑھ کر بولا ہے جو آج کسی کا جادو چلے گا، اور چلتا رہے گا؟ جو چراغ جل رہا ہے وہ بجھے گا، اس لیے کہ ہم نے ہزاروں چراغوں کو بجھتے دیکھا ہے، اگر

وہ ہزاروں چراغ بجھ سکتے ہیں جن کے لیے ہزاروں فانوس بنائے گئے تھے، تو آج کا چراغ کیوں بجھ نہیں سکتا؟

اپنی ہستی کو پہچانو، اپنی حیثیت کو جانو، اپنے خدا کو پہچانو، سمجھو کہ موت اب بھی تمہاری تاک میں کھڑی ہے، آسمان والا اب بھی آسمان والا ہے، اس کے پاس سب آسمانی لشکر ہے، ایک تارے کو توڑ دے، تمہارا خاتمہ ہو جائے، اور ستارہ تو بہت دور کی چیز ہے، خود تمہارے اوپر کسی وقت دورہ پڑ جائے، ایک ایٹم بم کا تجربہ کر لو، ایک ہائیڈروجن بم کا تجربہ کر لو، یہی انسانیت جس پر تم کو بڑا ناز ہے، یہ لمبے چوڑے لق و دق ملک جس پر تم کو بڑا ناز ہے، یہ انسانی سوسائٹی جس کے ہر وقت تم گن گاتے ہو، یہ ایک سسکی لے کر ابھی ختم ہو جائے گی، جو چیز رہنے والی ہے اس سے رشتہ جوڑو، اس کو پہچانو۔

یہ پیام انسانیت پیغمبروں کا پیام ہے

میں ایک بات کی اور وضاحت کر دینا چاہتا ہوں اور اس کو ضروری سمجھتا ہوں، بار بار ''پیام انسانیت'' کی تحریک کی نسبت میری حقیر ذات کے ساتھ کی گئی ہے، بار بار کہا گیا ہے کہ مولانا نے جو پیام دیا ہے، مولانا کی تحریک ''پیام انسانیت''، میں صاف صاف آپ سے کہتا ہوں، یہ میری تحریک نہیں ہے، میری کوئی ہستی نہیں ہے، مجھے خود پیام انسانیت کی ضرورت ہے، کسی وقت غصہ آ جائے، کسی وقت میں اپنے حدود سے آگے بڑھ جاؤں، آپ مجھے پیام انسانیت دیجیے، یہ پیام انسانیت پیغمبروں کا پیام ہے، یہ پیام انسانیت خدا کے ان سچے اور روحانی انسانوں کا پیام ہے یہ پیام انسایت حقیقی انسانیت کا پیام ہے، انسانیت پیام انسانیت دے رہی ہے، زندگی پیام انسانیت دے رہی ہے، میری کیا ہستی ہے، آج رہوں کل نہیں رہوں گا، اس چیز کی نسبت میری طرف نہ کیجیے، اس کی نسبت خدا کے پیغمبروں کی طرف کیجیے تا کہ برکت آئے، اس کی رحمت نازل ہو، اس کی نسبت خدا کے اتارے ہوئے صحیفوں کی طرف کیجیے تا کہ خدا کے یہاں قبولیت ہو، اس کی نسبت اچھے، مخلص اور دردمند انسانوں کی طرف کیجیے۔

پیام انسانیت کو ہندوستان کے گوشہ گوشہ تک پہنچائیے

میں بہت خوش ہوں، اور شکر گزار بھی ہوں اپنی طرف سے اور اپنے بھائیوں اور دوستوں کی طرف سے بھی کہ بہت تھوڑے وقت میں بڑی کمزور آواز پر آپ حضرات اتنی دور دور سے اپنے

ضروری کام چھوڑ کر یہاں آئے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ ابھی آس باقی ہے، ابھی انسانیت زندہ ہے، ایک آدمی جو سیاسی لیڈر نہیں، جو کسی کرسی پر بیٹھا ہوا نہیں، معمولی درجہ کا خدمت گار، کچھ لکھنے پڑھنے والا آدمی، اس کے چند دوست جو اپنا اپنا پیشہ کرتے ہیں، اور اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں، انھوں نے ایک صدا لگائی، آواز دی اور بلایا اور آپ یہاں آگئے، یہ آپ کے دل کی آواز ہونی چاہیے، یہ صرف ہماری آواز نہیں ہے، اس کو ہندوستان کے گوشہ گوشہ تک پہنچائیے، اور ہندوستانی شہریوں میں صبر وضبط کی عادت ڈالیے، افواہوں پر بے سوچے سمجھے یقین کر لینا، ایک ناممکن سے ناممکن بات کو مان لینا بڑی خطرناک بات ہے، الرجی (Allergy) کی ایک نئی قسم ہے، انسان ایسا الرجک (Allergic) ہو گیا ہے کہ ذرا سی بات سے اس کے اعصاب متاثر ہو جاتے ہیں، اور وہ فوراً جوش میں آجاتا ہے، اس عادت کو بدلیے، اتنے بڑے ملک کی امانت اللہ نے ہمارے حوالے کی ہے، اس بار کو اٹھانے اور اس کی حفاظت کے لیے بڑی قابلیت، بڑی لیاقت کی ضرورت ہے، بڑے دل گردے کی ضرورت ہے، بڑے ایمان کی ضرورت ہے، بڑی محنت کی ضرورت ہے، پختہ سمجھ اور بالغ عقل کی ضرورت ہے، یہ صفات اپنے اندر پیدا کیجیے۔

ان الفاظ کے ساتھ میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں، اور اپنی طرف سے اور اپنے دوستوں کی طرف سے جنھوں نے بہت تھوڑے وقت میں انتظام کیا، آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، اور آپ کی طرف سے ان کو مبارکباد دیتا ہوں (اگر آپ کی اجازت ہو) انھوں نے اتنے آدمیوں کو بلا کر بٹھا دیا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسانیت مری نہیں ہے، انسانیت سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔ (۱)

(۱) ماخوذ از پندرہ روزہ "تعمیر حیات"، لکھنؤ (شمارہ ۲۵ر نومبر ۱۹۸۰ء) و رسالہ "ملک کا حقیقی مسئلہ اور اس کے لیے اصلی خطرہ"، صفحہ ۲۵ تا ۳۵ (شائع کردہ پیام انسانیت فورم لکھنؤ)۔

۱۴

ملک کا خطرناک رخ اور دانشور طبقہ کی ذمہ داری (۱)

حمد وصلوٰۃ کے بعد:

﴿فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُوا بَقِيَّةٍ يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ﴾ (سورة هود: ۱۱۶)

(جو نسلیں تم سے پہلے گزر چکی ہیں، ان میں ایسے صاحب شعور کیوں نہ ہوئے جو ملک میں بگاڑ پھیلنے سے روکتے؟ ہاں ایسے تھوڑے تھے جن کو ہم نے بچالیا، اور جو ظالم تھے وہ عیش وآرام کے انھیں اسباب کے چکر میں پڑے رہے جو ان کے لیے مہیا کیے گئے تھے، اور وہ مجرم تھے۔)

معزز اساتذہ اور عزیز طلبہ!

میں نے آپ کے سامنے قرآن شریف کی ایک آیت پڑھی ہے، اس آیت میں جو درد، جو جوش، جو حقیقت اور طاقت ہے، میں اقرار کرتا ہوں کہ اس کو ترجمہ میں منتقل نہیں کرسکتا، میں قرآن مجید کا طالب علم رہا ہوں اور عربی زبان میں بھی شُد بُد رکھتا ہوں، لیکن میں اعتراف کرتا ہوں کہ قرآن مجید کی اس آیت کے اندر (درد کا لفظ استعمال کرنے سے میں ذرا ڈرتا ہوں کہ وہ خدا کا کلام ہے، لیکن درد انگیزی کہنے میں کوئی وجہ نہیں) جو درد انگیزی ہے، دوسری زبان میں اس کا منتقل کرنا بہت مشکل ہے۔

(۱) اپریل ۱۹۸۳ء میں حضرت مولاناؒ کی قیادت میں ''حلقۂ پیام انسانیت'' کے ایک وفد نے یوپی کے چند مغربی اضلاع کا تیز رفتار دورہ کیا، اس دورہ کا آخری اور اہم ترین مقام علی گڑھ تھا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کینیڈی ہال میں ۱۶/اپریل ۱۹۸۳ء کو یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کے سامنے یہ تقریر کی گئی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم سے پہلے کی نسلوں میں ایسے اہل شعور کیوں نہیں رہے جنھیں کچھ بچا کھچا احساس تھا، کچھ ان کے دل پر چوٹ تھی، انسانیت کا کچھ درد تھا، زمین میں جو فساد پھیل رہا تھا، جو تباہی مچ رہی تھی، اس سے لوگوں کو منع کرتے، تھوڑے سے ان لوگوں کے علاوہ جو اس کام کے لیے کھڑے ہوئے، جن کو ہم نے بچالیا تھا، باقی تمام لوگ وقت کے دھارے میں بہہ گئے، عیش و عشرت کے جن وسائل کی کثرت تھی، اور بگڑی ہوئی صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے جو زریں مواقع حاصل تھے، ان سے فائدہ اٹھانے لگے اور بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتے رہے، آپ جانتے ہیں کہ بگڑی ہوئی صورت حال سے فائدہ اٹھانا زیادہ آسان ہوتا ہے، دوسرے کے گھر ویران کر کے اپنے گھر کی تعمیر اور دوسروں کی لاشوں پر سے گزر کر اپنے مقاصد تک پہنچنے کے مواقع آسانی سے مہیا ہو جاتے ہیں، ﴿وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ﴾ جو ان کو سامان عیش وعشرت دیا گیا تھا، وہ اس میں پھنسے رہ گئے اور وہ مجرم تھے۔

اصل فکر و پریشانی کی بات اور خطرناک صورت حال

حضرات! انسان کے لیے بیماری کوئی غیر فطری چیز نہیں ہے، صحت کا اعتدال سے ہٹ جانا اور بیماری کا شکار ہو جانا انسانی فطرت کے خلاف نہیں ہے، بلکہ یہ ایک طرح سے زندگی کی علامت ہے، پتھر غلطی نہیں کرسکتا، درخت غلطی نہیں کرسکتا، انسان ہی غلطی کرتا ہے، اس لیے غلطی زیادہ پریشانی کی بات نہیں، اور اس پر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، انسانوں کی ایک بڑی جماعت کا کسی غلط راستہ پر پڑ جانا، اپنی سفلی خواہشات اور پست درجہ کے مقاصد کی تکمیل کے پیچھے دیوانہ ہو جانا، تاریخ انسانی کے لیے بھی اور تقدیر انسانی کے لیے بھی شدید تشویش کی بات نہیں ہے، تشویش کی بات یہ ہے کہ بگڑے ہوئے حالات سے پنجہ آزمائی کرنے، فساد و انتشار پیدا کرنے والی طاقتوں سے آنکھیں ملانے والے، اپنی سہولتوں، عزتوں (اور بعض اوقات حکومت واقتدار) کو خطرہ میں ڈال کر میدان میں اترنے والے نایاب ہو جائیں، اصل تشویش کی بات یہ ہے۔

انسان بار ہا ایسی بدنیت، فسادانگیز وانتشار پسند طاقتوں، قیادتوں یا سازشوں کے شکار ہو گئے ہیں، اور ایسا نظر آنے لگا ہے کہ انسانیت سکرات کے عالم میں ہے، وہ جلد دم توڑ دے گی، لیکن تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ ایسے ہر موقع پر کچھ ایسے افراد میدان میں آ گئے جنہوں نے زمانہ کی آنکھوں

میں آنکھیں ڈال کر حالات کا مقابلہ کیا، ان غلط رہنمائیوں اور قیادتوں کے مدمقابل بن کر کھڑے ہوگئے اور انھوں نے جان کی بازی لگادی، انسانی تہذیب کا تسلسل جو ابھی تک قائم ہے، محض نسلی تسلسل نہیں، بلکہ انسانی خصوصیات کا تسلسل جو ہر دور میں رہا ہے، انسانی احساسات و جذبات، اعلیٰ مقاصد، اخلاقی تعلیمات اور ان کی بقاو ترقی کے لیے ہمت و جرأت اور قربانی کا جذبہ جو اس وقت تک چلا آ رہا ہے، یہ درحقیقت انھیں لوگوں کا رہین منت ہے جو بگڑے ہوئے حالات میں میدان میں آئے، اور انھوں نے زمانہ کے چیلنج کو قبول کیا، اور ان بگڑے ہوئے حالات سے پنجہ لڑایا، اور بعض اوقات زمانہ کی کلائی موڑ دی، انھیں لوگوں کی بدولت انسانیت زندہ ہے، ہر زمانہ کے شاعر، ہر زمانہ کے ادیب، اور ہر زمانہ کے اہل دل زمانہ کے بگاڑ کی شکایت کرتے چلے آئے ہیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد بھی انسانی خوبیوں کا سرمایہ، انسانی احساسات وجذبات اور نیک انسان موجود رہے، یہ اصل میں انھیں لوگوں کی جہد وجہد کا نتیجہ ہے جو اُس وقت اپنے مفادات سے آنکھیں بند کر کے میدان آ گئے، انھوں نے اپنے لیے بھی، اپنے خاندانوں کے لیے بھی اور اپنی آئندہ نسلوں کے لیے بھی خطرہ مول لیا، زمانہ کا رخ موڑ دیا، اور انسانیت کی کھیتی ان کی کوششوں اور قربانیوں کے پانی سے ہری ہوگئی۔

انسانیت کی کھیتی ہر زمانہ میں کھاد چاہتی ہے

حقیقت میں انسانیت کی کھیتی ہر زمانہ میں کھاد چاہتی ہے، جس طرح فرٹیلائزر (Fertilizers) زمین میں قوت نمو بڑھاتے ہیں، پیداوار کو طاقت بخشتے ہیں، اسی طرح انسانیت کی کھیتی کے لیے بھی کھاد کی ضرورت ہے، انسانیت کی کھیتی کے لیے کھاد ''ذاتی مفادات'' ہیں، اغراض ومفادات کی یہ کھاد جب اس کھیتی میں پڑتی ہے تو وہ کھیتی لہلہا اٹھتی ہے، زمین اپنی پیداوار بڑھا دیتی ہے، اور انسانیت کی جھولی بھر جاتی ہے، انسانیت کو زندگی کی ایک نئی قسط عطا ہو جاتی ہے، انسانوں میں زندہ رہنے کا استحقاق اور زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

انسانیت کی بقا کی حقیقی ضمانت

زیادہ سے زیادہ وسائل کی فراہمی، سائنس وٹکنالوجی کی ترقی، علم، فلسفہ، ادب وشاعری کوئی چیز بھی انسانیت کی بقا کی ضمانت نہیں، انسانیت کی بقا کی حقیقی ضمانت وہ جری، دلیر، جانباز اور

دردمند انسان ہیں جو زخمی دل، اشکبار آنکھیں، سلگتے اور جلتے ہوئے دل و دماغ رکھتے ہیں، جو ناسازگار حالات کا سامنا کریں، چوٹ کو برداشت کریں اور تاریخ کے دھارے کو بدلنے کے لیے جان کی بازی لگادیں، جب کبھی اس جنس کی کمی نظر آتی ہے تو پورا سماج، پورا معاشرہ خطرہ میں پڑ جاتا ہے، خواہ دیکھنے میں آپ کو فربہی نظر آئے جیسے ایک فربہ جسم جس کے اندر بیسیوں قسم کی بیماریاں پرورش پاتی ہیں، لیکن اس کی فربہی سب پر پردہ ڈالے رہتی ہے، دیکھنے والوں کو دھوکا ہوتا ہے اور سمجھتے ہیں کہ یہ انسان تندرست ہے، لیکن حقیقت میں وہ بیماریوں کا مجموعہ ہے۔

سماج کی اصل روح

ایسا ہی سماج کا معاملہ ہے، سماج پر بعض مرتبہ غیر طبعی (Unnatural) اور غیر معتدل فربہی طاری ہو جاتی ہے، اس کے چہرہ پر خون چھلکتا ہوا نظر آتا ہے، لیکن جیسے کہ اقبالؔ نے کہا ہے:

کچھ اور چیز ہے کہتے ہیں جان پاک جسے
یہ آب و رنگ فقط آب و ناں کی ہے بیشی

یعنی پانی اور روٹی کی مقدار جسم میں زیادہ ہوگئی تو چہرہ پر تازگی اور رعنائی نظر آتی ہے، لیکن یہ جان پاک نہیں ہے، جان پاک تو کچھ اور ہی چیز ہے، سماج کی جان پاک اور سماج کی اصل روح اس کے اندر ایثار کا مادہ ہے، اس کے اندر کی قوت برداشت ہے کہ اس کے افراد کس طرح ناگوار باتوں کو برداشت کر لیتے ہیں، کتنے کڑوے گھونٹ پی جاتے ہیں، کتنے صدمے برداشت کر لیتے ہیں، وہ جلد اشتعال میں نہیں آتے، آپے سے باہر نہیں ہوتے، سماج میں نیک انسان کی کتنی قدر پائی جاتا ہے، شرافت کی کتنی قدر ہے، اس کو لوگ کس نظر سے دیکھتے ہیں، احسان کو وہ سماج کتنا مانتا ہے، ظلم سے اس کے اندر کتنی نفرت ہے؟

سماج کے لیے سب سے بڑا خطرہ

کسی سماج کے لیے سب سے بڑا خطرہ (خواہ وہ دنیا کا قدیم سماج ہو یا جدید سماج ہو) یہ ہے کہ اس کے اندر ظلم کا مزاج پیدا ہو جائے، پھر اس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ اس ظلم کو ناپسند کرنے والے اس معاشرہ میں انگلیوں پر بھی گنے نہ جا سکتے ہوں، دوربین تو دوربین، خوردبین سے بھی ان کو دیکھا نہ جا سکتا ہو، پورے سماج میں چند درجن آدمی بھی ایسے نہ ہوں جو اس ظلم کو، اس سفاکی کو، اس قساوت اور سنگدلی کو، کمزوروں پر دست درازی کو ناپسند کرتے ہوں، اور اپنی

ناپسندیدگی کا اعلان کرتے ہوں، گھر بیٹھ کر ناپسند کرنے والے تو مل جائیں گے، جو چار چھ آدمیوں کی موجودگی میں کہہ دیں کہ یہ ٹھیک نہیں ہو رہا ہے، بڑے خطرہ کی علامت ہے، لیکن اپنی ناپسندیدگی کا اعلان کریں اور اس کو لے کر میدان میں آجائیں، ایسے افراد کی جب کسی سماج میں، کسی معاشرہ میں کمی ہوتی ہے تو اس سماج، اس معاشرہ اور اس سوسائٹی کو کوئی طاقت نہیں بچا سکتی ہے۔

جب کسی معاشرہ میں ظلم پھیلنے لگا ہو اور پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا جانے لگا ہو، جب ظلم کے لیے یہ معیار بن گیا ہو کہ ظالم کون ہے؟ ظالم کی قومیت کیا ہے؟ ظالم کا فرقہ کیا ہے؟ ظالم کی زبان کیا ہے؟ ظالم کس برادری سے تعلق رکھتا ہے؟ تو انسانیت کے لیے ایک عظیم خطرہ پیدا ہو جاتا ہے، جب انسانیت کو اس طرح خانوں میں بانٹا جانے لگے، اور ظالم کی بھی قومیت دیکھی جانے لگے، جب اس کا مذہب پوچھا جانے لگے، جب آدمی اخبار میں کسی فساد یا کسی ظلم و زیادتی کی خبر دیکھے تو پہلے اس کی نگاہیں یہ تلاش کریں کہ کس فرقہ کی طرف سے یہ بات شروع ہوئی، اس میں نقصان کس کو پہنچا، جب ظلم کے ناپنے اور ظالم ہونے کا فیصلہ کرنے کا یہ پیمانہ بن جاتا ہے کہ وہ کس قوم، فرقہ، طبقہ و برادری سے تعلق رکھتا ہے، تو اس وقت معاشرہ کو کوئی طاقت، کوئی ذہانت، کوئی سرمایہ اور بڑے بڑے منصوبے بچا نہیں سکتے۔

ذوق سلیم نے بارہا دھوکا کھایا ہے لیکن قلب سلیم دھوکا نہیں کھاتا

اسلام سے پہلے عربوں کا ایک اصول اور مقولہ تھا جس نے محاورہ کی شکل اختیار کر لی تھی کہ ''اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو، چاہے مظلوم''، اور جاہلیت (اسلام سے پہلے) کا عرب اسی اصول پر چل رہا تھا، وہ گویا ایک رہنما اصول تھا، اور اس نے مذہبی تعلیم کی حیثیت اختیار کر لی تھی، اور یہ بات ایسی مشہور تھی کہ کسی کے سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی مجلس میں فرمایا کہ اپنے بھائی کی مدد کرو، چاہے ظالم ہو چاہے مظلوم۔ عربوں کے لیے یہ ایسی جانی بوجھی حقیقت اور روزمرہ کی بدیہی بات تھی کہ اس پر سکوت طاری ہو جانا چاہیے، پھر اللہ کا رسول کہہ رہا تھا، جو غلط بات نہیں کہہ سکتا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی جو تربیت کی تھی، اور ان کا جو ذہن بنایا تھا، وہ ذہن اس کو ہضم نہیں کر سکا، انھوں نے عرض کیا: نَنْصُرُہٗ مَظْلُوْمًا، فَکَیْفَ نَنْصُرُہٗ ظَالِمًا؟ (ہم مظلوم کی مدد تو کریں، لیکن ظالم کی مدد کیسے کریں؟)

سوسائٹی اور معاشرہ کی جو سب سے مستحکم بنیاد ہے اور جس پر سب سے زیادہ اعتماد کیا جا سکتا

ہے، وہ ایسی ہی تربیت ہے کہ اس کا ذوق سلیم، بلکہ اس کا قلب سلیم (ذوق سلیم نے بارہا دھوکہ کھایا ہے، لیکن قلب سلیم دھوکہ نہیں کھاتا) اس کا قلب سلیم اس پر جاگ جائے، چوکنا ہوجائے، اور پوچھنے لگے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ معاشرہ میں ظلم ہوتا رہے، بڑھتا اور پنپتا رہے؟

اخلاقی تربیت اور اس کی کامیابی کا آخری نمونہ

یہ اخلاقی تربیت اور اس کی کامیابی کا آخری نمونہ ہے، دنیا کی تاریخ میں ایسی تربیت کی مثال ملنی مشکل ہے کہ ایک طرف صحابہ کرام اطاعت وانقیاد کا بے مثال نمونہ تھے، وہ آنحضرت ﷺ پر پروانہ وار نثار ہوتے تھے، اور یہ نہیں پوچھتے تھے کہ ہمارا انجام کیا ہوگا؟ پروانے شمع پر گرتے ہیں اور جان دیتے ہیں اور انجام نہیں سوچتے، صحابہ کی جماعت رسول ﷺ کے کہنے کے بعد پھر غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتی تھی لیکن اب اس کے اندر ایسا انقلاب آچکا تھا، معاشرہ کو ایسی مستحکم، ایسی بلند اور ایسی اصولی بنیاد پر اٹھایا گیا تھا کہ جب آپ ﷺ فرمایا کہ اپنے بھائی کی مدد کرو، چاہے ظالم ہو چاہے مظلوم، تو صحابہ کرام تڑپ اٹھے، اور پورے ادب سے کہا کہ یا رسول اللہ! آپ نے اب تک ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ہم مظلوم کی مدد کریں اور ظالم کا ساتھ نہ دیں، کیا ہم اپنی قوت سماعت پر شک کریں، شاید ہمارے کانوں نے اسے صحیح نہ سنا ہو، آپ فرمائیں کہ ظالم کی مدد کیسے کی جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں، ظالم کی بھی مدد ہوتی ہے، مظلوم کی مدد یہ ہے اس پر ظلم نہ ہونے دو، ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کا ہاتھ پکڑلو، اس کو ظلم نہ کرنے دو۔

اخلاقی جرأت وغیر جانب داری اور خلوص کی طاقت

یہ وہ چیز ہے جو انسانی معاشرہ کو بچانے والی ہے کہ بلا تفریق مذہب وملت، بلا تفریق قومیت، بلا تفریق ذات برادری، اپنے تعلقات کو بالکل نظر انداز اور مفادات کو بالکل فراموش کرکے یہ نہ دیکھا جائے کہ ظالم کون ہے اور مظلوم کون ہے؟ ظالم کوئی بھی ہو، اپنی قوم کا محبوب ترین فرد ہو، قائد ہو، رہنما ہو، اس کو ظلم سے روکا جائے، اگر معاشرہ میں یہ اخلاقی جرأت، یہ غیر جانب داری اور خلوص کی یہ طاقت ہے تو معاشرہ بچ سکتا ہے، اور اگر یہ نہیں ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس معاشرہ کو نہیں بچاسکتی، آج ہندوستان میں کمی اسی چیز کی نظر آتی ہے، جس کی وجہ سے اس معاشرہ سے متعلق خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔

جب کسی انسانی نسل پر کسی دور میں اخلاقی گراوٹ کا ایسا دورہ پڑتا ہے، یا وہ کسی انسانی

سازش یا کسی انتشار پسند طاقت کا شکار ہوتی ہے، اس وقت دو طبقے میدان میں آتے ہیں، ایک دانشوروں کا طبقہ اور ایک مذہبی انسانوں کا طبقہ، یہ دو طبقے ہیں جن میں بگاڑ (Corruption) سب سے اخیر میں داخل ہوتا ہے، تاریخ ہمیں بتاتی ہے، قیاس بھی یہی چاہتا ہے، اور عقل سلیم (Common Sense) کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ سب سے اخیر میں جس طبقہ میں فساد داخل ہوتا ہے اور خرابی آتی ہے، وہ مذہبی آدمیوں کا طبقہ ہے، اس کے بعد دانشوروں کا طبقہ ہے، لیکن جب دانشوروں میں اور مذہبی انسانوں میں بھی بگاڑ (Corruption) آجائے تو پھر اس معاشرہ کا (یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ خدا حافظ ہے، خدا حافظ ہو تو اطمینان ہی اطمینان ہے) لیکن پھر اس معاشرہ کو کوئی چیز بچا نہیں سکتی۔

اس وقت کی ضرورت

اس وقت ضرورت ہے کہ دانشور اور مذہبی انسان میدان میں آئیں، اس وقت ضرورت ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں سے، ہماری دانش گاہوں سے افراد نکلیں اور معاشرہ کو بچانے کی کوشش کریں، مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ کا مؤرخ جب اس معاشرہ کی تاریخ لکھے گا جس میں ہم اور آپ سانس لے رہے ہیں، تو کہیں یہ نہ لکھے کہ یہ حادثہ اس وقت پیش آیا جب ملک میں مسلم یونیورسٹی موجود تھی، دار العلوم دیوبند موجود تھا، ندوۃ العلماء موجود تھا، اور جامعہ ملیہ موجود تھی، ان کی موجودگی بلکہ ان کی دیوار کے نیچے اور ان کے سایہ میں سب کچھ ہو رہا تھا، اس وقت ضرورت یہ ہے کہ آپ میدان میں آئیں اور بگاڑ کا، بے اصولی کا، بد دیانتی کا، رشوت خوری اور ذخیرہ اندوز کا، اقربا پروری اور خویش پروری کا، سنگ دلی کا اور (مجھے معاف کریں) سب سے بڑھ کر سفا کی اور درندگی کا جو دھارا بہہ رہا ہے، اور ملک تباہی و بربادی کے جس رخ پر جا رہا ہے، اس کا راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں۔

ایسے جوانمردوں کے لیے پہلی شرط تو یہ ہے کہ ان کے اندر اخلاقی جرأت ہو، اور وہ بےلوث ہوں، وہ اس معاشرہ کو دینے کے لیے آئیں، لینے کے لیے نہ آئیں، اس بگڑے ہوئے نظام سے فائدہ اٹھانے کے لیے نہ آئیں، بلکہ ان کی شان وہ ہو جو ایرانی شاعر عرفیؔ نے بیان کی ہے:

عدیل ہمت ساقیست فطرت عرفیؔ
کہ حاتم دگراں و گدائے خویشتن است

ان لوگوں کی جو ایسے بحران (Crisis) کے موقع پر میدان میں آتے ہیں اور پورے

معاشرہ کو اور پوری قوم کو موت کے منھ سے نکال دیتے ہیں، ان کی تعریف یہ ہے کہ وہ ساقی کی فطرت اور مزاج رکھتے ہیں، ساقی سب کو پلاتا ہے اور خود نہیں پیتا، یہ مرحلہ بہت مشکل ہے اور دل پر پتھر رکھے بغیر طے نہیں ہوسکتا، لیکن اس کے بغیر کام بھی نہیں چلتا۔

میں اپنے عزیز طلبہ سے کہنا چاہتا ہوں کہ آج ہندوستان میں عزت کا مقام جبھی حاصل ہوگا جب آپ اس ملک کو بچانے کی مخلصانہ، جان فروشانہ، بے غرضانہ، اور اخیر میں کہتا ہوں کہ مجنونانہ کوشش کریں گے، کسی قوم کو، کسی جماعت کو عزت کا مقام اسی وقت ملتا ہے جب وہ کسی کو فائدہ پہنچائے اور خود فائدہ نہ اٹھائے، جب وہ اپنا دامن جھاڑ دے اور دوسروں کی جھولی بھر دے، وہ اپنے گھر میں اندھیرا پسند کرے اور دوسروں کے گھر میں چراغ جلائے، جب وہ اپنے بچوں کو بھوکا سلائے حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کی طرح اور مہمانوں کو شکم سیر کر کے اٹھائے۔

اسباب کے پیچھے اسباب

آپ تاریخ پڑھیں تو آپ پر بہت سے حقائق کھلیں گے، اور عبرت و موعظت کا بڑا سامان ملے گا، لیکن افسوس ہے کہ تاریخی واقعات کی تہہ میں اور انقلابات سلطنت کے پس پردہ جو حقائق (Factors) کام کرتے ہیں، جو مخفی طاقتیں کام کرتی ہیں، جو وقت کی رفتار بدل دیتی ہیں، کسی ملک کی قسمت بدل دیتی ہیں، ہمارے مؤرخوں کی نگاہ وہاں تک نہیں جاتی، وہ زیادہ تر یہی لکھتے ہیں کہ فلاں بادشاہ آیا اور فلاں بادشاہ گیا، فلاں نے فلاں ملک پر حملہ کیا اور فتح یاب ہوا، اور فلاں نے شکست کھائی، لیکن اس کے پیچھے کیا طاقتیں کام کر رہی تھیں؟ حقیقی اسباب کیا تھے؟ پھر اسباب کے پیچھے اسباب ہوتے ہیں، جیسے مولانا رومؒ کہتے ہیں کہ گرمی کا زمانہ ہے اور ایک شخص پنکھا جھل رہا ہے، تو کوتاہ بیں یہ کہے گا کہ یہ ہوا اس پنکھے کی وجہ سے آرہی ہے، لیکن جس کی نظر اور گہری ہوگی تو کہے گا کہ نہیں، اصل میں اس ہاتھ کا کارنامہ ہے جو اس کو ہلا رہا ہے، پنکھا زمین پر رکھ دو تو ہوا نہیں آئے گی، اس سے بھی جس کی گہری نظر ہے وہ کہے گا کہ نہیں، یہ ہاتھ بھی نہیں، بلکہ انسان کا ارادہ ہے، اس کی نیک نیتی ہے اور خدمت کرنے کا جذبہ اصل میں اس کا سرچشمہ ہے، اگر کسی کی نظر اور گہری ہے تو وہ کہے گا کہ نہیں، یہ نہ پنکھے کا کارنامہ ہے نہ ہاتھ کافی ہے، ہوا ضروری تھی، یہ ہوا ہے جو فضا میں ہے، یہ ہوا اصل میں محسن ہے، لیکن جس کی نظر اس سے بھی آگے ہے، وہ کہے گا: نہیں، اس ہوا کا جو خالق ہے، اس ہوا کو جو حکم دینے والا ہے، جس نے اس کو طاقت دی ہے اور آزادی بخشی ہے کہ وہ چلے، وہ ہے محسن حقیقی۔

تاریخ کا معاملہ بھی یہی ہے کہ واقعات کے پیچھے اسباب ہوتے ہیں، ان اسباب کے پیچھے دوسرے اسباب ہوتے ہیں، اوران اسباب کے درمیان رشتہ ہوتا ہے، آپ جو یہ دیکھتے ہیں کہ دنیامیں کوئی سدھار پیدا ہوااور کوئی سماج موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہونے کے بعد اچانک تازہ دم ہوکر اٹھا، اور اس نے پھر زندگی کا سفر شروع کیا، اور اپنی صلاحیتوں کواجاگر کرنا شروع کیا، اس کے پیچھے کسی ایسی جماعت، کچھ ایسے افراد کا ہاتھ ہوتا ہے جواپنی زندگی کوخطرہ میں ڈالتے ہیں اور جواپنے نفع سے آنکھیں بند کرلیتے ہیں۔

اس ملک کی اخلاقی قیادت کا جھنڈا بلند کریں

کسی ایسے ملک میں جیسے کہ ہندوستان ہے، جومختلف تہذیبوں کا گہوارہ ہے، مختلف قوموں کا وطن ہے، اور یہاں کی ایک تاریخ ہے، یہاں کچھ غلط فہمیاں اور تلخیاں رہی ہیں، کچھ سیاسی کشمکش رہی ہے، وہاں موجودہ حالات میں (میں آپ سے صفائی کے ساتھ کہتا ہوں) کم سے کم مسلمانوں کے لیے کوئی راستہ عزت حاصل کرنے کا نہیں ہے، سوائے اس کے کہ وہ اس ملک کی اخلاقی قیادت کا جھنڈا بلند کریں اور اس ملک کو بچانے کی مخلصانہ کوشش کریں، وہ ثابت کردیں کہ ملک کو بچانے کے لیے اپنے کوخطرہ میں ڈال سکتے ہیں، اور اس ملک کو بچانے میں ان کی کوئی گروہی و مذہبی، قومی غرض یا انفرادی غرض نہیں ہے، وہ اپنی کوششوں کا اجرصرف خدا سے چاہتے ہیں، وہ ایک عقیدہ اور جذبہ کے تحت میدان میں آتے ہیں کہ یہ ملک امانت ہے، اس ملک کے باشندے خدا کے پیدا کیے ہوئے انسان ہیں، ان کے ساتھ ہمیں رہنا ہے، اگر یہ نہ ہوں گے تو ہم بھی نہیں ہوں گے۔

اس وقت ہندوستان میں یہ موڑ آ گیا ہے کہ پڑھے لکھوں کی جماعت، دانشوروں کی جماعت، ہماری جامعات اور دانش گاہوں کے فضلاء کی جماعت میدان میں آئے، اس وقت میدان دانشوروں کا ہے، مذہبی آدمیوں کا اور ایسے بے لاگ انسانوں کا ہے جو سیاسی پارٹیوں اور سیاسی مفادات سے بالکل آنکھیں بند کرلیں، اس سے کوئی مطلب نہ رکھیں کہ ایسا کرنے سے ہماری پارٹی پاور میں آئے گی اور ہمیں حکومت ملے گی، ایسی مثالیں بھی تاریخ میں ملتی ہیں کہ جب موقع آیا انعام ملنے کا، اور جب حکومت تھالی میں رکھ کر پیش کی جانے لگی تو اللہ کے بندوں نے کہا کہ ہم نے اس لیے کام نہیں کیا تھا، ہم نے تو ہمدردی میں کیا تھا، خلوص کے ساتھ کیا تھا، خدا کی

خوشنودی کے لیے کیا تھا، ہمیں اس کا انعام نہیں لینا ہے۔

ایک زریں موقع

حضرات! یہ حقیقت ہے جسے ہمارے نوجوانوں کو خاص طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ یہ بڑا اہم، بڑا قیمتی وقت ہے، ایسے زریں مواقع اقوام وملل کی تاریخ میں اور ملکوں کی تاریخ میں کبھی صدیوں کے بعد آتے ہیں، یہ ایک زریں موقع خدا کی طرف سے ہم کو اور آپ کو دیا گیا ہے، خدا کا شکر ہے، اس کا احسان ہے کہ اس نے آپ کو اس دور میں پیدا کیا، لوگ تو ہمدردی کریں گے، کہیں گے: ہم کاش ایسے دور میں نہ پیدا ہوئے ہوتے، لیکن جواں مردوں اور بلند ہمت لوگوں کے سوچنے کا طریقہ یہ نہیں، میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں، یہاں کے مسلمانوں کو مبارک باد دیتا ہوں، میں یہاں کے تمام خیر پسند عناصر کو اور تمام انسانیت دوست جماعتوں اور دماغوں کو مبارک باد دیتا ہوں کہ خدا نے ان کو ایک ایسے دور میں پیدا کیا اور ایک ایسا موقع عطا کیا جسے ہمارے اسلاف بڑی بڑی عبادتوں سے حاصل نہیں کر سکتے تھے، وہ رات رات بھر جاگ کر نہیں حاصل کر سکتے تھے، وہ دن دن بھر روزہ رکھ کر نہیں حاصل کر سکتے تھے، آج وہ موقع ہم کو حاصل ہے کہ ہم آج انسانیت کی بے لوث خدمت کر کے اور ملک کو بچانے کے لیے جان لڑا کر اس ملک کو خطرہ کے دہانہ سے، اژدہے کے منہ سے نکال سکتے ہیں۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے

میں بغیر کسی معذرت کے صاف کہتا ہوں کہ میں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، میں نہیں سمجھتا کہ ہمارا ہندوستانی معاشرہ کبھی ایسے خطرہ سے دوچار ہوا ہو جیسا کہ اس دور میں، اس تیس پینتیس برس کے اندر ہوا ہے، میں بالکل اس پر معذرت نہیں کروں گا، ہندوستان کا جسم بارہا زار و نزار ہوا، ہندوستان نے شکست کھائی، ہندوستان پر برطانیہ کی بدیسی حکومت رہی، یہ سب تاریخی واقعات ہیں، لیکن ہندوستان کی روح اور ہندوستان کا ضمیر اس طرح سے کمزور نہیں ہوا تھا کہ اس نے اپنا کام کرنا چھوڑ دیا ہو، ہندوستان کی تاریخ میں کبھی ایسا دور نہیں آیا کہ برائی کو اور ظلم کو اس آسانی کے ساتھ گوارا کر لیا گیا ہو جس آسانی کے ساتھ آج گوارا کیا جا رہا ہے، بلکہ اس کو فلسفہ بنایا جا رہا ہے، اس کے ذریعہ سے جماعتوں کو مستحکم اور منظّم کیا جا رہا ہے، اس کے ذریعہ ہندوستان میں حکومت کا استحقاق ثابت کیا جا رہا ہے، ہندوستان سیکڑوں مصیبتوں کا شکار ہوا ہے، لیکن ضمیر انسانی، ہندوستان

کا Conscience زندہ رہا، اس نے اپنا کام کرنا، اپنا Function کبھی نہیں چھوڑا، اس وقت جو اصل خطرے کی چیز ہے:

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگی ہی عبارت ہے تیرے جینے سے

مجھے یہ ڈر ہے کہ ہندوستان کا ضمیر کہیں مر نہ گیا ہو، اس سے بڑھ کر کوئی خطرہ کی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ اتنے بڑے ملک میں کسی دل دردمند کی کراہ سننے میں نہیں آتی کہ تڑپ کر کسی نے فریاد کی ہو اور قلندرانہ شان سے میدان میں آ گیا ہو:

گوئے توفیق وسعادت درمیاں افگندہ اند
کس بمیداں درنمی آید سواراں راچہ شد

انسانی ضمیر کے کارنامے

لیڈر اپنی جگہ پر، سیاسی جماعتیں اپنی جگہ پر، دانش گاہیں اپنی جگہ پر، لائبریریاں اپنی جگہ پر، خطیب ومقرر اپنی جگہ پر، ذہین (Intelligent) بلکہ Genius قسم کے انسان اپنی جگہ پر، لیکن وہ ضمیر کہاں ہے جو معاشرہ کی اس پستی پر، انسانیت کی اس پستی پر خون کے آنسو روئے؟ انسانیت کی حفاظت اسی ضمیر نے کی ہے، تفنگ وشمشیر نے نہیں کی ہے، سپاہ اور فوج نے نہیں کی ہے، شاہی خزانوں اور دولت کی بہتات نے نہیں کی ہے، علم انسانی کی ترقی نے نہیں کی ہے، ٹکنالوجی اور سائنس نے نہیں کی ہے، بلکہ ایک ضمیر انسانی ہے جو سب پر غالب آیا، جہاں وسائل نہیں تھے اس نے وہاں وسائل پیدا کر لیے، آپ دیکھیے، جب کسی کے دل پر چوٹ لگتی ہے اور جب کوئی بے قرار ہوتا ہے وہ کیا کر لیتا ہے؟ ایک آدمی کے پاس وسائل کا ڈھیر ہے، لیکن اس کے دل میں درد نہیں ہے اور کچھ کرنے کا ارادہ ہی نہیں ہے، تو وقت گزر جاتا ہے اور وہ کچھ نہیں کرتا۔

مجھے جو خطرہ ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستانی معاشرہ کا ضمیر تعطل کا شکار ہو گیا ہے، اس نے اپنا کام کرنا چھوڑ دیا ہے، یہ خطرہ کی بات ہے، اس لیے کہ انسانیت کی آس اسی ضمیر سے ہے، اس دنیا میں جو کچھ خیر وفلاح کی امید ہے وہ اسی ضمیر سے ہے، جب یہ ضمیر بیدار ہوتا ہے تو اس کو خدا کی طرف سے روشنی ملتی ہے، پیغمبروں کی طرف سے اس کو غذا ملتی ہے، اور یہ دولت پرستی کا شکار نہیں ہوتا، طاقت پرستی کا شکار نہیں ہوتا، تو پھر یہ ضمیر وہ کام کرتا ہے جو بڑی بڑی سلطنتوں سے اور بڑی بڑی

فوجوں سے نہیں ہوسکا، دیکھیے کچھ زندہ ضمیروں نے، کچھ صالح ضمیروں نے، کچھ دردمند ضمیروں نے اپنے اپنے زمانہ میں کیا کام کرلیا، یہ بزرگان دین کیا رکھتے تھے، ان کے پاس کیا سرمایہ تھا، لیکن انھوں نے ایک نیا معاشرہ پیدا کردیا، ایک نیا دوراُن کی ذات سے شروع ہوگیا۔

انسانیت کی ڈوبتی کشتی ہمیشہ انہی لوگوں نے بچائی ہے

آج ہمیں جس چیز کا شکوہ ہے، وہ یہ کہ ہر طرح کی آوازیں سننے میں آتی ہیں، ہر طرح کے منشور (Manifestos) سامنے آتے ہیں، ہر طرح کے اعلانات ہمارے سامنے آتے ہیں، لیکن انسانیت کی پستی اور انسانی جان و مال اور انسانی حقوق کی پامالی پر کوئی رونے والی آنکھ اور کوئی درد محسوس کرنے والا دل نظر نہیں آتا، ہم سمجھتے ہیں کہ ایسی دانش گاہوں میں جہاں سب کچھ سکھایا پڑھایا جاتا ہے، وہیں ایسے لوگ ملنے چاہئیں، وہیں ایسے لوگوں کو ڈھونڈنا چاہیے، چند نوجوان ہی سہی جو اپنے مستقبل کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں، جیسے کہ ایک پیغمبر نے اسی طرح کے ایک بگڑے ہوئے معاشرہ میں اصلاح کا کام شروع کیا تو ان کی قوم نے طعنہ دیا تھا، انھوں نے کہا: ﴿قَدْ كُنتَ فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هَـٰذَا﴾ (سورۃ ھود: ٦٢) اے صالح! تم سے تو بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں، تم تو بڑے Promising آدمی تھے، تم سے تو بڑی بڑی توقعات قائم تھیں کہ تم اپنے گھر کو خوش حال بناؤ گے، تم اپنی قوم کا نام روشن کروگے، اپنے وطن کا نام روشن کروگے، یہ تم کیا لے بیٹھے؟ تم نے یہ جھگڑا کہاں شروع کردیا؟ قوم کے نزدیک یہ جھگڑا تھا، لیکن انسانیت کی ڈوبتی کشتی ہمیشہ انھیں لوگوں نے بچائی ہے جنھوں نے اپنے مفاد کو نہیں دیکھا، معاشرہ کے مفاد کو دیکھا، لیکن جس قوم میں نام لینے کے لیے بھی ایسے چند آدمی نہ پائے جائیں جو کسی بڑے سے بڑے عہدہ اور منصب کو اپنے مقصد کے راستہ میں خاطر میں نہ لائیں تو ایسی جماعت اور ایسی قوم کے متعلق کوئی بڑی امید قائم نہیں کی جاسکتی، اور اس کا کوئی وزن نہیں، خدا کے میزان میں بھی اور انسانیت کے میزان میں بھی، ایسے صاحب عزیمت اور باہمت لوگ کم سے کم مسلمانوں میں ہر دور میں پائے گئے ہیں، جنھوں نے سلطنتوں اور بادشاہوں کو منھ نہیں لگایا، آج پھر ان کی ضرورت ہے، کسی تعداد میں سہی، لیکن ایسے لوگ ہونے چاہئیں جو یہ کہہ سکیں:

بروایں دام برصید دگرنہ
کہ عنقارا بلند است آشیانہ

آج مصیبت یہ آ گئی ہے کہ بار بار کے تجربوں سے مزاج دانوں اور تجربہ کاروں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اس معاشرہ میں ہر شخص کی ایک قیمت ہے، اگر وہ اتنے دام میں نہیں بک سکے گا تو اتنے دام میں ضرور بک جائے گا، لیکن خدا کے کچھ بندے ہمیشہ رہے اور رہنے چاہئیں جو کسی دام میں بھی نہ بک سکیں، بڑے سے بڑا سنہرا جال آپ ان کے سامنے ڈال کر دیکھیے، کہیں ان کے تصور میں بھی آ جائے کہ اعزاز قبول کر لو تو ان کی راتوں کی نیند اڑ جائے، میں کہتا ہوں کہ خدا کے فضل سے ابھی ایسے لوگ اس دنیا میں ہیں:

خاکساران جہاں را بحقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

ابھی ہماری نسل میں بھی ایسے لوگ ہیں کہ بڑے سے بڑا عہدہ اور منصب ان کو اپنے اس جادۂ حق سے اور مقام سے جس کو انھوں نے سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے، اپنے اس بوریائے فقر سے، اپنے خاک کی اس ڈھیر سے ہٹانے کی طاقت نہیں رکھتا، آج بھی خدا کے فضل سے ایسے لوگ موجود ہیں، اس لیے ہر شخص کے متعلق یہ خیال کرنا کہ یہ کسی نہ کسی قیمت میں بک جائے گا، یہ ہما سہی لیکن ہما کے بھی شکاری ہوتے ہیں، یہ ہما بھی دام میں آ جائے گی، یہ غلط ہے، ایسی ہما انسانیت کی آبرو ہے، آپ سے میں اس لیے نہیں کہتا کہ آپ ان کو تلاش کریں، میں کہتا ہوں آپ وہ ہما بنیں جس کو بڑے سے بڑا شکاری بھی شکار نہیں کر سکتا، پھر آپ وہ ہما بنیں گے کہ جس کے سر پر سے گزر جائے گی اس کے سر پر بادشاہی کا تاج رکھا جائے گا، وہ ہما ایک خیالی پرندہ ہے لیکن آپ حقیقی معنی میں ہما بن جائیں گے، آپ جس کے پاس سے گزر جائیں گے، اسے عزت ملے گی، طاقت ملے گی، اس کو اعتماد ملے گا، ایمان ملے گا۔

ہمارے ملک اور جاں بلب معاشرے کی اصل ضرورت

آج ہمارے ملک اور ہمارے جاں بلب معاشرہ کو بڑے بڑے فاضلوں، بڑے بڑے عالموں اور بڑے دانشوروں کی ایسی ضرورت نہیں جتنی صحیح اور دلیر انسانوں کی، قربانی کے لیے تیار ہونے والے انسانوں کی ضرورت ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ مسلم یونیورسٹی جس نے کبھی اس ملت اور اس ملک کو محمد علی جوہر جیسا فرزند دیا ہے، جنھوں نے اس ملک میں صحیح طور پر جمہوری زندگی کا آغاز کیا، یہاں عوامی سیاست درحقیقت مولانا محمد علی نے شروع کی، وہی گاندھی جی کو میدان میں

لائے، یہ ایک تاریخی واقعہ ہے، ان سے پہلے سیاست دانشوروں اور دستور کی سمجھ رکھنے والوں میں تھی، دانشوروں کا ایک بہت اونچا طبقہ تھا جو سیاسی باتیں کرتا تھا، بازار میں سیاست کو لانے والے، پارکوں میں سیاست کو لانے والے، اور پبلک میں سیاست کو لانے والے محمد علی اور شوکت علی ہیں، وہ آپ کی اسی یونیورسٹی کے فرزند تھے، جنھوں نے اس ملک میں حریت پسندی اور قومی و دینی غیرت کی آگ لگادی، اور جنھوں نے تحریک خلافت شروع کی، اور پھر تحریک آزادی میں ہراول دستہ بلکہ قائد کا کردار ادا کیا۔

ہر وقت کی ایک دعوت اور ضرورت ہوتی ہے

آج پھر ہندوستان کا معاشرہ طالب ہے، اس نے اپنا دامن پھیلا رکھا ہے، میں اس کی طرف سے ترجمانی کر رہا ہوں کہ ہمارا معاشرہ پھر آج آپ سے وقت کا سپاہی چاہتا ہے، ہر وقت کا ایک سپاہی ہوتا ہے، ہر وقت کی ایک دعوت ہوتی ہے، ہر وقت کی ایک ضرورت ہوتی ہے، جب ضرورت تھی تحریک آزادی کے سورماؤں کی، جب ضرورت تھی حریت کے صور پھونکنے والے سرفروشوں کی، تو اس وقت علی برادران میدان میں آئے، آج ملک کو اخلاقی زوال سے بچانے والوں کی ضرورت ہے، آج اس ملک میں ایثار و قربانی کا ایک مثالی نمونہ قائم کرنے والوں کی ضرورت ہے، آج اس ملک میں اصحاب کہف جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

﴿إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى، وَرَبَطْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَن نَّدْعُوَ مِن دُونِهِ إِلٰهاً لَقَدْ قُلْنَآ إِذًا شَطَطاً﴾ (سورة الكهف: ۱۳-۱٤)

(وہ چند نوجوان تھے کہ اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے، ہم نے انھیں ہدایت میں اور زیادہ مضبوط کر دیا، اور ان کے دلوں کی (صبر و استقامت سے) بندش کردی، وہ جب (راہ حق) میں کھڑے ہوئے تو انھوں نے (صاف صاف) کہہ دیا: ہمارا پروردگار تو وہی ہے جو آسمان وزمین کا پروردگار ہے، ہم اس کے سوا کسی اور معبود کو پکارنے والے نہیں، اگر ہم ایسا کریں گے تو یہ بڑی ہی بے جا بات ہوگی۔)

ملک کی اخلاقی گراوٹ

آج ہمارے معاشرہ کوایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے جو میدان میں آئیں اور ملک کو اخلاقی زوال سے بچائیں، اخلاقی زوال اپنی آخری حد تک پہنچ گیا ہے، ایک آدمی کسی حادثہ کا شکار ہو جائے تو یہ ایک ایسا واقعہ ہوتا ہے کہ اس کے قرب وجوار میں کہرام مچ جائے، لوگ جمع ہو جائیں، مائیں اپنے گھروں سے نکل آئیں، اپنے بچوں کو چھوڑ دیں، کوئی پانی لے کر آئے، کوئی دوا لے کر آئے کہ ہمارے بھائی معلوم نہیں کہاں جارہے تھے، حادثہ کا شکار ہو گئے، لیکن اس ملک کی اخلاقی گراوٹ کا حال یہ ہے کہ اس وقت ان مرے ہوئے، کچلے ہوئے انسانوں کے ہاتھوں سے گھڑیاں نکال لیتے ہیں، اور ان کے پرس کی تلاشی لیتے ہیں، اس وقت بجائے اس کے کہ ان کے خشک لبوں میں پانی کا ایک قطرہ ڈالیں، وہ ظالم ان کی قیمتی چیزیں لوٹنے میں لگ جاتے ہیں، آپ یہ واقعات تاریخ میں پڑھتے تو یقین نہ کرتے اور دوسرے ملک کے لوگ یقین نہیں کریں گے، لیکن ہم کیا کریں، ریلوں میں بارہا ایسے حادثے پیش آتے ہیں اور قریب کی دیہاتی آبادی ہے، دیکھتی ہے کہ ایک آدمی دبا ہوا ہے، دولکڑیوں کے بیچ میں اس کا بدن آ گیا ہے، وہ کہتا ہے کہ میرا سب کچھ لے لینا، لیکن کسی طرح مجھے اس شکنجہ سے نکال دو، تو انھوں نے اس کے ہاتھ سے گھڑی چھین لی، اور اس کی جیب سے کچھ روپے نکال لیے، اور اس کو مرتا ہوا چھوڑ کر چلے گئے، جو معاشرہ اس سنگ دلی کی حد تک پہنچ گیا ہو، اس معاشرہ کی کسی چیز کو دیکھ کر بھلا دل خوش ہو سکتا ہے؟ اس سے کچھ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ معاشرہ دنیا میں باقی رہے گا؟ کوئی بڑا قیادت کا رول ادا کرے گا؟

ظلم سلطنتوں، تہذیبوں اور معاشروں کے لیے پیغام موت ہے

خدا کو انسان کی جو چیز سب سے زیادہ ناپسند ہے، جس پر اس کی غیرت کو جوش آتا ہے، وہ ظلم ہے، سب کچھ وہ معاف کر سکتا ہے، عقائد کی حد تک قرآن اعلان کرتا ہے کہ شرک معاف نہیں کرے گا، اور انسانوں کی قسمتوں کا جہاں تک تعلق ہے، سلطنتوں، تہذیبوں اور معاشرے کی قسمتوں کا جہاں تک تعلق ہے، ظلم ان کے لیے پیغام موت ہے، ظلم کے بعد ان کو ڈھیل نہیں دی جاتی، تو میرے عزیزو! ہندو مسلمان نوجوانو! آپ اس معاشرہ کو ظلم سے بچانے کے لیے میدان میں آئیں، دیہاتوں اور شہروں میں جائیں، اور پکار لگائیں کہ یہ ظلم نہیں ہونا چاہیے، یہ فسادات نہیں ہونے چاہئیں، اس میں بے گناہ مارے جاتے ہیں۔

میں نے کئی مرتبہ اس کا نقشہ کھینچا ہے کہ ایک مسافر بڑے ارمانوں کے ساتھ بمبئی سے آ رہا ہے، تھوڑی سے پونجی بچا کر، سنا ہے کہ ماں بیمار ہے، میں جاتے ہی دوا دلاؤں گا، وہ میری صورت دیکھ کر خوش ہوں گی، ان کے اندر طاقت آ جائے گی، وہ آنکھیں کھول دیں گی، ابھی وہ اسٹیشن سے چلا ہی تھا کہ اسے چھرا بھونک دیا گیا، ادھر ماں تڑپ رہی ہے اور یہاں بیٹے نے جان دے دی۔

جس معاشرے میں یہ واقعات ہوں، اس معاشرہ میں کیا کوئی بھی ترقی، اقتصادی، سیاسی، علمی ترقی خوشی کی بات ہو سکتی ہے؟ اس ملک میں جو یونیورسٹیوں کی تعداد بتلائی جاتی ہے، میں کہتا ہوں کہ اس کے دس گنا یونیورسٹیاں ہو جائیں تب بھی اس معاشرے کے لیے کوئی خوشی اور اطمینان کی بات نہیں، کوئی عزت کی بات نہیں، متوسط پڑھے لکھے لوگ ہوں، مگر ظلم سے نفرت ہو، گناہ سے نفرت ہو، Corruption سے نفرت ہو، وہ معاشرہ زندہ ہے، طاقتور ہے، اور ممکن ہے کہ دوسری قوموں کی قیادت کرے۔

ہماری سوسائٹی کا روگ

میرے عزیز بھائیو! میرے محترم اساتذہ اور فضلاء، میں معافی چاہتا ہوں ؎

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اگر میں نے اپنے حدود سے تجاوز کیا ہو، اگر میں نے بعض تلخ حقیقتیں تلخ انداز میں کہی ہوں تو مجھے معاف فرمائیں کہ جب حقائق کی تلخی حد سے بڑھ جاتی ہے تو کوئی شیریں کلامی اسے شیریں نہیں بنا سکتی، وہ فریب دہی ہوتی ہے، میں نے ایک تلخ حقیقت کو تلخ انداز میں کہا ہے، اس پر میں آپ سے معذرت خواہ ہوں، ہماری سوسائٹی کا روگ یہ ہے کہ کوئی صاف بات نہیں کہتا، بہت دور چل کر، اپنی پارٹی اور اپنے فرقہ کو محفوظ رکھتے ہوئے، اس کو بچاتے ہوئے، ہزار احتیاط کے ساتھ ایک بات ایسی کہی جاتی ہے کہ پھر کوئی پکڑ نہ سکے، ان کو پکڑے جانے کی فکر زیادہ ہوتی ہے اور سوسائٹی کے تباہ ہونے کی فکر کم ہوتی ہے، لیکن جب آگ لگی ہو تو یہ تحفظات باقی نہیں رہتے، گفتگو کے آداب باقی نہیں رہ سکتے، جب آگ لگ جاتی ہے تو پھر کسی زبان میں کیسے ہی بے ڈھنگے طریقہ سے کہا جاتا ہے، بچہ بھی بول اٹھتا ہے کہ آگ لگی ہے، اس وقت صورت حال یہی ہے، نہ اس سے کم نہ اس سے زیادہ، اس وقت ہمارا معاشرہ کوہ آتش فشاں کے دہانہ پر پہنچ گیا ہے، اور کوئی تدبیر اس کو

بچا نہیں سکتی، اگر کوئی چیز اس کو بچا سکتی ہے تو وہی مذہبی انسانوں، دانشوروں اور بے غرض انسانوں کا میدان میں آنا اور حالات سے پنجہ آزمائی کرنا، اور اپنا عملی نمونہ دنیا کے سامنے اور کم از کم ہندوستان کے سامنے پیش کرنا۔

تو ہما کا ہے شکاری ابھی ابتدا ہے تیری

میں پھر کہتا ہوں کہ اس یونیورسٹی نے محمد علی اور شوکت علی کو پیدا کیا ہے، حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خاں کو پیدا کیا ہے، اور ہمیں امید ہے کہ یہ جامعہ اب بھی ایسے آدمیوں کو پیدا کر سکتی ہے، اور اس میں پیدا کرنے کی صلاحیت ہے، میں آپ کے سامنے اقبالؔ کا یہ شعر پڑھوں گا۔

تو ہما کا ہے شکاری ابھی ابتدا ہے تیری
نہیں مصلحت سے خالی یہ جہانِ مرغ و ماہی

آپ مرغ و ماہی پر اپنی طاقتیں صرف نہ کریں، آپ نے اگر ایک چھوٹی سی چڑیا کا شکار کر بھی لیا تو کوئی فخر کی بات نہیں، آپ کو سارا ہندوستان پیش نظر رکھنا چاہیے، اور آپ کو اپنی توانائی چھوٹے چھوٹے مسائل پر نہیں خرچ کرنا چاہیے، آپ کی طاقت بڑی قیمتی ہے، اس کا اصل مستحق آپ کا معاشرہ ہے، آپ کا یہ پورا عہد ہے، آپ کا یہ پورا ملک ہے، آپ کی ملت ہے، اس لیے آپ اپنے ساتھ بھی زیادتی کریں گے، اور ملک کی بھی حق تلفی کریں گے، اور ملت کی بھی حق تلفی کا ارتکاب کریں گے، اگر آپ نے چھوٹے چھوٹے مسائل میں اپنی طاقت صرف کر دی، یہ مسائل آپ کی عنقا شکار ہمت، آپ کی بلند نگاہی، اور آپ کی اندرونی صلاحیتوں اور جس ملت کی میراث آپ کو ملی ہے، اور جس کتاب الٰہی کے آپ حامل ہیں، اس کے شایان نہیں ہے، جس کی آیت پڑھ کر میں نے آپ کو سنائی ہے: ﴿فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُوا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ﴾ (سورۃ ھود: ۱۱۶) یعنی ان نسلوں میں ایسے کچھ بچے کھچے انسان تو ہوتے، دردمند انسان تو ہوتے، شعور والے انسان تو ہوتے، جو فساد سے لوگوں کو روکتے، منع کرتے، اگر وہ نہیں تھے تو ان قوموں کا تختہ الٹ دیا گیا، ان کی داستان بھی داستانوں میں نہیں رہی، وہ حرف غلط کی طرح تاریخ کے اوراق سے مٹا دیے گئے، اور ہمیں اندیشہ ہے کہ ہندوستان کا یہ موجودہ معاشرہ خدانخواستہ کہیں ایسے ہی کسی انجام سے دوچار نہ ہو، اس لیے میں آپ سے یہ اپیل کرتا ہوں کہ آپ اپنی توانائی، اپنی ذہانت، اپنی قوت عمل، اپنی Energy اور اپنا Talent

چھوٹے چھوٹے مسائل پر خرچ کرنے کے بجائے ہندوستان کو بچانے کے لیے، اور ملت کو اس کی عزت کا مقام دلانے کے لیے صرف کریں۔

میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے پورے صبر وسکون کے ساتھ، اور متانت وثقاہت کے ساتھ - جو اس یونیورسٹی کی ہمیشہ روایت رہی ہے - میری معروضات سنیں، و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمین۔ (۱)

(۱) یہ تقریر دفتر تحریک پیام انسانیت لکھنؤ سے متعدد بار علاحدہ رسالہ کی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔

۱۵

محبت کے ماحول میں جینا سیکھیے پھر زندگی کا مزہ دیکھیے![1]

انسان سب سے زیادہ محبت اور پیار کا بھوکا ہے

میں صدر صاحب کا اور معزز حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں، انھوں نے مجھے اس سے پہلے کبھی دیکھا نہیں، شاید سنا بھی نہ ہو؛ لیکن انھوں نے مجھ پر اعتماد کیا اور میرے متعلق ایسے لفظ کہے جن کی وجہ سے میں اپنے اندر ایک خوشی محسوس کرتا ہوں، اور حوصلہ پاتا ہوں، انسان صرف کھانے کا، صرف غذا کا، کپڑوں کا اور پیسے کا محتاج نہیں ہے، اس کی بھوک اور پیاس صرف پیسے اور کھانے پینے کی چیزوں کی نہیں ہے، سب سے زیادہ بھوکا، سب سے زیادہ شائق وہ محبت کا ہے، پریم کا ہے، اگر انسان کو اس دنیا میں یہ تحفہ نہ ملے اور سب کچھ مل جائے تو ایسا معلوم ہوگا جیسے کوئی میوزیم میں گیا ہے، سب کچھ دیکھ رہا ہے مگر اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں لگ رہا ہے، وہاں سے خالی ہاتھ آیا ہے، محبت ایسی چیز ہے جس سے آدمی اپنی بیماری بھول جاتا ہے، اپنا تکان بھول جاتا ہے، غصہ بھول جاتا ہے، رنج بھول جاتا ہے، انسان اصل میں پریم کا، محبت کا بھوکا ہے، باہمی اعتبار و اعتماد کا بھوکا ہے، اور اس کا قدردان ہے، میں آپ سب بھائیوں کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے ہم پر اعتماد کیا۔

---

(۱) ۲۲؍ اکتوبر ۱۹۸۳ء کو حضرت مولاناؒ کی قیادت میں تحریک پیام انسانیت کے ایک وفد نے گورکھپور کا دورہ کیا، اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہوار ایک ساتھ پڑے تھے، جس کی وجہ سے یوپی میں کئی شہروں میں کشیدگی تھی، ٹانڈہ اور بہرائچ میں فسادات ہو چکے تھے، اسی سلسلے میں ایک اجتماع گورکھپور سے لگ بھگ ۵۰-۵۲ کیلومیٹر دور قصبہ مہراج گنج میں بھی ہوا، جس میں مقامی اور اطراف کے مسلم اور غیر مسلم بڑی تعداد میں شریک ہوئے، اس جلسے میں حضرت مولاناؒ نے یہ تقریر فرمائی۔

اس زمانہ کی ایک بہت بڑی بیماری

اس زمانہ کی بہت بڑی بیماری یہ ہے کہ آدمی کو آدمی کا اعتبار نہیں رہا، اور ہمارے سیاست دانوں نے (خدا ان کو معاف کرے اور ان سے نیک کام لے، اچھا کام لے) اعتبار کھو دیا ہے، اپنا عتبار بھی کھو دیا ہے اور دوسروں کا اعتبار بھی انھوں نے بہت کمزور کر دیا، کسی کو کسی پر بھروسا نہیں رہا، آدمی ڈرتا ہے کہ معلوم نہیں کون سی مطلب کی بات کہی جائے گی، اور اب تو لوگوں کا یہ حال ہو گیا ہے کہ لوگ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ بے مطلب کی کوئی بات کہی جا سکتی ہے، یا دنیا میں کوئی ایک آدمی بھی ایسا نکل سکتا ہے جو اپنے مطلب کی بات نہ کہے، جو زیادہ تجربہ رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ مطلب کی بات ضرور آتی ہے، فرق صرف وقت کا ہے، کوئی پھوہڑ ہوتا ہے، جلد باز ہوتا ہے، وہ جلدی مطلب کی بات کہہ دیتا ہے، اور کوئی ذرا سمجھ دار ہوتا ہے، سیانا ہوتا ہے، وہ دیر میں مطلب کی بات کہتا ہے، کوئی ابھی کہہ دے گا، کوئی شام کو کہے گا، کوئی کل کہے گا، کوئی چھ مہینے بعد کہے گا، مگر کہے گا ضرور، اب دنیا کا اعتبار جاتا رہا، کسی کو کسی پر بھروسا نہیں رہا، تو میں آپ کا شکر گزار ہوں، میں یہاں پہلی بار آیا ہوں، آپ مجھے جانتے نہیں، پھر بھی آپ نے اپنے بھائیوں کا اعتبار کیا، انھوں نے کہا کہ ایک بھائی آنے والے ہیں، وہ کچھ اچھی باتیں کہیں گے، آپ اپنا کام کاج چھوڑ کر یہاں اتنی بڑی تعداد میں جمع ہو گئے، یہ بات حوصلے بڑھاتی ہے، اور یہ دنیا حوصلہ اور ہمت پر ہی چل رہی ہے، ورنہ دنیا کے حالات تو ایسے ہیں کہ آدمی کپڑے پھاڑ کر جنگل کو نکل جائے، پاگل ہو جائے اور انسان سے بالکل ناامید ہو جائے، بالکل مایوس ہو جائے، کہ انسان اب کسی کام کا رہا نہیں، آپ نے سنا ہو گا کہ دنیا امید پر قائم ہے، یہ بات سچی ہے کہ دنیا امید پر قائم ہے اور انہی باتوں سے امید بندھتی ہے کہ بھلا ان بھائیوں سے ہمارا کیا رشتہ، انھوں نے ہمیں دیکھا نہیں، ہم نے انھیں دیکھا نہیں، یہ زیادہ اخبارات اور رسالے بھی نہیں پڑھتے، بعض کتابیں بھی انھوں نے نہیں پڑھی ہوں گی، (شاید یہاں ہماری ایک کتاب بھی نہ پہنچی ہو گی، پہنچی بھی ہو گی تو خالی مدرسہ میں پہنچی ہو گی) جب بھی انھوں نے اعتبار کیا، اور ابھی یہ انسانیت سے مایوس نہیں ہیں۔

تم سوئی لائے ہوتے!!

میں ایک بزرگ کا قصہ سناتا ہوں، اسی سے اپنی تقریر شروع کرتا ہوں اور اسی پر ختم کروں گا، ایک بڑے بزرگ تھے، دلی میں ان کو دلی والے سلطان جی کہتے ہیں، اور کوئی حضرت محبوب الٰہی

کہتا ہے، کوئی سلطان المشائخ کہتا ہے، شاید آپ نے سنا ہو کہ دہلی میں نظام الدین ایک محلّہ ہے، یہ انھیں بزرگ کے نام پر ہے، ان کا نام تھا نظام الدین اولیاء، ان کے پاس کوئی بھائی، کوئی ان کے معتقد ایک قینچی لائے، انھوں نے کہا: مجھے قینچی کی ضرورت نہیں ہے، میرا کام کاٹنا اور پھاڑنا نہیں ہے، میں دلوں کو سیتا ہوں، جوڑتا ہوں، میں دلوں کو پھاڑتا نہیں ہوں، کاٹتا نہیں ہوں، قینچی تو کاٹنے اور پھاڑنے کی چیز ہے، یہ تو کسی اور کو دو، مجھے تو کوئی سوئی لاکر کے دو، جس سے میں اپنا کام کرسکوں، میرا کام ہے ملانا، میرا کام جدا کرنا نہیں ہے۔

سب سے بڑی قینچی

اس وقت قینچیاں تو بہت چل رہی ہیں اور بڑی سستی ہوگئی ہیں، میرے خیال میں تو بہت سے لوگ یونہی لیے لیے پھرتے ہوں گے، اور کسی چیز کو آپ کیا کہیں، زبان قینچی بن گئی ہے، اخلاق قینچی بن گئے ہیں اور سب سے بڑی قینچی کیا ہے؟ آپ مجھے معاف کریں، میں اکثر پڑھتا لکھتا رہتا ہوں، لوگوں سے ملتا بھی رہتا ہوں، میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ سب سے بڑی قینچی سیاست ہے، یہ بہت بڑی قینچی ہے، بڑی دھاردار اور بہت لمبی، ایک قینچی ایسی ہوتی ہے جس کی مار یا جس کی پہنچ ایک بالشت بھر یا اس سے بھی کم ہوتی ہے، لیکن سیاست کی قینچی ایسی ہے کہ یہاں ہاتھ میں لیجیے اور لکھنؤ تک کام کرجائیے، دلی میں قینچیاں ہیں جو سارے ہندوستان میں اپنا کام کررہی ہیں، دارالحکومت اور ہر سیاسی پارٹی قینچی بنی ہوئی ہے، ہر پولیٹیکل لیڈر، ہر جرنلسٹ، ہر لکھنے والا یہی کام کررہا ہے، قلم قینچی بن گیا ہے، وہ قلم جو ملانے کے لیے تھا، اور وہ زبان جو ملانے کے لیے تھی، جو محبت کے پھول برسانے کے لیے تھی، کہتے ہیں کہ فلاں آدمی کے منہ سے تو پھول جھڑتے ہیں، فلاں آدمی تو پھول برساتا ہے، یہ شاید پرانے زمانے کی باتیں تھیں، آج ان لبوں سے اور ان ہونٹوں سے کانٹے برس رہے ہیں، زبانیں قوموں کو قوموں سے جدا کرنے والی، گلے کٹوانے والی بن گئی ہیں، قلم گلے کٹوانے والا بن گیا ہے۔

زیر قلمت ہزار جان است

ایک مرتبہ لکھنؤ میں ایڈیٹرس کانفرنس تھی، اور اس میں ہماری پرائم منسٹر صاحبہ بھی آئی تھیں، انھوں نے اس کا افتتاح بھی کیا تھا، تو ہمارے بعض بھائی کانفرنس والوں کو ندوہ میں -جس کا میں خادم ہوں- بلالائے، ان میں اخبارات کے ایڈیٹر صاحبان تھے، ان میں مسلمان بھی تھے، ہمارے

ہندو بھائی بھی تھے، بڑا اچھا اجتماع تھا، مجھ سے کہا گیا کہ میں ان کو خطاب کروں، میں نے ان سے کہا کہ فارسی کا ایک پرانا شعر ہے، ہے تو غزل کا شعر، یہی عشق ومحبت کا شعر، کسی نے اپنے محبوب کے لیے کہا ہے، آج میں آپ کے سامنے پڑھتا ہوں ؎

آہستہ خرام بلکہ مخرام
زیر قدمت ہزار جان است

کہنے والا شاعر اپنے محبوب کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ تمہارے قدم کے نیچے ہزار جانیں ہیں، آہستہ چلیے گا، بلکہ نہ چلیے تو بہتر ہے، اور میں آپ سے کہتا ہوں کہ ''زیر قلمت ہزار جان است'' کہ آپ کے قلم کے نیچے ہزاروں جانیں ہیں، محبوب کے قدم کے نیچے ہوں نہ ہوں، لیکن ہم گواہی دیتے ہیں اور دن رات تماشا دیکھتے ہیں کہ آپ کے قلم کے نیچے ہزاروں نہیں لاکھوں جانیں ہیں، اس بے چارے شاعر کی پہنچ تو ہزار تک تھی، اور ایک آدمی سے محبت کرنے والے کتنے لوگ ہوں گے؟ لیکن اخبار والوں کا خدا بھلا کرے، آج صحافت اتنی ترقی کر گئی ہے اور اس کے اثرات اتنے بڑھ گئے ہیں کہ لوگ اسے Majesty کہتے ہیں، اور یہ بات صحیح بھی ہے، جیسے کسی زمانے میں بادشاہوں کو خطاب کیا کرتے تھے، آج کل اس کو Her Majesty کہنا چاہیے، اس کی پہنچ کہاں نہیں ہے؟ اس کے دائرۂ کار اور اس کے اثرات کسی بادشاہ کے اختیارات سے کم نہیں ہیں، اگر یہ قلم قینچی بن جائے، تو اتنی بڑی اتنی دور تک اثر کرنے والی کیا دنیا میں کوئی قینچی ہوگی؟

میں نے ان سے کہا کہ وہ زمانہ گیا جب محبوب سے کہتے تھے کہ حضور! آپ کے قدموں کے نیچے ہزاروں جانیں ہیں خدا کے بندوں کی، آپ نہ چلیں تو اچھا ہے، اور چلیں تو بہت خیال سے چلیں، بہت دھیان کے ساتھ چلیں کہ کوئی مارا نہ جائے، میں آپ سے کہتا ہوں، ایڈیٹر صاحبان سے میں نے کہا کہ ''زیر قلمت ہزار جان است''، آپ کے قلم کے نیچے ہزاروں جانیں ہیں، اور آج دنیا میں قلم نہیں قینچیاں کام کر رہی ہیں۔

وہ اللہ کے بندے ہمارے ملک میں بہت ہیں جنھوں نے جوڑنے اور دلوں کو ملانے کے کام کیے ہیں، میں بہت دنیا پھرا ہوا ہوں، میں دنیا کے بہت دور دور حصوں میں گیا ہوں، اور میں نے بہت سے ملک دیکھے ہیں، اسلامی ملک بھی دیکھے ہیں، لیکن یہ محبت کی بانسری بجانے والے، محبت کی سریلی آواز سنانے والے، محبت کے گیت گانے والے ہمارے ملک میں جتنے ہوئے دوسرے ملکوں میں کم ملتے ہیں، میں تھوڑا سا تاریخ کا طالب علم بھی ہوں، مجھے اس کا بڑا شوق ہے، بلکہ ایک

طرح کی ہابی (Hobby) لت جیسی ہوتی ہے، مجھے تاریخ کی لت ہے، میں نے تاریخ پڑھی ہے، اور تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہمارے اس ملک میں ایسے خدا کے بندے باہر سے بھی آئے اور یہاں بھی پیدا ہوئے جنھوں نے وہی کام کیا جو سوئی کرتی ہے، جیسا کہ میں نے حضرت محبوب الٰہی کا واقعہ سنایا، ان کا نام تو محبوب الٰہی ہے، لیکن وہ اصل میں انسان سے محبت کرنے والے تھے، آپ ہمارے ان بزرگوں کے، صوفیوں کے قصے پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ محبت کیا چیز ہے اور انسان کی کیا عزت ان کی نظر میں تھی۔

ہمارے سماج کا زہر

آدمی کوئی غلطی کرتا ہے تو اس کو مذہب کے سر تھوپتے ہیں، اور اس مذہب کو ذمہ دار بناتے ہیں، اور یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو ان کی پرانی عادت ہے، یہ ہمیشہ ایسی ہی حرکتیں کرتے رہے ہیں، حالانکہ غلطی ایک شخص کی ہوتی ہے، جرم اگر ہوتا ہے تو ایک فرد کا ہوتا ہے، اس کا تعلق نہ پوری جماعت سے ہوتا ہے نہ مذہب سے، اصل بات یہ ہے کہ ہمارے ذہن میں زہر آ گیا ہے اور اس نے ہمارے پورے اس نظام کو، ہمارے ماحول کو، ہماری سوسائٹی اور پورے سماج کو گندہ کر کے رکھ دیا ہے، اس زہر کو نکالنے کی ضرورت ہے، اگر یہ زہر نہ نکالا گیا تو آپ یہ سمجھ لیجیے کہ آدمی کا اپنے گھر سے نکلنا مشکل ہو جائے گا، میں کوئی پہنچا ہوا آدمی نہیں ہوں، معمولی انسان ہوں، مگر آدمی کو اللہ نے یہ طاقت دی ہے کہ سامنے کی چیزوں کو دیکھ کر اندازہ لگائے، بجلی چمکتی ہے، دو چار بوندیں پڑتی ہیں اور گرج ہوتی ہے تو آدمی کہتا ہے: پانی برسنے والا ہے، اس میں کوئی پیغمبری کی بات نہیں ہے، یہ روز کا تجربہ ہے، اسی طرح آج روز ہمارے سامنے ہونے والے حادثات اور واقعات یہ بتلا رہے ہیں کہ اگر یہی حال رہا، اس ملک میں یہی سب کچھ ہوتا رہا، اور ہم نے اس کو نہیں روکا، تو ہمارے ملک اور ہمارے سماج کی خیر نہیں، یہ بدگمانی، یہ نفرت جو ہمارے اندر پرورش پا رہی ہے، اور ہمارا لٹریچر، ہمارے ایجوکیشن کا سسٹم، اور ہمارا فلسفہ اور سب سے بڑھ کر پالیٹکس جو اس نفرت کو بڑھا رہی ہے۔

خوف اور نفرت کا فلسفہ

کسی بڑے یورپین فلاسفر نے کہا کہ اگر تم کسی قوم کو قابو میں رکھنا چاہتے ہو، اپنے کنٹرول میں رکھنا چاہتے ہو، تو دو باتوں کا خیال رکھو، ان کو ختم نہ ہونے دو، ایک نفرت اور ایک خوف، یہ دو چیزیں قائم رکھو، کسی سے ڈراتے رہو اور کسی سے لڑاتے رہو، تم لیڈر بنے رہو گے، اور تمھاری گدی محفوظ

رہے گی، C. E. M. Joad نام ہے اس کا، اس کی کتاب ہے: Introduction to Modern Philosophy، اور دوسری ہے: Guide to Modern Wickedness۔

ابھی چند سال پہلے وہ لندن یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ کا صدر تھا، اس کی یہ دو کتابیں بہت مشہور ہیں، اس نے لکھا ہے کہ اگر نفرت اور خوف کے لیے تمھیں اپنے یہاں کی کوئی کمیونٹی نہ ملے تو کہیں اوپر سے لے آؤ، آسمان سے لے آؤ، کوئی خیال جس کا وجود نہیں، کہیں وہ چیز پائی نہیں جاتی، کسی ستارے کو، سورج کو، چاند کو، مچھلی یا دریا کو، کسی کو اس طرح پیش کرو، تمھارے جو ماننے والے ہیں اس سے نفرت کرنے لگیں، اور ڈرنے لگیں، بس تمہارا کام بن گیا، بس تم آرام سے گھر بیٹھے رہو، خود ہی تمہارا کام بنتا جائے گا، لوگ لڑاتے رہیں گے یا ڈرتے رہیں گے اور تمہارا الو سیدھا ہوتا رہے گا، آج مصیبت یہ ہے کہ یہ سیاسی لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ اس وقت کام نکل گیا، مگر آئندہ کیا ہوگا، ملک اگر ڈوبا تو ہم کہاں بچیں گے، ہم نے مانا کہ ہمارا کام اس وقت نکل جائے گا، ہم الیکشن جیت لیں گے، ہم کسی جگہ کے چیرمین ہو جائیں گے، ہم پاپولر ہو جائیں گے، ہم کو لوگ سر پر بٹھائیں گے، آنکھوں میں جگہ دیں گے، لیکن اس کے بعد پھر وقت آئے گا، ممکن ہے وہ ہماری زندگی ہی میں آجائے، اور ہماری زندگی میں نہ آئے تو یہ جو آئندہ کی نسل ہے، ہمارے بچے ہیں، ان کے زمانے میں آئے گا۔

آدمی اپنے بچوں کا بھی خیال کرتا ہے، اسی کے لیے محنت کرتا ہے، زمین خریدتا ہے، باغ لگاتا ہے، کوئی کہے کہ یہ باغ آپ کی زندگی میں کب پھل لائے گا؟ تو ہم اس سے کہیں گے: یہ ہم اپنے لیے نہیں، اپنے بچوں کے لیے لگا رہے ہیں، یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لیے سامان کرتا ہے، آپ اپنے بچوں کو نہیں سوچتے کہ اگر اس ملک میں نفرت اور ڈر اسی طرح سے رہا تو آج سے ساٹھ برس یا ستر برس بعد جب ہم دنیا میں نہیں ہوں گے، اس وقت اس ملک کی کیا حالت ہوگی؟ ہمارے بچے کس ماحول میں زندگی گزاریں گے؟

نفرت کی کاشت کی جا رہی ہے

جس طرح سے کسان بیج ڈالتا ہے تو کھیتی اگتی ہے، پھر کاٹتا ہے، ایسے ہی نفرت اور خوف کی بھی کھیتی ہے، نفرت اور خوف کی کھیتی سب سے زیادہ پھلنے پھولنے والی ہے، اس کی جو فصل آتی ہے، وہ فصل کسی چیز کی نہیں، نفرت کے بیج آپ ڈال دیجیے، خوف کے بیج آپ بکھیر دیجیے، اس کے بعد

وہ ایسی فصل لائے گی، اتنی پیداوار ہوگی کہ نہ آپ کے گیہوں کی اتنی پیداوار ہوتی ہے، نہ جو کی ہوتی ہے، نہ جوار کی ہوتی ہے، نہ دھان کی ہوتی ہے، کسی کی نہیں ہوتی، آج ہمارے ملک میں یہی کھیتی بوئی جا رہی ہے، نفرت اور خوف کی، ایک کمیونٹی دوسری کمیونٹی سے ڈرتی بھی ہے اور اپنے ڈر کو چھپاتی بھی ہے، میں آپ کو بتا دوں یہ بھی ایک کمپلکس (Complex) ہے، کبھی کبھی ایک انسان کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بڑا شیر مرد ہے، بہادر ہے، لیکن اندر خوف بیٹھا ہوا ہے، میں صاف کہتا ہوں کہ مسلمان ہندو بھائی سے ڈرتا ہے، اور ہندو بھائی مسلمان سے ڈرتا ہے، غصہ بھی اس کے اندر ہے اور ڈرتا بھی ہے، ساتھ ہی ساتھ اس ڈر کو چھپاتا ہے، آدمی ڈر کو ظاہر نہیں کرتا کہ کہ لوگ کہیں گے کہ بزدل ہے، کمزور دل کا ہے، ظاہر تو نہیں کرتا لیکن دل میں ڈر بیٹھا ہوا ہے، آپ دل چیر کر کے دیکھیے، ایک ایک شہری کے دل میں ڈر بیٹھا ہوا ہے، ہندو مسلمان سے ڈر رہا ہے۔ صاف سن لیجیے، مجھ سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اور ہندو مسلمان سے ڈر رہا ہے، اور کیوں ڈر رہا ہے؟ اس لیے کہ اس نے اس کو نہیں پہچانا، وہ نہیں جانتا کہ اس کے اندر پریم کا کتنا مادہ ہے، خدا نے اس کے اندر کتنی محبت رکھی ہے۔

ہماری ایک کمزوری

اگر اس محبت کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے اور محبت کرنے کا اس کو موقع دیا جائے تو ایسی محبت کرے گا جیسے کہ کوئی ماں اپنی اولاد سے کرتی ہے، لیکن جب ہندو و مسلمان ایک دوسرے سے واقف ہی نہیں ہیں تو محبت کا رشتہ مضبوط کیسے ہو سکتا ہے؟

ہماری ساری تاریخ، ہمارا لٹریچر، ہماری شاعری (Poetry) سب بھری ہوئی ہیں محبت کے گیتوں سے، لیکن محبت کے مادہ کو نکلنے تو دیا جائے، اس پر تو ڈھکن ایسا لگایا گیا ہے اور اس کو سیل کر دیا گیا ہے کہ محبت نکلنے نہیں پاتی، سوراخ جو کیا جاتا ہے وہ نفرت کے نکلنے کے لیے کیا جاتا ہے، محبت کے سوراخ سب بند اور نفرت کے سوراخ سب کھلے ہوئے، نفرت کا موقع ہر جگہ ہے، اور وہی آدمی پاپولر ہوتا ہے، لیڈر ہوتا ہے، الیکشن جیتتا ہے، اور وہی آدمی پھر گدی پر آتا ہے جو نفرت کرنا سکھاتا ہے، جو توڑنا سکھاتا ہے۔ اور جو محبت کی بات کرتا ہے، اس کو لوگ کہتے ہیں کہ آپ اپنے گھر بیٹھیے، آپ کا کام نہیں ہے، آپ کی ہمیں ضرورت نہیں ہے، یہ آپ اپنے گیت وہیں الاپیے گا۔

میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہماری آپ کی سب کی کمزوری یہی ہے، ابھی ایک آدمی آ جائے

اور جوشیلی تقریر کرے اور کہے: دیکھو بھائی مسلمانو، دیکھو یہ ظلم ہو رہا ہے اس ملک میں اور یہ ہو رہا ہے، اور تمہارے ہندو بھائی تو یہ کرنا چاہتے ہیں اور تمھیں عزت کے ساتھ رہنے نہیں دینا چاہتے، تو میں یہاں چلاتا رہوں گا، میرے سب ساتھی منھ دیکھتے رہیں گے، اور سارا مجمع ادھر ہی چلا جائے گا، پھر اسی کے زندہ باد کے نعرے لگنے لگیں گے، ایسے ہی کوئی بھائی آ جائے اور ہندو بھائی کے جذبات سے کھیلنے لگے اور بھڑ کانے لگے کہ پاکستان ایسا اور پاکستان نے یہ تیاریاں کی ہیں تو لوگ ہمارے چیر مین صاحب صدر صاحب کو بھی چھوڑ دیں گے، ہم کو بھی چھوڑ دیں گے، اور کوئی بڑے سے بڑا لیڈر آ جائے اس کو بھی چھوڑ دیں گے، یہ ہماری کمزوری ہے۔

اور یہ کمزوری اسی لیے ہے کہ ان لوگوں کو موقع دیا گیا جو انسان کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، انھوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ انسان سے کام لینے کا آسان راستہ اور سستا طریقہ یہ ہے کہ اس کے جذبات کو بھڑ کاؤ، اس میں نفرت اور جوش پیدا کرو، اور پھر اپنا کام کر لو، اور جو محبت کی بات کرتے ہیں، پی جانے کی بات کرتے ہیں، ضبط کرنے کی بات کرتے ہیں، اپنے نفس کو کنٹرول کرنے کی بات کرتے ہیں، ان کی بات سننے والے تھوڑے سے ہیں، چند آدمی بیٹھے رہیں گے، وہ بھی کسی کو نیند آنے لگے گی، کوئی سو جائے گا، یہ ہمارے ملک کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔

اگر یہ دھارا اسی طرح بہتا رہا تو یہ مجمع بھی نہ ہو سکے گا، جو اس وقت ہوا ہے، دس بیس برس کے بعد یہ بھی آپ نہ کر سکیں گے، ابھی خدا نے موقع دیا ہے، کچھ محنت کر لیجیے، اور مل کر رہنا سیکھیے، اور سب مل کر اس ملک کو بچانے کی کوشش کیجیے، اس ملک میں اللہ نے جو نعمتیں پیدا کی ہیں، ان نعمتوں کو پہچانیے، اپنا ملک سمجھئے، اس کی ایک ایک چیز سے محبت کیجیے، اور آدمیوں کی طرح رہنا سیکھیے، تو مزہ آئے زندگی کا، زندگی بے پیسے کی بھی کتنی مزے دار ہے، تھوڑی غذا کے ساتھ بھی کیسی مزے دار ہے۔!!

محبت کے کرشمے

جس خاندان میں محبت ہے وہ خاندان چاہے سوکھی روٹی کھائے لیکن کیسے چین کی بانسری بجاتے ہیں، کیسی میٹھی نیند سوتے ہیں، کیسے سکھی ہیں اور جس خاندان میں چھوٹا ہو یا بڑا، نفرت ہے، مقدمہ بازی ہو رہی ہے، اور بھائی بھائی کو نہیں دیکھ سکتا، وہاں حالت یہ ہے کہ رات کو نیند نہیں آتی، کہ معلوم نہیں کون گلا گھونٹ دے، اور کون گھر میں گھس آئے اور کیا کر دے، کون ہماری عزت خاک میں ملا دے، ہماری بے عزتی کرا دے، اور پھنسوا دے، ہمارے خلاف مقدمہ دائر کر دے، خاندان میں سب کچھ ہے، کمانے والے بہت ہیں، بینک بیلنس بہت اور گھر میں ٹی. وی. بھی ہے،

فرتج بھی ہے، عیش وعشرت کا سارا سامان ہے، لیکن زندگی میں کوئی مزہ نہیں، آرام سے چار آدمی بیٹھ کر محبت کی باتیں کریں، اس کو ترستے ہیں، اور جہاں کچھ نہیں ہے، نہ ریڈیو ہے نہ ٹی. وی. ہے، نہ اچھے اچھے برتن ہیں، نہ فرنیچر ہے، نہ ڈیکوریشن کا کوئی سامان ہے، مگر محبت ہے، بھائی بھائی سے محبت کرتا ہے، ایک ماں ہے اس کے چار بچے ہیں، دو بچیاں ہیں، سب آپس میں مل جل کر رہ رہی ہیں، ایک دوسرے پر قربان ہوتے ہیں، اور دوسرے چچازاد بھائی وغیرہ کبھی جو آتے ہیں، سب جھک کر سلام کرتے ہیں، دل باغ باغ ہو جاتا ہے، بڑی بوڑھی عورتیں پیار کرتی ہیں، بڑے بوڑھے سر پر ہاتھ رکھتے ہیں، اور چھوٹے پیر چھوتے ہیں، اس گھر میں معلوم ہوتا ہے کہ جینے کا مزہ، اور وہاں کی سوکھی روکھی روٹی میں مزہ ہے جو دوسری جگہ کے حلوے مانڈوں میں وہ مزہ نہیں۔

محبت کے ساتھ جینا سیکھئے

تو میرے بھائیو! محبت کے ساتھ جینا سیکھئے! آپ کو معلوم تو ہو کہ محبت کے ساتھ زندگی کا کیا مزہ ہے؟ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ آدمی آدمی سے ڈر رہا ہے، محلّہ والا محلے والے سے ڈر رہا ہے، ایک آفس میں کام کرنے والے کو اسی آفس میں جو اس کے ساتھ کام کرتا، میز سے میز لگی ہوئی اس پر بھروسا نہیں کہ کسی وقت اس کے خلاف فائل داخل کردے، شکایت کردے، رشوت لینے میں پکڑوادے، خود لے رشوت لیکن اس کو پکڑوادے، یہ آج حالت ہو رہی ہے Offices کی، یہ حالت ہو رہی ہے محلوں کی، یہ حالت ہو رہی ہے ہمارے اداروں کی، جو آدمی بنانے کے کام کرتے تھے، معاف کریں مجھے پرنسپل صاحب، یہاں کا حال اچھا ہوگا، لیکن ہم شہروں کا حال جانتے ہیں، وہاں کی یونیورسٹیز میں یا کالجز میں، کہیں بھی کسی کو بھروسا نہیں ہے، اعتماد تو بالکل ختم ہو گیا، کوئی کسی پر بھروسا کرے اور اس سے امید رکھے، ایسا نہیں ہے، شاگرد استاد کا ادب نہیں کرتا، استاد شاگرد پر شفقت نہیں کرتے ہیں، اور دونوں بالکل فریق ایک دوسرے کے حریف کیمپ بنے ہوئے ہیں، کہ یہ اس کو اکھاڑنا چاہتا ہے اور برباد کرنا چاہتا ہے، وہ ان کو برباد کرنا چاہتے ہیں۔

میرے بھائیو! لمبی تقریر کی ضرورت نہیں، آپ آدمیت سیکھیے، ہمیں آدمیت کی تعلیم سب سے پہلے ہمارے پیغمبروں نے دی جو خدا کی طرف سے اسی کے لیے بھیجے گئے تھے، پھر بعد میں جو ان کے جانشین تھے اور ان کی طرح کے کام کرنے والے تھے، جو بزرگ تھے، اللہ والے لوگ تھے، جیسا کہ ہم نے ابھی آپ کو ایک بزرگ کا قصہ سنایا کہ ان کے پاس کوئی بڑی عمدہ بنی ہوئی قینچی تحفہ میں لائے، انھوں نے کہا کہ ہمیں قینچی کی ضرورت نہیں، ہمیں تو سوئی دو، میں پھاڑنے کا کام نہیں

کرتا، میں تو دلوں کو سینے کا کام کرتا ہوں، یہ کیسی سیدھی بات ہے، سیدھی سادی کہانی ہے، کوئی فلسفہ اور کہیں کوئی گہرائی نہیں ہے، مگر کیسی سچی بات ہے، آج اس ملک کو سوئی کی ضرورت ہے، قینچی کی ضرورت نہیں، قینچی گھر گھر چل چکی، گاؤں گاؤں چل چکی، محلے محلے چل چکی، اور ایک مدرسے اور اسکول میں چل چکی، اب محبت کی، پریم کی سوئی کی ضرورت ہے، آدمی آدمی کو پہچانے، قدر جانے، محبت کرنا سیکھے، مدد کرنا سیکھے، اور ایسے واقعات ہمارے ملک میں نایاب نہیں، آج بھی ایسے لوگ ہیں جو انسانوں سے انسانیت کے ناتے سے محبت کرتے ہیں۔

ایک واقعہ

ایک مرتبہ ہم لوگ اترولہ سے آرہے تھے، ہمارے ڈاکٹر صاحب بھی موجود ہیں، یہ ڈرائیو کررہے تھے، ہم شادی میں گئے تھے ایک اپنے دوست کی، وہاں سے چلے تو صاحب! ہونے والی بات، ایک یکہ ایک دم سے آکر سامنے کھڑا ہوگیا، اور اس میں ایک جوان عورت تھی، جو شاید رخصت ہوکر میکہ آرہی تھی، یا سسرال جارہی تھی، گھونگھٹ وغیرہ کاڑھے ہوئے وہ سامنے آگئی اور ڈاکٹر صاحب نے بہت بچایا لیکن ذرا سا دھکا لگا اور وہ گر گئی، بے ہوش ہوگئی، ہمارے ڈاکٹر صاحب تو ڈاکٹر بھی ہیں، اور دوائیں بھی رکھتے ہیں، خیر اس کو تھوڑی دیر کے بعد ہوش آگیا، اب سارا گاؤں جمع ہوگیا، وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ہم لوگوں کو اس سے کیا دلچسپی کہ اس کو ماریں، ہم تو سیدھے جارہے تھے، لکھنؤ پہنچنے کی جلدی تھی، ہم کوئی دشمن تو تھے نہیں، ہم گاؤں کو جانتے بھی نہیں، لیکن لوگ جمع ہوگئے لاٹھیاں لے کر اور کہا کہ جانے نہیں دیں گے، اور قریب تھا کہ کوئی کمیونل رائٹ (Communal Riot) ہوجائے اور ہم سب کی جانیں جائیں، اتنے میں ایک ماسٹر صاحب ہندو بھائی کھڑے ہوگئے کہ یہ ہو نہیں سکتا اور چارپائی بچھائی، انھوں نے کہا کہ کچھ بال بیکا نہیں ہوسکتا ان کا، اور کسی کو بڑھنے نہیں دیا، وہ ہمیں تھانے لے گئے اور وہاں چاہتے تھے کہ خود ہی پیسہ خرچ کریں، کہا گیا کہ ہمارے پاس پیسہ ہے، انھوں نے کہا کہ نہیں یہ ہمارا فرض ہے، لوگوں نے کہا کہ آپ ہندو ہیں، یہ مسلمان ہیں، آپ کو ایسی کیا ہمدردی؟ کہنے لگے: آدمی تو ہیں، ہم بھی آدمی ہیں، یہ بھی آدمی ہیں، خدا ان کا بھلا کرے، اس کے بعد کبھی ملاقات نہیں ہوئی، لیکن یہ ملک اسی سے قائم ہے اب تک، اور اسی سے قائم رہے گا، ہم یہ چاہتے ہیں کہ گاؤں گاؤں یہ سندیش اور پیغام کو پہنچائیں، اور ہمارے سب ہندو بھائی اور مسلمان بھائی اس بات کو سیکھیں، یہی پیام انسانیت کا مقصد ہے۔

نقارخانہ میں طوطی کی آواز

پرانی مثل ہے: ’’نقارخانہ میں طوطی کی آواز‘‘، اس نقارخانہ میں ہم جیسے طوطی کی آواز کون سنے گا، جہاں اتنے اخبار نکلتے ہیں، اتنے جلسے ہوتے ہیں، وہاں ہم ایک تحصیل کے اپنے ان چند بھائیوں کے سامنے جن کی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں ہوگی، ان کے سامنے اپنی بات کہہ کر چلے جائیں گے، کیا بڑا انقلاب آجائے گا، مگر نہیں، دنیا میں سب کام اسی طرح ہوتے ہیں، اگر کرنے والے شروع میں یہ دیکھتے اور یہ سوچتے کہ کتنے آدمی سننے والے ہیں، کتنے آدمی کرنے والے ہیں، تو ایک کام دنیا میں نہ ہوتا، یہ ملک بھی آزاد نہ ہوتا، اس ملک کو آزاد کرانے کے لیے جنہوں نے کوشش کی، گاندھی جی نے کوشش کی، علی برادران نے کوشش کی، اور موتی لال جی نے کوشش کی، اس وقت کیا ان کے پاس جمگھٹا تھا؟ کیا ان کی بات سننے کے لیے ایک ایک لاکھ دو دو لاکھ آدمی جمع ہوئے تھے؟ یہ تو بہت بعد میں ہوا ہے، اسی طرح ایک بیج کیا رنگ لاتا ہے، اگر کسان یہ سوچے کہ یہ مٹھی بھر بیج کیا کرلیں گے، اور زمین میں ڈال کر خواہ مخواہ کے لیے وقت ضائع کرنا ہے تو بھوکوں مرجائیں۔

اعتماد کی فضا پیدا کیجیے!!

آپ سے ہمیں یہی کہنا ہے کہ یہاں ایسی فضا پیدا کیجیے محبت کی اور اعتماد کی، ایک کو دوسرے پر اعتبار آئے، دیکھیے، ہمارے قرآن شریف میں ایک بات ایسی کہی گئی ہے جس سے ایک آئیڈیل سوسائٹی کی تصویر سامنے آتی ہے، ایک موقع ایسا تھا کہ کسی نے کسی پر الزام لگادیا، تو قرآن کہتا ہے کہ جب تم نے یہ بات سنی تھی تو تم نے یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ یہ بات غلط ہوگی، اس لیے کہ ہم نہیں کرسکتے تو دوسرا بھی نہیں کرسکتا، ہر آدمی دوسرے آدمی کا آئینہ ہے، ایسی ہی ہماری آئیڈیل سوسائٹی ہونی چاہیے کہ کوئی کہے کہ فلاں نے چوری کی تو یہ سوچیں کہ کیا ہم چوری کرسکتے ہیں، یہ بات غلط ہوگی، ہم چوری نہیں کرسکتے، تو وہ ہمارا بھائی بھی چوری نہیں کرسکتا، تو قرآن ایسی سوسائٹی بنانا چاہتا ہے۔

یہ اعتماد، یہ بھروسا اور یہ Confidence ہونا چاہیے کہ آدمی سنتے ہی نہ مان لے، آج تو یہ ہے اگر کسی کے خلاف کوئی بات کہی سنتے ہی مان لی جائے گی، اور اگر اچھی بات کہی تو ہزار جرحیں ہوں گی، صاحب! آپ نے دیکھا کیا، آپ نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا؟ کیا آپ نے آزمایا تھا؟ کیا آپ اس وقت جاگ رہے تھے؟ سو رہے تھے؟ دس باتیں کہیں گے، ارے کوئی اچھی بات کہہ

کے تو دیکھے، اور اگر آ کر ابھی کوئی یوں ہی کہہ دے کہ یہ مولوی صاحب آپ انھیں پہچانتے ہیں؟ ارے یہ مولوی صاحب بڑے تیز ہیں، معلوم نہیں کیا یہ کرتے ہیں، بس پندرہ بیس آدمیوں کو یقین آجائے گا۔

بھئی آپ دکان پر جاتے ہیں، سودا لاتے ہیں، سارا کام دنیا میں بھروسا پر چل رہا ہے، آپ ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں، اس بھروسا پر جاتے ہیں کہ یہ اپنے فن سے واقف ہیں، یہ ہمدردی کرتے ہیں، یہ اچھی دوا دیں گے، طالب علم استاد سے پڑھتا ہے تو وہ بھی اسی بھروسے پر کہ آپ ہم سے زیادہ جانتے ہیں، آپ ہمیں علم دے سکتے ہیں، تو گویا جو چیز ایک کو دوسرے سے ملاتی ہے، باندھے ہوئے ہے، وہ ہے اعتماد اور بھروسہ، اس کو آپ کاٹ دیجیے تو سب الگ الگ گر جائیں گے، اکائیاں سب بکھر جائیں گی، دنیا میں ان اکائیوں کو جو چیز ملائے ہوئے ہے اور ان کا ایک مجموعہ بنائے ہوئے ہے، وہ ہے: اعتماد یعنی بھروسا اور اچھی امید، اس کو آپ کاٹ دیجیے، سب بکھر کر رہ جائے گا، ایک سماج بھی نہیں چل سکے گا، ایک گاؤں نہیں چل سکے گا۔

بس یہی ہمیں کہنا ہے، آپ سے اور پورے ہندوستان سے، یہی ہمارے اس سفر کا مقصد ہے، اور یہی پیام انسانیت کا پیغام ہے، آپ سب پڑھے لکھے لوگ ہیں، زیادہ لمبی تقریر کی ضرورت نہیں۔ محبت اور اعتماد کی فضا پیدا کیجیے، اور ہندوستان کو جنت نشاں بنانے کی کوشش کیجیے۔!![1]

---

(۱) پندرہ روزہ "تعمیر حیات"، لکھنؤ (شمارہ ۱۰ و ۲۵ / دسمبر ۱۹۸۳ء)۔

۱۶

اعتماد واطمینان کا ماحول پیدا کیجیے![1]

جناب صدر اور عزیز بھائیو!

میں اس وقت بڑی خوشی محسوس کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ عزت بھی کہ کتنے بھائیوں کو قریب سے دیکھنے اور ان کے ساتھ بیٹھنے اور ان سے باتیں کرنے کا موقع مل رہا ہے، آپ نے جتنے تھوڑے وقت اور شورٹ نوٹس پر اتنے پڑھے لکھے بھائیوں کو مختلف فرقوں کے اور مختلف طبقوں کے بھائیوں کو جمع کر لیا، یہ آپ کے خلوص کی، آپ کی محبت کی اور نیک نیتی کی دلیل ہے، آپ کو خوش ہونا چاہیے اور اپنے مالک کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ آپ کی ایک آواز پر، آپ کی دعوت پر جس کے ساتھ کوئی اور کسی قسم کی ضیافت کا سامان نہیں، خواہ اس کا تعلق پیٹ سے ہو، منھ سے ہو، کانوں سے ہو یا آنکھوں سے ہو، اس طرح کی کوئی چیز اس میں شامل نہیں ہے، سیدھا سادہ جلسہ ہے اور ایک پیغام ہے، اسی کے سننے کے لیے اتنے بھائی آگئے، یہ بڑی امید پیدا کرنے والی چیز ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ابھی ہمارے ملک میں کام کرنے کی بڑی گنجائش ہے، ابھی بھروسا ختم نہیں ہوا ہے، اعتماد بالکل ختم نہیں ہو گیا ہے، ایک شہری دوسرے شہری پر ابھی کچھ اعتبار رکھتا ہے۔

معتدل اور خوشگوار حالات بہت بڑی نعمت ہیں

اس پر آپ کو جتنی مبارکباد دی جائے کم ہے، لیکن اس میں خدا کی مدد بھی شامل ہے، اور وہ یہ کہ اس وقت موسم اچھا ہے، کہیں گرج چمک نہیں ہے، بارش کا خطرہ نہیں ہے، شہر میں بھی معتدل حالات ہیں، اگر آپ ساری محنت کر لیتے، سب جتن کر لیتے، ایک ایک کو خوشامد کرتے، ایک ایک کے گھر جاتے، ہاتھ جوڑتے اور اسے یہاں آنے پر آمادہ کرتے، لیکن بجلی چمک رہی ہوتی، بادل

---

(۱) اسلامیہ کالج، گورکھپور میں ۲۲/اکتوبر ۱۹۸۳ء کو حلقۂ پیام انسانیت کی جانب سے منعقد ایک جلسے میں کی گئی تقریر، جلسہ میں گورکھپور یونیورسٹی اور شہر کے معزز مسلمانوں اور ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد شریک ہوئی۔

گرج رہے ہوتے، اور کچھ بوندیں پڑ رہی ہوتیں، یا شہر میں کہیں کسی حصہ میں (خدا بچائے) کوئی دنگا فساد کی کوئی جھوٹی سچی خبر آ جاتی تو آپ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے تھے، تو تعریف صرف آپ کی اور آپ کی نیک نیتی کی نہیں، بلکہ اس کا حق موسم کو بھی پہنچتا ہے، معتدل حالات کو بھی پہنچتا ہے، اگر سب کچھ ہوتا، بڑے سے بڑا اسپیکر، ہندوستان کا بڑے سے بڑا قابل کوئی کسی یونیورسٹی کا وائس چانسلر آتا، یا ایجوکیشن منسٹر آتے، یا پھر باہر کے بڑے اور دنیا میں شہرت رکھنے والے اسکالر آتے، سب کچھ ہوتا، لیکن نارمل حالات نہ ہوتے، موسم خراب ہوتا، اور لوگوں کی طبیعتوں میں پریشانی ہوتی، اور لوگوں کو یہ اطمینان نہ ہوتا کہ وہ خیر و عافیت کے ساتھ، آرام کے ساتھ جلسہ میں جائیں گے، اور جلسہ جب بھی ختم ہوا اطمینان کے ساتھ وہ گھر پہنچ سکیں گے، راستے میں بھیگ نہیں جائیں گے، اور اس کے نتیجہ میں بیمار نہیں ہوں گے، اور ان کو سواری بھی مل جائے گی، اور کوئی جیب نہیں کاٹے گا، کوئی ان پر حملہ نہیں کرے گا، اگر یہ اطمینان وسکون نہ ہوتا، تو آپ کی محنت اتنی کامیاب نہ ہوتی، اور اتنا بڑا جلسہ تو کیا، چار آدمیوں کا اکٹھا کرنا بھی مشکل ہو جاتا۔

میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دنیا کے سارے کام، بڑی سے بڑی قابلیت کی بات، بڑے سے بڑا اخلوص اور بڑے سے بڑا جوہر، اور بڑی سے بڑی ذہانت سب کچھ ہو، لیکن نارمل حالات نہ ہوں، تو سب بے کار ہو جاتا ہے، اس لیے یہ معتدل حالات، موسم کا معتدل ہونا، وقت کا خوش گوار ہونا اور امن وامان کا ہونا، یہ بہت بڑی نعمت ہے۔

امن وامان اور محبت واعتماد کا شامیانہ

جیسا کہ یہ شامیانہ ہے، جس کے نیچے آپ بیٹھے ہوئے ہیں، اس سے بھی اونچا اس سے بھی وسیع ایک شامیانہ ہے، اور یہ کھمبے جو شامیانے کو تھامے ہوئے ہیں، ان سے بھی زیادہ مضبوط اور ان سے بھی زیادہ شاندار کھمبے ہیں اس کے، وہ شامیانہ اس شامیانہ کے اوپر تنا ہوا ہے، آپ اس کو دیکھتے نہیں ہیں، وہ شامیانہ کیا ہے؟ وہ امن وامان کا شامیانہ ہے، وہ شامیانہ محبت کا شامیانہ ہے، وہ شامیانہ ایک دوسرے کی عزت کرنے کا شامیانہ ہے، وہ شامیانہ بھروسے کا شامیانہ ہے، وہ تجربہ کا شامیانہ ہے، تجربہ کر کے ہم نے یہ دیکھا کہ آدمی آدمی ہے، آدمی سانپ نہیں ہے، بچھو نہیں ہے، ہم آپ جو ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں، آپ برا نہ مانیے گا، آپ کو اندر سے یہ اطمینان ہے کہ آدمی کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں، آپ بھیڑیے کے پاس نہیں بیٹھے ہوئے ہیں، بڑے سے بڑے

بہادر آدمی ذرا بھیڑیے کے پاس بیٹھ کر تو دکھائے، خیر بھیڑیا تو بھیڑیا ہے، خدا اس سے بچائے، میں نے وہ جلسے بھی دیکھے ہیں کہ جہاں سماں بندھا ہوا ہے، سب ٹکٹکی لگا کر مقرر کو دیکھ رہے ہیں، اس کی تقریر پر کان لگائے ہوئے ہیں اور ایک دم سے کسی نے شور مچایا کہ سانپ آ گیا، کسی نے تحقیق نہیں کی ابھی، یقین نہیں ہے کہ اس نے جلسے کو منتشر کرنے کے لیے کہہ دیا ہے، اس میں کوئی پولیٹیکل سازش ہے، یا واقعی کوئی سچ مچ کا سانپ آ گیا، پھر صاحب، وہ جادو بیاں مقرر جو لوگوں پر جادو کر رہے تھے، دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے، اور جلسے میں بھگدڑ مچ گئی، اس کو پرسکون کرنے اور نظم وضبط برقرار رکھنے کی بہت کوشش کی اور کہا: بیٹھے رہیے، غلط ہے، کچھ نہیں ہے اور ایک سانپ کیا کر لے گا، اور سانپ سے آپ ڈرتے ہیں؟ بڑے افسوس کی بات ہے، بڑی شرم کی بات ہے، اور والنٹیر وں سے کہا کہ جاؤ، دوڑو، پکڑو اور اس کو نکالو، لیکن صاحب کوئی کسی کی نہیں سنتا تھا، وہ شامیانہ بھی اکھڑ گیا، وہ کھمبے بھی لوگوں نے گرا دیے، ایک کے اوپر ایک گرا جا رہا تھا اور لوگ زخمی ہو گئے۔

امن بہت بڑی نعمت ہے

یہ جلسوں میں ہوا ہے اور آپ اس بھول میں نہ رہیے کہ یہ مقرر کی کوئی خوبی ہے، اور اللہ معاف کرے، ہمارے یہ بلانے والے جنھوں نے یہ جلسہ سجایا ہے، یہ شامیانہ لگایا ہے، اور لوگوں کو بلایا ہے، اور جن کے چہروں پر کوئی اعتبار ہے، عزت ہے، ان کی تعریف نہیں بلکہ تعریف اس معتدل موسم کی ہے، اور یہ جو اس وقت امن وامان کی فضا ہے، اور یہ جو پرسکون فضا ہے، یہ کارنامہ اس کا ہے، یہ خدا کی بہت بڑی نعمت ہے، ہم اس کو بھول جاتے ہیں، لیکن اس دنیا میں آپ اگر لٹریچر دیکھیے، شاعری دیکھیے، اور ایجادیں دیکھیے، بڑے بڑے انکشافات دیکھیے، سائنس کی ترقی دیکھیے، ٹکنالوجی کی ترقی دیکھیے، فلسفہ کی ترقی دیکھیے، یہ سب نارمل حالات کی دین ہے۔

دنیا میں دو عظیم جنگیں، عالمی جنگیں ہوئیں، اس وقت دنیا میں سب کچھ موجود تھا، ان دونوں جنگوں پر بڑا کام ہوا ہے، بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن میں چاہتا ہوں کہ یونیورسٹی کا کوئی اسکالر اس پر ڈاکٹریٹ کرے، مقالہ لکھے کہ پہلی جنگ عظیم میں اور دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں کتنا کام ہوا، حالانکہ ہر جگہ گولے نہیں برس رہے تھے، ہر جگہ بم نہیں گر رہے تھے، ہر ملک کو خطرہ نہیں تھا، لیکن طبیعتیں پریشان تھیں، وہ سکون واطمینان نہیں رہا تھا، دنیا کے باقی رہنے کا یقین نہیں رہا تھا کہ دنیا باقی بھی رہے گی یا نہیں، ایسا تو نہیں ہے کہ قیامت آ جائے، مسلمان اس کو قیامت کہتے ہیں، اور

ہمارے ہندو بھائی اور کسی طریقے سے کہتے ہوں گے، لیکن آدمی کو یہ اطمینان نہیں تھا کہ رات کو سوئے گا تو صبح کو اٹھے گا بھی، اور یہ کہ دنیا کو کس کے لیے قائم رہنا ہے، محنت کس کے لیے، شاعری کس کے لیے، ادب کا کوئی کارنامہ، کوئی بہت بڑی چیز پیش کرنا، یہ کس لیے؟ جب دنیا ہی رہنے والی نہیں ہے، جب آدمی ہی رہنے والا نہیں، تو پھر یہ کس کے لیے محنت کی جائے؟ آپ رامائن کو لیجیے، یا شاہ نامہ کو لے لیجیے، فارسی کے اور چاہے عربی کے جو بہت بڑے بڑے ورکس (Works) ہیں، ان کو لے لیجیے، چاہے غالب کے دیوان کو لے لیجیے، چاہے میر تقی میر اور سودا کے کلام کو لے لیجیے، اور چاہے لکھنؤ اور دلی کے شعراء کے کلام لے لیجیے، یہ سب نارمل حالات کی چیزیں ہیں، تو ہر قیمت پر نارمل حالات کو باقی رکھنا چاہیے، یعنی پہلے انسان کو انسان پر بھروسا ہو، اور انسان کو زندگی کا بھروسا ہو، اپنی عزت کا بھروسا ہو، اگر مجھے ہزار کوئی شوق دلاتا ہو اور میرے یہاں گورکھپور میں بہت سارے دوست ہیں، بہت سارے عزیز ہیں، ہمارے پرانے تعلقات ہیں، اور ہم یہاں آتے رہتے ہیں، سب نے ہمیں شوق دلایا اور آرام سے آرام دہ طریقہ سے لائے، لیکن ہمیں یہ ڈر ہوتا کہ ہماری بے عزتی ہو جائے گی، ہمیں وہاں کوئی پریشان کرے گا، تو میں آنے کی ہمت نہیں کرتا، اس لیے کہ آدمی کو اپنی عزت پیاری ہے، اولاد پیاری ہے، گھر پیارا ہے، وطن پیارا ہے، اور یہ سب چیزیں جب زد پہ آ جائیں، یا خطرہ میں پڑ جائیں تو نہ شعر کہنے کا مزہ ہے نہ کسی اور چیز کا، شعر تو شعر، میں کہتا ہوں مذہبی فرائض ادا کرنے کا بھی مزہ نہیں، دلی کے ایک شاعر نے کہا تھا:

آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ
طاعت میں کچھ مزہ ہے نہ لذت گناہ میں

گناہ کی بھی لذت جاتی رہتی ہے، یہ سب باتیں ہیں، یہ سب مزے ہیں، سب تماشے ہیں سکون وامن وامان کے اور معتدل حالات کے۔

معتدل حالات پیدا کیجیے!

اس لیے سب سے بڑا فرض، اس ملک میں سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ نارمل حالات ہوں، آدمی کو آدمی کا بھروسا ہو، اور آدمی کو اپنی زندگی کا بھروسا ہو، کہ وہ ابھی رہے گا، ابھی محنت کر سکتا ہے، اس کو کچھ کرنا چاہیے، اس کو ہاتھ پاؤں مارنا چاہیے، اپنے لیے بھی، اپنے بچوں کے لیے بھی، اور علم میں اضافہ کرنے کے لیے اور دنیا کو کچھ دینے کے لیے، کچھ دنیا کی جھولی میں ڈالنے

کے لیے، کچھ روشنی عطا کرنے کے لیے، کچھ محبت کا اظہار کرنے کے لیے، خدا نے اس کو ایک جوہر دیا ہے، ایک کمال دیا ہے، اس کے اندر کام کرنے کا ایک شوق ولولہ پیدا کیا ہے، اس کے اظہار کرنے کا ابھی موقع ہے، اگر یہ معلوم ہو جائے، ڈاکٹر ابھی آ کر کہہ دے (خدا ہم کو اور آپ کو سب کو بچائے) کسی طرح ظاہر ہو جائے مریض پر یا کسی تندرست آدمی پر کہ شام تک خیریت نہیں ہے، کان میں بھنک پڑ گئی ہو کہ ڈاکٹر صاحب کچھ کہہ گئے ہیں، اب وہ پوچھ رہا ہے کہ کیا کہہ گئے ہیں، لاکھ آپ کہیے کہ بھائی کچھ نہیں، کچھ نہیں، آپ اطمینان رکھیے، لیکن کان میں ایک بات پڑ گئی کہ شام تک خطرہ ہے، پھر صاحب آپ کسی طرح ان کا دل بہلانا چاہیں، کیسی عمدہ کہانی سنانا چاہیں، کیسی عمدہ غزل سنانا چاہیں، کیسا عمدہ کھانا کھلانا چاہیں، کسی دعوت میں لے جانا چاہیں، اس مریض کا دل نہیں لگے گا، بلکہ اگر تندرست آدمی کے کان میں ایسی بات پڑ گئی ہے تو اس کا بھی کسی چیز میں دل نہیں لگے گا، اور وہ اسی وقت بیمار پڑ جائے گا، لیٹ جائے گا، ایسا معلوم ہوگا کہ ساری طاقت جواب دے گئی، جسم کا نظام فیل ہے، کیا بات ہوئی؟ کوئی گولی اس کو نہیں کھلائی گئی، کوئی انجکشن ایسا نہیں دیا گیا، جو وہ صبح کو تھا وہی اب بھی ہے، لیکن اس کا دل دھڑکنے لگا، اس کو اپنی زندگی کا بھروسا نہیں رہا، اب اس کو کسی چیز میں مزہ نہیں آتا، جس کو پھانسی کی سزا ہوتی ہے، جیل میں آپ جا کر جو لوگ پھانسی گھروں میں ہیں (اللہ اس سے بچائے) وہاں جا کر دیکھیے یا جیلروں سے پوچھیے، یا ان کے عزیزوں سے پوچھیے، کسی بات میں ان کا جی نہیں لگتا، کوئی بات اچھی نہیں لگتی۔

سب سے پہلے کرنے کا کام

تو سب سے پہلا کرنے کا کام کسی ملک میں، کسی دیش میں، کسی شہر میں یہ ہے کہ نارمل حالات باقی رہیں، امن و امان باقی رہے، انسان کو انسان پر بھروسا رہے اور کام کرنے کا موقع رہے، کام کرنے کا وقت باقی رہے، انسان کے اندر خدا نے جو شوق رکھا ہے، جو چنگاری ہے اس کے اندر کام کرنے کی، وہ بجھنے نہ پائے، وہ اپنا کام کرتی رہے، تب تو یہ دنیا چمن ہے، باغ ہے، اس کا لطف اٹھائیے، زندگی کا لطف اٹھائیے، لیکن اگر سب کچھ اس دنیا کو دے دیا جائے، اور صرف یہ بھروسا جو ہے دل کا، سکون جو ہے اور انسان سے اچھی امید جو ہے، یہ اس سے لے لی جائے، تو پھر بس سب خاک میں مل جاتا ہے، پھر کیسے ہی فلسفی دنیا کے جمع ہو جائیں اور اطمینان دلانا چاہیں، اطمینان نہیں ہوتا۔

مریضوں کو اسپتالوں میں جا کر دیکھیے کہ رنگت اُڑی ہوئی ہے، ہوائیاں اڑ رہی ہیں، آدمی

کے چہرے کا رنگ زرد پڑا ہوا ہے، اور ابھی تو کوئی خطرہ نہیں ہے، لیکن اسپتال کی فضا کو بھی دخل ہے، آپ کسی مریض کو اپنے گھر لے آیئے، اور وہاں بچوں کے ہنسنے بولنے کی وہ آواز سنے اور وہاں کسی بیمار ہونے کی بات اس کے کان میں نہ پڑے، تو اس کا خون بڑھ جاتا ہے، وہ اپنے کو تندرست محسوس کرنے لگتا ہے، اور اچھے خاصے آدمی کو اسپتال پہنچا کر دیکھیے، اسپتال تو ایک صحت کی جگہ ہے، لیکن اسپتال کا ماحول جو ہے وہ بیماروں کا ماحول ہے، وہاں بیمار آتے ہیں، اور بیماری کی باتیں ہوتی ہیں، بیماری سے وہاں مقابلہ کیا جاتا ہے، اور دوا پلائی جاتی ہے، انجکشن دیے جاتے ہیں، وہاں کوئی خوشی کی بات نہیں سناتا، کوئی مبارکباد دینے نہیں آتا، سب مزاج پرسی کے لیے آتے ہیں، جو آتا ہے یہی پوچھتا ہے کہ خیریت ہے؟ رات کیسی گزری؟ آپ اچھے ہیں؟ جو آرہا ہے وہ یہی پوچھ رہا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اچھا بھلا آدمی بھی اپنے آپ کو مریض سمجھنے لگتا ہے، حالانکہ اسپتال میں ہر طرح کا سکھ ہے، اور بعض بعض اسپتالوں میں تو ایسا ہے کہ لوگ وہاں شوقیہ جاتے ہیں، وہاں ایسا سکون ملتا ہے، وہاں ایسی عمدہ غذائیں کھانے کو ملتی ہیں، خاص طور پر یورپ و امریکہ کے آدمی اسپتال کو گھر پر ترجیح دیتے ہیں، لیکن وہاں کا ماحول دوسرا ہے، اور ماحول کا اثر پڑتا ہے۔

اس زمانہ کا مرض

تو میرے بھائیو! سیدھی سی بات یہ ہے کہ خدا نے اس ملک کو سب کچھ دیا، کیسے کیسے لوگ یہاں پیدا ہوئے، اور خدا نے کوئی نعمت دے کر ہم سے چھینی نہیں، لیکن ہم نے اس کے لیے اپنی اہلیت، اپنا اس کے لیے قابل اور مستحق ہونا ثابت نہیں کیا، ہم نے اس کی قدر نہیں کی، خدا کی نعمت کی قدر نہیں کی، جلد ہی ہم میں لالچ پیدا ہوگئی، اور تھوڑے سے وقت میں زیادہ دولت مند بننے کی ہوس پیدا ہوگئی، دولت کمانے کا شوق بُرا نہیں ہے، یہ ہر زمانہ میں رہا ہے، لیکن اس زمانہ کی بیماری ہے، کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت مند بننے کا شوق، یہ مصیبت ہے اس زمانہ کی، ہمارے موجودہ لٹریچر نے، ہمارے پریس نے، ہمارے ناولوں نے، کہانیوں نے جو فضا بنائی ہوئی ہے، اور جو جلد بازی پیدا کر دی ہے، اور جلدی پیسے سے جو آرام ملتا ہے کہ جو چیز ہم خرید سکتے ہیں، بازار میں گئے اور ٹی وی لائے، بازار میں گئے اور ریفریجریٹر (Refrigerator) لائے، اور آرام کی چیزیں لے آئے، کولر لے آئے، یہ چیزیں ایسی ہیں کہ جلدی مل جاتی ہیں، اس لیے آدمی جلدی دولت مند بننا چاہتا ہے، پہلے دیر میں دولت مند بنتا تھا، اس کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارنا پڑتا تھا، پھر دولت کا جو

نتیجہ تھا، دولت کی جو دین تھی، وہ بھی بہت دیر میں ملا کرتی تھی، ڈھونڈھنے سے ملتی تھی۔

اب دولت بھی جلدی حاصل ہوتی ہے، ایسے طریقے نکل آئے ہیں خاص طور پر وہ طریقہ جس کو لوگ ''بالائی آمدنی'' کہتے ہیں، جو اوپر کی آمدنی ہے، وہ بہت جلدی دولت مند بنا دیتی ہے، اس دولت کا نتیجہ بھی بہت جلدی حاصل ہوتا ہے، ابھی آپ کو ایک رقم ملی جو حساب میں بھی نہیں تھی، جو آپ کو مہینوں بڑی محنت کرے سے نہیں ملتی، لیکن کسی کو کام پڑ گیا تھا آپ سے، میں کسی خاص طرف اشارہ نہیں کر رہا ہوں، کسی کو کسی سے کام پڑ گیا تھا، اُس کو اپنا کام کرانا تھا، اور اس کو بھی اپنا کام کرنا تھا، دونوں ایک دوسرے کے محتاج تھے، اس میں خدا کا بیچ میں کوئی واسطہ نہیں تھا، بیچ میں صرف مطلب تھا، وہ اپنا کام کرانا چاہتا تھا، یہ اس سے پیسے وصول کرنا چاہتے تھے، لیکن نتیجہ یہ ہے کہ دس ہزار روپے کی رقم جو برسوں میں ملتی وہ یک مشت بیٹھے بٹھائے مل گئی، چونکہ اس کو بھی جلدی کام کرانا ہے اور اس کو بھی جلدی کام کرنا ہے، اس کے یہاں بھی وقت کی بڑی قدر ہے، اور یہاں بھی جو پہلے نہیں تھی، تو نتیجہ یہ ہے کہ چٹ پٹ کام ہو گیا، اس نے چٹ پٹ دیا اس نے چٹ پٹ لیا، اور چٹ پٹ بازار جا کر اسی وقت سامان خرید لایا، اب جو گھر میں جاتا ہے تو بچے دیکھتے ہیں کہ ٹیلی ویژن بھی ہے، اور ریڈیو بھی ہے اور جناب فریج بھی اور کولر بھی ہے، فلاں چیز بھی ہے، یہ سب کہاں سے ہوا؟ یہ بات پہلے نہیں تھی، پہلے بہت انتظار کرنا پڑتا تھا، بہت لمبا پروسس تھا، اس پروسس کو طے کرنا ہوتا تھا، تب جا کر پیسے ملتے تھے، اب یہ سب کام آندھی پانی کی طرح ہو جاتے ہیں، تو نتیجہ یہ ہے کہ ایک رات میں لوگ دولت مند بننا چاہتے ہیں، یہ ہے مرض ہماری اس سوسائٹی کا، جیسا کہ کہانیوں میں آتا ہے کہ ''ایک رات میں'' بس ایک رات میں سب کام ہو گیا، آج سوئے تھے ہم، تو ایک معمولی آدمی تھے، متوسط درجہ کے آدمی تھے، لیکن صبح اٹھے تو لاکھ پتی تھے۔

پوری زندگی لاٹری بن گئی ہے

اور خدا بھلا کرے لاٹری کا بھی چلن ہو گیا ہے، کتنے آدمیوں کے منہ میں پانی بھر آتا ہوگا، ہم بھی اخبارات میں پڑھتے ہیں کہ فلاں آدمی کروڑ پتی بن گیا، اور لاکھ پتی ہو گیا، یہ تو ہیں لاٹری کے طریقے، کبھی کسی کی قسمت جاگ اٹھتی ہے اور کبھی کسی کی، لیکن لاٹری کے علاوہ پوری زندگی لاٹری بن گئی، مصیبت تو یہ ہے کہ اس لاٹری میں کبھی کبھی کسی کا نام نکلتا ہے، لیکن یہاں پر تو سب نے داؤں پر چڑھا رکھا ہے اپنی تمام قابلیت کو، اپنی تمام ایمانداری کو، اپنی شرافت کو، اپنی عزت کو، اور ہر

ایک چاہتا ہے کہ آج ہی اس کے نام کا پتہ نکل آئے۔ اس زمانہ میں پیسے کی جو محبت پیدا ہوگئی ہے اور خاص طور پر ہمارے مشرقی ملکوں میں، ہمارے ایشیائی ملکوں میں، اور ہمارا ملک بھی ایشیا ہی میں ہے، تو ان مشرقی ملکوں میں پیسے کی محبت ایسی پیدا ہوگئی ہے کہ لوگ سارے حدود پھلانگ گئے اور جتنی حدیں اور جتنی سرحدیں تھیں سب ہی کراس کر گئے، ہر قیمت پر پیسہ ملنا چاہیے، اور چاہے انسانیت کا خون ہو اور چاہے شرافت کا خون ہو۔

میں نے کئی مرتبہ دیکھا کہ دفتر میں آدمی بیٹھا ہوا ہے، اور ایک آدمی آیا تو بجائے اس کے کہ دیکھے کہ اس کے چہرے پر کیا اُتار چڑھاؤ ہے، اور یہ کیا مصیبت لے کر آیا ہے، ہم اس کی کیا مدد کرسکتے ہیں، ہم اس لیے بیٹھے ہیں کہ لوگوں کے کام کردیں، لیکن اس کے چہرے پر ہماری نظر پڑی ہے، اس خیال سے کہ دیکھیں کس معیار کا آدمی ہے، کس اسٹینڈرڈ کا آدمی ہے، اس سے کتنا ملنے کی امید ہے، دیکھا کہ ذرا اچھے کپڑے پہنے ہوئے ہے، دل خوش ہوا کہ ہاں موٹی آسامی ہے، اور بجائے اس کے کہ دھڑکتے ہوئے دل پر آدمی کی نظر جائے، اور اس کے دل کی دھڑکن سنے، اس کے چمکتے ہوئے جیب اور پرس پر نظر جاتی ہے کہ اس سے آج خوب کام نکلے گا۔

ہماری خرابیوں کا اصل سبب

میں دعویٰ کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہماری خرابیوں میں نوے فیصدی جس کی ذمہ داری ہے، وہ ہے پیسے کی حد سے بڑھی ہوئی محبت، کہ جس طریقہ سے پیسہ آئے، لینا چاہیے، ہمارا یہ پورا سماج اس وقت کرپٹ ہو رہا ہے، پہلے بھی افراد کرپٹ ہوتے تھے، کوئی زمانہ خالی نہیں گیا، میں تاریخ کا طالب علم ہوں، میں جانتا ہوں کہ ہر زمانہ میں خرابیاں رہی ہیں، اور بیماریاں رہی ہیں، انسان کے ساتھ بیماریاں لگی ہوئی ہیں، زندگی کے ساتھ بیماریاں لگی رہتی ہیں، لوگ کرپٹ رہے ہیں، لیکن سماج کرپٹ ہوجائے، سوسائٹی کرپٹ ہوجائے، کم از کم میرے علم میں کبھی ایسا نہیں ہوا، اگر کبھی ایسا ہوا ہے تو زوال آگیا ہے، رومن کرپٹ ہوگئے، رومن معاشرہ جب کرپٹ ہوگیا، تو زوال آگیا، پھر اس ملک کو کوئی چیز بچا نہیں سکی، یعنی رومن قانون تھا جس کی تمام دنیا میں دھوم مچی ہوئی تھی، اس کا لٹریچر تھا، اس کا فلسفہ تھا، اس کا کلچر تھا اور اس کا تمدن تھا اور کیا کیا تھا، سب رکھا کا رکھا رہ گیا، اور جو اس سوسائٹی کا زوال آیا اور وہ سوسائٹی گرنے لگی، تو جیسے برگد کا کوئی بڑا درخت ہو اور اس میں کیڑا لگ گیا ہو، بس ایک ہوا کا جھونکا کافی ہے اس کو گرا دینے کے لیے، ہوا کا ایک جھونکا آیا، کسی ملک کی کوئی طاقت آئی اور اس کو بہا لے گئی۔

موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

ہم کو اور آپ کو اسی ملک میں رہنا ہے، بسنا ہے، جن کو جہاں جانا تھا، وہ چلے گئے، اب تو ہم آپ سب یہیں رہ رہے ہیں، اور دیکھیے ایک بات اور بھی سمجھ لیجیے کہ جس طریقہ سے آپ دیکھتے ہیں کپڑے کو کہ اس کا ایک دھاگا دوسرے دھاگے سے بندھا ہوا ہے تب جا کر وہ کپڑا ہے، چادر ہے، اسی طریقہ سے سماج ایک دوسرے سے بندھا ہوا ہے، کبھی نہ سمجھئے کہ آپ دوسروں سے بالکل آنکھیں بند کر کے زندگی گزار سکتے ہیں، اس میں نہ مذہب کا فرق ہے اور نہ بڑے اور چھوٹے کا فرق ہے، اور نہ قابلیت کا فرق ہے، یہ سب ایک جال ہے، بندھا ہوا، ایک کا گلا دوسرے کے گلے کے ساتھ بندھا ہوا ہے، یہاں اگر اکثریت خراب ہے تو کوئی شخص، چار آدمی، دس آدمی، بیس آدمی ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ نوے آدمی خراب ہیں تو ہم دس آدمی اچھے ہیں، یہ دس آدمی خراب ماحول میں رہ نہیں سکتے، جیسے کہ مچھلی کو پانی سے نکال کر خشکی میں ڈال دیجیے، تڑپ تڑپ کر مر جائے گی، ایسے ہی کرپٹ سوسائٹی میں آپ کسی آدمی کو رکھیے گا، کیسے ہی وہ مہاپرش ہو، کیسے ہی مسلمانوں میں ولی اللہ ہو اور عابد ہو، وہ رہ نہیں سکتا، زندگی خدا نے بنائی ہے، ایک موج دوسری موج سے ملی ہوئی ہے، جس طرح آپ دریا کو دیکھتے ہیں کہ کوئی موج دریا سے باہر نہیں رہ سکتی، موج دریا کے اندر تو موج ہے، لیکن دریا سے باہر آ کر فوراً خشک ہو جائے گی، ریت میں اور مٹی میں جذب ہو جائے گی، تلاش کیجیے تو ایک بوند بھی نہیں ملے گی، ایسے ہی زندگی ایک دریا ہے، اس میں ہر لہر دوسری لہر سے جڑی ہوئی ہے، ملی ہوئی ہے، کوئی یہ نہ سمجھے کہ صاحب ہم تو اچھے ہیں، ہمارا گھر بھی اچھا ہے، ہمارا محلّہ بھی اچھا ہے، نہیں محلّہ وغیرہ کچھ نہیں، جب تک شہر اچھا نہ ہو کوئی چیز اچھی نہیں، جزیرہ جو ہوتا ہے دریا میں ہوتا ہے، خشکی میں نہیں ہوتا، کبھی آپ نے سنا ہے کہ خشکی کا جزیرہ ہے؟ دریا میں ہزاروں سے برس سے ایک جزیرہ ہے، انڈونیشیا میں، آپ دیکھیے جزیروں کا ایک جال بچھا ہوا ہے، لیکن خشکی کے اندر، یہاں کوئی گھر سوچے کہ ہم جزیرہ بن کر رہیں گے، ایسا نہیں ہو سکتا، یہ قانون قدرت کے خلاف ہے، یہاں ایک کی قسمت دوسرے کی قسمت سے بندھی ہوئی ہے، جڑی ہوئی ہے، آپ اچھے تو ہم اچھے، ہندو بھائی اچھے تو مسلمان بھائی اچھے، مسلمان بھائی اچھے تو ہندو بھائی اچھے۔

مسلمان بھائی یہ نہ سمجھے کہ صاحب ہم تو نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں، ہم تو سچ بولتے ہیں، ہم رشوت نہیں لیتے تو ہمارا کیا؟ دراصل ایسا ہونا بھی غنیمت ہے، یہ غنیمت ہی ہے، بس اگر

آپ بچے ہوئے ہیں تو آپ کی اولاد نہیں بچ سکتی، ایسے بگڑے ہوئے ماحول میں آپ نے اپنے کو بچالیا تو آپ کا کمال ہے، لیکن آپ کی اولاد جونئی جنریشن آئے گی، وہ نہیں بچ سکے گی، اس لیے آپ کو فکر ہونی چاہیے، آپ کو پورے ماحول کو، پورے سماج کو درست کرنے کی فکر کرنی چاہیے، کوئی شخص کہیں کسی پہاڑ کی چوٹی پر چلا جائے تو چلا جائے لیکن شہر میں اگر رہتا ہے تو سو کام اس کے پڑتے ہیں، اب اگر دکان پر جایئے تو وہاں جھوٹ اور فریب، دفتروں میں جائے تو جھوٹ اور فریب، اسکولوں اور کالجوں میں جائے تو وہاں بھی قاعدے کی بات نہیں ہوتی ہے، ایمانداری کی بات نہیں ہوتی ہے، محنت کرنا اور محنت سے پاس ہونا، اور استادوں کا شاگردوں پر محنت کرنا، ان پر شفقت کرنا، اور شاگردوں کا استادوں کا ادب کرنا اور محنت سے پڑھنا وہاں بھی نہیں، ایسے سماج میں تو آدمی کا دم گھٹنے لگتا ہے، اور لگنا چاہیے، وہ آدمی آدمی نہیں، اس کے سینے میں دل نہیں ہے، اور دل میں احساس نہیں جس کا دم نہ گھٹے۔

مجھے تعجب ہے

میں تعجب کرتا ہوں کہ یہ سارے کام ہوتے رہتے ہیں ہمارے اس ملک میں، لیکن دم کیوں نہیں گھٹتا ہے لوگوں کا؟ لیڈر سب اپنی پارٹیاں بنا رہے ہیں، اخباروں کو دیکھیے تو معلوم ہو رہا ہے کہ ترقی ہی ترقی ہے اور شانتی ہی شانتی ہے اور امن ہی امن ہے، ملک بہت ترقی کر رہا ہے، لیکن اندر کیا ہو رہا ہے؟ یہ آپ ریل سے سفر کرنے والوں سے پوچھیے، ریلوں پر سفر کرنا مشکل، ہوائی جہاز پر سفر کرنا مشکل، دفتروں میں کام کرنا مشکل، کہ بالکل ہمارا حق ہے کہ ابھی کام ہونا چاہیے، منٹوں میں کام ہونا چاہیے، لیکن مہینوں میں نہیں ہوتا ہے، جب تک مٹھی گرم نہ کیجیے گا، تب تک کام ہوگا نہیں، دفتروں میں لوگ بڑی صفائی اور بڑی ڈھٹائی سے کہہ دیتے ہیں، کس چکر میں پڑے ہیں، فائل تک تو ملے گی نہیں، کلرک کی مٹھی تو گرم کیجیے، کچھ ابھی چائے پانی کا انتظام تو کیجیے، میں بھی اسی ملک میں رہتا ہوں، اسی زندگی میں رہتا ہوں، میرے بھی دس کام پڑتے ہیں، میں جانتا ہوں کہ کیا ہو رہا ہے، ایک اندھیر مچا ہوا ہے۔

دشمن ہمارے اندر چھپا ہے

آپ سمجھ لیجیے کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ باہر کی کوئی طاقت کسی ملک کو نقصان پہنچائے، کسی ملک پر چڑھائی کرے، یہ زمانہ چلا گیا، اچھا ہوا کہ چلا گیا، اس کے جلدی آنے کی امید بھی نہیں ہے،

کوئی ایک بار بے حیائی کرے تو بے حیائی کرے، ورنہ اب تو کوئی ملک کسی ملک کے اندرونی معاملات میں دخل نہیں دیتا، سارا ڈر ہمیں یہاں اپنے ملک کے اندر سے ہے، باہر کے لوگ آئے، بہت دن تک رہے اور چلے گئے، لیکن اگر اندر خرابی ہو، اگر پاپ اندر گھس گیا ہو، ہمارے جسم کے رگ وریشے میں جذب ہو گیا ہو، ہمارا نیچر بن گیا ہو، تو باہر کا دشمن کیا ہم تو خود کافی ہیں اپنے بھائی کو پریشان کرنے کے لیے، رُلانے کے لیے، دِق کرنے کے لیے، ذلیل کرنے کے لیے، وہ باہر کا دشمن جو تھا، اس کا ایک دائرہ تھا، جب اس سے کام پڑتا تھا تو بڑی ذلت محسوس ہوتی تھی کہ ہاں بھائی ہم تو غلام قوم کے فرد ہیں، لیکن یہاں تو قدم قدم پر رسوائی کا، زحمت کا سامنا ہوتا ہے، اور زندگی عذاب بن گئی ہے، کوئی اس زندگی کی تمنا نہیں کرتا، اس سے خوش نہیں ہوتا۔

اپنے ملک میں آکر خوشی نہیں ہوتی

میں خود آپ سے کہتا ہوں کہ اپنے ملک میں آنے سے جو خوشی ایک مسافر کو ہونا چاہیے، وہ نہیں ہوتی، ہم عرب جائیں، جو خود ہمیں بہت پیارا ہے، جہاں سے ہمارے دین، ہمارا ایمان کا رشتہ ہے، لیکن ہم انسان ہیں، ہم جب ہندوستان میں آئیں گے تو ہمیں خوشی ہونی چاہیے، ہم پورے انسان نہیں اگر ہمیں یہاں آنے پر خوشی نہ ہو، وہاں دس بار خدا لے جائے گا اور ہمیں اس کی ایک ایک چیز پیاری ہے، یہ سب ٹھیک ہے، یہ ایمان کا تقاضا ہے، لیکن ہم ہندوستانی ہیں، ہم انسان ہیں، ہم کو یہاں آکر خوشی ہونی چاہیے، ہم اپنی بولی بولیں گے، ہم اپنے کپڑوں میں نکلیں گے، ہم اپنے بھائیوں سے ملیں گے، ہم اپنے عزیزوں سے ملیں گے، اپنے دوستوں سے ملاقات ہوگی، جانی بوجھی بازار، جانی بوجھی گلیاں، یہ سب ہم کو ملیں گی، یہیں ہم پیدا ہوئے ہیں، یہیں پلے بڑھے، یہ بالکل فطری بات ہے کہ ہمیں یہاں آکر خوش ہونا چاہیے۔

لیکن ہمارا سماج اتنا خراب ہو گیا ہے کہ اب اس سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے اس ملک کا رہنے والا ڈرتا ہے، میں آپ سے یہ بات کہوں گا، باہر نہیں کہوں گا، یہ باہر کہنے کی بات بھی نہیں ہے، مجھے شرم آئے گی اور شرم آنی چاہیے، میں آپ کے سامنے برملا کہتا ہوں اور آپ سے صحیح کہتا ہوں کہ بمبئی کے ایرپورٹ پر جس وقت ہوائی جہاز پہنچتا ہے میں دو مہینے کے بعد کہیں باہر سے آیا ہوا ہوتا ہوں، کسی عرب ملک سے، کسی یورپین ملک سے، کہیں سے، تو خوشی کچھ تھوڑی سے ہوتی ہے، میں اس کا انکار نہیں کرتا کہ دوست عزیز باہر کھڑے ہوں گے میرے انتظار میں، باہر نکلتے ہی

گلے لگائیں گے، خوش ہوں گے، گھر جاؤں گا، تو اپنا کھانا جو مجھے پسند ہے، جس طرح میں رہتا ہوں سب وہاں ملیں گے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ڈر لگتا ہے کہ معلوم نہیں کس قدم پر بے عزتی ہو جائے، یعنی دوسرے ملکوں میں تو بے عزتی کا ڈر نہیں ہوتا، ہم بارہا یورپ کے ممالک میں گئے، وہاں Any Thing To Declare, Noting to Declare That، آدمی کو آدمی پر اعتماد ہے، پوچھا کوئی چیز تو ایسی نہیں ہے جس پر کسٹم وسٹم ہو؟ جی نہیں، کوئی چیز ایسی نہیں، بس تو جائیے، یہاں تو یہ کھولیے، یہ دکھائیے، یہ کپڑا پھیلائیے، ذرا یہ ڈبہ کھولیے، یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ فونٹن پن کی جو روشنائی ہے ان کو ڈراپر سے نکالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ سونے کا پانی تو نہیں ہے، وہاں آدمی کو دیکھ پہچان جاتے ہیں کہ یہ اسکالر معلوم ہوتے ہیں، پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں، آپ کہاں آئے ہیں، لکچر دینے آئے ہیں، فلاں یونیورسٹی نے بلایا ہے، تو بس پھر کیا مجال کہ کوئی بولے۔

یہاں ہم کہتے ہیں کہ بھائی ہم وہاں لکچر دینے گئے تھے، ہم وہاں فلاں اکیڈمی کے ممبر ہیں، ہم فلاں کمیٹی کے ممبر ہیں، کوئی اعتبار نہیں کرتا، اور بار بار اصرار کہ نہیں دکھائیے، آپ کیا لے کر آئے ہیں، اور کبھی کبھی دیکھا کہ گزر رہے ہیں کہیں سے، تو چپکے سے کہا کہ نیا فونٹن پن تو ہوگا آپ کے پاس؟ بتلائیے کہ آپ اگر رشوت وغیرہ نہیں دیتے تو کم از کم یہی فونٹن پن دیتے جائیے، تب آپ جلدی سے گزر جائیں گے، ورنہ کھڑے رہیں گے، آپ کو بھوک لگی ہے، دوست واحباب باہر گاڑیاں لے کر کھڑے ہیں، یہ دو گھنٹے سے، کچھ جہاز لیٹ آیا، کچھ یہاں دیر لگ رہی ہے، لیکن آپ گزر نہیں سکتے، جب تک کہ آپ مٹھی گرم نہ کیجیے، آپ کا پڑھا لکھا سب آ کر یہاں بے کار ہو گیا، اور اب آپ گویا ایک چور ہیں، اب آپ پروفیسر نہیں، آپ اسکالر نہیں ہیں، آپ دنیا کو کوئی مشورہ دینے والے نہیں ہیں، کوئی اچھی عقلمندی کی بات کہنے والے نہیں ہیں، آپ اصل میں چور ہیں، ارے بھائی جو اپنے ملک میں چور ہو، اور دوسری جگہ اشراف میں کیسے شمار کیا جا سکتا ہے؟ کتنی افسوس کی بات ہے، وہاں تو کوئی بھول کر بھی شک نہ کرے اور یہاں شک کی نگاہ سے دیکھا، اصل چیز شک ہے، اگر شک ثابت نہ ہو تو مجبوراً آپ اچھے آدمی ہیں، شریف آدمی ہیں، مجبوری کی بات ہے، ورنہ اصل بات یہ ہے کہ جس وقت آپ کا استقبال ہوگا، وہ پہلی نظر جو آپ پر پڑے گی، وہ شک کی نظر پڑے گی۔

اور میں یہ بھی کہہ دوں کہ اس میں ہمارا بھی قصور ہے کہ اچھے خاصے لوگ وہاں اسمگلنگ کر کے آئے، کچھ سونا لے کر آئے، یہ بھی ہوتا ہے دونوں طرف سے آگ برابر لگی ہوئی ہے، اب

یہ بات بھی پکی ہوگئی کہ جو باہر جاتا ہے وہ کچھ نہ کچھ غلط کام کر کے آتا ہے، کچھ چیز لے کر آتا ہے، اب بتائیے کہ وہ خوشی کہاں سے آئے کہ جو خوشی ہمیں اپنے بھائی بہنوں سے ملنے سے ہوتی، سب خوشی دب گئی اور ڈر اس پر غالب آ گیا کہ دیکھیے عزت سلامت رہتی ہے یا نہیں؟۔

اب بس ایک چیز رہ گئی ہے

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس ملک کی ہم نے وہ گت بنائی ہے کہ اللہ کی پناہ، خدا نے اس ملک کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کی، کوئی بخل نہیں کیا، کسی چیز میں کمی نہیں کی، ہم نے اس ملک کی درگت بنائی ہے اپنے اخلاق سے، اپنی پیسے کی حد سے بڑھی ہوئی محبت سے، اور جو وہ جلدی دولت بند بن جانے کا شوق ہے، اس لیے کہ دولت ملتی بھی ہے بہت جلدی، اور اس کا نتیجہ، اس کا پھل، اس کا فائدہ بھی بہت جلدی حاصل ہوتا ہے، یہ مصیبت ہے کہ سائنس نے ٹکنالوجی نے ایسا کر دیا ہے کہ دولت ملتی بھی جلدی ہے اور اس کا فائدہ بھی بہت جلدی ظاہر ہوتا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ اخلاق و مذہب، انسانیت، ساری چیزیں اس سے دب گئیں، بس ایک چیز رہ گئی کہ اپنا کام کرو آرام کرو، کہاں کے فلسفوں میں پڑے ہو، خیالی باتوں میں، اور کیسا عذاب و ثواب، کیسا مرنا جینا، اور یہ تو یہی زندگی ہے، کھاؤ کماؤ اور جلدی سے اپنے گھر کو سجاؤ۔

ہماری ذمہ داری

بس میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ آپ کی اور ہماری ذمہ داری ہے کہ کوئی باہر سے آ کر اس ملک کی اصلاح نہیں کرے گا، اور ہم بالکل اس کے لیے دوبارہ تیار نہیں ہیں کہ ہم باہر کے لوگوں کو بلائیں اور دوبارہ ان کے شاگرد بنیں، اور اس سے بڑھ کر کوئی توہین نہیں ہو سکتی، کبھی ہمارے ملک نے دوسرے ملکوں کو دیا ہے، ریاضی دی، فلسفہ دیا ہے، کیسے کیسے لوگ باہر سے آئے ہیں اور یہاں سے سیکھ کر گئے ہیں، اور مسلمانوں کے دور میں بھی ہمارے ہندوستان کے علماء نے مکہ اور مدینہ میں جا کر پڑھایا ہے، اور وہاں دریا بہا دیے ہیں علم کے، اور مان گئے مکہ اور مدینہ والے اور مصر و شام والے کہ ہندوستان جیسے عالم ہمارے یہاں بھی نہیں ہیں، ہم بالکل اس کے تیار نہیں ہیں کہ باہر کے لوگوں کو یہاں دعوت دیں، آپ کو یہاں کرنا ہے اور آپ ہی کو کرنا چاہیے۔

پہلی بات یہ کہ نارمل حالات ہونا چاہیے، ملک میں ہر اچھا کام نارمل حالات میں ہوتا ہے۔

اور دوسری بات یہ کہ پیسے کی محبت، یہ کرپشن اور یہ گراوٹ جو آ گئی ہے اس کو دور کرنے کی

کوشش کیجیے، اس کے خلاف ایک مہم چلائیے، اور اپنے اپنے طور پر ہم ہندوستان میں اتنا بڑا ملک ہے، کیا کرلیں گے، لیکن ہم یہاں سے یہ ارادہ کر کے اٹھیں کہ بس آج سے کوئی غلط کام نہیں کرنا ہے، ہم ناانصافی نہیں کریں گے، ہم کوئی تکلیف نہیں پہنچائیں گے، ہم مدد کریں گے، ہم خدمت کریں گے، بس یہ پیغام ہے ہمارا، اور یہی پیام انسانیت ہے کہ آدمی واقعی آدمی بن جائے، اگر آدمی آدمی بن جائے تو مزہ آجائے زندگی کا۔ (۱)

(۱) پندرہ روزہ "تعمیر حیات"، لکھنؤ (شمارہ ۱۰ و ۲۵ / فروری ۱۹۸۴ء)۔

۱۷

انسانی معاشرہ میں عدل واحسان کی اہمیت (۱)

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ (سورة النحل: ۹۰)

(بے شک اللہ تعالیٰ اعتدال اور احسان کا، اور اہل قرابت کو دینے کا حکم فرماتے ہیں، اور کھلی برائی اور مطلق برائی اور ظلم کرنے سے منع فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ تم کو اس لیے نصیحت فرماتے ہیں کہ تم نصیحت قبول کرو۔)

بھرے بازار اور شاہراہ عام پر کی جانے والی بات کی اہمیت وتاثیر

میرے بھائیو اور دوستو! ہم لوگ اس کے عادی ہیں کہ کسی ہال یا بہت پُرسکون جگہ پر تقریر ہو، جہاں اگر کوئی سوئی بھی گر جائے تو آواز آئے، اور سب لوگ کان لگا کر سن رہے ہوں، لیکن میں بہت خوش ہوں کہ آج عین بازار میں جلسہ ہو رہا ہے، میرا خیال یہ ہے کہ جب تک کوئی بات بازار میں نہ آئے، بازار میں اس کا چرچا نہ ہو، اور بازار والے اس کو قبول نہ کر لیں، اس کا اعتبار نہیں، اس وقت بہت بڑی کمزوری یہ ہے کہ ہم مدرسوں میں، مسجدوں میں، اور ہمارے بہت سے بھائی مندروں میں، پاٹ شالاؤں میں بات کرتے ہیں، لیکن ان کی حیثیت ایسی ہے جیسے سمندر میں کوئی جزیرہ ہو، وہاں آپ جو چاہیے کر لیجیے، سمندر کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہوتا، یا ہوائی جہاز پر آپ اُڑ رہے ہو، وہاں باتیں کر رہے ہوں، اور آپ کے آس پاس کے حضرات دو چار چھ آدمی وہاں سن رہے ہوں، اور آپ خوش ہو رہے ہوں کہ ہم نے اتنی اونچائی سے یہ بات کہی ہے کہ اب یہ بات

(۱) یہ تقریر اُجّین کے اس جلسۂ عام میں کی گئی جس کا انتظام ۲۵ر نومبر ۱۹۸۳ء بروز جمعرات شہر کی ایک عام شاہراہ (سڑک) پر کیا گیا تھا، اور جس میں بڑی تعداد میں شہر کے تعلیم یافتہ اور عام غیر مسلم بھی شریک تھے۔

ضرور دنیا میں چل جائے گی، تو جہاز تو چلے گا، مگر آپ کی بات نہیں چلے گی، اس لیے کہ آپ کی بات اس جہاز کے اندر گونج کر رہ جائے گی۔

اب بھی دنیا سے سچائی ختم نہیں ہوئی، اچھی بات کہنے کا چلن ختم نہیں ہوا، مگر وہ ہوائی جہازوں میں کہی جانے لگی، یا کسی گنبد اور اونچے محل میں کہی جا رہی ہے، اور دنیا میں ہو کچھ رہا ہے، باتیں بڑی اونچی اونچی کہی جاتی ہیں، لیکن اونچی جگہ سے کہی جاتی ہیں، اونچے ہی لوگ کہتے ہیں، اونچے ہی لوگ سنتے ہیں، اونچی جگہ پر کہتے ہیں، مگر ہم آپ جو زمین پر چلنے والے ہیں وہ اس سے متاثر نہیں ہوتے ہیں، اس لیے کہ وہ بات ابھی عام زندگی کی سطح پر نہیں آئی، میں پڑھنے لکھنے والا آدمی ہوں، ایسی جگہ بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہوں جہاں چڑیا پَر نہ مار سکے، مجھے یہاں بازار میں کھلی سڑک پر گھبرانا چاہیے تھا، ڈسٹرب (Disturb) ہونا چاہیے تھا، مگر زندگی نے مجھے کچھ سبق دیا ہے، اس کی بنا پر میں خوش ہوں، اور میں چاہتا ہوں کہ یہ سلسلہ جاری ہو کہ جو باتیں مدرسوں اور مسجدوں کے اندر کہی جاتی تھیں، کبھی ریڈیو پر کہی جاتی ہیں، وہ باتیں بازار میں کہی جائیں۔

ہندوستان کی آزادی کی تحریک جب تک کہ ہال میں رہی، لائبریریز میں رہی، اور اسکالرس کے درمیان رہی، دانشوروں، فلاسفر اور تھنکرز (Thinkers) کے درمیان رہی، ہندوستان ٹس سے مس نہیں ہوا، نہ انگریزی حکومت ٹس سے مس ہوئی، لیکن جب پبلک جلسے ہونے لگے، جب پارکوں میں وہ بات کہی جانے لگی، جب برسر بازار، برسر راہ وہ بات کہی جانے لگی، تو ہندوستان کیا برطانوی حکومت ہل گئی، جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کی قلمرو میں سورج ڈوبتا نہیں ہے، اگر یہاں ڈوبا تو کہیں نکلا ہوا ہوتا ہے، تو سڑکوں اور بازاروں میں جلسے، عوامی جگہوں پر اجتماعات، یہ بہت اچھا سلسلہ ہے۔

معتدل و پرسکون حالات وفضا کی ضرورت

اس وقت دنیا کوہ آتش فشاں کے دہانے پر کھڑی ہے، جہاں پھٹ جانے والا مادہ ہوتا ہے، میں سیدھی سیدھی بات آپ سے کہتا ہوں، ذرا آپ سوچیے، اس وقت آپ لوگ بہت شائت ہو کر، بہت اطمینان سے میری بات سن رہے ہیں، اگر کبھی پانی برسنے لگے تو ایک کا بھی بیٹھنا مشکل ہے، اسی طریقہ سے اگر کوئی جانور آ جائے، بات کیا ہے؟ اچھی بات ہو، مذہب کی بات ہو، اخلاق کی بات ہو، عقل کی بات ہو، سمجھ کی بات ہو، انصاف کی بات ہو، سب نارمل حالت میں کہی جاتی ہے، سنی جاتی ہے، اگر نارمل حالت نہ ہو، اگر غیر معتدل (Abnormal) حالات ہوں، فضا بالکل بگڑی ہوئی ہو،

بجلی چمک رہی ہو، کہ اب گری تب گری، اور بادل گرج رہے ہوں، معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ ٹوٹ جائے گا، اور پانی موسلا دھار برس رہا ہو، تو اگر کوئی دنیا کا بڑے سے بڑا مقرر بھی اسٹیج پر آئے اور کہے کہ میں تمھیں بڑی حکمت کی باتیں سنانے والا ہوں، کوئی سننے کے لیے تیار نہیں ہوگا، یہ انسان کی فطرت ہے، انسان نارمل حالت میں–جب اس کی طبیعت کو سکون ہوتا ہے، کوئی ڈر نہیں ہوتا، کوئی خطرہ نہیں ہوتا، وہ بہت زیادہ بیمار نہیں ہوتا، بہت زیادہ بھوکا نہیں ہوتا– بات غور سے سنتا ہے، اور مانتا بھی ہے، اور کوئی اندر کی پریشانی ہو، یا باہر کی پریشانی ہو، تو پھر چاہے سر کاٹ کر رکھ دیجیے، انسان سنتا نہیں۔

ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے اس ملک ہندوستان ہی میں نہیں، ساری دنیا میں نارمل حالات ہوں تاکہ کام کرنے والوں کو کام کا موقع ملے، پڑھانے والوں کو پڑھانے کا موقع ملے، لٹریری لوگوں کو لٹریچر کی خدمت کا موقع ملے، جو شاعر ہیں انھیں شاعری کا موقع ملے، جو آرٹسٹ ہیں ان کو اپنے آرٹ میں اپنا کمال دکھانے کو موقع ملے، جو دانشور ہیں، اسکالر ہیں، ان کو تحقیق کرنے اور ریسرچ کرنے کا موقع ملے، ریسرچ کے، لٹریچر کے جو بڑے بڑے شاہکار دنیا میں تیار ہوئے، یہ سب نارمل حالات میں ہوئے، کسی شخص کے پیٹ میں درد ہو، اس سے کچھ لکھا جائے گا؟ کچھ بولا جائے گا؟ آپ ہزار منطق اس پر صرف کر دیجیے، اس کو قائل کرنے کی کوشش کیجیے، پیٹ میں درد ہے تو کیا بات ہے، ہوتا ہی ہے، آپ اپنا کام کیجیے، آپ تو شعر سنیے، مگر کیا اس سے سنا جائے گا اور وہ لطف لے سکے گا؟

اس عہد اور معاشرہ کی سب سے بڑی کمی

حضرات! اللہ نے اس ملک کو سب کچھ دیا ہے، مگر پھر کس چیز کی کمی ہے، وقت پر کام نہیں ہوتا، اور کسی کی مانگ پوری نہیں ہوتی، ذرا سا کام آپ کا ہو، آپ کو سفر کرنا ہو، بغیر رشوت دیے ہوئے کوئی کام ہی اس زمانہ میں نہیں ہو رہا ہے، خدا نے زندگی میں کوئی کمی نہیں رکھی، اس کو ہر طرح سے مکمل کر کے اس نے دیا، اس دنیا کو ایسا بنا دیا کہ اگر آدمی چاہے تو اس کو زندگی کا حقیقی مزہ آنے لگے، جنت کا مزہ چاہے آئے نہ آئے، جینے کا مزہ ضرور آجائے، پریم ہو، محبت ہو، وقت پر کام ہو، پاؤں پھیلا کر، آنکھ بند کر کے خوب میٹھی نیند سوئیے، نہ چور کا کھٹکا، نہ ڈاکو کا دھڑکا، نہ کسی لٹیرے کا غم، کسی چیز کی کوئی فکر نہ ہو، سونا اچھالتے ہوئے چلے جائیے، کوئی پوچھنے والا نہ ہو، کوئی دیکھنے والا نہ ہو، یہ سب کچھ ہے، پھر آپ سوچیے کہ کس چیز کی کمی ہے، سائنس نے کتنی ترقی کی ٹکنالوجی نے کتنی ترقی کی کہ دنیا میں اب سردی، گرمی کو کنٹرول کر لیا گیا ہے، بیماریوں پر کنٹرول کر لیا گیا ہے،

فاصلے ختم کر دیے گئے ہیں، اور اب اسپیس (Space) کوئی چیز نہیں ہے، یہ سب کچھ ہوا لیکن نتیجہ کچھ نہیں، مقصد حاصل نہیں ہو رہا ہے۔

بات کیا ہے؟ چیزیں بنیں، مشینیں بنیں، مگر آدمی نہیں بنا، ان مشینوں سے کام لینے والا آدمی تھا، وہ نہیں بنا، اور آپ جانتے ہیں کہ جب آدمی تھا، اور مشینیں نہیں تھیں تو دنیا کیسی سکھی تھی، راجا بکر ماجیت کا زمانہ یاد کیجیے، جس کو آج تک لوگ یاد کرتے ہیں، اور آپ کے شہر کا بہت بڑا نام ہے کہ بکرمی جنتری آپ کے شہر سے شروع ہوئی، راجہ بکر ماجیت کے زمانہ میں میں آپ سے پوچھتا ہوں یہ مشینیں تھیں؟ یہ مائک تھا جس سے دور تک آواز پہنچائی جاسکے؟ یہ ریڈیو تھا؟ ٹی وی تو خیر ابھی آیا ہے، لیکن ریڈیو بھی تھا؟ مگر کیا تھا؟ کان تھے، دل تھا، اور کان تھے تو مائک ہو نہ ہو، لاؤڈ اسپیکر ہو نہ ہو، ریڈیو ہو نہ ہو، Electricity ہو نہ ہو، پھر بھی آدمی دور کی بات بھی سن لیتا تھا، اور مان لیتا تھا اپنے فائدے کی بات، دوسروں کے فائدے کی بات، اب مصیبت یہ آگئی ہے کہ مشینیں موجود، اچھی سے اچھی بات دور سے دور جگہ تک آپ پہنچا سکتے ہیں، مگر آدمی سننے کے موڈ میں نہیں، اس کا سننے کو جی ہی نہیں چاہتا، وہ تو بس پیسہ کے پیچھے، آرام کے پیچھے، عیش کے پیچھے، مالدار بن جانے کے پیچھے، عزت دار بن جانے کے پیچھے اور کرسی کے پیچھے ایسا دیوانہ ہو کر پڑا ہے کہ اس کو کچھ ہوش نہیں ہے، اب کیا فائدہ ان چیزوں کا؟ بلکہ یہ چیزیں اور زیادہ نقصان پہنچاتی ہیں، آدمی جس کی نیت خراب ہے، اُن سے برا کام لے سکتا ہے۔

بھائیو! ہم یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ اچھے کام ہیں، یہ کام جب ہوسکیں گے اور ان کا تحفظ (Protection)، ان کی گارنٹی اس وقت ہے جب عام فضا (Atmosphere) درست ہو، جب کہ ہمارے آپ کے بازاروں کی زندگی اچھی ہو، بازار میں جو لوگ آتے ہیں، دکانوں پر بیٹھتے ہیں، سودا خریدنے آتے ہیں، گھر لے جاتے ہیں، یہ جب اچھے آدمی ہوں گے، بھلے آدمی ہوں گے، خدا سے ڈرنے والے اور انسان سے محبت کرنے والے ہوں گے، تو پھر اس کے بعد ہر اچھا کام ہو سکے گا، ہندوستان میں سیکڑوں یونیورسٹیاں ہیں، لیکن روز جھگڑا ہے، لڑکے پڑھنا نہیں چاہتے، ٹیچر پڑھانا نہیں چاہتے، وہ ڈگری چاہتے ہیں، یہ تنخواہ چاہتے ہیں، ان یونیورسٹی والوں سے پوچھیے، وہ فریاد کرتے ہیں، صاحب کہاں کا پڑھنا، کہاں کا پڑھانا؟ نہ ہمیں پڑھانے کا شوق ہے، نہ انھیں پڑھنے کا شوق، اور ہمیں پڑھانے کا شوق ہو بھی تو ان کو پڑھنے کا شوق نہیں، وہ تو ڈگری لینے کے لیے آتے ہیں، وہ تو کہتے ہیں کہ ہماری حاضری لکھ لیجیے، بلکہ یہ مطالبہ ہونے لگا ہے کہ بغیر

امتحان کے ڈگری دے دی جائے، بی.اے. ہوگیا، ایم.اے. ہوگیا، ایل.ایل. بی. ہوگیا، کہتے ہیں کہ امتحان کو ختم ہی کرادو۔

خودغرضوں اور دولت پرستوں کی سنگ دلی اور انسانیت کی پامالی

بھائیو! سامان ہونے سے کچھ نہیں ہوتا، اصل میں مَن ہے، اصل میں آدمی کی روح ہے، وہ اگر صحیح ہوجائے گا، Conscience اس کا صحیح ہوجائے، اور وہ چیزوں کا صحیح طور پر استعمال کرنا سیکھ جائے، تو تھوڑا سامان بھی بہت ہے، بلکہ سامان کچھ بھی نہ ہو تب بھی کام چلالے گا، خدا کے پیغمبروں نے بہت تھوڑے سامان کے ساتھ بہت بڑا کام کیا، آج اتنے بڑے سامان کے ساتھ کچھ کام نہیں ہورہا ہے، بات کیا ہے؟ ہمارے اوپر ان چیزوں کی حکمرانی ہے، وہ چیزیں Dominate کررہی ہیں، ہم پر حکومت چلاتی ہیں، جو انسان کے لیے پیدا کی گئی ہیں، اور انسان کی ضرورت پوری کرنے کے لیے پیدا کی گئی ہیں، انسان اُن کا غلام بن گیا ہے، اب انسان اُن کے پیچھے آنکھ بند کرکے ایسا پڑا ہے کہ آدمی اپنے جیسے انسانوں کو روندتا ہوا، ان کی لاشوں پر چلتا ہوا وہاں پہنچنا چاہتا ہے، آج یہ حالت ہوگئی ہے کہ بہت سے آدمی ایسے ملیں گے کہ جنھیں معلوم ہوجائے کہ پیسہ اس کے بغیر نہیں ملے گا، ترقی اس کے بغیر نہیں ملے گی کہ آدمیوں پر پاؤں رکھتا ہوا چلا جائے، کسی کے پیٹ پر اور کسی کے سینہ پر اور کسی کے منھ پر، تو بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جو اس کی پرواہ نہیں کریں گے، آدمیوں کو روندتے ہوئے نکلیں گے، اور آدمیت تو روندی جا ہی رہی ہے، آدمی کو روندیں نہ روندیں، لیکن آدمیت کو تو روز روندا جارہا ہے، پاؤں سے اس کو کچلا جارہا ہے، اس کو ذلیل کیا جارہا ہے۔

آدمیت پیدا کیجیے

ہمارا پیام یہ ہے کہ آدمیت پیدا کیجیے، اور فضا درست رکھیے تاکہ سب اچھے کام ہوسکیں، ورنہ بھائی کسی کام کی خیریت نہیں ہے، اگر فضا اچھی نہ ہوئی اور یہی بجلیاں چمکتی اور کوندتی رہیں، بادل گرجتے رہے، پانی برستا رہا، فرض کیجیے، کوئی کتا ہی بیچ میں آگیا اور کسی نے پکار کر کے کہہ دیا کہ بھیڑیا، بھیڑیا، پھر کوئی نہیں سنے گا، نارمل فضا رکھو تاکہ ہر اچھا کام ہوسکے، نہیں تو نہ علماء وعظ کہہ سکیں گے، نہ کوئی بھلا آدمی پیغام دے سکے گا، کوئی کسی کی سنے گا ہی نہیں، جب زلزلہ آتا ہے (اللہ بچائے) تو پھر کسی کو کسی کا ہوش نہیں رہتا، آگ لگتی ہے تو ماں باپ بچوں تک کو بھول جاتے ہیں،

جنگ عظیم (Great War) میں یہ حالت تھی کہ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا، تو بس ہم یہ کہتے ہیں کہ امن وامان رہے، آدمی آدمی کی قدر کرے، آدمی آدمی سے محبت کرنا سیکھے۔

آپ کے یہاں کالی داس ہوئے ہیں، جو بہت بڑے شاعر تھے، آج تک ان کا کلام زندہ ہے، ان کا زمانہ امن کا زمانہ تھا، شانتی (Peace) کا زمانہ تھا، نارمل حالات تھے، جب جاکر انھوں نے ایسی زندہ جاوید چیز تیار کی جو آج تک پڑھی جاتی ہے، ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں نارمل حالات رہیں تاکہ اخلاق کے سکھانے والوں کو اخلاق سکھانے کا موقع ملے، علم سکھانے والوں کو علم سکھانے کا موقع ملے، انسانیت سکھانے والوں کو انسانیت سکھانے کا موقع ملے۔

عدل واحسان کی برکت

ابھی قرآن شریف کی آیت پڑھی گئی: ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيْتَاءِ ذِي الْقُرْبَى﴾ اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ انصاف (Justice) کے اصول کو اپنایئے اور احسان کو اپنا شعار بنایئے۔

انصاف تو یہ ہے کہ جتنا دینا ہے دے دو، اور احسان یہ ہے کہ اس سے کچھ زیادہ دے دو، انصاف یہ کہ جتنا کرنا ہے کرلو، اور احسان یہ کہ اس سے بھی زیادہ کرلو، اگر تمہارے ساتھ کسی نے ناانصافی کی اور تم انصاف کرو، یہ احسان ہوگا، یہ اعلیٰ اخلاق کی تعلیم ہے، سب مذہبوں نے تعلیم دی، اور اسلام نے تو ایسی دی کہ ایک نئی دنیا بنا کر رکھ دی، اس زمانہ کا جو سماج تھا، اس کے حالات آپ پڑھیں، کوئی حد ہے، ایک آدمی نے پاس والے گھر کو کوئی چیز جو اُس کے یہاں پکی تھی بھیجی تحفہ میں، تھوڑی دیر کے بعد اسی کے گھر میں واپس آگئی، کیسے واپس آئی؟ ہم نے تو اسے گھر سے نکال دیا تھا، اس نے اس گھر کو بھیجی تھی، اس گھر والے نے اس گھر کو بھیجی، اس گھر والے نے اس گھر کو بھیجی، اور چکر کھا کر پھر اسی کے یہاں آگئی، اپنا ہی تحفہ واپس اپنے پاس آگیا، اور اس سے بڑھ کر کے یہ کہ ایک زخمی جان دے رہا ہے، بالکل جان کنی کی حالت ہے، اور پانی پیش کیا جاتا ہے تو کہتا ہے: نہیں، میرے پاس ایک دوسرا زخمی پڑا ہوا ہے، میں نے اس کی کراہ ابھی سنی ہے اس کو دیجیے، اس کو دیا تو اس نے کہا: تیسرے کو دیجیے، تیسرے، چوتھے، اخیر میں وہ جب اس کے پاس آیا تو وہ مرچکا تھا، وہ بھی مرچکے تھے، وہ سب تو مرچکے تھے، لیکن اخلاق کو زندہ کر گئے، اور زندگی کی تعلیم دے گئے کہ اللہ کے بندے، شیر مرد اس طرح کرتے ہیں کہ جان دے دیں لیکن اپنے اوپر دوسرے کو ترجیح دیں۔

خودغرضی ساری خرابیوں کی جڑ ہے

آج دنیا کی ساری خرابی یہ ہے کہ آدمی اپنا کام نکال لینا چاہتا ہے (معاف کیجیے ہماری یوپی کی زبان میں ''اپنا الو سیدھا کر لینا'' چاہتا ہے) چاہے کسی کی جان جائے، چاہے کسی کے بچے مر جائیں، بس اپنا اُلو سیدھا ہو، سارا فساد اس وقت اسی وجہ سے ہے، ریلوں میں کیا ہو رہا ہے؟ ڈاکے پڑ رہے ہیں، محکموں میں کام نہیں ہو رہا ہے، آدمی کو اپنا حق نہیں مل رہا ہے، کوئی کام وقت پر نہیں ہو رہا ہے، ڈاک خانے چوپٹ، اور ٹیلی فون کو تو پوچھیے نہیں، وہ تو بالکل ستیاناس، اور ریلوں کی بُری گت ہے، نہ وقت کی پابندی نہ کسی کے اندر ڈیوٹی کا احساس، نہ ذمہ داری کا شعور، اب کیسے یہ کارخانہ چلے؟

کیا انسان ہی مارنے کے لیے رہ گیا ہے؟

آج انسان آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے، آدمیوں کو مارنے والوں سے پوچھتا ہوں، ذرا بتاؤ تم نے اپنی زندگی میں کتنے بچھو مارے ہیں، ذرا لکھ کر مجھے دو، ایک بچھو نہیں مارا ہوگا، ایک سانپ نہیں مارا ہوگا، ایک بھیڑیے کا شکار نہیں کیا ہوگا، تو کیا آدمی ہی رہ گیا مارنے کے لیے؟ خدا کے غضب سے نہیں ڈرتے ہو؟ کیا آدمی بچھو سے بھی گیا گزرا، سانپ سے بھی گیا گزرا ہے؟ کتنے چوہے مارے؟ یہی بتا دیجیے، چوہے بڑا نقصان کرتے ہیں، آپ نے کتنے چوہے مارے؟ یہ جو بڑے تیس مار خان بنے ہوئے ہیں، رستم بنے ہوئے ہیں، اور جن کے ہاتھ انسانوں کے خون سے سرخ ہو رہے ہیں، انھوں نے کتنے موذی جانور مارے ہیں؟ ایک نہیں مارا ہوگا، آدمی مارنے کے لیے شیر ہیں اور شیر مارنے کے لیے بلی، شرم آنی چاہیے، کسی کے باغ میں جا کر کے ایک پھول کو مسلو، معلوم ہو جائے گا کہ تمہارا کیا حشر ہوتا ہے؟

باغ کے مالک ایک پھول خراب کرنے اور ایک گلاب کا پودا نکالنے کے روادار نہیں، تو کیا اللہ میاں اپنے اس چمنستان میں یہ پسند کرے گا کہ وہ بنائے اور تم بگاڑو، کمہار ہی کے یہاں جا کر کبھی دیکھ لو، دو چار گھڑے توڑو، دیکھو کیسے آتے ہو، سر بھی تمھارا سلامت رہتا ہے کہ نہیں، دو ٹکے کا کمہار، تمھیں بغیر مارے نہیں چھوڑے گا، کمہار کے گھڑے نہیں توڑ سکتے ہو، اللہ میاں کے بنائے ہوئے یہ پھول، اللہ کے بنائے ہوئے یہ گلدستے، اللہ میاں کے بنائے ہوئے یہ شیش محل، اللہ میاں کے بنائے ہوئے یہ تاج محل، جس پر ہزار تاج محل قربان ہوں، تاج محل یہ کس کا بنایا ہوا ہے؟ انسان کا، انسان کس کا بنایا ہوا ہے؟ خدا کا، پھر اس تاج محل کی کیا حقیقت ہے انسان کے سامنے؟ اللہ

میاں تاج محل بنائیں، تم توڑو، ذرا آگرہ کے تاج محل پر تم ہاتھ اٹھا کر دیکھو، گردن تمھاری ناپی جاتی ہے کہ نہیں؟ اپنے یہاں کے جو آثار قدیمہ ہیں، جو خود گر رہے ہیں، ان پر کہیں ہاتھ اٹھا کے دیکھو، پس اللہ میاں کی بنائی ہوئی چیزیں ہی ایسی سستی ہیں کہ ان کی کوئی قیمت ہی نہیں، جب چاہو ان کو توڑ کر کے رکھ دو، صاف سن لو، فسادات کر کے، آدمیوں کو مار کر کے، رشوت لے کر، کام چوری کر کے ملک رہے گا نہیں، چاہے اس کی پشت پر امریکہ ہو، چاہے روس ہو، سن لو، صاف بات، اپنا گھر اگر تم بگاڑو گے کوئی دوسرا اسنبھال نہیں سکتا، اپنا گھر اپنے ہی ہاتھ سے بنتا ہے، اپنے گھر کو سنبھالو۔

راجا بکرماجیت کا نام کیوں زندہ ہے؟

ہندوستان میں معلوم نہیں کتنے راجا آئے اور چلے گئے، مگر بکرماجیت کا نام زندہ ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ان میں انصاف تھا، اس زمانہ کے مطابق ان کو رہنمائی ملی، اس کے مطابق انھوں نے انصاف کیا، ہم نے تاریخ میں پڑھا ہے کہ وہ منصف تھے، اور بہت اچھے راجا تھے، جب ہی ان کا نام ابھی تک زندہ ہے، ان کے اسی شہر میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ یہاں کی فضا کو درست رکھیے، تا کہ اچھے لوگ اپنا کام کر سکیں، لکھ پڑھ سکیں، پیام دے سکیں، لکھا سکیں، پڑھا سکیں، اور ملک کی خدمت کر سکیں، اور مالک کی عبادت کر سکیں، جب کہیں فساد ہوتا ہے تو مسجدوں میں اذان بھی نہیں ہو سکتی، نماز بھی نہیں ہو سکتی، لوگ جاتے ہوئے ڈرتے ہیں، گھر سے نکلتے نہیں۔ (۱)

(۱) ماخوذ از ''تحفۂ دین ودانش''، مؤلفہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، شائع کردہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، طبع اول ۷؍۱۴۰۷ھ؍۱۹۸۷ء، (صفحہ ۹ تا ۲۰)۔

۱۸

مسلمانوں کے مسائل وجذبات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے![1]

ڈائلاگ کی ضرورت وافادیت

دوستو، بھائیو اور بزرگو! میں آپ سب کی تشریف آوری اور تکلیف فرمائی کا اپنی طرف سے اور اپنے سب بلانے والے ساتھیوں کی طرف سے خلوص دل سے خیر مقدم کرتا ہوں، ہمارے دور اور ہمارے ملک میں سیاسی کانفرنسوں، پارٹیوں کے اجلاس، علمی سیمیناروں اور ادبی نشستوں کی کمی نہیں، شاید کوئی دن خالی جاتا ہو کہ کوئی ایسی نشست نہ ہوتی ہو، پریس کانفرنسوں کی بھی کمی نہیں، مگر وہ خاص اغراض کے ماتحت کی جاتی ہیں، اور ان میں بے تکلف تبادلۂ خیال کی نوبت کم آتی ہے، ضرورت ہے کہ رسوم و تکلفات سے آزاد ہو کر جس طرح ایک خاندان یا ایک محلّہ کے لوگ کسی جگہ اکٹھے ہو کر بے تکلف بات چیت کرتے ہیں، دوستانہ وعزیزانہ گلہ شکایت ہوتی ہے، غلط فہمیاں رفع کی جاتی ہیں، اپنے خاندان یا محلّہ کے فلاح و بہبود کے لیے مشورے ہوتے ہیں، بچھڑے ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں، اس طرح ہم کبھی کبھی کسی مرکزی مقام پر جمع ہو کر دوستانہ و بے تکلفانہ گفتگو وتبادلۂ خیال کریں، اسی خیال و تجربہ کے ماتحت Dialogue زیادہ مفید سمجھا گیا ہے، اور اس کے بہتر نتائج نکلے ہیں، اسی خیال کے ماتحت آپ حضرات کو آج تکلیف دی گئی ہے۔

مختلف قوموں کی ایک دوسرے سے لاعلمی یا ناقص واقفیت اور اس کے اثرات ونقصانات

حضرات! ہندوستان میں تقریباً ایک ہزار برس سے ہندو مسلمان اکٹھے رہتے ہیں، شہروں،

(۱) دہلی میں ۴؍مئی ۱۹۸۵ء کو دانشوروں اور صحافیوں کے ایک چیدہ مجمع میں ایک اہم گفتگو اور تبادلۂ خیال۔

قصبات، دیہاتوں اور محلوں میں ان کی ملی جلی آبادی اور مشترک سکونت ہے، بازاروں، منڈیوں، تعلیمی مرکزوں، کچہریوں، دفتروں اور اب سو برس سے زیادہ عرصہ ہو رہا ہے کہ سیاسی تحریکات، سماجی کاموں، اسٹیشن اور ڈاک خانوں، ریلوں اور بسوں میں ان کو ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور ایک دوسرے کو جاننے پہچاننے کے مواقع آسانی سے میسر ہیں۔

لیکن یہ دنیا کا حیرت انگیز واقعہ اور ایک طرح کی پہیلی ہے جس کا بوجھنا آسان نہیں کہ عام طور پر ایک کو دوسرے کے مذہبی عقائد، تہذیب و معاشرت، طور طریق اور قومی خصوصیات سے قریب قریب اتنی بیگانگی اور اجنبیت ہے جیسی پرانے زمانے میں اکثر دو ملکوں کے باشندوں کے درمیان ہوا کرتی تھی، ہر ایک کی معلومات دوسرے کے متعلق ناقص، سطحی، سرسری اور زیادہ تر سنی سنائی باتوں اور قیاسات و تخیلات پر مبنی ہیں۔ ہر فرقہ دوسرے فرقہ کے بارے میں بہت سی شدید غلط فہمیوں میں مبتلا، اور بعض اوقات منافرت انگیز لٹریچر، سیاسی پروپیگنڈے، زہر آلود اور رنگ آمیز تاریخ، نصاب کی کتابوں اور بے تحقیق داستانوں اور کہانیوں کی بنا پر اپنے ذہن و دماغ میں اس کی ایک غلط اور مکروہ تصویر قائم کیے ہوئے ہے۔ ایک فرقہ کے کٹر اور متعصب نہیں، نیک دل اور سادہ طبیعت افراد سے اگر دوسرے فرقہ کے بنیادی عقائد، مراسم اور معاشرت کے اصولوں کے متعلق دریافت کیا جائے تو وہ یا تو لاعلمی کا اظہار کریں گے یا ایسے جوابات دیں گے جن سے ایک واقف آدمی کو بے اختیار ہنسی آجائے گی، راقم سطور کو - جو بکثرت سفر کرتا ہے اور ریلوں اور بسوں میں ہر طبقہ اور ہر سطح کے لوگوں سے اس کا بکثرت ملنا جلنا ہوتا ہے - بارہا اس کا تجربہ ہوا۔

لیکن یہ ہنسی کی بات نہیں، رونے کا مقام ہے کہ سیکڑوں برس سے ساتھ رہنے کے باوجود ہم ایک دوسرے سے اتنے ناواقف ہیں، اس کی ذمہ داری تنہا ایک فرقہ پر نہیں، سب پر ہے، اور خاص طور پر مذہبی، سماجی کام کرنے والوں، اپنے ملک سے سچی محبت رکھنے والوں اور انسانیت دوستوں پر ہے کہ انھوں نے ایک کو دوسرے سے صحیح طور پر واقف کرانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی، یا کی تو ناکافی۔

مہذب دنیا میں اب یہ اصول تسلیم کر لیا گیا ہے کہ محبت، احترام و اعتماد اور امن و سکون کے ساتھ رہنے اور نیک مقاصد کے لیے ایک دوسرے سے تعاون اور اشتراک عمل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنا ضروری ہے، آبادی کے ہر عنصر اور ملک کے ہر فرقہ اور ہر گروہ کو معلوم ہونا چاہیے کہ دوسرا عنصر، دوسرا فرقہ اور گروہ کن اصولوں پر عقیدہ رکھتا ہے، جن ضابطوں

کا اپنے کو پابند اور ان کو اپنے لیے ضروری سمجھتا ہے، اس کی تہذیب و معاشرت کا خاص رنگ کیا ہے؟ اس کو زندگی کی کون سی قدریں عزیز ہیں؟ اس کو قلبی سکون اور پُر از اعتماد زندگی گزارنے کے لیے کیا چیزیں درکار ہیں؟ کون سے عقائد و مقاصد اس کو جان سے زیادہ عزیز اور اولاد سے زیادہ پیارے ہیں؟ ہمیں اس سے گفتگو کرنے میں، اس کے ساتھ خوشی اور مسرت کے ساتھ وقت گزارنے میں کن جذبات و احساسات کا لحاظ رکھنا چاہیے؟ بقائے باہم (Co-existence) کے لیے (جو شائستہ اور پرسکون زندگی کا مانا ہوا اصول ہے) شرط اولین ہے کہ ضروری حد تک واقفیت حاصل ہو۔

ایک ایسے ملک کے لیے یہ اصول اور بھی ضروری قرار پاتا ہے جس کو اپنی رنگا رنگ تہذیب پر ناز اور "جیو اور جینے دو" کے زریں اصول پر اس کا پرانا عقیدہ ہے، اس وقت ساری دنیا میں دور دراز ملکوں کے مذاہب اور فلسفوں، تہذیبوں اور معاشرتوں، زبانوں اور کلچروں، لہجوں اور محاوروں، یہاں تک کہ عادات و اخلاق، شوق اور لت (Hobby)، کھیلوں اور تفریحات، کھانوں اور لباسوں کی باریکیوں سے واقف ہونے کا عام رجحان پایا جاتا ہے، اس کے لیے یونیورسٹیوں میں مستقل مضامین داخل اور مستقل شعبے قائم ہیں، ایک ملک سے دوسرے ملک میں وفود جاتے ہیں، پروفیسروں اور طالب علموں کی ٹیمیں روز آتی جاتی ہیں، یہ بڑے غضب کی بات ہے کہ ایک ہی ملک کے باشندے سیکڑوں برس سے ساتھ رہنے سہنے کے باوجود ایک دوسرے سے اتنے بھی آشنا اور شناسا نہ ہوں جتنے ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک کے لوگوں سے ہوتے ہیں۔

اس صورت حال کا نقصان ہندوؤں مسلمانوں کو یکساں اور نتیجہ کے طور پر ہندوستان کو، بلکہ بالآخر انسانیت کو پہنچ رہا ہے، ملک کے فرقوں کے درمیان بڑی بڑی خلیجیں قائم ہیں، دلوں میں تلخیاں اور دماغوں میں شکوک ہیں، محبت والفت کے ساتھ رہنے، ہنسنے بولنے، زندگی کا لطف اٹھانے اور ایک دوسرے پر اعتماد اور ایک دوسرے کی تہذیب اور مسلک کے احترام کی دولت سے (جو زندگی کا حسن و رونق اور خدا کی ایک بے بہا نعمت ہے) مجموعی طور پر یہ ملک محروم ہے، اور اس کا نتیجہ ہے کہ بعض فرقوں اور (اس کے کہنے میں کوئی خوف اور حرج نہیں کہ) خاص طور پر مسلمانوں کی بہترین صلاحیتیں اور توانائی اپنی صفائی اور مدافعت اور اپنے مذہب، تہذیب اور زبان کی حفاظت میں صرف ہو رہی ہے، اور ان کی وہ توانائیاں جو ان کو قدرتی طور پر ورثہ میں ملی ہیں، اور جنھوں نے ماضی میں، زندگی کے مختلف شعبوں میں، اور فلسفہ و تصوف سے لے کر فن تعمیر اور فنون لطیفہ تک، اور مملکت کے نظم و نسق سے لے کر خدمت خلق کے میدانوں تک اپنے روشن اور لافانی نقوش چھوڑے ہیں، ابھی اس ملک

کی تعمیر و ترقی میں اور اس کے استحکام و آراستگی میں اس طرح صرف نہیں ہو رہی ہیں جیسی ہونی چاہئیں، نفسیاتی طور پر اس کے لیے یہ اطمینان ضروری ہے کہ وہ صحیح طور پر سمجھے جاتے ہیں، ان کو خیالی اور بیجا حد تک نہیں، واقعی اور ضروری حد تک اعتماد اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، ان کے اور دوسرے فرقوں کے درمیان دبیز پردے پڑے ہوئے نہیں ہیں، ان کو شک و حقارت اور بے گانگی و اجنبیت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے، ایک ایسی نسل اور فرقہ کی طرح جو ایک ہزار برس سے ہمارے ساتھ دیوار بہ دیوار اور دوش بدوش رہ رہا ہے، ہم اس کے چہرہ کے خط و خال سے واقف، اس کی خوبیوں اور کمزوریوں سے آگاہ اور اس کے ماضی و حال سے آشنا ہیں، ہمیں اس کے مذہبی عقائد کا بھی اتنا علم ہے جتنا ان لوگوں کو ہو سکتا ہے جو ساتھ دینے پر نہیں لیکن ساتھ رہنے پر مجبور ہیں، ان کے رسم و رواج، ان کی تہذیب و معاشرت، ان کے تقریبات و تہواروں، اور ان کی خوشی و غمی سے ہماری واقفیت ایک یورپین سے زیادہ اور ایک ہم وطن اور ہم سفر کے شایان شان ہے۔

مسلمانوں کی بنیادی خصوصیتیں

اب میں آپ کی اجازت سے مسلمانوں کی چند بنیادی خصوصیات کا تذکرہ کروں گا، جن کا جاننا اور اس کا لحاظ رکھنا ان کے ہر مسئلہ کے سمجھنے اور اس کے حل کرنے کے سلسلے میں ضروری ہے۔

مسلمانوں کی پہلی بنیادی خصوصیت: معین عقیدہ، اور مستقل دین و شریعت

دنیا کے تمام مسلمانوں (اور ہندوستان کے مسلمان بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں) کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ملی وجود کی بنیاد ایک معین عقیدہ اور ایک مستقل دین و شریعت پر ہے جس کو اختصاراً مذہب (۱) کہتے ہیں، (اگرچہ اس سے اس کا صحیح مفہوم ادا نہیں ہوتا، اور وہ لفظی

(۱) دنیا کے بہت سے مذاہب بالخصوص مسیحی دنیا میں - جو خاص تجربوں اور بحرانوں (Crises) سے گزری ہے، اور جہاں ریاست (State) زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے، اور جس کا شروع سے یہ مقولہ رہا ہے کہ "جو کچھ خدا کا ہے وہ خدا کو دو، اور جو کچھ قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو" - مذہب کا ایک بہت محدود مفہوم اور دائرۂ اثر رہ گیا ہے، اور وہاں عام طور پر یہ حقیقت تسلیم کر لی گئی ہے کہ مذہب انسان کا پرائیویٹ مسئلہ ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی بہت جگہ مذہب یا دھرم صرف عبادات اور چند مذہبی رسوم (Rituals) کی تکمیل کا نام رہ گیا ہے، اسلام میں دین کا مفہوم اس سے زیادہ وسیع اور حاوی ہے، وہ عقائد و عبادات سے لے کر تمدن و معاشرت اور عائلی زندگی کے قوانین پر محیط ہے، اسی لیے وہ زیادہ مؤثر اور متاثر ہونے والا عنصر ہے، عربی اور قرآنی اصطلاح میں اس کو دین کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس کا دائرہ "مذہب" سے زیادہ وسیع ہے۔ (ح)

اشتراک کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیاں اور التباس پیدا کر دیتا ہے) اسی لیے ان کا ملی نام اور عالمگیر لقب کسی نسل، خاندان، دینی پیشوا، بانی مذہب اور ملک کے بجائے ایک ایسے لفظ سے مشتق ہے جو ایک معین عقیدہ اور رویہ کو ظاہر کرتا ہے، دنیا کی عام مذہبی قومیں اپنے اپنے دینی پیشواؤں، بانیانِ مذہب، پیغمبروں، ملکوں یا نسلوں کی طرف منسوب ہیں، اور ان کے نام انھیں شخصیتوں یا انھیں نسلوں اور ملکوں کے نام سے مشتق ہیں، جیسے یہودی یہود (Judaist) اور بنی اسرائیل (Bani Israel) کہلاتے ہیں، یہودا (Judah) حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں میں سے ایک بیٹے کا نام اور اسرائیل خود حضرت یعقوبؑ کا نام ہے، عیسائی (Christians) حضرت عیسیٰ (Christ) کی طرف منسوب ہیں، یا ان کو نصاریٰ (Nazarenes) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، جس کی نسبت شہر ناصرہ (فلسطین) (Nazareth) کی طرف ہے، جہاں حضرت عیسیٰ کی زندگی کا بیشتر حصہ گزرا تھا، مجوسیوں کے مذہب کے پیرووں کا - جن کو عام طور پر ہندوستان میں پارسی کے نام سے یاد کرتے ہیں - صحیح نام (Zoroastrian) یا زرتشی ہے، جن کی نسبت اس مذہب کے بانی (Zarathustra) سے ہے، بودھ مذہب اور بدھ مت (Buddhism) اور اس کے ماننے والے اپنے بانی گوتم بدھ (Buddha) کی طرف منسوب ہیں، یہی حال ہندوستان کے بیشتر مذاہب کا ہے۔

لیکن مسلمانوں کی نسبت - جن کو قرآن شریف اور تمام مذہبی کتابوں، اور تاریخوں اور ادبیات میں "مسلمون" اور "امت مسلمہ" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے، اور اب بھی دنیا کے ہر گوشہ میں وہ "مسلم" کے لقب سے جانے پہچانے جاتے ہیں - لفظ اسلام کی طرف ہے، جس کے معنی خدا کی بادشاہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا، سپر ڈال دینا اور اپنے آپ کو حوالہ (Surrender) کر دینا ہے، جو ایک مستقل فیصلہ، ایک معین رویہ، طرز حیات اور مسلک زندگی ہے، وہ باوجود اپنے پیغمبر سے شدید تعلق کے بحیثیت قوم کے محمدی نہیں کہلاتے، ہندوستان میں پہلی مرتبہ انگریزوں نے ان کو Mohammedans اور ان کے قانون کو Mohammedan Law کے نام سے موسوم کیا، لیکن ان لوگوں نے جو اسلام کی روح سے واقف تھے، اس پر اعتراض کیا، اور اپنے لیے اسی قدیم لقب "مسلم" کو ترجیح دی، اور ان اداروں کو جن کا نام انگریزوں کے ابتدائی دور حکومت میں Mohammedan College یا محمڈن کانفرنس پڑ گیا تھا، مسلم سے تبدیل

کردیا۔(۱)

اسی بناپر ''عقیدہ'' اور ''دین وشریعت'' مسلمانوں کے پورے نظام زندگی اوران کی تہذیب ومعاشرت میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں، اوروہ قدرتی طور پران کے معاملہ میں غیرمعمولی طریقہ پر ذکی الحس (Sensitive) واقع ہوئے ہیں، ان کے انفرادی اور قومی مسائل پر غور کرنے، نیز قانون سازی، دستوراور آئین، حتی کہ معاشرتی اور اخلاقی امور میں اس بنیادی حقیقت کوپیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

دینی تسلسل اوراپنی اولادونسل کی دینی تعلیم کی اہمیت کی وجہ

اس متعین عقیدہ اور دین وشریعت سے وابستگی اور اس کو اپنی اخروی نجات اور دنیوی سعادت کا ذریعہ سمجھنے کا قدرتی اور فطری نتیجہ ہے کہ وہ اس کو اپنی اولاداور آئندہ نسلوں تک منتقل کرنا اوراس اعتقادی ودینی تسلسل کو برقرار رکھنا ضروری سمجھتے ہیں، اوراس بارے میں (وہ جس تاریخی دَور یاجغرافیائی مقام میں ہوں) وہ کسی طرح کی رکاوٹ یامداخلت پسند نہیں کرتے کہ یہ نہ صرف اس عقیدہ اوردین کی تعلیم کا تقاضا ہے، قرآن مجید میں کہا گیا ہے: ﴿يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قُوْآ أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ (سورة التحريم:٦) (اپنی جانوں اورافرادخاندان کودوزخ کی آگ سے بچاؤ) اورحدیث میں ہے کہ ''تم میں سے ہرایک اپنے زیردستوں اورزیرتربیت و زیراثر لوگوں کا ذمہ دارہے''،(۲) بلکہ یہ اولاداوراپنے وارثوں سے سچی محبت کا بھی تقاضا ہے، اور ہرقوم کا فطری حق ہے کہ آدمی جواپنے لیے پسند کرتا ہے، وہ اپنی عزیزاولادوافرادخاندان کے لیے بھی پسند کرے۔

اس بناپر مسلمان جس ملک، جس ماحول میں رہیں، وہ اپنی آئندہ نسل تک اپنے عقائد و خصائص منتقل کرسکنے اوربقدرضرورت اس کا انتظام وتحفظ کرسکنے کی آزادی کوضروری سمجھتے ہیں، اور

---

(۱) مثلاً سرسید احمد خاں مرحوم کے قائم کیے ہوئے مدرسۃ العلوم (علی گڑھ) کا نام پہلے محمدن اینگلواورینٹل کالج Mohammedan Anglo-Oriental College تھا، لیکن جب یونیورسٹی قائم ہوئی تو اس کا نام مسلم یونیورسٹی رکھا گیا، اسی طرح علی گڑھ کی مشہور تعلیمی کانفرنس کا نام ابتدا میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (Mohammedan Educational Conference) تھا، بعد میں اس کو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے لکھا اوریاد کیا جانے لگا۔(ح)

(۲) صحيح البخاري، كتاب الجمعة، باب الجمعة في القرى والمدن۔

اس کی عدم موجودگی اور اس کی ضمانت و آزادی نہ ہونے کی صورت میں وہ اپنے کو حقیقی طور پر ملک کا آزاد و باعزت شہری سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس دینی تعلیم کی آزادی اور بنیادی عقائد کے تحفظ کے نہ ہونے کی صورت میں ان کو ایسی ہی بے چینی محسوس ہوتی ہے جیسی مچھلی کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دینے یا انسان کو سانس لینے کے لیے ہوا سے محروم کر دینے سے ہوتی ہے۔ میں اس موقع پر بے تکلف یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ مسلمان کے لیے دین و مذہب سے محرومی یا اس کی تبدیلی کا مفہوم ایسا وحشت ناک تصور ہے جو میرے محدود علم میں کسی مذہب یا تہذیب میں نہیں ہے۔

یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ مسلمان نہ صرف سیکولر (Secular) حکومت کا مفہوم اور اس کے فرائض اور دائرۂ کار سے واقف ہیں، بلکہ اس کی قدر اور تائید بھی کرتے ہیں، اور اس کو ہندوستان جیسے کثیر المذاہب اور رنگا رنگی تہذیب وثقافت رکھنے والے ملک کے لیے موزوں ترین طریق حکومت اور پالیسی سمجھتے ہیں، اس لیے وہ یہ ذمہ داری حکومت پر عائد نہیں کرتے کہ وہ ان کے بچوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام کرے، وہ صرف دو چیزیں چاہتے ہیں، ایک یہ کہ ان کو اس مذہبی تعلیم کا رضا کارانہ نظام قائم کرنے سے روکا نہ جائے، اور اس میں قانونی و انتظامی دقتیں نہ پیدا کی جائیں، دوسرے سرکاری مدارس میں ایسی تعلیم مذہبی عقائد و رسوم اور روایات کی شکل میں نہ دی جائے جس سے کسی ایک مذہب کے عقائد و مسلمات کی تبلیغ ہوتی ہو، یا ان کے بنیادی عقیدۂ توحید و رسالت کی تردید یا بیخ کنی ہوتی ہو۔

دوسرے درجہ میں ان کو اپنی وہ زبان بھی عزیز ہے اور اس کو باقی رکھنا چاہتے ہیں جس میں ان کا سب سے بڑا مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی سرمایہ ہے، میری مراد اُردو سے ہے جس سے رشتہ منقطع ہو جانے سے وہ نسلی خلا (Generation Gap) پیدا ہو جاتا ہے، جس کی کوئی باشعور قوم اجازت نہیں دے سکتی۔ یہ حقیقت ہے کہ اب کسی کتب خانہ یا کتابی ذخیرہ کو نذر آتش کر دینے اور برباد کر دینے کی ضرورت نہیں، صرف رسم الخط (Script) بدل دینا کافی ہے، اس قوم کا رشتہ اپنے ماضی سے، اپنی تہذیب سے اور اگر اس میں مذہبی سرمایہ ہے تو مذہب سے خود بخود منقطع ہو جائے گا، اس لیے مسلمان اپنے ملی وجود اور تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے اردو زبان کی بقا اور اس کے پڑھنے اور سیکھنے کے مواقع کے باقی رہنے اور (حکومت کی سطح پر) اس کی تعلیم کی سہولت کو ضروری سمجھتے ہیں، اور اس کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، اور حکومت اور سرکاری نظام تعلیم سے اس بارے میں ضروری حد تک تعاون و امداد کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس موقع پر اس سے زیادہ تفصیل سے عرض کرنے کی

ضرورت نہیں ہے کہ یہ ایک مستقل موضوع ہے، اور اس پر پورا لٹریچر اور تحریک موجود ہے۔

مسلم پرسنل لا کی اہمیت کی وجہ

اسی طرح یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ ان چند قوانین کو مستثنیٰ کر کے جو مقامی رواج، عرف (Convention) یا جاگیردارانہ نظام کے اثر سے مسلمانوں نے اختیار کیے، اور ان کو انگریزی دور میں محمڈن لا میں شامل کر دیا گیا، ان کا شخصی اور عائلی قانون (Personal Law) کا اصل اور بنیادی حصہ قرآن شریف سے ماخوذ ہے، اور اس کی تفصیلات و جزئیات اور تشریحات حدیث و فقہ پر مبنی ہیں۔

ان میں کچھ حصہ ایسی وضاحت و قطعیت کے ساتھ قرآن مجید میں آیا ہے یا وہ ایسے تواتُر کے ساتھ ثابت اور ایسے تسلسل کے ساتھ اس پر عمل ہو رہا ہے، یا اس پر علماء کا ایسا اجماع ہو چکا ہے کہ اس کا انکار کرنے والا اب اصولی و قانونی لحاظ سے دائرۂ اسلام سے خارج سمجھا جائے گا، اور خواہ اس کی تشریح اور عملی تطبیق (Application) میں کتنا ہی زمانہ کا لحاظ کیا جائے، اس میں تغیر و تبدل اور ترمیم کا کوئی سوال نہیں، اس معاملہ میں کسی مسلم اکثریت کے ملک کی نمائندہ حکومت اور مجلس قانون ساز کو بھی کسی تبدیلی کا اختیار نہیں، اور بالفرض اگر ایسا کیا گیا یا کرنے کا ارادہ ہے تو یہ ایک تحریف کا عمل اور مداخلت فی الدین کے مرادف ہے، البتہ جو تمدنی مسائل اجتہادی ہیں، ان کے بارے میں کوئی نص قرآنی (قرآن کا صریح حکم) یا قطعی حدیث نہیں ہے، مسلم دانشوروں اور ماہرین فقہ (جو مسائل کے استنباط کی اہلیت رکھتے ہیں) ضروری بحث و نظر کے بعد مقاصد و اصول دین اور جدید حالات و تغیرات کی رعایت کرتے ہوئے ان کو وقت اور عملی زندگی سے ہم آہنگ بنا سکتے ہیں، اور یہ عمل (Process) تاریخ اسلام کے ہر دور میں جاری رہا ہے، اور اس کا اتنا بڑا ذخیرہ مسلمانوں کے پاس (فقہ و فتاویٰ) کی شکل میں موجود ہے جس کی نظیر کسی دوسری ملت کے پاس ہمارے علم میں نہیں ہے۔

مسلمانوں کا اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق

ان کی دوسری خصوصیت ان کا اپنے پیغمبر سے گہرا تعلق ہے، ان کے یہاں پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیثیت محض ایک بڑے انسان، قابل تعظیم شخصیت اور مذہبی پیشوا کی نہیں، ان کا تعلق آپؐ کی ذات کی ساتھ اس سے کچھ زیادہ اور اس سے کچھ مختلف ہے، جہاں تک آپؐ کی

عظمت کا تعلق ہے، اس کو اس مشہور مصرع سے زیادہ بہتر طریقہ پر ادا نہیں کیا جاسکتا کہ ع

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

ان کو آپؐ کے بارے میں تمام مشرکانہ خیالات اور اس غلو و مبالغہ سے بھی روکا گیا ہے جو بعض پیغمبروں کی امتوں نے اپنے پیغمبر کے متعلق روا رکھا ہے، ایک صحیح حدیث میں صاف طریقہ پر آیا ہے کہ ''مجھے میری حد سے نہیں بڑھانا، اور میرے بارے میں اس مبالغہ سے کام نہ لینا جو عیسائیوں نے اپنے پیغمبروں کے بارے میں روا رکھا ہے، کہنا ہو تو یوں کہنا کہ: خدا کا بندہ اور خدا کا رسول''۔ (۱)

لیکن اس معتدل عقیدہ اور تعظیم کے ساتھ مسلمانوں کو اپنے پیغمبر کے ساتھ وہ جذباتی لگاؤ، وہ قلبی ربط و تعلق ہے جو ہمارے محدود علم و مطالعہ میں کسی قوم و ملت میں اپنے پیغمبر کے ساتھ نہیں پایا جاتا، یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان میں اکثر افراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے والدین، اولاد اور جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں، اور آپ کے ناموس مبارک کی حفاظت اپنا فریضہ جانتے ہیں، وہ کسی وقت بھی ناموس مبارک پر آنچ آنے تک کو برداشت نہیں کر سکتے، وہ اس معاملہ میں اتنے جذباتی اور حساس واقع ہوئے ہیں کہ ایسے نامبارک موقع پر وہ بے قابو ہو جاتے ہیں، اور اپنی زندگیوں کو قربان کر دینے سے بھی نہیں ہچکچاتے، ہر دور میں اس بیان کی صداقت کے لیے واقعات اور دلائل ملیں گے، آج بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام، آپؐ کا ناموس، آپؐ کا شہر، آپؐ کا کلام، آپؐ سے نسبت رکھنے والی چیزیں مسلمانوں کے لیے محبوب ترین اشیاء ہیں، اور وہ ان کے خون اور اعصاب میں حرکت و حرارت پیدا کرتی رہتی ہیں۔

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس بارے میں صدیوں سے ہندوستانی مسلمانوں کو دنیائے اسلام میں ایک امتیاز حاصل رہا ہے، اس کے متعدد تاریخی، علمی و جغرافیائی، نسلی اور نفسیاتی اسباب ہیں، جن کا تجزیہ و تشریح ادب و شاعری، مذہب و تصوف، اور نفسیات پر بحث و تحقیق کرنے والے مصنفین کا کام ہے۔ یہاں اتنا کہنا کافی ہے کہ آخری صدیوں میں بہترین نعت گو شاعر اس ملک میں پیدا ہوئے، اور سیرت نبوی پر بہترین کتابیں (جن کا لوہا عرب و مسلم ممالک میں بھی مانا گیا اور ان سے فائدہ اٹھانے اور مختلف زبانوں میں ترجمہ کرنے کی تحریک پیدا ہوئی) آخری دور میں

---

(۱) صحیح البخاري، کتاب أحادیث الأنبیاء، باب قول الله تعالی (واذکر في الکتاب مریم إذ انتبذت من أهلها)۔

ہندوستانی مصنفین کے قلم سے اردو زبان میں نکلیں۔

قرآن مجید سے تعلق

یہی معاملہ ان کا قرآن مجید کے ساتھ ہے کہ وہ اس کو محض دانشمندی، اخلاقی نصائح اور معاشرتی قوانین کا کوئی مجموعہ نہیں سمجھتے، جو کسی درجہ میں قابل احترام ہیں، اور جب سہولت سے ممکن ہو اس پر عمل کرلیا جائے، بلکہ وہ اس کو اول سے لے کر آخر تک لفظاً و معنًی خدا کا کلام اور وحی الٰہی سمجھتے ہیں، جس کا ایک ایک حرف اور ایک ایک نقطہ محفوظ ہے، اور اس میں کسی شوشہ کی تبدیلی بھی نہیں ہوسکتی، وہ اس کو ہمیشہ باوضو پڑھتے اور اونچی جگہ رکھتے ہیں، ان میں اس کے مکمل طور پر حفظ کرنے اور اچھے سے اچھے طریقہ پر پڑھنے کا بھی خاص اہتمام ورواج ہے، خود ہندوستان میں قرآن مجید کے حفاظ کی تعداد ہزاروں سے متجاوز لاکھوں تک پہنچی ہوئی ہے، رمضان المبارک میں تراویح کی نماز میں (جو دن کی آخری نماز عشاء کے بعد ہوتی ہے) مساجد میں کم سے کم ایک بار پورے قرآن مجید کے پڑھنے اور سننے کا عام رواج ہے، اور مشکل سے کوئی آباد مسجد اس سے خالی ہوتی ہے۔

ان دونوں (پیغمبر اور قرآن) کے بعد ان کا دینی وجذباتی تعلق مسجدوں، مرکز اسلام (مکہ مدینہ) اور مقامات مقدسہ سے بھی ہے، ان کے عقیدہ میں مسجد ایک مرتبہ بن کر مسجد رہتی ہے، اس پر نہ کسی کا قبضہ ہوسکتا ہے نہ وہ فروخت ہوسکتی ہے، یہ تعلق، عقلی اور عملی طور پر ان کی سچی حب الوطنی اور ملک کے ساتھ وفاداری کے کسی طرح منافی اور اس پر اثر انداز نہیں کہ ان دونوں میں کسی طرح کا تضاد نہیں، یہ ان کے عقیدہ، جذبۂ احسان مندی کا نتیجہ ہے (کہ جس سے آدمی کوئی نعمت پاتا ہے یا اس کو اس کی وجہ سے سیدھا راستہ ملتا ہے، اور روشنی حاصل ہوتی ہے، اس کا شکر گزار اور احسان مند ہوتا ہے) اور یہ ان کے مطالعۂ تاریخ کا بھی نتیجہ ہے، اور اس سے کسی حساس، باضمیر اور شریف فرد اور قوم کو روکا نہیں جاسکتا۔

صرف مسلمانوں ہی نہیں، کسی فرقہ، قوم یا آبادی کے متمیز عنصر کی قوت عمل، توانائی اور خدا کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے، اور اس کے تعاون سے ملک کی تعمیر وترقی میں فائدہ اٹھانے، اور ملک میں اتحاد واعتماد، خوش دلی اور گرم جوشی کی فضا قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس ملت یا فرقہ کے بنیادی عقائد، اس کے مذہبی جذبات، اس کے نازک شعور اور ”حساسیت“

(Sensitivity) کالحاظ رکھا جائے، اور ان شخصیتوں یا حقیقتوں کا احترام ملحوظ رہے جن کی عظمت وعقیدت یا محبت صدیوں سے اس کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو چکی ہے، اور جن کی اہانت سے (جو اکثر اوقات بے ضرورت ہوتی ہے) بڑے بڑے قومی وملکی مفادات کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔

اتنا ہی نہیں بلکہ بالغ نظری، حق پسندی، سچی حب الوطنی اور حق ہمسائیگی کا تقاضا ہے کہ اگر اس قوم یا فرقہ کا کوئی ایسا مسئلہ سامنے آجائے جو حق وانصاف پر مبنی ہے، اور اس بارے میں وہ قوم یا فرقہ کسی ظلم وزیادتی کا نشانہ یا نشۂ قوت کا شکار ہے، تو اس میں اس کی حمایت وتائید کی جائے، اور اس مسئلہ میں اس قوم یا فرقہ کے شانہ بشانہ حق کی حمایت کی جائے، اور مظلوم کا ساتھ دیا جائے۔

گاندھی جی کی بالغ نظری اور اس کا فائدہ

اس بالغ نظری اور اپنے ہم وطنوں کی ایک صحیح مسئلہ اور موقف میں نہ صرف تائید وحمایت بلکہ قیادت کی درخشاں مثال گاندھی جی کے اس تاریخ ساز طرز عمل میں ملتی ہے جو انھوں نے ۲۰-۱۹۱۹ء کی شہرۂ آفاق خلافت تحریک کی تائید کرکے پیش کی، اور جس سے ہندوستان کے اتحاد اور جنگ آزادی کو وہ بیش بہا فائدہ پہنچا جس کی مثال نہ اس سے پہلے ملتی ہے نہ اس کے بعد، ہم یہاں پہلے ان کی کتاب Search for Truth (تلاش حق) کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں، پھر تحریک آزادی کی تاریخ سے اس کے فوائد واثرات کا جائزہ لیں گے۔

گاندھی جی لکھتے ہیں:

> ''کانگریس کی طرف سے پنجاب کی ڈائرشاہی کی تحقیقات ابھی شروع ہی ہوئی تھی، میرے پاس ہندو مسلمانوں کی اس مشترکہ کانفرنس میں شریک ہونے کی دعوت آئی، جو مسئلۂ خلافت پر غور کرنے کے لیے دہلی میں ہو رہی تھی، اس دعوت نامہ پر منجملہ اور لوگوں کے حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اور مسٹر آصف علی کے دستخط تھے، اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ کانفرنس میں سوامی شردھانند جی بھی شریک ہوں گے، جہاں تک مجھے یاد ہے سوامی جی اس کانفرنس کے نائب صدر منتخب ہوئے تھے، اور اس کا اجلاس نومبر میں قرار پایا تھا، اس کانفرنس کا مقصد اس صورت حال پر غور کرنا تھا جو خلافت کے معاملہ میں حکومت کی بدعہدی سے پیدا ہوگئی تھی، اور یہ طے کرنا تھا کہ کانفرنس میں علاوہ خلافت کے گئو رکشا کے مسئلہ پر

بھی بحث ہوگی، اور یہ اس کے طے کرنے کا بہترین موقع ہے، مجھے گئو رکشا کا ذکراس سلسلہ میں پسند نہیں آیا، میں نے اس دعوت نامہ کے جواب میں جو خط لکھا اس میں شرکت کا وعدہ کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ ان دونوں مسئلوں کو گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے، اگر ان دونوں کے متعلق بحث کرنا ہے تو اس طرح نہ کیجیے، جیسے سودا چُکایا جاتا ہے، بلکہ دونوں کے حسن وقبح پر الگ الگ غور کیجیے۔

یہ خیالات دل میں لیے ہوئے کانفرنس میں گیا، اس میں مجمع بہت کافی تھا، مگر اتنا نہیں جتنا اس کے بعد کے جلسوں میں ہوا، میں نے اس مسئلہ پر جس کا ذکر آچکا ہے، سوامی شردھانند جی آنجہانی سے گفتگو کی، انھوں نے میری تجویز کو پسند کیا، اور کہا کہ آپ اسے کانفرنس میں پیش کیجیے، میں نے حکیم صاحب سے بھی مشورہ کیا، کانفرنس میں میں نے یہ کہا کہ اگر خلافت کا مسئلہ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں حق پر مبنی ہے، اور اگر حکومت نے اس معاملہ میں صریح بے انصافی کی ہے، تو ہندوؤں کا فرض ہے کہ وہ اس کی تلافی کے مطالبہ میں مسلمانوں کا ساتھ دیں، ان کے لیے یہ بات نازیبا ہے کہ اس موقع پر گئو رکشا کا مسئلہ بیچ میں لائیں، اور صورت حال سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں سے سودا چکائیں، اور مسلمانوں کے لیے بھی اس شرط پر گاؤکشی بند کرنا نامناسب ہے، کہ ہندو خلافت کے معاملہ میں اُن کا ساتھ دیں، یہ دوسری بات ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے مذہبی جذبات کے لحاظ سے ہمسائیگی اور ملکی برادری کے حقوق کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی خوشی سے گاؤکشی ترک کردیں۔"(۱)

مسٹر اندولال کے. یاگنک (Indulal K. Yajnic) اپنی انگریز کتاب (Gandhi as I Know Him) میں گاندھی جی کی تحریر کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں، وہ تحریر فرماتے ہیں کہ

"مختصر دعوی یہ ہے کہ سلطنت ترکیہ میں جتنی غیر مسلم نسلیں آباد ہیں، ان کی حفاظت کی پوری ذمہ داری لے کر پوری ترکی کو ترکی کے قبضہ میں رہنا چاہیے، مقدس مقامات اور جزیرۂ عرب یعنی ملک عرب حسب تعریف علمائے اسلام پر

---

(۱) تلاش حق، صفحہ ۳۰۸-۳۰۹ (ح)

سلطان کا اقتدار بدستور قائم رہے، البتہ اگر اہل عرب چاہیں تو وہ خود اختیاری حکومت کے حقوق ہر وقت حاصل کر سکتے ہیں۔

مجھے مسئلہ خلافت کی تفصیلات میں پڑنے کی ضرورت نہ تھی، میرے اطمینان کے لیے یہی کافی تھا کہ مسلمانوں کے مطالبات میں کوئی چیز ناجائز اور غیر معقول نہ تھی .... مجھے احساس ہوا کہ خلافت کے متعلق مسلمانوں کا مطالبہ نہ صرف مبنی برانصاف تھا، بلکہ برطانیہ کے وزیر اعظم نے بھی ان کے مطالبہ کی صداقت کو تسلیم کر لیا تھا، اس لیے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ وزیر اعظم کے اس وعدہ کو پورا کرانے کے لیے جو کچھ بھی میرے امکان میں ہے دریغ نہ کروں۔''

یہ تھی وہ نازک دلیل جس کی بنا پر قبل اس کے کہ تحریک خلافت کو وہ اہمیت حاصل ہو جو اسے بعد میں ملے گی، گاندھی جی نے مطالبۂ خلافت کی تائید اپنے لیے لازمی قرار دے دی۔ (۱)

مشہور نیشنلسٹ مسلمان دانشور اور تحریک خلافت کے ایک باوثوق مؤرخ قاضی محمد عدیل عباسی صاحب اپنی کتاب ''تحریک خلافت'' میں گاندھی جی کی سرگرمیوں اور مصروفیتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''گاندھی جی زمین کا گز بنے ہوئے چاروں طرف دوڑ رہے تھے، خلاف اسلامیہ سے جو ہمدردی انھوں نے ظاہر کی، اور جس خلوص سے وہ مسلمانوں کے ساتھ میدان میں آ گئے، اس کا اثر ہر کہہ ومہہ پر تھا۔''(۲)

اپریل ۱۹۲۴ء کے ''ینگ انڈیا'' میں گاندھی جی نے خود لکھا:

''خلافت کی یہی تحریک ہے جس نے قوم کو بیداری عطا کی، اب میں پھر اسے سونے نہ دوں گا۔''(۳)

قاضی محمد عدیل عباسی لکھتے ہیں:

''جو نظارہ ہندو مسلم اتحاد کا خلافت تحریک کے زمانہ میں آنکھوں کے

---

(۱) صفحہ ۳۷-۳۸، ترجمہ مولانا ظفر احمد انصاری۔ (ح)

(۲) تحریک خلافت صفحہ ۱۴۴، قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم۔ (ح)

(۳) ایضاً صفحہ ۱۷۲۔ (ح)

> سامنے آیا، اس کو پھر دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس گئیں، تحریک آزادی نے عوام کے دل ودماغ پر قبضہ کرلیا تھا، اب صرف ایک جذبہ کارفرما تھا، کہ انگریز کو ہندوستان سے نکال باہر کیا جائے، اور اس لیے سارا ہندوستان پھٹے کپڑوں، ننگے سر اور ننگے پیر والے رضا کاروں سے بھر گیا، لوگ اپنا کام کاج چھوڑ کر نکل آئے........ کالجوں اور اسکولوں سے ہندو اور مسلمان لڑکے نکل پڑے، اور دوش بدوش کام شروع کردیا، ایک لہر تھی جو موج دریا کی طرح رواں دواں تھی، کہیں اختلاف یا نفرت کا ایک دوسرے سے نام ونشان نہ تھا۔"(۱)

گاندھی جی کی یہی بالغ نظری، حقیقت پسندی اور وسیع القلبی تھی جس کے نتیجہ میں ہمارے ملک میں ہندو مسلم اتحاد کا ایسا نظارہ دیکھنے میں آیا جو نہ اس سے پہلے نظر آیا تھا، نہ اس کے بعد، اور جس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ سارا ملک غیر ملکی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا، اور بالآخر اس کو اس ملک کی حکومت سے دستبردار ہو کر اس کو اہل ملک کے حوالہ کرنا پڑا۔

برعکس اور ناقابل فہم طرز عمل

اس کے بالکل برعکس ذہنیت اور طرز عمل کی میں ایک ایسی مثال پیش کرتا ہوں جو ان سطور کے لکھنے کے وقت تک قائم ہے، اور جو اس وقت مجلسوں، کانفرنسوں، سیمینار، اخبارات ورسائل کا موضوع بنی ہوئی ہے، بلکہ گھر گھر مجلس مجلس اس کا تذکرہ ہے، یہ وہ صورت حال ہے جو سپریم کورٹ کے ۱۳/اپریل ۱۹۸۵ء کے شاہ بانو کیس کے فیصلہ نے پیدا کردی ہے، سپریم کورٹ کے فاضل چیف جسٹس چندر چوڑ نے یہ فیصلہ دیا کہ مسلمان مطلقہ خاتون کو اس وقت تک جب تک وہ دوسری شادی کرے، اور شادی نہ کرنے کی صورت میں حین حیات طلاق دینے والے شوہر کی طرف سے گزارہ (نان نفقہ) (Maintenance) دیا جانا ضروری ہے، جس کے لیے دلیل اور جواز قرآن مجید کے لفظ "متاع" سے فراہم کیا گیا، جس کا ترجمہ انگریزی کے ان بعض مترجمین نے تفسیر اور عربی زبان سے گہری واقفیت نہ ہونے اور سیاق وسباق کا لحاظ کیے بغیر (Maintenance) سے کیا ہے، فیصلہ کی تمہید میں اس کا دعوی کیا گیا کہ اسلام میں عورت کو اس کا جائز اور فطری مقام نہیں دیا گیا، اور اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے، اور اس طرح اس نئے فیصلہ اور قانون کے

(۱) تحریک خلافت، صفحہ ۲۷۱-۲۷۲، قاضی محمد عدیل عباسی، مطبوعہ ترقی اردو بورڈ نئی دہلی۔ (ح)

ذریعہ اس کے حقوق کا تحفظ کیا جانا ضروری ہے۔

اس فیصلہ کے انداز تحریر اور اس سے جو وسیع اور عمیق اثرات مرتب ہوتے ہیں، اس کے خلاف مسلمانوں میں ایک ایسا شدید ردعمل اور بے چینی کی ملک گیر لہر پیدا ہوئی جس کی مثال (اگر مؤرخانہ احتیاط سے کام لیا جائے) تو تحریک خلافت کے بعد نہیں ملتی، اس نے مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر (Schools of thought) اور فقہی مسلکوں کو اس طرح متحد کر دیا، اور اس کے خلاف یک آواز بنا دیا، جس کی مثال عرصۂ دراز سے کم سے کم اس ملک میں دیکھنے میں نہیں آئی، سری نگر سے لے کر کنیا کماری تک اور خلیج بنگال سے لے کر بحر عرب کے کنارہ تک اتنے عظیم جلسے ہوئے جن کی نظیر دور دور اور دیر دیر تک نظر آنی مشکل ہے، جن میں ہزاروں انسانوں سے لے کر لاکھوں تک حاضرین کی تعداد پہنچتی ہے، جو اس جذبہ، ذوق وشوق اور جوش وخروش کے ساتھ شریک ہوئے جو صرف ایمان وعقیدہ، حق وصداقت پر یقین اور اپنی جان سے زیادہ عزیز مذہب کے لیے خطرہ کا احساس ہی مذہب کو ماننے والی کسی قوم کو جمع کر سکتا ہے۔

میں صرف اپنے وطن رائے بریلی کی مثال دیتا ہوں جو ایک نسبتاً چھوٹا شہر ہے، جس کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ نہیں، ۹ر فروری ۱۹۸۶ء کو وہاں جو جلسہ تحفظ شریعت کے نام سے چند نوجوان کارکنوں کی طرف سے منعقد کیا گیا (جو کوئی سیاسی یا دینی وعلمی شہرت نہیں رکھتے تھے) اس میں حاضرین کی تعداد کا محتاط اندازہ ایک لاکھ سے زائد کا تھا، لوگ اپنے جذبہ اور شوق سے مختلف اضلاع سے مستقل بسیں اور اپنے کھانے پینے کا انتظام کر کے آئے تھے، بڑے اور مرکزی شہروں کے جلسوں کی وسعت اور کامیابی کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

سپریم کورٹ کے فیصلہ کے بارے میں مسلمانوں کی اس بے چینی کے تین اسباب تھے:

ا:- پہلا یہ کہ اس سے ان کے آئینی قانون پرسنل لا میں مداخلت کا دروازہ کھلتا ہے، اگر وہ اس پر خاموش رہتے ہیں تو ان کے اس عائلی قانون کے (جس کو وہ اپنے مذہب کا جزو اور قرآن وحدیث وسنت کے صریح احکام پر مبنی سمجھتے ہیں) سارے اجزاء خطرے میں پڑ جاتے ہیں، اور ایسا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس کے کہیں رکنے کی کہیں کوئی ضمانت نہیں، اور اس سے ان کا اپنے مذہب پر آزادی سے عمل کرنے اور ہندوستان میں اپنے ملی تشخص کو قائم رکھنے کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں، اور وہ زندگی کے دریا میں مچھلیوں کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، جن کی کوئی شناخت نہیں، اور جب مچھلیوں کا ذکر آ گیا تو میں کہتا چلوں کہ جہاں تک مسلمانوں کے

بنیادی عقائد کا تعلق ہے وہ اپنی شریعت کے بغیر اسی طرح معنوی طور پر زندہ نہیں رہ سکتے جیسے جسمانی طور پر مچھلی پانی سے باہر زندہ نہیں رہ سکتی۔

۲:-ان کی بے چینی اور اس فیصلہ سے بے اطمینانی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ ان کے نزدیک ان کی شریعت مطلقہ خاتون کو اس سے زیادہ تحفظ فراہم کرتی اور باعزت زندگی کے وسائل و مواقع مہیا کرتی ہے جتنا سپریم کورٹ کے فیصلہ نے اس کا انتظام تجویز کیا ہے، اور یہ اس سے کم وقت میں اور زیادہ سہولت و عزت کے ساتھ ہوسکتا ہے جتنا عدالت اور انتظامیہ کے ذریعہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کی بنا پر ممکن ہے۔

معترضین کا کہنا ہے کہ اگر طلاق کے بعد سابق شوہر سے سابق بیوی کو نان نفقہ نہ دلوایا گیا تو وہ بے سہارا بن جائے گی۔ مگر نان نفقہ کے متعلق شریعت کا بندوبست جو زیر بحث بل میں شامل کرلیا گیا ہے، اس بندوبست سے کہیں بہتر ہے جس کی وکالت شاہ بانو والے مقدمہ میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے حمایتی کررہے ہیں، اس فیصلہ کے تحت ایسی مطلقہ عورت کے نان نفقہ کی ذمہ داری جو اپنی گزر بسر خود نہ کرسکے، اور جس نے طلاق کے بعد شادی نہ کی ہو، صرف ایک شخص یعنی اس کے سابق شوہر پر ڈالی ہے، اور اگر یہ شخص نادار ہو یا اس کا انتقال ہوجائے تو اس کی سابق بیوی کے لیے کوئی سہارا نہیں رہ جائے گا، جب کہ بل کے تحت ایسی عورت کی کفالت اس کے بہت سے رشتہ داروں پر اور اگر وہ سب نادار ہوں تو وقف بورڈ پر عائد ہوگی۔

اس موقع پر اس اخلاقی اور نفسیاتی فرق اور نتائج کو بھی خیال میں رکھنا چاہیے جو ایک ایسے مرد سے گزارہ (نان نفقہ) حاصل کرنے میں اور اس کے برخلاف اپنے قریبی عزیزوں سے جو اس کی وراثت پانے کے مستحق ہیں، اور جن کا رشتہ ازدواجی تعلق پر منحصر نہیں، خون اور نسل و نسب کا رشتہ ہے، ایک شریف و خوددار عورت پر مرتب ہوتے ہیں۔ کیا ایک شریف اور خوددار عورت کے لیے یہ زیادہ موزوں و مناسب ہے کہ وہ اس مرد سے آذوقۂ حیات حاصل کرے جس نے طلاق دے کر اس کو اپنے گھر سے نکال دیا ہے یا اپنے ان خونی رشتہ داروں سے جو اب بھی اس سے محبت اور اس کا احترام کرتے ہیں؟ اس کا جواب ضمیر و عقل سلیم رکھنے والا ہر فرد آسانی کے ساتھ دے سکتا ہے۔

میں یہاں پر اس سے زیادہ اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا، تقریروں اور ان مضامین میں جو ماہرین دینیات و قانون نے اس موضوع پر لکھے ہیں اس پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے، اور ہمارے حقیقت پسند، صاف ذہن اور جرأت مند وزیر اعظم نے بھی اپنی ۲۷ فروری ۱۹۸۶ء کی تقریر

میں اس کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے اور اس پر روشنی ڈالی ہے۔

۳:- مسلمانوں کی بے چینی اور اختلاف کی تیسری وجہ یہ ہے جو خالص اصولی، علمی، عقلی و انسانی اہمیت کی حامل ہے، اور جس میں وہ حقیقتاً اپنے ہی دین و شریعت کے دفاع اور اس کی حفاظت کی خدمت انجام نہیں دے رہے ہیں، بلکہ وہ دوسرے مذاہب، فرقوں اور تمام علوم وفنون (Sciences) اور پورے نظام علم وفکر کے حصار بندی (Protection) کا فرض انجام دے رہے ہیں، وہ یہ کہ کسی علم وفن میں مہارت خصوصی اور اس کی نمائندگی کا حق کس کو حاصل ہے، اور اس میں کس کا قول سند (Authority) سمجھا جائے گا؟ یہ ایک بین الاقوامی بلکہ عالمی ودوامی حقیقت کو تسلیم کرانے کی مقدس جدوجہد کے مرادف ہے، اور جو ہمارے پورے نظام فکر ونظام تعلیم کو انتشار و بحران (Anarchy) اور (Crises) سے بچاتا ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ کی تشریح اور سنت اور فقہ کے احکام کی ترجمانی کا حق اس مذہب کے ماہرین فن (Specialist Scholars) اور Experts کو حاصل ہے، یا ان کتابوں کے ترجمہ کی مدد سے عدالت کے فاضل ججوں اور ایسے دانشوروں کو حاصل ہے جو نہ اس مذہب کی اصل زبان سے واقف ہیں، نہ انھوں نے اس کے مطالعہ میں کافی وقت اور ضروری محنت وتوجہ صرف کی ہے؟ مسلمان علماء اور عامۃ المسلمین کی اس فکر مندی اور جدوجہد کا محرک فوری طور پر فاضل جج کے قرآنی اصطلاحات ''متاع'' اور ''متعہ'' اور 'نفقہ' وغیرہ کی وہ تشریح ہے جو انھوں نے -جیسا کہ میں نے اوپر کہا- قرآن مجید کے ایک دو انگریزی ترجموں اور قانونی کتابوں کے سرسری مطالعہ کی بنا پر کی ہے، لیکن حقیقت میں اس سے ہر مذہب وفرقہ کا مذہبی نظام، عائلی قانون اور عقائد وعبادات تک خطرہ میں پڑ جاتے ہیں، اور جیسا کہ میں نے سلطان پور میں ہونے والے ایک عظیم جلسہ کی تقریر میں کہا تھا کہ ہندوستان کے ہر مذہب و فرقہ اور کمیونٹی کو اگر خطرہ کا احساس ہو جائے اور ان کی دور بینی اور ذہانت اس حقیقت کو بھانپ لے کہ بقول شاعر ع

آج تم کل ہماری باری ہے

تو مسلمانوں کے شکر گزار ہوں گے کہ انھوں نے اپنی آواز بلند کر کے اس خطرہ کے سد باب کا انتظام کیا، میں نے اس سلسلہ میں قرآن مجید کی بعض آیات کا بھی حوالہ دیا، میں نے یہ بھی کہا کہ میں متعدد عرب ممالک کی علمی مجلسوں (Academies) اور ماہرین قانون کی کمیٹیوں کا ممبر ہوں، میں اگر کسی عرب فاضل کو بھی ویدیا ہندو مذہب کی کسی مذہبی اصطلاح کی من مانی تعبیر اس کی

زبان، سیاق وسباق سمجھے بغیر اور اس کے ماہرین فن کی مدد لیے بغیر کرتے ہوئے سنوں گا، تو میں پہلا شخص ہوں گا جو اس پر سختی سے اعتراض کرے گا اور اس کے اس طرز عمل کو غلط کہے گا۔

اس سب کے علاوہ یہ مسئلہ مسلم کمیونٹی کے ایک مخصوص ومحدود طبقہ سے تعلق رکھتا ہے، جس کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے، طلاق کی شرح اور مطلقہ عورتوں کی تعداد کے بارے میں عام طور پر مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے، پھر عرصۂ دراز سے یہ سلسلہ جاری تھا، اور یہ مسئلہ کبھی کسی عوامی اور قومی سطح پر نہیں آیا تھا، مطلقہ خواتین اپنے اپنے خاندانوں اور خونی رشتہ داروں ماں باپ، بھائی بہن، اور اگر اولاد ہے تو اولاد کے ساتھ سیکڑوں برس سے زندگی گزار رہی ہے۔ میں نے مدراس کی ایک پریس کانفرنس میں جو ۱۰رنومبر ۱۹۸۵ء کو ہوئی تھی، جس میں ہندوستان کے چوٹی کے انگریزی اخبارات کے نمائندے بھی شامل تھے، بے ساختہ سوال کیا کہ آپ میں سے کون ہے جس نے چند مسلمان عورتوں کو سڑک پر کھڑا ہوا بھیک مانگتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے سنا کہ ہم بھوکوں مررہے ہیں، اور ہمارا کوئی خبر لینے والا نہیں؟ کسی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا کہ ہم نے دیکھا ہے۔

اس سب کے بعد پھر یہ قانون مسلمانوں کے لیے بنایا گیا، اس کا نفاذ واطلاق مسلمانوں پر ہوتا ہے، اس کے لیے ہمارے دوسرے عزیز ومعزز ہم وطنوں کو۔ جن کی خواتین پر یہ قانون لاگو نہیں۔ بے چین اور مضطرب ہونے کی کوئی وجہ نہیں، لیکن مسلمانوں کے اختلاف اور احتجاج کا سلسلہ شروع ہوا، تو سارے ملک میں، اور خصوصیت کے ساتھ پریس میں، اور خاص طور پر انگریزی ہندی پریس میں ناگواری، طنز وتعریض وتضحیک کی ایک لہر دوڑ گئی، پھر جب ۲۱رفروری ۱۹۸۶ء کو یہ بل پارلیمنٹ کے نئے سیشن میں ٹیبل پر رکھ دیا گیا، اور ان مسائل کی فہرست میں آگیا جن پر پارلیمنٹ کو غور کرنا اور فیصلہ دینا ہے، تو ایسا معلوم ہوا کہ سارے ہندوستان میں خطرہ کی ایسی گھنٹی بج گئی جیسی (خدا محفوظ رکھے) ملک پر کسی بیرونی حملہ یا ملک کے اندر کسی شدید وبا، یا کوہ آتش فشاں پھٹنے کے موقع پر بجنی چاہیے، یہ اس احساس تناسب (Sense of proportion) کے بھی خلاف ہے جس پر زندگی کا نظام چل رہا ہے، مسئلہ جس نسبت سے توجہ، فکرو پریشانی کا مستحق ہے اسی نسبت سے اس کی طرف توجہ اور اس میں توانائی صرف کرنے کی ضرورت ہے، رائی کا پربت بنانا نہ عقل سلیم کا تقاضا ہے نہ عقل عملی (Practical wisdom) کا۔

گاندھی جی کے اس اعلیٰ اخلاقی واصولی موقف اور اس عاقلانہ قیادت کو سامنے رکھتے ہوئے جس نے ایک ایسے مسئلہ میں جس کا تعلق ہندوستان کے مسلمانوں کے اندرونی حالات سے براہ

راست نہ تھا، ہندوستان سے ہزاروں میل دور اور سمندروں پار خلافت کے مسئلہ سے تھا، جس کا مرکز ترکی تھا، ہمارے ہم وطنوں اور اکثریت کے دانشوروں اور اخبار نویسوں اور مختلف پارٹیوں کے رہنماؤں کا موقف یہ ہونا چاہیے تھا کہ اگر وہ مسلمانوں کے موقف کی تائید نہ کریں تو کم سے کم غیر جانب دار اور خاموش رہیں، کہ اس سے ان کے عائلی قانون پرسنل لا، ان کی قومی زندگی اور ان کے طبقۂ خواتین کے حقوق وتحفظ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس سے ملک میں ایک خوشگوار فضا اور باہمی اعتماد کی کیفیت پیدا ہوتی، اس سے کہیں زیادہ ان کی توجہ کی مستحق خود ان کے فرقہ اور طبقۂ نسواں کی سیکڑوں، ہزاروں نئی بیاہی ہوئی دلہنوں کے جلائے جانے یا غیر طبعی طور پر ان کو ہلاک کر دینے کے وہ واقعات ہیں جن سے شاید اس لمبے چوڑے ملک میں کوئی دن خالی جاتا ہوں، نیشنل پریس کی اطلاع کے مطابق صرف دہلی میں ہر بارہ گھنٹہ میں ایک نئی بیاہی دلہن کو جلا کر مار ڈالا جاتا ہے، [۱] Times of India لکھنؤ کی اشاعت ۶/اپریل ۱۹۹۶ء میں ایک خاتون کا بیان شائع ہوا ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان میں غیر قانونی طور پر اسقاط حمل سے چھیاسٹھ لاکھ اموات ہوتی ہیں۔

مسلمانوں کو خطرہ اور قریب قریب یقین ہے کہ اگر اس جبری گزارہ کا قانون پاس ہو گیا، اور طلاق دینے والے سابق شوہر کو دوسری شادی تک (جس کا ہونا ضروری نہیں) اور اس کے نہ ہونے کی شکل میں مدت العمر گزارہ دینا (جس کی مقدار اندازہ ہے کہ مسلسل طریقہ پر گرانی اور معیار زندگی بڑھتے رہنے کی وجہ سے برابر بڑھائی جاتی رہے گی) ضروری ہوگا، طلاق سے بچتے ہوئے (جو بعض اوقات زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت بن جاتی ہے، اور جس کا اعتراف مغربی دانشوروں اور ہمارے ملک کے قانون سازوں نے بھی کیا ہے) اپنی ناپسندیدہ رفیقۂ حیات سے پیچھا چھڑانے کے لیے مسلمان بھی ایسے ہی عمل اختیار کریں گے جیسے نہایت سفاکانہ طریقہ پر بیوی کو رخصت کرانے کے بعد ہندوستان کے معاشرہ میں کثرت سے پیش آرہے ہیں، اگر خدانخواستہ یہ قانون پاس ہو گیا تو جو لوگ زندہ رہیں گے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے یا اپنے کانوں سے سنیں گے۔

میں معذرت خواہ ہوں کہ ایسے دوستانہ خوشگوار اور پُر از اعتماد مجلس میں جو ملک کے اصولی اور بنیادی مسائل پر غور کرنے کے لیے جمع ہوئی ہے، میں نے ایک ایسے مسئلہ کا ذکر اتنی تفصیل کے ساتھ کیا جو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے، لیکن اس کا ذکر کیے بغیر حالات کا صحیح جائزہ اور ملک کو صحیح رخ پر لگانے اور اپنی توانائیوں اور صلاحیتوں کو ملک وانسانیت کی خدمت پر صرف کرنے کا کام نہیں

(۱) قومی آواز ۱۰/جون ۱۹۸۴ء۔ (ح)

کیا جا سکتا۔

ملک کے لیے صحیح اور محفوظ راستہ

سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے ملک کے بقا، ترقی، عزت و استحکام، اور اس کا معاصر دنیا اور اس خطرناک و پیچیدہ عالمی صورت حال میں اپنا شایان شان کردار ادا کرنے کے لیے صحیح، محفوظ، باعزت اور بے خطر راستہ وہی ہے جو تحریک آزادی کے مخلص دانشور اور بلند قامت و قیمت رہنماؤں پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا آزاد اور ان کے ساتھیوں نے تجویز کیا تھا، اور وہ سچے سیکولرزم، صحیح جمہوریت، اور ہندو مسلم اتحاد کا راستہ ہے، خواہ وہ کتنا طویل اور مشکل ہو، اس کے علاوہ جو راستہ تجویز کیا جائے گا اس سے خواہ عارضی و وقتی طور پر کامیابی حاصل ہو، ملک کے لیے تباہ کن اور ان قربانیوں پر پانی پھیرنے والا ہے جو جنگ آزادی میں عمل میں آئیں، اور ملک کو ایسی مشکلات و مسائل سے دوچار کرنے والا ہے جن کا کوئی حل نہیں ہے۔

ملک کے لیے تین بڑے خطرے

اب میں مذہب، انسانی تاریخ، فلسفہ اور اخلاق کا ایک طالب علم ہونے کے ناطے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں (اور مجھے اندیشہ ہے کہ شاید دوسرا شخص جس پر سیاسی طرز فکر غالب ہے نہ کہے گا) کہ اس ملک کے لیے دو خطرے بڑے تشویشناک ہیں، اور آپ کی پہلی توجہ کے مستحق، ایک ظلم و تشدد کا رجحان، انسانی جان و مال اور عزت و آبرو کی بے قیمتی (خواہ اس کا تعلق کسی فرقہ سے ہو) جس کا ظہور فرقہ وارانہ فسادات، طبقاتی اونچ نیچ کی بنا پر پورے پورے خاندانوں اور محلوں کی صفائی، تھوڑے سے مالی فائدہ کے لیے انسان کی جان لے لینا، سفاکانہ جرائم اور مظالم کی کثرت، اور سب کے آخر میں (لیکن سب سے زیادہ شرمناک حقیقت) مطلوب و متوقع جہیز نہ لانے پر نئی بیاہی دلہنوں کو جلا دینا، یا زہر دے کر مار دینا اور ان سے پیچھا چھڑانا ہے۔

جو لوگ مذہب پر یقین رکھتے ہیں، ان کے لیے تو یہ سمجھنا بہت آسان ہے کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا اور چلانے والا جو ماں سے زیادہ محبت کرنے والا اور مہربان ہے، اس عمل سے خوش نہیں ہو سکتا، اور اس کو زیادہ دن برداشت نہیں کرے گا، اور اس کے نتیجہ میں ہزاروں کوششوں اور قابلیتوں کے باوجود کوئی ملک پنپ نہیں سکتا، اور وہ معاشرہ زیادہ دن باقی نہیں رہ سکتا، لیکن جو لوگ مذاہب پر اعتقاد نہیں رکھتے، وہ اس تاریخی حقیقت سے واقف ہیں کہ اس سے کم درجہ کے ظلم اور

سفا کی کی وجہ سے بڑی بڑی شہنشاہیاں اور وہ تہذیبیں جن کا کسی زمانہ میں ڈنکا بجتا تھا، اور آج بھی تاریخ و ادب کے صفحات پر ان کے روشن نقوش ہیں، زوال کا شکار ہو گئیں، اور داستان پارینہ بن کر رہ گئیں، اس صورت حال کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے، سیاسی مسائل و انتخابی مہم سے زیادہ اس کے خلاف طوفانی مہم چلانے کی ضرورت ہے، اس کے لیے گاؤں گاؤں، محلّہ محلّہ جانے کی ضرورت ہے، سخت قوانین، عبرتناک سزاؤں، ابلاغ عامہ کے ذرائع سے کام لینے اور انتظامیہ کو سخت سے سخت قدم اٹھانے کی ضرورت ہے، ورنہ نہ بانس رہے گا نہ بانسری۔

دوسرا خطرہ فرقہ پرستی، جارحیت و تشدد کے کھلے رجحانات ہیں جن کے سلسلہ میں ادنی سی رعایت، لچک اور نرمی سے وقتی طور پر خواہ کچھ فائدہ پہنچ جائے یا پریشانی سے بچا جا سکے، ملک کو زمین دوز اور دھماکہ خیز سرنگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا ہے جو بالآخر ملک کو لے ڈوبے گی۔ گاندھی جی اس حقیقت کو خوب سمجھتے تھے کہ فرقہ وارانہ منافرت، تشدد اور جارحیت پہلے ملک کی آبادی کے اہم عنصروں (ہندو مسلم فرقوں) کے درمیان اپنا کام کرے گی، پھر یہی ذیلی مذہبی اختلافات، طبقات اور برادریوں کی صف آرائی، اور نسلی، لسانی، صوبائی و علاقائی تعصّبات کی شکل میں ظاہر ہوگی، اور جب یہ کام بھی ختم ہو جائے گا تو وہ آگ کی طرح (جب اس کو جلانے کے لیے ایندھن نہ ملے تو اپنے کو کھانے لگتی ہے) ملک کو اور امن پسند شہریوں کو اپنا لقمہ بنالے گی اور یہ ملک تباہ ہو کر رہ جائے گا۔

اس لیے اس جارحانہ احیائیت (Agressive Revivalism)، تشدد، ایک ہی فرقہ سے مطالبات اور اس پر تنقید کا سلسلہ، اپنے کو بالکل بدل دینے اور اپنے ملی و تہذیبی و مذہبی تشخصات سے دست بردار ہو جانے کا مسلسل مطالبہ، سیکڑوں اور ہزاروں برس کی سوئی ہوئی بلکہ مری ہوئی تاریخ کو دوبارہ جگانا، اور زندہ کرنا،[1] جو تبدیلیاں صدیوں پہلے (اچھی یا بری) ہوئیں اور ان کو اس ملک کے حقیقت پسند، فراخ دل اور غیرت مند شہریوں نے صدیوں گوارا کیا، ان کے سفر کو پہلے قدم سے شروع کرنا اور ان کی تلافی کی کوشش اس ملک کو ان نئے مسائل و مشکلات سے دوچار کرے گی جن کا مقابلہ کرنے کی اس ملک کو نہ فرصت ہے نہ ضرورت، اور اس طرح حکومت، انتظامیہ اور

(۱) جس کا مظاہرہ کسی شہرت یا کہانیوں اور روایتوں کی بنیاد پر مسجد کو مندر میں تبدیل کرنا، اس میں مورتیاں رکھنے کا وہ عمل ہے جس کی سب سے زیادہ انتشار انگیز اور سنگین مثال بابری مسجد (اجودھیا) کا واقعہ ہے، متعدد مسلم و غیر مسلم مؤرخین اور تحقیقی کام کرنے والوں نے دعویٰ کیا ہے کہ اس کا کوئی تاریخی و علمی ثبوت نہیں کہ بابر نے کسی مندر یا رام جنم بھومی کو مسجد میں تبدیل کیا، یہ شروع سے مسجد ہے۔ (ح)

دانشور طبقہ کی توانائی بے محل صرف ہوگی، جس کی ملک کو اپنے تعمیری کاموں، سالمیت واستحکام میں ضرورت ہے، اس لیے اس شگاف کو جب کہ وہ معمولی توجہ اور مسالہ سے بند ہوسکتا ہے، اس سے پیشتر بند کردیا جائے جب وہ ہاتھیوں سے بھی بند نہیں ہوسکے گا، ملک کے اس عمومی و بنیادی مفاد کی خاطر کسی کی ناراضگی یا الیکشن کے نتائج پر اثر پڑنے یا کسی ریاستی ومقامی انتظامیہ کی ناگواری کا خیال نہیں کرنا چاہیے، کہ ملک ان سب چیزوں سے زیادہ عزیز، اور اصول، مصالح وفوائد پر مقدم ہے۔

اصول پسندی کی ایک روشن مثال

میں اس اصول پسندی کی ایک مثال پیش کرتا ہوں جو ملک کے عظیم رہنما اور پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے پیش کی۔

۱۹۵۰ء میں جب کانگریس پر بابو پرشوتم داس ٹنڈن جی کی قیادت میں (جو کانگریس کے صدر ہوگئے تھے) فرقہ پرست عنصر غالب آرہا تھا، اور وہ کانگریس کو سیکولرزم اور ہندو مسلم اتحاد کے بجائے ــ جس کی بنیاد گاندھی جی، جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد نے ڈالی تھی ــ فرقہ پرستی اور ہندو احیائیت (Hindu Revivalism) کی طرف پھیرنا چاہتے تھے، اور جمہوریت واکثریت کے احترام اور اس کی پیروی میں جواہر لال جی سے بھی اس کی توقع کر رہے تھے کہ وہ اپنے عمر بھر کے خیالات اور سوچنے کے طرز کو چھوڑ کر کانگریس میں رہنے کے لیے اس کو اختیار کریں گے، جواہر لال جی نے اس سے انکار کردیا، اس موقع پر انھوں نے جو تقریر کی وہ ہندوستان کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، گاندھی نگر ناسک میں ۲۱ ستمبر ۱۹۵۰ء کو انہوں نے فرمایا:

> ''میں جمہوریت پسند نہیں ہوں، اگر اس کا یہ مطلب لیا جاتا ہو کہ میں کسی ہجوم کی رائے کے سامنے جھکوں، میں کبھی ایسی بات نہیں کروں گا جس کے غلط ہونے کا مجھے یقین ہو، اور عوام (ہجوم) چاہتے ہوں کہ اس غلط بات کو میں مانوں، ایسی صورت میں یہ ممکن ہے کہ اگر کانگریس چاہے تو میں کانگریس سے باہر نکل کر انفرادی طریقہ پر اپنے خیالات کے لیے لڑوں۔''

> ''کچھ لوگ مجھ سے آکر کہتے ہیں کہ مجمع فلاں بات نہیں مانتا، اور جمہوریت کی آواز آگے بڑھ رہی ہے، دراصل یہ بزدلوں کی دلیل ہے، اگر جمہوریت کا مطلب ہجوم کے آگے جھکنا ہے تو ایسی جمہوریت کو جہنم واصل ہونا چاہیے، اس قسم کی ذہنیت جہاں بھی سر اٹھائے گی میں اس کے خلاف لڑوں گا،

ہاں جمہوریت مجھ سے وزارت چھوڑنے کو کہہ سکتی ہے، میں اس کا حکم مانوں گا، اگر کانگریسی یہ چاہتے ہیں کہ وہ آنے والے انتخابات میں چند ووٹ حاصل کرنے کے لیے اپنے اصول ونظریات چھوڑ بیٹھیں تو کانگریس مردہ ہوجائے گی، مجھے ایسی لاش کی ضرورت نہیں ہے۔"(۱)

تیسری چیز جو فوری توجہ کی مستحق اور تشویش کا باعث ہے

تیسری چیز جو فوری توجہ کی مستحق اور تشویش کا باعث ہے وہ اخلاقی و انتظامی انتشار (Corruption) ہے، جو اس حد تک پہنچ گیا ہے جس کی نظیر کم سے کم مجھے اس ملک کی تاریخ میں اس سے پہلے نہیں ملی، آپ اس سلسلہ میں سرکاری رپورٹوں اور ملک کے نظم ونسق کی ظاہری ٹیپ ٹاپ اور ترقی کو نہ دیکھیے، عام شہریوں، متوسط درجہ کے آدمیوں اور ان لوگوں سے پوچھیے جن کا عدالتوں، دفاتر، ریلوے، ہوائی سروس، پولیس، تھانوں، ٹیلی فون، ہسپتالوں، سرکاری ٹھیکوں اور زندگی کے مختلف شعبوں سے کام پڑتا رہتا ہے، رشوت کے بغیر ادنی درجہ کا کام نہیں ہوسکتا، پیسہ کے ذریعہ ہر کام کرایا جاسکتا ہے، ہر مجرم کو چھڑایا جاسکتا ہے، ہر شریف انسان کو پھانسا جاسکتا ہے، ہر طرح کا غلط فیصلہ حاصل کیا جاسکتا ہے، ہر جگہ فساد کرایا جاسکتا ہے، یہاں تک کہ ملک کے راز بھی بیچے جاسکتے ہیں، دواؤں اور غذاؤں میں ملاوٹ ہورہی ہے، طبی امداد ملنی مشکل ہورہی ہے، مریضوں کے لیے جو انتظامات ہیں وہ بیکار جارہے ہیں، سنگ دلی اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے، ریلوے، ہوائی سروس میں رشوت کی گرم بازاری سے حکومت کو روزانہ لاکھوں، کروڑوں روپے کا نقصان ہورہا ہے۔

اس سب کی جڑ میں پیسہ کی حد سے بڑھی ہوئی محبت، خدا کا خوف دل سے نکل جانا، اور انسان سے ہمدردی، ملک سے وفاداری، اور اس کے مفاد کو ترجیح دینے اور اس کے نقصان کا خیال رکھنے کا جذبہ ختم ہوجاتا ہے، ایسی صورت میں ملک صنعتی طور پر، سیاسی طور پر، خارجی تعلقات کی بنیاد پر ترقی اور تعلیم کی اشاعت اور خواندگی کا تناسب بڑھ جانے کے باوجود تیزی سے زوال کی طرف جارہا ہے، لوگ زندگی سے عاجز ہیں، اور آخری شرم وناکامی کی بات یہ ہے کہ انگریزوں کے دور غلامی کو یاد کرتے اور اس کی تمنا کرتے ہیں جب انتظامیہ چوکس تھا، ریلیں وقت پر چلتی اور پہنچتی تھیں، ہسپتال اطمینان اور خوشی اور خدمت وراحت کے ٹھکانے تھے، نوجوان اپنی محنت ولیاقت سے پاس ہوتے تھے، تقرریاں اور ترقیاں قابلیت اور استحقاق کی بنا پر ہوتی تھیں، اب یہ سب چیزیں خواب وخیال ہوگئیں۔

---

(۱) قومی آواز لکھنؤ، ۲۲ ستمبر ۱۹۵۰ء (ح)

ہندوستانی پریس اور اخبار نویسوں سے شکایت

حضرات! چونکہ آپ کو کسی روایتی سیاسی کانفرنس میں نہیں بلکہ ایک ایسی بے تکلف مجلس میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے جس میں ہم کو ایک ایسی جماعت کی طرح جو ایک کشتی پر سوار ہے، یا ایک ایسے افراد خاندان کی طرح جو کسی تقریب میں جمع ہیں، ایک دوسرے سے بے تکلف اپنے دل کی بات کہنے اور شکوہ وشکایت کا حق ہے، میں اپنے ملک کے انگریزی، ہندی اور اردو اخبار نویسوں اور صحافیوں سے کچھ کہنے کی جرأت کرتا ہوں۔

آپ سے زیادہ کون اس بات کو جانتا ہے کہ یگانگت اور محبت بڑھانے، اس کے بالمقابل دو فرقوں اور خود ایک فرقہ کے افراد میں تلخی وبدگمانی اور نفرت وکراہت پیدا کرنے میں پریس کو جو دخل ہے، وہ کسی دوسرے ادارہ کو نہیں۔ میں نے ایک مرتبہ اخبار نویسوں اور ایڈیٹروں کی ایک کانفرنس کے نمائندوں کو جو چند سال پہلے لکھنؤ میں ہوئی تھی، خطاب کرتے ہوئے فارسی کا ایک مصرع ایک حرف کی ترمیم کے ساتھ پڑھا تھا، شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے ع

زیر قدمت ہزار جان است

''تمہارے قدم کے نیچے ہزاروں جانیں ہیں،'' میں نے صرف ایک حرف بدل کر کہا ع

زیر قلمت ہزار جان است

''آپ کے قلم کے نیچے ہزار جانیں ہیں،'' میں یہ نہیں کہوں گا کہ آہستہ چلیں یا بالکل نہ چلیں، میں کہوں گا کہ احتیاط سے چلیں، میں نے ۱۰ / نومبر ۱۹۸۵ء میں مدراس کی پریس کانفرنس میں جو مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں ہوئی تھی، کہا تھا کہ میں اخبار کو ایک سچا اور ایمان دار کیمرہ سمجھتا ہوں، جس کا کام یہ ہے کہ وہ تصویر کو (اس سے قطع نظر کہ وہ حسین ہے یا بھدی) اپنے اصلی رنگ وروپ میں پیش کردے، ملک میں پیش آنے والے واقعات، مختلف فرقوں کے جذبات وشکایات، منعقد ہونے والے احتجاجی جلسوں اور جلوسوں کو اپنے صحیح حجم (Bulk)، حاضرین کی تعداد کے صحیح اندازہ اور مقررین وسامعین کے اصلی جذبات وکیفیات کے ساتھ پیش کردے تاکہ حکومت، ملک اور پبلک کو صورت حال کا صحیح اندازہ ہوسکے، اور وہ اپنے انتظامی، اخلاقی فرائض اور ذمہ داریاں محسوس کریں، میں اس حد تک اس کو ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر ہپیز (Hippies) یا (ہم سے آپ سے دور) کوڑھیوں یا متعدی امراض رکھنے والوں کی کوئی کانفرنس ہو تب بھی ہم کو اس کے حجم کے ساتھ پیش کرنا چاہیے تاکہ ملک کے اصلاحی، تربیتی ادارے، حفظان صحت کا نظام اور سماجی سدھار کا

کام کرنے والے (Social Workers) اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں، اور وقت اور کام کی وسعت وضرورت کے مطابق تیار ہو کر میدان میں آئیں۔

ملک میں کسی مریضانہ علامت کے ظاہر ہونے یا کسی غلط اور تخریبی رجحان کو پورے طور پر نمایاں نہ کرنے سے ملک و معاشرہ سخت خطرہ سے دوچار ہو سکتا ہے، اور اقوام وملل کی قدیم تاریخ میں اس کی بہت سے شہادتیں موجود ہیں، ایک وسیع ملک، ایک ترقی یافتہ و طاقتور حکومت، ایک مہذب و تعلیم یافتہ معاشرہ بروقت خطرہ اور غیر صحت مندانہ رجحانات اور کوششوں کو روکنے سے غفلت برتنے کے نتیجہ میں بارہا دائمی زوال کا شکار ہو گیا، اور دنیا کی تاریخ میں داستان پارینہ بن کر رہ گیا ہے۔ ہمارے معزز وعزیز اخبار نویسوں اور ایڈیٹروں کو اپنے ایڈیٹوریلز (Editorials) اور اپنے اظہار رائے کے کالموں میں اپنے نقطۂ نظر اور اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے اظہار کا پورا حق ہے، اور ان کے اس حق کو کوئی چھین نہیں سکتا، لیکن واقعات کی رپورٹنگ اور مختلف فرقوں اور جماعتوں کے جذبات، شکایات اور مطالبات کی روئیداد پیش کرنے میں ان کو کسی طرح کی رنگ آمیزی اور جانب داری سے کام نہیں لینا چاہیے۔

ملک کی سب سے بڑی اقلیت اور فرقہ (مسلمانوں) کو شکایت ہے کہ ان کے جلسے وجلوسوں، احتجاج اور مظاہروں اور یہاں تک کہ ان کی ملی تقریبات اور مجلسوں کی صحیح تصویر ہندوستانی پریس میں آنے نہیں پاتی، اور محض اخبارات پڑھ کر کسی کو ان کے احساس کی شدت، ان کی بے چینی، بے اطمینانی اور ان کی اکثریت کے جائز آئینی مطالبے کا اندازہ نہیں ہو سکتا، یہ نہ صرف اس مخصوص اقلیت اور فرقہ کے لیے مضر اور اس کے ساتھ ناانصافی ہے، بلکہ ملک وحکومت دونوں کے لیے نقصان رساں اور ان کے حق میں بدخواہی اور بداندیشی ہے کہ ان کو واقعہ کی سنگینی کا علم نہ ہونے پائے، اور وہ تھوڑی کوشش سے اس کا تدارک وعلاج نہ کر سکیں، جو بڑھ جانے کے بعد بڑی کوشش سے بعض اوقات ممکن نہیں ہوتا ہے۔

میں آپ کی اجازت سے بطور نمونہ اس سلسلہ میں اپنے چند مشاہدات پیش کرنا چاہتا ہوں، ۲۷-۲۸/دسمبر ۱۹۷۲ء میں بمبئی میں پہلی مرتبہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا، اور Y.M.C.A. مدن پورہ کے میدان میں ایک پبلک جلسہ ہوا جس میں محتاط اندازہ کے مطابق ایک لاکھ کے قریب مجمع تھا، اسی دن آنجہانی عبدالحمید صاحب دلوائی کی قیادت میں ایک مظاہرہ ہوا، جس میں چند درجن سے زیادہ آدمی نہیں تھے، مسلمانوں نے اس پر اپنی سخت ناپسندیدگی کا

اظہار کیا، پولیس نے مظاہرین کو اپنے گھیرے میں لے لیا، ورنہ ان کو سخت حالات سے دوچار ہونا پڑتا، میں نے خود اگلے روز بمبئی کے انگریزی اخبارات پڑھے، اس میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے سلسلہ کے جلسہ کا بہت معمولی طور پر تذکرہ تھا، لیکن دلوائی صاحب کے مظاہرہ کو بہت نمایاں طریقہ پر دکھایا گیا تھا، جس سے ناواقف آدمی سمجھتا کہ اس میں ہزاروں آدمی شریک تھے اور مسلمانوں کی نمائندگی یہی جلوس کرتا تھا۔ اس عدم توازن اور حقائق کو نمایاں نہ کرنے کا جو اثر انتظامیہ، ملک کے دانشور طبقہ اور برادران وطن پر ہوسکتا ہے، اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

دوسری مثال قریبی زمانہ کی ہے، ۶-۷/اپریل ۱۹۸۵ء میں کلکتہ میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا اجلاس ہوا، ۷/اپریل ۱۹۸۵ء کو شہید مینار میدان میں شام کو پبلک جلسہ ہوا جس میں اچھے تجربہ کاروں کا اندازہ ہے کہ پانچ لاکھ آدمی شریک تھے، جہاں تک نظر کام کرتی تھی، انسانوں کا جنگل نظر آتا تھا، میں بورڈ کا صدر ہوں اور اس جلسہ میں بطور خود موجود تھا، اور تقریر بھی کی، اگلے دن میں آسنسول کے لیے روانہ ہو رہا تھا، میں نے ہوڑہ اسٹیشن پر جتنے انگریزی اخبارات مل سکے حاصل کیے، جو اخبارات مجھے ملے ان میں کہیں اس جلسہ کا تذکرہ نہ تھا، ایک انگریزی اخبار میں ان الفاظ میں خبر دی گئی تھی: "Hundreds of Muslims attended"، اب آپ ہی فرمائیے، نہ صرف باہر کے لوگوں کو بلکہ کلکتہ کے ان باشندوں کو بھی جن کو اس جلسہ کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، صحیح صورت حال اور اپنے ہم وطن بھائیوں کے جذبات کی شدت کا اندازہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اور خود حکومت کی مشینری، عدلیہ اور انتظامیہ اور ملک کا حقیقت پسند طبقہ اس کا مداوا کیسے کرسکتا ہے؟ مبالغہ نہ ہوگا اگر میں کہوں کہ سیکڑوں مثالوں میں سے یہ دو مثالیں ہیں جو میں نے پیش کیں۔

موجودہ مسئلہ مسلم پرسنل لا بل کے سلسلہ میں بھی یہی تلخ تجربہ ہوا کہ ہمارے انگریزی و ہندی اخبارات نے (بہت خفیف استثناء کے ساتھ) خبریں دینے، تبصرہ کرنے، تردیدی و مخالفانہ مضامین و مراسلات شائع کرنے میں میونسپلٹی اور کارپوریشن کے شہری قانون (One-way Traffic) کا مظاہرہ کیا، ڈھونڈھنے پر بھی مطلقہ خواتین کے حقوق کے تحفظ کے زیر بحث بل کے حامیوں یا اس کی وضاحت کرنے والوں کا کوئی مضمون یا مراسلہ دیکھنے میں نہ آیا، اس طرح یہ اخبارات و رسائل (مجھے معاف کیا جائے) ایک ہی نقطۂ نظر کے ترجمان اور پرجوش حامی تھے، جو اکثریتی فرقہ کی اکثریت اور مسلم فرقہ کے انگلیوں پر گنے جانے والے چند افراد کا نقطۂ نظر اور طرز فکر تھا، اور اس سے ملک و بیرون ملک کا کوئی اخبار بیں (جس کی معلومات و خیالات کا انحصار اخبارات

کے مطالعہ پر ہو) اس بے چینی، جوش و خروش، اور بے نظیر وحدت، فکر و خیال کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا جو ہندوستان کے دس یا پندرہ کروڑ مسلمانوں میں پائی جاتی ہے، اور جس سے واقف ہونا ہر حقیقت پسند، جمہوریت اور آزادی رائے کا احترام کرنے والے محبّ وطن اور ذمہ دار انسان کا فرض ہے۔

آخر میں دہلی ہی کے (جہاں ہم جمع ہیں) نامور اردو شاعر مرزا غالبؔ کا ایک شعر پڑھتے ہوئے آپ سے رخصت ہوتا ہوں:

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے[۱]

(۱) یہ ڈائلاگ علاحدہ رسالہ کی شکل میں کل ہند مجلس استحکام و یکجہتی، لکھنؤ سے شائع ہوا۔

۱۹

ملک کی نازک صورت حال اور محبان وطن کی ذمہ داری [1]

بھائیو اور دوستو! آپ مجھے معاف کریں، میں بھائیو اور دوستو کے الفاظ کے سوا اس وقت دوسرے الفاظ استعمال نہیں کر رہا ہوں، کسی اسٹیج پر اگر مختلف خصوصیات اور اعزاز و امتیاز رکھنے والے معزز حاضرین بڑی تعداد میں تشریف رکھتے ہوں تو ان میں سے ایک ایک کا نام لے کر خیر مقدم کرنا، اور حاضرین جلسہ کو باخبر کرنا کہ ایسے معزز حضرات ہمارے اسٹیج پر تشریف رکھتے ہیں، نہ صرف نازک بلکہ ایک خطرناک کام ہے، کہ معلوم نہیں کسی ممتاز شخصیت کا نام رہ جائے یا اس کی شان کے مطابق القاب و آداب ذہن میں نہ رہیں، اس لیے میں الگ الگ نام لینے اور ان کی خصوصیات کے ساتھ خطاب کرنے سے احتیاط کر رہا ہوں، اور بھائیو اور دوستو ہی کہہ کے آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں، اور یہی ہماری اس تحریک ''پیام انسانیت'' کی روح اور اسپرٹ ہے، اور میں اسی کو عام کرنا چاہتا ہوں۔

ہر انسان کے دو گھر ہوتے ہیں

حضرات! میں کسی لمبی چوڑی تمہید و علمی و فلسفیانہ انداز بیان کے بغیر کہنا چاہتا ہوں کہ ہر انسان کے دو گھر ہوتے ہیں، ایک اس کا اپنا گھر جس میں وہ اپنے کنبہ اور بال بچوں کے ساتھ رہتا ہے، اس گھر کا پُرسکون ہونا، محفوظ اور ہر خطرہ سے دور رہنا، اس میں محبت، امن وسکون اور بھائی چارہ کی فضا رہنا بہت ضروری ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی انسان کا ایک دوسرا گھر بھی ہے، وہ گھر بڑا ہے، وہ کیا ہے؟ وہ اس کا ملک ہے، لیکن ہم اکثر بھول جاتے ہیں کہ یہ دونوں ہمارے گھر ہیں، ایک ہمارا چھوٹا گھر (چاہے وہ بڑی وسیع اور شاندار کوٹھی ہو) جس میں ہمارے بچے اور ہمارا کنبہ رہتا ہے، دوسرا بڑا گھر جو ہمارے چھوٹے گھر جیسے بے شمار گھروں سے مل کر بنا ہے، جس میں ہمارے

---

(۱) حیدرآباد میں ۲۹/دسمبر ۱۹۸۸ء کو منعقد ''اجلاس پیام انسانیت'' کا خطبۂ صدارت۔

بھائی بند اور اہل وطن رہتے ہیں، ہم جس طرح اپنے چھوٹے سے خاندان کے فرد ہیں، اسی طرح ہم اس بڑے کنبہ، سوسائٹی (معاشرہ یا سماج) اور ملک کی آبادی کے بھی ایک فرد ہیں۔

آپ کے گھر کی قسمت ملک سے وابستہ ہے

ہمارے نظروں سے یہ حقیقت اکثر اوجھل ہو جاتی ہے کہ ایک گھر کی قسمت دوسرے گھر سے وابستہ ہے، معاف کیجیے گا، بڑے گھر (ملک) کی قسمت آپ کے گھر سے اتنی وابستہ نہیں ہے جتنی آپ کے گھر کی قسمت اس بڑے گھر (ملک) سے وابستہ ہے، اگر وہ گھر پُر امن اور پُر سکون (شانت) ہے، اگر وہ گھر محفوظ ہے، اگر اس گھر میں محبت کا دور دورہ ہے، اگر اس گھر کا ہر فرد دوسرے فرد کا حق پہچانتا ہے، اس کو اس کی جان پیاری ہے، وہ ہر انسان کو اپنا بھائی سمجھتا ہے، اس کا اپنے اوپر حق مانتا ہے، اس کی جان کی، اس کے مال کی، اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے، تو وہ گھر خوش نصیب ہے، وہاں جینے اور رہنے کا مزہ ہے، اور وہ گھر خطرہ سے محفوظ ہے، جب تک ہم اس بڑے گھر (اپنے ملک اور دیش کو) اپنا گھر نہ سمجھیں گے، اس گھر کی فکر نہ کریں گے، اس گھر میں امن کا دور دورہ اور محبت و باہمی اعتماد کی فضا نہ ہوگی، اس کی ہر چیز ہم کو پیاری نہ معلوم ہوگی، اس وقت تک اس چھوٹے گھر کا کوئی ٹھکانہ نہیں، اس کی بقا اور حفاظت کی کوئی ضمانت نہیں۔

گھر کے باہر کی فضا کا سازگار ہونا ضروری ہے

لیکن یہ بدیہی اور واضح حقیقت اکثر ہمارے ذہن سے نکل جاتی ہے، اپنے ذاتی گھر کی فکر، اس کی محبت جسے بڑے گھر (دیش اور ملک) کے مقابلہ میں ''بچوں کا گھروندا یا گڑیوں گڈوں کا محل'' کہنا غلط نہ ہوگا، ہم اپنی دنیا سمجھنے لگتے ہیں، اپنی زندگی اور اپنی فکر و دلچسپی کو اس گھر کی چہار دیواری میں محدود سمجھ لیتے اور اپنی قسمت کو اپنے کنبہ اور خاندان کے افراد سے وابستہ کر دیتے ہیں، اور بڑے گھر کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لیتے ہیں، یہ حقیقت ہمارے ذہنوں سے نکل جاتی ہے کہ جب باہر زور کی آندھیاں اور ہواؤں کے جھکڑ چل رہے ہوں، باہر آگ لگی ہو اور وہ آگ بڑھتی چلی آرہی ہو، ہماری بستی سیلاب کی زد میں ہو، یا زلزلہ کے پُر زور جھٹکے آرہے ہوں، تو کوئی ایک گھر بھی اس بنیاد پر محفوظ نہیں رہ سکتا، کہ وہ بڑی مضبوط اور گہری بنیادوں پر اٹھایا گیا ہے، اور انجینئری اور فن تعمیر (Architecture) کے اعلیٰ اصولوں پر اس کی تعمیر ہوئی تھی، اور وہ نہایت مضبوط، آہنی پھاٹک رکھتا ہے، جس سے اگر شیر اور ہاتھی بھی سر ٹکرائیں تو کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔

اسی طرح اگر یہ گھر محبت والفت کی گھنی چھاؤں کے نیچے زندگی گزار رہا ہے، زمین کے ذرہ ذرہ اور درخت کے پتہ پتہ سے امن وشانتی کا پیغام مل رہا ہے، خاندان کا ہر فرد دوسرے فرد پر قربان ہونے کے لیے تیار ہے، لیکن باہر نفرت کی گرم اور زہریلی ہوائیں چل رہی ہیں، بدگمانیوں اور دشمنیوں کے طوفان اٹھ رہے ہیں، تو یہ گھر بھی سکون کے ساتھ نہیں رہ سکے گا، جب کسی بستی میں یا بستی کے آس پاس وبا پھیلی ہوتی ہے (اللہ ہم سب کو محفوظ رکھے) اور جب غذاؤں اور پانی میں بیماری کے جراثیم اور سُمّیت پیدا ہو جاتی ہے تو بڑے سے بڑا صاف ستھرا گھر اور بعض اوقات صحت و بیماریوں سے حفاظت کے مرکز سینوٹوریم (Sanatoriums) اور ہسپتال دواخانے بھی محفوظ نہیں رہتے، آپ ہزار اپنے گھر کا دروازہ بند کرلیں، دروازوں پر تالے ڈال لیں، اور اوپر سے شامیانہ بھی لگادیں، اور سب کو تاکید کردیں کہ خبردار کوئی باہر قدم نہ نکالے، تو یہ سب انتظامات بھی کام نہ دیں گے، جب تک کہ باہر کی پوری فضا آپ کے گھر سے تعاون نہ کر رہی ہو، آپ کے گھر کی فضا کے لیے سازگار نہ ہو، اس وقت تک وہ محفوظ نہیں کہا جاسکتا۔

ایک مثال

میں اس کی چھوٹی سی مثال دیتا ہوں، گرمی کا سخت زمانہ ہے، آگ برس رہی ہے، آپ ایک پتھر پر کھڑے ہوئے ہیں، پتھر جل رہا ہے، آپ ایک بالٹی پانی اپنے پاؤں کے نیچے کے پتھر پر ڈال دیتے ہیں، وہ تھوڑی دیر کے لیے ٹھنڈا ہو جاتا ہے، مگر آپ کو تھوڑی دیر کے بعد ہی احساس ہو جائے گا کہ پتھر اور زمین پر نہیں، آپ کی محنت پر پانی پھر گیا، وہ جگہ پھر گرم ہوگئی، اگر پورا فرش جل رہا ہے اور موسم ہی ایسا ہے، تو جہاں آپ کھڑے ہیں اس حصہ کو ٹھنڈا کرنے سے کام نہیں چلے گا، یہ موسم اور ماحول کی گرمی کا اثر ہے، آپ اپنی جگہ پر برف کی سل رکھلیں اور اس پر آپ کھڑے ہو جائیں، تھوڑی دیر بعد وہ برف کی سل بھی پگھل جائے گی اور گرمی آپ کے پیروں کو جھلسا دے گی۔

مستقل طور پر ساتھ رہنے والی چیز باہر کی کائنات اور ماحول ہے

آج ہمارے بڑے بڑے دانا اور فرزانہ، مفکرین اور مصنفین، یہاں تک کہ جینیس لوگ بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں، وہ صرف اپنے رہنے کی جگہ کو ایر کنڈیشن کر رہے ہیں، لیکن اس ماحول اور فضا سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں جس میں آپ کو زندگی گزارنی ہے، آپ ایک گھر یا ایک محلّہ یا ایک بستی کو بھی Airconditioned کرلیں تو اس سے کام نہیں چلے گا، اگر آپ یہ بھی طے

کرلیں کہ آپ اس گھر سے باہر نہیں نکلیں گے تب بھی ایرکنڈیشن زیادہ دیر تک آپ کا ساتھ نہیں دے گا، فضا کی گرمی اس کا موٹر جلا کر رکھ دے گی، یا اس کے ٹھنڈا کرنے کی صلاحیت کچھ عرصہ کے بعد دم توڑ دے گی، کام کرنے والی چیز قانون قدرت ہے، مستقل طور پر ساتھ دینے والی چیز باہر کی کائنات اور ماحول ہے، آسمانی کتابیں بھی یہی تعلیم دیتی ہیں۔

نفس پرستی اور دولت پرستی کا نتیجہ پورے معاشرہ پر پڑتا ہے

قرآن شریف کی آیت ہے:

﴿وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً وَّاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ (سورة الأنفال:۲۵)

”اور اس فتنہ سے بچتے رہو جو اگر اٹھا تو اس کی زد صرف اُنہیں پر نہیں پڑے گی جو تم میں ظلم کرنے والے ہیں، بلکہ سبھی اس کی لپیٹ میں آجائیں گے، اور جان لو کہ اللہ (بدعملیوں کی) سزا دینے میں سخت ہے۔“

کسی معاشرہ یا ماحول میں بے راہ روی، اصول واخلاق سے چشم پوشی، نفس اور دولت پرستی، ظلم وسفا کی کا نتیجہ اسی فرد یا افراد تک محدود نہیں رہتا، بلکہ اس کا اثر پورے معاشرہ اور ماحول پر پڑتا ہے، اور وہ پورا معاشرہ اور ماحول جس نے اس کو روکنے کی کوشش نہیں کی اور اس سے آنکھیں بند کرلیں، اس کی گرفت میں آجاتا ہے۔

تاریخ بھی بتاتی ہے کہ دنیا میں کئی ایسی مستحکم سلطنتیں اور ترقی یافتہ تہذیبیں گزری ہیں جن کا دنیا میں طوطی بولتا اور ڈنکا بجتا تھا، لیکن ان میں مرور زمانہ سے ذہنی انتشار، اخلاقی زوال وانحطاط رونما ہوا، نفس پرستی ودولت پرستی کا لاوہ پھوٹ پڑا، انسانی حقوق پامال اور عزت وآبرو خاک میں ملائی جانے لگی، خواہشات نفس کی تسکین اور ذاتی مفادات کی تکمیل پر ذہانتیں اور عملی طاقتیں صرف کی جانے لگیں، مذہبی تعلیمات اور اخلاقی قدروں سے بالکل آنکھیں بند کرلی گئیں، بلکہ ان کا مذاق اڑایا جانے لگا، محلوں اور کوٹھیوں میں داد عیش دی جارہی تھی اور انگریزی مثال کے مطابق ”روم جل رہا تھا“، اس زمانہ میں بھی بڑے بڑے تھنکر، فلاسفر، ادیب وشاعر اپنے اپنے کاموں میں لگے تھے، وہ اپنے جوہر دکھارہے تھے، اور لوگوں کو اپنی فنی مہارت اور ادبی کمالات سے مسحور کر رہے تھے، لیکن معاشرہ بگڑا ہوا تھا، بازاروں میں فساد تھا، سڑکوں پر فساد تھا، خاندانوں میں فساد تھا،

مختلف طبقوں میں فساد تھا، جب فساد کی یہ اندھی آندھی چلی تو رومن ایمپائر بھی جو اپنے قانون (Roman Law)، اپنے نظم ونسق (Administration)، اپنی وسیع فتوحات اور شاندار نوآبادیوں اور ترقی یافتہ تہذیب اور بلند معیار زندگی کی بنا پر دنیا میں ضرب المثل تھا، اس سب کے باوجود خالق کائنات کے مقرر کردہ ترقی وزوال اور موت وحیات کے ازلی وابدی قانون سے بچ نہ سکا، جس کی قرآن کریم نے تصویر کھینچی ہے:

﴿وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَن مِّن بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ﴾ (سورة القصص: ۵۸)

"اور ہم بہت سی ایسی بستیاں ہلاک کر چکے جو اپنے سامان عیش پر نازاں تھیں، سو ان کے یہ گھر ہیں، کہ ان کے بعد آباد ہی نہیں ہوئے، مگر تھوڑی دیر کے لیے، اور آخرکار ہم ہی مالک رہے۔"

اس تاریخی زوال وانحطاط پھر آخری سقوط وزوال کی تاریخ اور اس کی تفصیلات آپ انگریزی کے شہرہ آفاق مصنف وادیب Gibbon کی کتاب The History of the Decline and Fall of the Roman Empire (تاریخ زوال وسقوم روما) کے صفحات میں پڑھ سکتے ہیں۔

اس وقت کا سب سے بڑا مرض

آج ہندوستان میں ہم اسی حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہیں، ہمیں صرف اپنے گھر کی فکر ہے، اس وقت کا سب سے بڑا مرض وہ ہے جس کو ہمارے صوفی (سنت) اور شاعر "نفسی نفسی" (یعنی میں ہی میں) کہتے تھے، شخص کی انانیت (Ego) اتنی بڑھ گئی ہے کہ ساری اخلاقی قدریں، سارے انسانی اعتبارات اور سارے قومی وملکی مفادات پس پشت پڑ گئے ہیں، خودغرضی، مفاد پرستی کا ایک جنون پیدا ہو گیا ہے، ہر شخص اسی فکر میں ہے کہ میں دن بھر میں کتنا کما سکتا ہوں، میں مہینہ بھر میں کتنی آمدنی کر سکتا ہوں، میری تنخواہ کتنی اور میری بالائی آمدنی کتنی ہے، مجھے معاف کیجیے، آج کل بالائی آمدنی اصل ترجیح وفضیلت کا معیار (Qualification) ہے، شادی بیاہ کے رشتوں اور پیاموں میں بے تکلف پوچھا جاتا ہے، اور تعارف وتعریف میں بھی کہا جاتا ہے کہ بالائی آمدنی کتنی ہے؟ معاف کیجیے گا، اس بالائی آمدنی سے بہت کم لوگ بالا وبلند ہیں۔

صرف اپنے گھر کی فکر کر لینا اور اس کو مثالی بنا دینا کافی نہیں

حضرات! اپنے گھر کی فکر کر لینا، اپنے گھر کو گلزار بنا لینا، اور اس کو ایک مثالی (Ideal) ماحول بنا دینا بالکل کافی نہیں ہے، وجہ یہ ہے کہ سمندر میں تو جزیرے (Islands) ہو سکتے ہیں، سمندر میں ہزاروں اور اس سے زائد بھی جزیرے ہوں گے، وہ ہزاروں لاکھوں برس سے اپنی جگہ پر ہیں، لیکن زمین کسی جزیرے کو قبول نہیں کر سکتی، قانون قدرت سمندر میں جزیروں کی اجازت دیتا ہے، اور ان کی سلامتی کا ضامن ہے، قانون قدرت خدا کا Natural Law ہے، وہ ابدی اور دائمی ہے، وہ زمین میں جزیرہ بنانے کی اجازت نہیں دیتا، آج ہم نے گھر گھر کو جزیرہ بنا رکھا ہے، شہر شہر کو جزیرہ بنا رکھا ہے، اپنی ذات اپنی برادری کو جزیرہ بنا رکھا ہے، یہ جزیرے ٹھہر نہیں سکتے، ہم آج سے دو ہزار سال پہلے کی تاریخ پڑھتے ہیں، تو ان جزیروں کا نام ملتا ہے، وہ جزیرے آج تک موجود ہیں، اور رہیں گے، پہاڑ لاکھوں برس سے کھڑے ہیں، لیکن سطح زمین کے لیے اللہ کا قانون دوسرا ہے، وہاں اپنی الگ دنیا نہیں بسائی جا سکتی، وہاں کے ہر خطہ کا متأثر اور مؤثر ہونا قانون قدرت ہے، اس پوری سطح زمین کے لیے خدا کا حکم، مذہب کی تعلیم اور قانون فطرت یہ ہے کہ مل جل کر رہا جائے، انسانیت ایک مسلسل زنجیر ہے، جس کی ہر کڑی دوسری کڑی سے پیوست ہے، ہر ایک کی قسمت دوسرے سے وابستہ ہے، یہاں ہر ایک ایک ہی وقت میں سائل اور مسئول ہے، ہر ایک محتاج اور محتاج الیہ ہے، قدیم مشرقی فلسفہ کی اصطلاح میں انسان ''مدنی الطبع'' ہے، (یعنی فطرتاً متمدن اور اجتماعی زندگی گزارنے کا خواہشمند اور ضرورت مند ہے)، یہاں جنگل کی زندگی نہیں گزاری جا سکتی کہ ایک جانور کو دوسرے جانور سے سروکار نہیں، اور ہر طاقتور کمزور کو شکار کرنے کے لیے تیار ہے، کوئی کام باہمی صلاح و مشورہ اور تعاون سے نہیں ہوتا۔

اہل وطن کی ذمہ داری

ہر ملک اور شہر کو ایک ایسے حساس، شریف النفس، پر محبت خاندان کی طرح رہنا چاہیے جو دوسرے کی تکلیف سے تکلیف اور دوسرے کی خوشی سے خوشی محسوس کرے، جہاں چمن کے پھولوں، مناظر قدرت، اور جمالیاتی مظاہر، اس سے آگے بڑھ کر اپنے سرمایہ و دولت اور سامان عزت و لذت سے بڑھ کر اپنے ہم وطنوں اور انسانی بھائیوں کے بچوں کو دیکھ کر خوشی محسوس ہو، بلکہ پیار آئے، میں نے ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ اس ملک کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جہاں

لوگ خود اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش نہ ہوسکیں، وہ بچوں کو دیکھیں تو بجائے خوش ہونے اور اطمینان کا سانس لینے اور شکر کرنے کے ان پر یہ فکر غالب ہو کہ معلوم نہیں کل ان کے ساتھ کیا پیش آئے، کل امن وامان کی حالت کیا ہوگی، کوئی طوفان جھکڑ ایسا چلے کہ یہ کلیاں پھول بننے سے پہلے مسل دی جائیں اور کہنے والا حسرت سے کہے ع

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

یہ ایک ایسی انوکھی، غیر معمولی اور استثنائی بات ہے جس کو باہر کا آدمی مشکل سے باور کرسکتا ہے، ایسا کیوں ہے؟ مختصراً اس لیے کہ انسانی قدر وقیمت کا احساس نہیں، انسانیت کے رشتہ سے ایک خاندان ہونے کا، اور اس کی طرف کشش اور میلان ہونے کا جذبہ نہیں، معصومیت، انسانی جمال وکمال سے لطف لینے، ملک کی ہر چیز کو ملک کی دولت سمجھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی عادت نہیں، حالانکہ ہمارے اس ملک کو اس بات کا فخر ہے کہ یہاں وہ لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے باہر کی دنیا کو بھی امن ومحبت کا پیغام دیا، اس ملک کے خمیر میں محبت ہے، پریم ہے، آپ اس ملک کی تاریخ پڑھتے ہیں، اس ملک کی تاریخ خالی مہابھارت نہیں ہے، رامائن نہیں ہے، اس ملک کی تاریخ میں محبت کی وہ داستانیں، آپ کے بھائی چارہ اور ایثار وقربانی کا جذبہ چمکتا ہوا نظر آتا ہے، میں صرف دو تین باتیں یہاں کے صوفیوں کی سناتا ہوں، میں تاریخ کا ایک طالب علم ہوں اور اسی کے ناطہ ان صوفیوں کے کچھ واقعات نقل کرتا ہوں۔

حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کا واقعہ

حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ چھٹی صدی ہجری اور بارہویں صدی عیسوی کے ایک بزرگ ہیں، ان کے پاس ایک شخص قینچی لایا، ہر شہر کا ایک تحفہ ہوتا ہے، وہ اس کے شہر کا تحفہ تھا، جہاں قینچیاں بہت اچھی بنتی تھیں، وہ بہت خوش تھا کہ میں حضرت کے سامنے اپنے شہر کی یہ سوغات پیش کروں گا، تو حضرت بہت خوش ہوں گے کہ بڑی کام کی چیز لایا اور مجھے دعادیں گے، لیکن جب ان کے سامنے قینچی پیش کی گئی تو انھوں نے فرمایا کہ یہ کیا؟ یہ ہمارے کام کی چیز نہیں، ہمارا کام کاٹنا نہیں، پھاڑنا نہیں، ہمارا کام سینا اور جوڑنا ہے (ان کا مطلب دلوں کو جوڑنا اور ملانا تھا) ہمیں قینچی کی ضرورت نہیں ہے، تم ہمارے لیے سوئی لائے ہوتے۔

سیدھوں کے ساتھ سیدھا اور ٹیڑھوں کے ساتھ بھی سیدھا

انھیں کے ایک جانشین اور خلیفہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے (جن کو دلی والے

سلطان جی کہتے ہیں) فرمایا کہ دنیا کا دستور تو یہ ہے سیدھے کے ساتھ سیدھا اور ٹیڑھے کے ساتھ ٹیڑھا، لیکن ہمارے بزرگوں کا یہ کہنا ہے کہ سیدھوں کے ساتھ سیدھا اور ٹیڑھوں کے ساتھ بھی سیدھا، اور فرمایا کہ اگر کوئی شخص ہمارے سامنے ایک کانٹا ڈال دے اور میں بھی کانٹا ڈالوں تو کانٹے ہی کانٹے ہوجائیں گے، اگر اس نے کانٹا ڈالا تو تم اس کے سامنے پھول ڈالو، پھول ہی پھول ہوجائیں گے، یہ پیام ہندوستان میں خاص طور پر دیا گیا، اور یہاں باہر سے جو لوگ آئے، انھوں نے اس کو اور زیادہ طاقت اور سرگرمی سے دیا، یہاں تک کہ اس کی خوشبو سارے ملک میں پھیل گئی اور پاس کے ملکوں میں بھی پہنچی۔

اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت

اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے (اور یہی پیام انسانیت کی تحریک کا خلاصہ ہے) کہ ہم اپنے اس بڑے گھر کی فکر کریں اور یہ نہ سمجھیں کہ ہم آرام سے ہیں، اور اصول و اخلاق کی زندگی گزار رہے ہیں، تو پھر باہر دیکھنے کی ضرورت نہیں کہ کیا ہو رہا ہے، پیغمبر انسانیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ایسی بلیغ اور واضح مثال دی ہے جس سے بہتر مثال کم سے کم مجھے نہیں ملی، میں لٹریچر کا بھی طالب علم ہوں، اور ہسٹری اور فلاسفی کا بھی، مختلف ملکوں میں جو اصلاحی تحریکیں پیدا ہوئیں، ان سب کا میں نے امکانی حد تک مطالعہ کیا ہے، مجھے ایسی سمجھ میں آنے والی مثال نہیں ملی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زندگی ایک کشتی کی طرح ہے، اس میں ایک بالائی درجہ (Upper Class) اور ایک زیریں درجہ (Lower Class) ہے، میں اس کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ سمجھتا ہوں، عرب کے ملک میں نہ دریا ہیں، نہ نہریں، اس وقت کوئی ایسی بین الاقوامی بندرگاہ بھی نہیں تھی جہاں غیر ملکی کشتیاں اور جہاز آئیں جیسا کہ اس وقت جدہ ہے، باہر کی دنیا میں بھی عام طور پر ایک ہی درجہ کی معمولی اور سادہ کشتیاں چلتی تھیں، تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپؐ نے کبھی سمندر کا سفر نہیں کیا، پھر آپؐ نے بالائی اور زیریں طبقہ کی مثال کیسے دی؟ سب جانتے ہیں کہ جو لوگ اپر کلاس میں رہتے ہیں، وہ بالانشینوں کی طرح بلند خیال، بلند معیار زندگی کے لوگ اور ضرورت سے زیادہ حساس (Sensitive) اور خوددار ہوتے ہیں، اور نیچے کے طبقہ میں غریب غرباء اور متوسط الحال لوگ سفر کرتے ہیں، آپؐ نے فرمایا کہ اس کشتی میں پانی کا انتظام بالائی حصہ میں ہے، اور وہیں سے سب مسافروں کو ملتا ہے، حصہ زیریں کے رہنے والے بھی بہرحال انسان ہیں، پانی کے بغیر ان کا بھی گزارا نہیں، وہ اوپر جاتے ہیں، اور پانی بھر کر لاتے ہیں، پانی کی فطرت

ہے کہ وہ چھلکے، وہ یہ نہیں دیکھتا کہ کون پاس بیٹھا ہے، یہ بڑے آدمی ہیں، ان پر پانی نہیں گرنا چاہیے، یہ بے ادبی ہے، گستاخی ہے، لیکن پانی نے منطق نہیں پڑھی، پانی جب گرے گا تو چاہے کسی ملک کا بادشاہ بیٹھا ہوا ہو وہ بھی بھیگ جائے گا، پھر یہ بھی ذہن میں رکھ لیں کہ کشتی یا جہاز ہلنے والی چیز ہے، اور دریا یا سمندر مواج بھی ہے اور متلاطم بھی، برتن بھی ہر ایک کے پاس بڑا نہیں ہوتا، کوئی چھوٹا برتن لے کر آتا ہے، یا جہاز ہلتا ہے، پاس بیٹھا ہوا آدمی مزے مزے کی باتیں کر رہا ہے، کوئی شعر و شاعری میں مصروف ہے، کسی نے ابھی کپڑے بدلے ہیں، اور قیمتی فرش پر جلوہ افروز ہے، پانی اِدھر گرا اُدھر گرا، اُن بالانشیوں کی اونچی پیشانی پر غصہ کی شکن آجاتی ہے، ان کو گراں گزرتا ہے، ایک مرتبہ ہو دو مرتبہ ہو تو آدمی برداشت بھی کر لے لیکن یہ تو روز کا اور کئی کئی مرتبہ کا کام ہے، انھوں نے کہا کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا اور ہم اس کو برداشت نہیں کر سکتے، کام ان کا پانی کا اور پریشان ہم ہوں، ہم پانی نہیں لے جانے دیں گے، اب یہاں کوئی پانی لینے نہ آئے۔

نیچے کے درجہ والوں نے جب یہ سنا تو کہا کہ پانی کے بغیر گزارا نہیں، اگر آپ ہمیں اوپر نہیں آنے دیتے تو آپ آرام سے بیٹھیے، خدا مبارک کرے، ہم نیچے ہی کشتی میں سوراخ کر لیتے ہیں، وہیں بیٹھے ہی بیٹھے پانی بھر لیا کریں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر اللہ نے ان کو عقل دی ہے، اور ان کی شامت نہیں آئی ہے، تو ان کی خوشامد کر لیں گے کہ خدا کے لیے ہمیں معاف کرو، ہم سے غلطی ہوئی، تم کشتی میں سوراخ نہ کرو، اس لیے کہ اگر کشتی میں سوراخ ہوا تو نہ ہم بچیں گے اور نہ تم بچو گے، آپ کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے سارے انسان ایک ملک کے بسنے والے، ایک معاشرہ کے افراد (خواہ ان میں نسل و نسب، عرفی حیثیت، اقتصادی حالت اور دماغی سطح کے لحاظ سے کتنا ہی فرق ہو) ایک کشتی کے مسافر ہیں، ہمارے ملک میں خود یہ محاورہ ہے ''ایک کشتی کے مسافر'' یعنی اگر کشتی پر کوئی مصیبت آئے گی تو کوئی فرق و امتیاز نہیں ہوگا، اور بڑے چھوٹے سب ڈوبیں گے۔

کسی سماج کی اخلاقی ترقی و تنزلی کا تھرمامیٹر

صاحبو! میرے لیے ایک بڑی پہیلی ہے جس کا بوجھنا مشکل ہے کہ اتنے لانبے چوڑے ملک میں چند سو آدمی بھی ایسے نہیں ہیں جن کو اس بڑے گھر کی فکر ہو، جو اس سے ڈر رہے ہوں کہ (ملک) پر کوئی آفت آئی تو ہماری بھی خیریت نہیں، یہاں کسی طبقہ کی کمی نہیں، دانشوروں اور فضلاء کی کمی نہیں، اہل قلم، مفکرین، حکماء اور سیاسی رہنماؤں کی بھی کمی نہیں، اجتماعی خدمت (Social

work) کرنے والوں کی بھی کمی نہیں، لیکن آپ مجھے معاف کریں، وہ کتنے آدمی ہیں جو اس فکر میں ڈوبے چلے جارہے ہیں، جن کی راتوں کی نیند اڑ رہی ہو کہ اس ملک کا کیا بنے گا؟ اس ملک میں کرپشن کا یہ حال ہے کہ آخری چیز جو کسی سماج کی خرابی کی دلیل ہو سکتی ہے، وہ بھی یہاں شروع ہو گئی ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ غذاؤں ہی میں نہیں دواؤں میں بھی ملاوٹ ہونے لگی ہے، اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو مرکزی حکومت کے ایک وزیر صحت نے کچھ عرصہ پہلے کہا تھا کہ ۶۰ فیصدی دواؤں میں ملاوٹ شروع ہو گئی ہے، ایک رفاہی اسپتال کے افتتاح کی تقریب میں جس میں اس ریاست کے چیف منسٹر بھی موجود تھے، اور بڑے بڑے اہم اور ذمہ دار لوگ بھی، میں نے کہا تھا کہ کسی سماج کے اخلاقی ترقی وتنزل کا تھرمامیٹر یہ ہے کہ اسپتال میں جا کر دیکھیے کہ وہاں کس قدر ہمدردی اور خلوص اور بے غرضی سے مریضوں کی خدمت ہوتی ہے، اور کرپشن وہاں تو نہیں پہنچ گیا ہے؟ ابھی کچھ عرصہ ہوا واقف دوستوں نے بتایا کہ بعض اسپتالوں میں جائے ضرورت (Toilet) پر تالے لگا دیے گئے ہیں، جب مریض یا اس کا تیماردار بے قرار ہو کر دوڑتا ہے تو وہاں کے عملہ کا کوئی آدمی کہتا کہ پہلے دو روپیہ دو، پہلے پانچ روپیہ دو، پھر ہم تالہ کھولیں گے، میرے ایک عزیز دوست نے جو سرکاری ملازم ہیں، ابھی بتایا کہ ہم کو ہر سال میڈیکل ٹسٹ کرانا پڑتا ہے، کبھی ترقی کے لیے، کبھی پوسٹ کے لیے، ہمیشہ chek up کے لیے جاتے تھے، اور رپورٹ لے کر واپس آجاتے تھے، لیکن اس دفعہ گئے تو چیک کرنے والے اور رپورٹ دینے والے کہنے لگے کہ آپ کے بائیں پھیپھڑے پر دھبہ ہے، اب کیا کیا جائے؟ انھوں نے کہا کہ دو ہزار روپے، اس کا علاج انجکشن نہیں ہے، اس کا علاج دو ہزار روپے ہیں، جب دو ہزار روپے ان کے ہاتھ میں رکھے گئے تب جا کر وہ دھبہ مٹا، ادھر مٹھی گرم ہوئی ادھر کلیجہ ٹھنڈا ہوا، اس طرح ملک کیسے چلے گا؟ اور زندگی کا لطف تو بڑی چیز ہے، زندگی کیسے گزاری جائے گی؟

ہم مسلمانوں نے اپنا فرض ادا کرنے میں کوتاہی کی

میں یہ تسلیم کرتا ہوں اور اپنا مذہبی فرض سمجھتا ہوں کہ ہم مسلمانوں نے بھی اپنا فرض ادا کرنے میں کوتاہی کی، ہم کو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی تھی کہ

"اَلرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی، اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْأَرْضِ یَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ۔"(۱)

---

(۱) جامع الترمذي، أبواب البر والصلة، باب ماجاء في رحمة الناس۔

''رحم کرنے والوں پر بڑی رحمت کرنے والا خدا بھی رحم کرتا ہے، تم اہل زمین کے ساتھ رحم وشفقت کا برتاؤ کرو، جو آسمان پر ہے وہ تمہارے ساتھ رحمت ومہربانی کا معاملہ کرے گا۔''

ہندوستان کے مشہور شاعر حالیؔ نے نظم میں اس طرح ترجمہ کیا ہے:

خدا رحم کرتا نہیں اس بشر پر
نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر
کرو مہربانی تم اہل زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

اگر ہم سے قیامت میں سوال ہوا کہ اس ملک میں رہتے ہوئے تم نے کیسے ان خرابیوں کو برداشت کیا، سب سے پہلے تمہاری ذمہ داری تھی، تمہیں اس کے لیے اپنا سب کچھ داؤں پر لگادینا تھا، یہ اس لیے کہ ابھی ہمارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سیرت اور زندگی، آپ کی تربیت دی ہوئی نسل کے کارنامے، اور خدمات کا ذخیرہ موجود ہے، اس ملک میں کثرت سے روحانی پیشوا، معلمین اخلاق، زہد وایثار کی زندگی گزارنے والے اور انسانیت کا سچا درد رکھنے والے مسلسل پیدا ہوتے رہے ہیں، تم نے وہ محنت کیوں نہیں کی جو تمہیں کرنی چاہیے تھی؟

میں یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا ہوں کہ اسلام ایک متعین عقیدہ اور ایک معین مذہب ہے، اس کے حدود ہیں، اس کا ایک قانون ہے، اس کی ایک شریعت ہے، اس پر عمل کرنا، اس کے مطابق زندگی گزارنا ہم سب کا فرض ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہماری یہ بھی ذمہ داری ہے کہ ہم اس ملک کو بچائیں، ہمارے ہوتے ہوئے یہ ملک ڈوبے نہیں، ہم اگر کسی کشتی پر سوار ہیں تو اس کشتی کو ڈوبنا نہیں چاہیے، یہ ہماری اور آپ سب کی ذمہ داری ہے، اور قیامت میں ہم سے اس کا سوال ہوگا۔

ملک سو گیا ہے مرا نہیں ہے

حضرات! آخر میں مَیں صفائی سے کہتا ہوں کہ ملک سو گیا ہے، مرا نہیں ہے، سویا ہوا شخص سو بار جگایا جاسکتا ہے، مرا ہوا ایک بار بھی زندہ نہیں کیا جاسکتا، دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ ممالک، معاشرے، تہذیبیں اور ماحول ہزاروں بار سوئے ہزاروں بار جاگے، سونا عیب نہیں، سونا زندگی کی ضرورت اور علامت ہے، لیکن سونے کی ایک حد ہوتی ہے، رات بھر سوئیے، دن میں بھی سو لیجیے، لیکن سوتے ہی

رہیے، اس کی اجازت نہیں، خاص طور پر ایک ایسے زمانہ میں جب زندگی کی دوڑ بہت بڑھ گئی ہے، ریس بہت تیز ہوگئی ہے، اور اب بہت بڑا مقابلہ درپیش ہے، اس وقت ساری دنیا میں ایک مقابلہ ہے، یہ مقابلہ خالی اقتصادیات کا، سیاسیات کا، فوجی طاقتوں کا نہیں، اخلاقی مقابلہ بھی ہے اور اصولی بھی، اس وقت ہمارے ملک کو اپنی اخلاقیات کی بھی فکر کرنی چاہیے، اور معاشرہ کو بھی نمونہ کا اور معیاری بنانا چاہیے، ہماری پیام انسانیت کی یہ تحریک ''نقار خانہ میں طوطی'' کی آواز کہی جاسکتی ہے، لیکن اگر طوطی کو کسی نے بھی نہیں سنا، جب بھی وہ کم سے کم خدا کے سامنے گواہی دے گا کہ میں نے آواز لگائی، لیکن طوطی کی آواز سنی جاتی ہے، ہمیں تاریخ بتاتی ہے کہ کبھی کبھی نقار خانوں کو بھی طوطی کی آواز کو سننا اور اس پر دھیان دینا پڑا ہے، ساری تاریخ ان نقار خانوں کے گھن گرج، اور طوطی کی نحیف آواز کی تاریخ سے بھری ہوئی ہے، اور اس بات کی شہادتیں موجود ہیں کہ طوطی کی آواز کو کبھی بہروں نے بھی سنا، اور نقار خانوں نے بھی اس کی رسید دی، اور وہ آواز کلیۃً ''صدا بصحرا'' نہیں ثابت ہوئی، اسی توقع پر ہم مختلف مقامات پر یہ جلسے کرتے ہیں، اور یہاں بھی آئے ہیں:

جلانے والے جلاتے ہی ہیں چراغ آخر
یہ کیا کہا کہ ہوا تیز ہے زمانے کی (۱)

(۱) یہ خطبہ علاحدہ رسالہ کی شکل میں حلقۂ پیام انسانیت، لکھنؤ کی طرف سے دسمبر ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا، نیز پندرہ روزہ ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۱۰/جنوری ۱۹۸۹ء) میں بھی شائع ہوا۔

۲۰

غیرت ورحمت الٰہی کائنات کے بگاڑ کو پسند نہیں کرتی [1]

اللہ بڑا غیور ہے، اور غیرت الٰہی کبھی اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ اس کی بنائی ہوئی بے مثال کائنات کو کوئی بگاڑ دے، اور اس کی سنواری ہوئی کسی چیز کو توڑ پھوڑ کر برباد کرے، ایسا کرنے والوں کی پہلے تو تنبیہ کی جاتی ہے، پھر بھی اگر وہ راہ راست پر نہ آئیں تو ان کو اس دنیا سے بگاڑ کے عوض مٹا دیا جاتا ہے، تاکہ دنیا میں بگاڑ کے بجائے صرف بناؤ کے کام ہوتے رہیں۔ غیرت ایک ایسی صفت ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں کو بھی عطا کی ہے، اسی لیے کسی شخص کی غیرت اس کو گوارا نہیں کرتی ہے، کوئی صنعت کار ایک کرسی یا کوئی کمہار ایک گھڑا یا مٹی کا برتن ہی بنائے اور کوئی دوسرا خواہ مخواہ اس کو توڑ دے، بنانے والا بگاڑنے والے کی خیریت دریافت کرے گا، حتی کی اس کی حد یہ ہے کہ کوئی اپنے گھر کے صحن کو پاک وصاف کرے اور دوسرا اس میں بار بار کوڑا کرکٹ پھینکتا رہے، یہ بھی غیرت مند آدمی کے لیے پسندیدہ بات نہیں ہوگی۔

انسانیت کی پستی

آج انسانیت کس درجہ گر چکی ہے کہ وہ کائنات کی ہر چیز کو تباہ وبرباد کرنے پر تلی ہوئی ہے، اور انسان دوسرے انسان کے خون کا پیاسا ہے، ذرا ذرا سی بات پر یہاں تک کہ بچوں کے معمولی جھگڑوں میں ماں باپ ہی نہیں بلکہ بچے اگر دو مختلف ذاتوں سے تعلق رکھتے ہوں، تو دو مذہب والوں کے درمیان جنگ ہو جاتی ہے، انسان کا خون اس زمین پر سب سے ارزاں ہے، کیا غیرت انسانی نے کبھی اس بات کو گوارا کیا ہے کہ کوئی خون خوار شیر آجائے اور شہر میں بچوں، عورتوں اور مردوں پر حملہ کرکے ان کو زخمی کرنے یا چیرنے لگے، تو وہ خاموش تماشائی بن کر دیکھتے رہ جائیں،

---

(۱) پریسڈنسی ہال (بنگلور) میں تحریک پیام انسانیت حلقۂ کرناٹک کے زیر اہتمام ۱۲ر جون ۱۹۹۰ء کو منعقد ایک جلسہ میں کی گئی تقریر کا خلاصہ۔

خواہ زخمی ہونے والے یا مرنے والے کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو، ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا اور نہ ہوا ہے، ایسے موقع پر تمام انسان مل کر ان درندہ صفت حیوانوں کو قابو میں لانے یا ختم کردینے کی کوشش کریں گے، اور انسانیت کو کسی بھی طرح برباد ہونے سے بچالیں گے، تو پھر کیا بات ہے کہ یہیں کا انسان آج درندہ صفت ہوتا جارہا ہے، اور اس کی بعض حرکات پر درندے بھی شرمانے لگتے ہوں گے۔

ہر دور میں خداشناسی اور انسانیت دوستی کا سبق دینے والے پیدا ہوتے رہے

اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے کہ

﴿وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا﴾(الأعراف:٥٦)

''اور زمین میں بگاڑ نہ پیدا کرو اور اس کو خراب نہ کرو اس کی اصلاح کے بعد۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے مختلف زمانوں میں انسانوں کی اصلاح، دنیا میں انسانیت و امن قائم کرنے اور انسانوں کو اپنے خالق و معبود کو پہچاننے، اس کی عبادت کرنے اور دنیا میں شریف و مہذب انسانوں کی طرح رہنے کا سبق دینے کے لیے پیغمبر بھیجے، اور انھوں نے انسانیت کو صحیح راستہ پر لگایا، پھر ان کے بعد ان کے جانشین ان کے پیغام کے امین اور انسانیت کے بہی خواہ پیدا ہوتے رہے، جو خداشناسی اور انسان دوستی کا سبق دیتے رہے، فتنہ وفساد، خانہ جنگی اور تخریبی عمل کی مذمت کرتے رہے، اور اس کو روکتے رہے، ہر ملک اور ہر دور میں انسانیت کے معلم و مصلح پیدا ہوتے رہے، ہمارے اس ملک ہندوستان میں خاص طور پر روحانی پیشوا، معلمین اخلاق، خدا شناس اور انسان دوست ہستیاں کثرت سے باہر سے بھی آئیں اور یہاں بھی پیدا ہوئیں، جن کے نام تاریخ میں روشن ہیں، اس ملک میں اس اصلاحی، اخلاقی اور روحانی جدوجہد و قربانیوں اور کوششوں کے بعد آسانی کے ساتھ فساد پر آمادہ ہوجانا اور ان کی کوششوں پر پانی پھیر دینے کی کوشش کرنا بڑی ناشکری وناقدری اور بڑے خطرے کی بات ہے۔

غیرت مالک کون ومکان اور رحمت خالق انسان

اسی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے فساد وافساد کے موقع پر اللہ تعالیٰ کی غیرت و رحمت دونوں جوش میں آجاتی ہیں، غیرت مالکِ کون ومکان کی حیثیت سے اور رحمت خالق انسان کی حیثیت سے، آپ اگر کسی مکان اور اس مکان کے رہنے والے کسی کنبہ وخاندان پر دست درازی

کریں یا اس مکان کو نقصان پہنچانے اور وہاں کے رہنے والوں کو پریشان کرنے کی کوشش کریں، تو اس مکان کے مالک کو پہلے مالک مکان کی حیثیت سے غیرت آئے گی، کہ آپ نے اس کی ملکیت پر دست درازی کی اور اس مکان کو لاوارث سمجھ لیا، اسی کے ساتھ اس مکان کے مکینوں کے بارے میں جن کو اس نے بسایا ہے اس کی رحمت کو جوش آئے گا کہ وہ کمزور ہیں، بے دست و پا ہیں، اور ان کے پاس حفاظت کے وسائل نہیں ہیں، پھر ان فرقہ وارانہ فسادات، ظلم و سفاکی اور تخریبی کارروائیوں پر (جواب اس ملک میں جلد جلد اور جابجا ہونے لگی ہیں) خدا کو غصہ اور رحم کیوں نہیں آئے گا جو مالک کون ومکاں بھی ہے اور خالق بنی نوع انساں بھی؟!!

تشدد اور رشوت خوری و بدانتظامی

میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ کا یہ شہر اپنے حسن و جمال، سرسبزی و شادابی اور موسم کی خوشگواری کے لیے مشہور ہے، اور Garden City کہلاتا ہے، مجھے معلوم نہیں یہاں کوئی Zoo ہے یا نہیں، (لکھنؤ میں تو ہے) اگر ہے تو اس سے یا کہیں باہر سے دو خونخوار شیر یا دو ظالم بھیڑیے آجائیں اور بچوں، بوڑھوں اور جوانوں پر بھی حملے شروع کردیں تو آپ برداشت کریں گے؟ اور کیا ان کو آزادی کے ساتھ اپنا کام کرنے دیں گے؟ صاف سن لیجیے یہ دو خونخوار جانور تشدد (Violence) اور رشوت خوری و بدانتظامی (Corruption) کی شکل میں موجود ہیں، اور آپ سب نے ان کو آزاد چھوڑ دیا ہے، یہ کسی طرح ان خونخوار شیروں اور بھیڑیوں سے کم نہیں ہیں، یہ وہاں بھی پہنچ سکتے ہیں اور پہنچ چکے ہیں جہاں شیر اور بھیڑیے نہیں پہنچ سکتے، کوئی بستی اور کوئی محکمہ ان سے محفوظ نہیں۔

ملک کو برباد کرنے والے دو دشمن

یاد رکھیے! تشدد کسی ایک گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں رہتا، اگر اس ملک کو اور خود اپنے آپ کو تباہی سے بچانا چاہتے ہیں تو آپ ان دو خطرناک دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوجائیں، اس ملک کو برباد کرنے والے یہ دو ہی دشمن ہیں، ایک رشوت خوری، دولت کی حد سے بڑھی ہوئی لالچ، دوسرے تشدد، ان دونوں دشمنوں کی جڑیں ایسی مضبوط ہوچکی ہیں کہ ملک ان کی گرفت میں آچکا ہے، اور کھوکھلا بنتا جارہا ہے، تحریک پیام انسانیت اسی لیے وجود میں لائی گئی ہے، برادران اسلام اور برادران وطن کو جوڑ کر ایک ہی پلیٹ فارم پر لایا جائے، ان کے درمیان دوستی اور محبت

کے بیج بوئے جائیں، اور آپس کی نفرت اور کدورت کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے، اس سمت میں ہمیں ہر جگہ کامیابی کے امکانات نظر آ رہے ہیں، اور ہر کوئی ہماری آہ کو اور ہماری کراہ کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے، یہ مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے کہ اس ملک کو اور اس کے رہنے والوں کو بچانے کے لیے برادران وطن سے تعلقات بڑھائیں، آپس میں میل ملاپ کی فضا پیدا کریں، اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں، اور ابنائے وطن کو نیک مشورہ دینے اور ملک کو بچانے کی ذمہ داری قبول کریں، خدا آپ کی مدد کرے گا، اور اس ملک کی اور یہاں بسنے والے تمام انسانوں کی حفاظت فرمائے گا۔

تشدد کا رجحان ملک کے لیے تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ

یہ بھی یاد رکھیے کہ تشدد کسی ایک فرقہ یا طبقہ کے ساتھ مخصوص نہیں رہتا، اس کو اپنے عمل کے لیے کوئی دوسرا فرقہ نہیں ملتا تو وہ اپنے فرقہ وطبقہ ہی میں اپنا میدان تلاش کر لیتا ہے، اور اپنی غذا مہیا کر لیتا ہے، آگ کو جب کوئی غذا نہیں ملتی تو وہ خود کو کھانے لگتی ہے، تشدد کا رجحان جو اس ملک میں فرقہ وارانہ و مذہبی بنیاد پر پیدا ہو گیا ہے، یہ کسی حد پر جا کر رکنے والا نہیں، یہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا، اور طبقوں، برادریوں، ذاتوں اور پڑوسیوں کو اپنا شکار بنائے گا، اور یہ ملک کے لیے تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ ہے۔[۱]

(۱) ماخوذ از پندرہ روزہ "تعمیر حیات" لکھنؤ (شمارہ ۲۵ / جون ۱۹۹۰ء)۔

۲۱

غلطی کو غلطی تسلیم نہ کرنا خطرناک ہے (۱)

غلطی کرنا اور بیمار ہونا کوئی خلاف فطرت بات نہیں

حضرات! غلطی سب سے ہوتی ہے، انسان ہی غلطی کرتا ہے، پتھر غلطی نہیں کرتا، درخت غلطی نہیں کرتا، بیمار بھی ہوتا ہے تو انسان ہی بیمار ہوتا ہے، پتھر بیمار نہیں ہوتا، غلطی کرنا اور بیمار ہونا کوئی خلاف فطرت بات نہیں، قوموں، ملکوں اور حکومتوں اور معاشروں کی تاریخ غلطی کی نظیروں سے بھری ہوئی ہے، لیکن جو چیز خطرناک ہے وہ یہ کہ غلطی کو غلطی مانا نہ جائے، غلطی کو محسوس نہ کیا جائے، پھر اس کے بعد دوسرا درجہ یہ ہے کہ پھر اس کو ہمت کر کے غلطی بتایا نہ جائے، اب امید بنتی ہے اور آس پیدا ہوتی ہے کہ ہم آپ سب غلطی کو غلطی سمجھ رہے ہیں، کس کی غلطی؟ میں کسی جماعت، کسی فریق کا نام نہیں لوں گا، ہم کسی کا نام نہیں لیتے لیکن کہتے ہیں کہ غلطی ہوئی، دنیا کے مذاہب، سب سے افضل مرتبہ مذہبوں کا ہے، اس کے بعد تہذیبیں، کلچر، ملک اور سماج، یہ سب کے سب اسی طرح بچے ہیں کہ غلطی کو غلطی کہنے والے لوگ وقت پر پیدا ہو گئے، میری اس بات پر بھی آپ دھیان رکھیں کہ وقت پر پیدا ہونا بھی ضروری ہے، وقت گزر جانے کے بعد تنقید و اعتراف کرنے سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہوتا۔

ملک کے ایک عظیم دانشور کے دکھتے ہوئے دل کی کراہ

حضرات! میرے پاس وقت کم ہے، مجھے اس بارے میں معاف کیا جائے کہ میں تاریخ کا ایک طالب علم ہوں، میرا ذہن ماضی کی طرف جاتا ہے، اور پیچھے کی طرف لوٹتا ہے، وہ تاریخ کے

(۱) ۲؍جولائی ۱۹۹۰ء کو لکھنؤ میں ''فوکس'' کے زیر اہتمام منعقد ایک نمائندہ فرقہ واریت مخالف کنونشن میں -جس میں ملک کے سیکولر مزاج دانشوروں اور علماء کے علاوہ متعدد علمی، سیاسی، سماجی اور مذہبی شخصیتوں نے شرکت کی- کی گئی تقریر۔

گزرے ہوئے منظروں کو اپنے سامنے لاتا ہے، مجھے وہ دن یاد آرہا ہے کہ ۱۷ر نومبر ۱۹۴۶ء کی تاریخ ہے اور دہلی میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم (سابق صدر جمہوریہ ہند) جو اس وقت جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر (شیخ الجامعہ) تھے، جامعہ کی سلور جبلی منائی جا رہی تھی، ان کی دعوت پر ہندوستان کے دار الحکومت دہلی میں اپنے تاریخی مطالعہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ایک ایسا چیدہ اور چنیدہ مجمع ڈائس پر نظر آرہا تھا جو میرے علم میں نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد دیکھنے میں آیا ہے، میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ سامنے ایک طرف پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، شری راجے گوپال اچاریہ جی بیٹھے ہوئے ہیں، دوسری طرف مسٹر جناح، نواب زادہ لیاقت علی خاں اور سردار عبدالرب نشتر بیٹھے ہوئے ہیں، ان کے پیچھے ڈائس پر ہندوستان کے مشہور ترین فضلاء، مصنفین و مفکرین اور ادیب و اہل قلم تشریف فرما ہیں، جن میں علامہ سید سلیمان ندوی، سر شیخ عبدالقادر (مدیر مخزن، لاہور) محمد اسد صاحب (سابق لیو پولڈ ویس) بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق، مشہور شاعر حفیظ جالندھری (اور مسلمان علماء اور زعماء میں سے) مولانا قاری طیب صاحب، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم جمعیۃ العلماء ہند، اور متعدد عظیم رہنما اور تحریک آزادی کے مجاہدین موجود ہیں۔

یہ عظیم اور وقیع مجمع سامنے بیٹھا ہوا تھا اور حالات یہ تھے کہ دہلی میں (فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلے میں) چھرے زنی اور چاقو زنی کی وارداتیں ہو رہی تھیں، ہم لوگ جو باہر کے مہمان کی حیثیت سے آئے تھے (میں بھی خوش نصیبی سے ان میں شامل تھا) ہم لوگ پولیس اور والنٹیر وں کی حفاظت و معیت میں اپنی قیام گاہ تک پہنچائے گئے تھے، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم نے اس وقت اس منتخب اور قابل احترام مجمع کو خطاب کر کے جو کچھ کہا تھا، میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بہتر اور اس سے زیادہ مؤثر اور ادبی انداز میں کہنا مشکل ہے، مجھے صدر صاحب اجازت دیں کہ میں ان کے خطبہ کا ایک اقتباس آپ حضرات کو سنا دوں، معلوم ہوتا ہے کہ بالکل اس موجودہ صورت حال کی عکاسی ہے:

> ''آپ سب صاحبان آسمان سیاست کے تارے ہیں، لاکھوں نہیں، بلکہ کروڑوں آدمیوں کے دل میں آپ کے لیے جگہ ہے، آپ کی یہاں کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر میں تعلیمی کام کرنے والوں کی طرف سے بڑے ہی دکھ کے ساتھ چند لفظ عرض کرنا چاہتا ہوں۔
>
> آج ملک میں باہمی منافرت کی آگ جو بھڑک رہی ہے، اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے، یہ آگ شرافت اور انسانیت کی

سرزمین کو جھلسے دیتی ہے، اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں گے؟ حیوانوں سے بھی پست تر سطح اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنوار سکیں گے؟ اس کے لیے خدمت گزار کیسے پیدا کرسکیں گے؟ جانوروں کی دنیا میں انسانیت کو کیسے سنبھال سکیں گے؟ یہ لفظ شاید کچھ سخت معلوم ہوتے ہوں، لیکن ان حالات کے لیے جو روز بروز ہمارے چاروں طرف پھیل رہے ہیں، اس سے سخت لفظ بھی بہت نرم ہوتے، ہم جو اپنے کام کے تقاضوں سے بچوں کا احترام کرنا سیکھتے ہیں، آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے، جب ہم سنتے ہیں کہ بہیمیت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی محفوظ نہیں ہیں۔

شاعر ہندی نے کہا تھا کہ ''ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے، اپنے ساتھ یہ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا''، مگر کیا ہمارے دیس کا انسان اپنے سے اتنا مایوس ہو چکا ہے کہ ان معصوم کلیوں کو بھی کھلنے سے پہلے ہی مسل دینا چاہتا ہے؟ خدا کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیے اور اس آگ کو بجھائیے، یہ وقت اس تحقیق کا نہیں کہ آگ کس نے لگائی؟ کیسے لگی؟ آگ لگی ہوئی ہے، اسے بجھائیے، یہ مسئلہ اِس قوم اور اُس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں، مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ زندگی میں انتخاب کا ہے، خدا کے لیے اس ملک میں مہذب زندگی کی بنیادوں کو یوں کھدنے نہ دیجیے۔''(۱)

اس ملک کو دنیا کی اخلاقی قیادت کرنا چاہیے

حضرات! میں محسوس کر رہا ہوں گویا یہ بات آج کہی جا رہی ہے، اور اس سے بہتر انداز میں کہنی مشکل ہے، اس وقت مسئلہ یہ ہے کہ آپ اس ملک کو سنبھالیے، اس ملک میں شریفانہ زندگی گزارنے، اس ملک کے باصلاحیت باشندوں کو اپنی ذہانتوں کے اظہار اور اس سے بڑھ کر اپنے خلوص، اپنی خدا ترسی، انسانیت دوستی اور شرافت و اخلاق نمایاں کرنے کا موقع دیجیے، اس ملک میں

(۱) ماخوذ از خطبہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم، بتقریب سلور جبلی جامعہ ملیہ ۱۷ نومبر ۱۹۴۶ء، بعض دیکھنے والوں نے بتایا کہ اس خطبہ کے پڑھنے کے وقت مولانا آزاد اور صف اول میں بیٹھے ہوئے بعض معزز رہنماؤں کی آنکھوں میں آنسو دیکھے گئے۔ (ح)

خدا کے فضل سے سب کچھ موجود ہے، میں نے نہ صرف ہندوستان کی بلکہ باہر کی تاریخ بھی پڑھی ہے، اس کی روشنی میں کہتا ہوں کہ کوئی ایسی نعمت و دولت نہیں ہے جو اس ملک میں نہ ہو یا کسی نہ کسی راستہ سے یہاں نہ آئی ہو، یہاں کی سرزمین اور فضا نے اس کو ترقی دینے، اس کی قدر کرنے اور اس کو آگے بڑھانے کی صلاحیت کا اظہار کیا، آپ اس ملک کو سنبھالیے اور خدا کی اس نعمت کی قدر کیجیے۔

میں یہاں تک کہوں گا کہ اس ملک کو دنیا کی اخلاقی (Moral) قیادت کرنی چاہیے، دنیا کی بڑی طاقتوں اور بڑے ممالک نے اپنے کو اس قابل نہیں رکھا کہ وہ دنیا کی قیادت کرسکیں، بلکہ ایک حقیقت پسند انسان یہ دیکھتا ہے کہ ایشیا کے ان ملکوں میں ان بڑی مغربی طاقتوں کی وجہ سے خرابی پیدا ہو رہی ہے، وہ کسی صالح، کسی لائق قیادت کو، کسی اچھی لیڈر شپ کو ابھرنے نہیں دیتے، اور اگر وہ قیادت وہاں پیدا ہو جاتی ہے تو اس کو زیادہ دنوں تک باقی رہنے کا موقع نہیں دیتے، وہ وہاں کی سیاست میں دخل دیتے ہیں، وہاں کی اقتصادیات و اخلاقیات میں دخل دیتے ہیں، میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ آج دنیا میں وہ تخت خالی ہے جس پر ایک بڑا ملک بیٹھے اور دنیا کو اخلاق، سچی خدا ترسی (محض اس کے نام پر فائدہ اٹھانے اور مخلوق پر دست درازی اور فائدہ اٹھانے کے لیے نہیں) بلکہ خدا سے صحیح طور پر ڈر کر اور خدا کی محبت میں- جو خالق کائنات اور خالق نوع بنی انسان ہے- بلا اختلاف رنگ و نسل انسانوں کو سینہ سے لگائے اور ان سے محبت اور ان کی خدمت کرے۔

دنیا کی اخلاقی قیادت کا تخت آج خالی ہے

آج یہ تخت خالی ہے، روس نے (مجھے معاف کیا جائے) اس بارے میں اپنی نااہلی ثابت کردی، وہ فیل ہوگیا، امریکہ فیل ہو رہا ہے، برطانیہ فیل ہو چکا، یورپ کی دوسری بڑی طاقتیں سب فیل ہوگئیں، جب کوئی قوم، کوئی ملک اپنے خلوص و بے غرضی، اپنی صلاحیت و اہلیت اور اپنی خدا ترسی اور انسانیت دوستی کا ثبوت دے دیتا ہے تو اس کے لیے جنگ کی ضرورت نہیں ہوتی، اس کے لیے بڑے پروپیگنڈے کی ضرورت نہیں، اس کے لیے حقائق (Facts) اور خلوص و صداقت کی ضرورت ہے، اخلاقیات، انسان دوستی اور محبت اور خلوص اور روحانیت اس ملک کی روایات میں ہے، اور اس نے تاریخ کے مختلف دوروں میں یہ سوغات باہر بھی بھیجی ہے، اور اب بھی بھیج سکتا ہے، میں اپنے مسلمان بھائیوں سے خاص طور پر کہوں گا کہ ان کی اس سلسلہ میں خاص طور پر بڑی ذمہ داری ہے، قیامت کے روز ان سے پوچھا جائے گا کہ دنیا لڑ رہی تھی، برباد ہو رہی تھی، انسانیت مسلی

اور پاؤں کے نیچے روندی جارہی تھی، اخلاقیات کا خون کیا جارہا تھا، عصمتیں برباد تھیں، عزتیں پامال تھیں، اور انسان کا خون سب سے زیادہ سستا ہو چکا تھا، تم بیٹھے کیا کر رہے تھے؟ تمہارا فرض تھا، تم اس صورت حال کو بدلنے کی کوشش کرتے، تمہاری یہ ذمہ داری صرف ہندوستان ہی میں نہیں ساری دنیا میں تھی، ڈاکٹر اقبال نے اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے ع

"ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات"

حضرات! میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ میں پیام انسانیت کا Credit خود نہیں لیتا، اس کا سہرا میرے سر بندھا ہوا نہیں ہے، میری صلاحیتیں، میرا تجربہ، میرے مشاغل، میرا ذوق اور میری صحت کوئی چیز بھی اس کی متحمل نہیں تھی، لیکن دل میں ایک چٹک تھی جس نے مجھے اس پر آمادہ کیا، بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آگ لگتی ہے اور آگ بجھانے والے بھی ہوتے ہیں، لیکن ان کو آواز دینے والا کوئی نہیں ہوتا، اس وقت ایک بچہ بھی کھڑا ہو کر آواز لگائے کہ آگ لگی ہے، آگ لگی ہے، اس وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کس عمر کے آدمی نے آواز لگائی، کسی قابل آدمی نے آواز لگائی ہے، یا ناقابل اور غیر تعلیم یافتہ آدمی نے، جب آگ لگی ہو اور گاؤں اور بستی جل رہی ہو، تو پھر جو بول سکتا ہے اس کو بولنا چاہیے، جو دوڑ سکتا ہے اس کو دوڑنا چاہیے، جو دُہائی دے سکتا ہے اس کو دُہائی دینا چاہیے، اس احساس فرض نے مجھے مجبور کیا کہ اتنے بڑے ملک میں اور اتنے بڑے بڑے لوگوں کی موجودگی میں یہ آواز لگاؤں، مجھے اس پر فخر نہیں کہ میں نے یہ آواز لگائی، اور میں یہ دعویٰ بھی نہیں کرتا کہ سب سے پہلے میں نے ہی آواز لگائی، آواز برابر لگائی جاتی رہی ہے، یہ ہمارے ملک کی ناقدری، اس کی تاریخ سے ناآشنائی ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ آواز پہلی مرتبہ لگائی گئی ہے، میں نہیں سمجھتا کہ کوئی صدی خالی گئی ہو کہ جب یہاں ایسے جرأت مند انسان موجود نہ ہوں جنھوں نے آواز لگائی، میں آپ کے سامنے صاف اقرار کرتا ہوں، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میری یہ نحیف آواز اتنے بڑے آدمی کو اور اتنے پڑھے لکھے اشخاص کو جمع کرلے گی، یہ اس ملک کی صلاحیت اور زندہ دلی کی دلیل ہے۔

تاریخ ایک سویا ہوا شیر ہے اس کو جگانا نہیں چاہیے

میں اپنے صوبہ کے وزیر اعلیٰ شری ملائم سنگھ یادو کو اس بات کی داد دوں گا کہ انہوں نے ایک ایسے زمانہ میں جب صرف سیاسی مقاصد، سیاسی زبان اور سیاسی انداز ہر طرف رائج ہے، انہوں

نے ایک اصولی اور اخلاقی آواز بلند کی، اور کہا کہ ہم قانون کو اس طرح پامال ہوتے نہیں دیکھ سکتے، اگر قانون کھیل بن گیا، اگر عدالت کے فیصلے کھیل بن گئے، اگر امن عام بچوں کا مذاق بن گیا، تو اس ملک میں نہ پڑھا جاسکتا ہے اور نہ لکھا جاسکتا ہے، نہ انسانیت کی خدمت ہوسکتی ہے نہ علم وادب کی، اور یہ تو بڑی چیزیں ہیں، گھر میں آرام سے آدمی بیٹھ بھی نہیں سکتا، میں ان کو داد دوں گا کہ انھوں نے اصول واخلاق کی آواز لگائی، ان سے کہوں گا کہ وہ اس پر مضبوطی سے قائم رہیں، اس راہ میں بڑے بڑے امتحان ہوتے ہیں، اصول واخلاق کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، یہ سودا اتنا سستا نہیں ہے، اگر انہوں نے اس پر ثابت قدمی دکھائی تو تاریخ میں ان کا نام ہوگا، امید ہے کہ وہ عبادت گاہوں کے معاملہ میں یہ کھیل نہیں ہونے دیں گے، کہ آج اس مسجد کے معاملہ میں، کل اس مندر کے معاملہ میں تاریخ کو جگایا جارہا ہے، اور ہزار دو ہزار پہلے قافلہ جہاں سے چلا تھا، پھر قافلہ کو وہاں سے سفر کرنے پر آمادہ کیا جارہا ہے، اگر یہ کام ہندوستان میں شروع ہوگیا تو سارے تعمیری اور ملک کو ترقی دینے والے کام بند ہوجائیں گے، اس لیے میں نے جیسے پہلے کہا تھا، آج پھر کہتا ہوں: ''تاریخ ایک سویا ہوا شیر ہے اس کو جگانا نہیں چاہیے،'' آپ اس کے پاس سے نکل جائیے، اس کو سوتا چھوڑ دیجیے، اگر آپ نے اس کو جگا دیا تو پھر اس غلطی کی قیمت ادا کرنی پڑے گی، تاریخ کو پچھلے دور میں واپس لے جانا اور وہاں سے سفر شروع کرنا جب ہندوستان میں باہر سے نسلیں آرہی تھیں، تہذیبیں اور مذاہب آرہے تھے، تو ہم کوئی کام جو اس ملک کے کام آسکتا ہے نہیں کرسکتے۔

میں آپ کی اس توجہ، سماعت اور احترام ومحبت کا شکر گزار ہوں، اور خدا سے دعا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ فرقہ وارانہ مفاہمت اور بقائے باہم کے شریفانہ اصول کے لیے جو قدم اٹھایا گیا ہے اور جو کوشش شروع کی گئی ہے وہ بار آور، نتیجہ خیز، وسیع ووقیع ہو۔ (۱)

(۱) پندرہ روزہ ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۲۵ رجولائی ۱۹۹۰ء)۔

۲۲

یہ ملک ڈوب رہا ہے (۱)

ایک معمہ یا دو متضاد پہلو

معزز حضرات فضلاء اور اسکالرس اور ہمارے محبت کرنے والے اور قدر کرنے والے احباب اور دوست!

میں اس وقت ایک بڑی آزمائش میں مبتلا ہوں، یعنی Curiosity کی ایک کیفیت یا جسے معمہ اور پہیلی کہتے ہیں، Puzzle ہوتا ہے، وہ میرے سامنے ہے، وہ یہ کہ تقریر میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اس چیز کو اس بات نے دبا دیا ہے اور میری سمجھ میں یہ نہیں آتا، میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ جس ملک میں (میں شہر نہیں کہتا ہوں، ملک کہتا ہوں) اور جس سرزمین پر اور جس ملک میں اتنے شریف انسان پائے جاتے ہوں، جو ہمارے سامنے نظر آرہے ہیں، جن کے چہروں سے شرافت ہی نہیں محبت بھی ٹپک رہی ہے، اور جو ایک آواز پر اتنی بڑی تعداد میں یہاں جمع ہوگئے ہیں، انسانیت کی آواز پر یہاں جمع ہوگئے ہیں، اور جن کے چہرے مہرے اور جن کی آنکھیں اور جن کی مسکراہٹ اور محبت بتاتی ہے کہ ان کے دل میں کیسی شرافت اور کیسی محبت ہے، کیسی انسانیت ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا میں آپ سے اس کا جواب چاہتا ہوں اور اچھے پڑھے لکھوں سے میں چاہتا ہوں کہ یہ پہیلی بجھائیں، مجھے سمجھائیں، کنونس (Convince) کریں کہ اتنے انسان جس ملک میں اور سارے ہندوستان میں اگر صرف اتنے ہی آدمی جو سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، اور اس بھٹکل کے اور یہاں کے آس پاس کے، اس بستی کے نواحی اور مقامات کے لوگ یہاں آئے ہوئے ہیں، ان کے ہوتے ہوئے ہمارا یہ ملک اس خطرہ میں کیوں مبتلا ہے؟ جیسے اس میں آگ لگ رہی ہے اور اس کو بجھانے والا کوئی نہیں؟ کیسے اس ہندوستان میں Corruption ہے؟ کیسے

(۱) بھٹکل میں ۲۹؍نومبر ۱۹۹۱ء کو منعقد جلسۂ پیام انسانیت میں کی گئی تقریر۔

یہاں Communal Riots (فرقہ وارانہ فسادات) ہوتے ہیں؟ بھائی بھائی کو مار رہا ہے، انسان انسان کو ہلاک اور ذبح کر رہا ہے، اور سوائے پیسے اور دولت کے اور کوئی مقصد اور عزت کی چیز نظر نہیں آتی، میرا دماغ اس پہیلی کے بجھانے میں مصروف ہے کہ اتنے آدمیوں کے ہوتے ہوئے یہ ملک کیسے ڈوب رہا ہے، اور یہ ملک کیسے تباہی کی طرف جا رہا ہے، یہ ہمارے بھائی جو ہیں کیا ان حالات سے واقف نہیں ہیں؟ یا ان حالات کو برا نہیں سمجھتے؟ یہ دونوں باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں، میں دونوں میں سے ایک کا تشفی بخش جواب نہیں دے سکتا، یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ یہ ان حالات سے واقف نہیں، یہ بھی سمجھ نہیں سکتا کہ اس کو برا نہیں سمجھتے، پھر یہ کیا ہو رہا ہے؟

تاریخ کا سبق

میں تاریخ کا ایک طالب علم ہوں، اور تاریخ میری Hobby ہے، تاریخ کے مطالعہ سے میں اس کا ثبوت دے سکتا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ اس سے دس گنا کم تعداد میں خدا کے پیغمبر خدا کا پیغام لے کر آئے تھے، اور ان کی تو بہت بڑی شان ہے، اور ان کے ساتھ تو خدا کی بہت بڑی مدد ہوتی ہے، ان سے کم تعداد میں مصلحین اور دانشوروں نے انقلاب برپا کر دیا، اور جو سیلاب اور طوفان آ رہا تھا برائی اور کرپشن کا، اس کو انھوں نے روک دیا، وہیں کا وہیں روک دیا، بات کیا ہے؟ فرق صرف کس بات کا ہے؟ یہ بات ان کے دل سے لگی ہوئی تھی، بلکہ ان کے دل پہ ایک چوٹ تھی، ان کو کھانے میں مزہ نہیں آتا تھا، بات کرنے میں مزہ نہیں آتا تھا، اپنے بچوں کو دیکھ کر وہ خوش نہیں ہوتے تھے، اپنے گھر جا کر ان کو چین نصیب نہیں ہوتا تھا، راتوں کی نیند ان کی حرام ہو جاتی تھی، بڑی مشکل سے وہ سو سکتے تھے، وہ یہ دیکھ کر کہ ان کے چاروں طرف ظلم و گناہ، برائی و بے دردی، سفا کی و درندگی اور دولت کی محبت اور عشق کا کیسا طوفان و سیلاب پھیلا ہوا ہے، یہ دیکھ کر وہ اس کے لیے کھڑے ہو گئے، وہ اس کے لیے خم ٹھونک کر اور خدا کے بھروسے پر بلکہ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر کھڑے ہو گئے، اور معتبر تاریخ بتاتی ہے۔ صرف مذہبی تاریخ نہیں، آپ پڑھیں The Historian's History of the World اور جو دنیا کی عالمی تاریخیں ہیں۔ وہ بتاتی ہیں کہ ایک خدا کے پیغمبر نے یا ان کے جانشین و نائب نے جنہوں نے ان کی تعلیم کو سمجھا اور اس کو انھوں نے دل سے لگا لیا، اور دل میں قبول کر لیا، انھوں نے ملکوں کو بچا لیا ہے، ملکوں کو ڈوبنے اور تباہ ہونے سے بچا لیا ہے۔

ملک ڈوب رہا ہے

اس دریائے حیرت میں میرا دماغ غوطہ لگا رہا ہے، اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آپ

سے کیا خطاب کروں، کیا کہوں، کون اس پہیلی کو بجھائے، ہمارے سامنے اتنے شریف آدمی بیٹھے ہوئے ہیں اور ہندوستان میں سب کچھ ہو رہا ہے؟ فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے ہیں، انسانوں کا خون بہایا جا رہا ہے، پیسے کے لیے سب کچھ کیا جا رہا ہے، اور بیاہی ہوئی دلہنوں کو اور شریف زادیوں کو جن کو بڑے ارمانوں سے اور بڑی خوشامد سے بیاہ کر کے لاتے ہیں، محض اس گناہ اور جرم میں کہ وہ اتنا زیور نہیں لائیں، وہ کوئی موٹر اور ایمپسیڈر کار نہیں لائیں، وہ اتنا سونا نہیں لائیں، وہ اتنا Bank Balance نہیں لائیں، ان کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے، ان کو آگ لگا کر جلا دیا جاتا ہے، ان کو زہر کھلا کر مار دیا جاتا ہے، آپ سمجھتے ہیں کہ یہ خدا جو اس دنیا کا بنانے والا ہے، یہ کب تک اس کو دیکھتا رہے گا؟ اور کس وقت خدا کا عذاب اس ملک پر نہیں آ جائے گا۔

زبان معجز بیانی سے ترجمانی

میرے دماغ نے اتنی دیر میں جو کچھ سوچا ہے اس سے مجھے ایک سرا مل گیا ہے، جو میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، اور وہ سرا بجائے اس کے کہ میں اپنی زبان سے بیان کروں، میں پیغمبر خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنہوں نے سب سے بڑا دنیا میں انقلاب کیا، اور برائی روک دی، اور ایک نسل نہیں بلکہ اس دنیا کو ایک دوسرے رخ پر لگا دیا، اور ابھی تک اس کا اور ان کی تعلیمات کا اثر باقی ہے، انہوں نے ایک مثال دی ہے، اور میں حیرت میں ہوں ایک تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے بھی اور عربی زبان کے ایک جاننے والے اور مصنف کی حیثیت سے بھی، کہ یہ بات کیسے انہوں نے کہی، سوائے اس کے کہ خدا نے ان کے دل میں ڈالی اور الہام ہوا کہ آپؐ نے فرمایا۔

پہلے آپ یہ سمجھ لیجیے کہ عرب میں کوئی دریا نہیں ہے، صرف سمندر ہے، وہ بھی ایک سرحد پر جہاں جدہ ہے وہاں عرب کا سمندر بہتا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک جہاز ہے، اس کے دو طبقے ہیں۔ اور میں حیرت میں ہوں، میں سمجھتا ہوں تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے کہ اس وقت جہاز رانی نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ اس کے دو دو درجے ہوں، ایک اپر کلاس اور دوسرا لوور کلاس، سیدھی سادی کشتیاں ہوتی تھیں اس زمانہ میں، یہ بہت بعد کی بات ہے کہ جب ایسے اسٹیمر ایجاد ہوئے جن میں دو دو طبقے ہوتے تھے Upper Class اور Lower Class، میں نے بھی اس میں سفر کیا ہے اور اب اس کا رواج نہیں رہا، لیکن ہم نے وہ زمانہ دیکھا ہے کہ جب زیادہ تر حجاج بحری جہاز سے جاتے تھے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرے کی مثال ایسی کشتی سے دی جس میں ایک اوپر کا درجہ ہے، وہ بالائی درجہ ہے، اور وہ بالانشین کہلاتے ہیں، (ہماری اردو زبان میں بالانشین

Upper Class Passengers یا Upper Class Citizens جنہیں کہتے ہیں) بالانشین اور یہ دراصل ایک طنزیہ جملہ ہے کہ یہ تو بالانشیں لوگ ہیں، ان کو کیا خبر؟ تو کچھ لوگ اوپر کے درجہ میں بیٹھے ہوئے ہیں، کچھ لوگ لوور کلاس میں ہیں، اتفاق سے پینے کے پانی کا انتظام اپر کلاس میں ہے، اپر کلاس والوں کی خاطر بھی زیادہ ہوتی ہے، آپ جانتے ہیں فرسٹ کلاس کی ہماری ٹرین اس میں بھی یہی ہوتا ہے کہ فرسٹ کلاس کے لیے بڑی بڑی آسانیاں مہیا کی جاتی ہیں، تو ان کے اعزاز میں پینے کا میٹھا پانی اپر کلاس میں تھا، نیچے والے اوپر جاتے تھے اور پانی بھر کر لاتے تھے، تو پانی کی یہ فطرت ہے کہ وہ چھلکتا ہے، وہ یہ نہیں دیکھتا کہ کس پر گرے کس پر نہ گرے، جب پانی آپ لے کر کے جائیں آپ کے ہی پاس کوئی بڑا امیر آدمی بیٹھا ہوا ہو، کوئی نواب ہو، کوئی والی ریاست ہو، کوئی مجسٹریٹ ہو، کچھ ہو، پانی جب گرے گا تو وہ یہ نہیں دیکھے گا کہ کس پر گر رہا ہے، وہ جب پانی لے کر آتے تھے تو ہزار احتیاطوں کے ساتھ وہ پانی چھلکتا تھا، جب چھلکتا تھا تو کسی کے کپڑے بھیگ جاتے تھے، کسی نے کپڑے دھو کر کے بچھائے وہ بھیگ گئے، کبھی آدمی بیٹھے ہوئے ہیں، مجلس میں دلچسپ باتیں ہو رہی ہیں، کوئی قصہ کہہ رہا ہے، کوئی شعر پڑھ رہا ہے، وہ پانی اس پر گر جاتا تھا۔

انہوں نے ایک مرتبہ دو مرتبہ تین مرتبہ برداشت کیا، اور اس کے بعد کہنے لگے کہ بھئی یہ ہم سے نہیں برداشت ہوتا، یہ ہم سے نہیں دیکھا جاتا، پانی لے جائیں آپ اپنی ضرورت کے لیے، کپڑے ہمارے خراب ہوں؟ اور ہم پریشان ہوں؟ ہم پانی نہیں لے جانے دیں گے، ان لوگوں نے کہا: پانی کے بغیر گزارا کیسے؟ پہلے بہت سوچا، اس کے بعد انہوں نے کہا: بہت اچھا، پھر ہم اسٹیمر کا جو نیچے کا حصہ ہے اس میں ہم سوراخ کر لیتے ہیں، وہیں سے ہم بھر لیا کریں گے، وہیں پر ہم اپنے ڈول ڈالیں گے، اپنا برتن ڈالیں گے اور وہیں سے پانی بھر لیا کریں گے اور پی لیا کریں گے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر ان کی قسمت میں زندگی ہے اور اللہ نے ان کو سمجھ دی ہے، کچھ عقل عام ہے، Common Sense ہے، عقل عام تو بڑی چیز ہے، کچھ اپنی زندگی کی قیمت محسوس کرتے ہیں تو ہاتھ جوڑیں گے اور ان کا ہاتھ پکڑ لیں گے اور کہیں گے: خدا کے لیے معاف کرو، ہم ہی پانی پہنچا دیں گے تمہارے یہاں، لیکن تم یہ کام نہ کرو کہ سوراخ کر لو، وہیں سے پانی بھر لو، آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو وہ بھی بچیں گے، نیچے والے بھی بچیں گے، اوپر والے بھی بچیں گے، جہاز بھی بچے گا، اگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور ان کو کرنے دیا اور ضد و غرور میں آ گئے کہ ہم تو بالانشیں ہیں، ہم تو Upper Class Passengers ہیں، مرنے دو ان کو، یہ

سوراخ کریں گے، اور پانی انہیں کے یہاں آئے گا، تو جہاز ڈوبے گا، اور جب جہاز ڈوبے گا تو نہ اوپر والے بچیں گے نہ نیچے والے بچیں گے۔

جب آگ لگتی ہے تو سب کے گھر جلا کر خاک کر دیتی ہے

آج ہندوستان کا معاملہ یہی ہے، آج ہماری سوسائٹی اور پوری نوع انسانی کا جو اس وقت مغالطہ اور فراڈ ہے، اور جو ان کے غلط سوچنے کا طریقہ ہے، وہ یہی ہے کہ جب تک آگ ان کے گھر تک نہیں پہنچتی، سمجھتے ہیں کہ ہمارا گھر محفوظ ہے، ہمیں کوئی ضرورت نہیں، لیکن جب کہیں آگ لگتی ہے کسی گاؤں میں تو پھر وہ تمیز نہیں کرتی کہ یہ بڑے اسکالر کا گھر ہے یا بڑے عالم دین کا گھر ہے، آگ کچھ نہیں دیکھتی، جب آگ لگتی ہے تو سب کے چھپر اور سب کے گھر جلا کر خاک کر دیتی ہے، تو اس وقت ہماری بھی یہی حالت ہے کہ ہم سب اس جہاز کے سوار ہیں۔

آپ مجھے معاف کریں کہ ہمارے ملک میں بالکل یہی ہو رہا ہے، بے سمجھے ہو رہا ہو، یعنی ممکن ہے کہ یہ واقعہ آپ نے پہلے کبھی نہ سنا ہو، لیکن ہو یہی رہا ہے، اس وقت کی صورت حال یہی ہے کہ ہم آپ سب خدا کے فضل سے اپر کلاس کے مسافر ہیں، میں آپ کے اعزاز میں کہتا ہوں اور آپ کے احترام میں کہتا ہوں، خوشامد میں نہیں کہتا، اللہ نے آپ کو کھانے کو دیا ہے، پہننے کو دیا ہے، عزت دی ہے، آپ کی سوسائٹی میں بھی آپ کی عزت ہے، وقعت ہے، آپ کو بلایا گیا آپ یہاں آئے، ہم سب آپ کو محبت کی عزت کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں، ہم سب اپر کلاس کے مسافر ہیں، لیکن لوور کلاس کے لوگ جو کر رہے ہیں اس وقت ہندوستان میں یعنی پینڈے میں سوراخ کر رہے ہیں، جہاز کی سطح میں سوراخ کر کے اپنا کام نکالنا چاہتے ہیں، یہ لوور کلاس کے مسافر کون ہیں؟ یہ وہ Corrupt لوگ ہیں، جرائم پیشہ لوگ ہیں، کریمنل (Criminal) لوگ ہیں، وہ لوگ ہیں جو ملک کو بدنام کرتے ہیں، انسانیت کو بدنام کرتے ہیں، اور جن کو ملک کے ڈوب جانے کی کوئی فکر نہیں ہے، ان کا کام پورا ہو جائے، رشوت لے کر ملازمت مل جائے۔

احساس ذمہ داری کی ضرورت

اللہ نے ہم کو آپ کو دَرد دیا ہے، دل دیا ہے، دماغ دیا ہے، عقل دی ہے، اور شرافت دی ہے، مگر ہم اپنی اس ذمہ داری کو نہیں محسوس کر رہے ہیں، اور اس حقیقت کو نہیں سمجھ رہے ہیں کہ اگر ہم نے جرم کرنے والوں کا ہاتھ نہ پکڑا، ہم نے ان جرائم پیشہ لوگوں اور ظالموں، اور مذہب کو بدنام کرنے والوں، اور ملک کو

بدنام کرنے والوں، بلکہ ملک کو تباہ اور ملک کو ڈبونے کا کام کرنے والوں کا، اور آگ لگانے والے کا ہاتھ ہم نے نہیں پکڑا تو پھر آگ یہ نہیں دیکھتی کہ وہ کہاں تک پہنچ رہی ہے اور کون کون اس کی زد میں آ رہا ہے۔

خدا کے پیغمبروں کا مشن

بس میرے بھائیو! بات اتنی ہے کہ اس وقت ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کو ہمیں برداشت نہیں کرنا چاہیے، اور یہ خدا کے پیغمبروں اور خدا نے جن سے کام لیا ہے انسانیت کو بچانے کا، ہم میں ان میں یہی فرق تھا کہ ان کے اعصاب اور ان کے پورے دماغ پر یہ چیز حاوی ہو گئی تھی، یہ چیز ان کے اوپر پورے طور پر چڑھ گئی تھی، اور یہ فکر ان کے دل سے لگ گئی تھی، نہ کھانے میں مزہ آتا تھا نہ سونے میں مزہ آتا تھا ان کو کہ آخر اس ملک میں یہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ اس کا نوٹس (Notice) لیتے تھے، اور نوٹس ہی نہیں لیتے تھے بلکہ اس کے مقابلہ میں وہ خم ٹھونک کر مدمقابل بن کر کھڑے ہو جاتے تھے، آج اسی طبقہ کی کمی ہے۔

مذہبی طبقہ کی خصوصیات اور ذمہ داری

میں ابھی سوامی جی سے کہہ رہا تھا کہ ہمارا تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ جب فساد بہت بڑھ جاتا ہے، بگاڑ (Corruption) بہت بڑھ جاتا ہے، اور پیسے کی محبت جب حد درجہ بڑھ جاتی ہے، تو اس وقت مذہبی طبقہ میدان میں آیا کرتا ہے، اس لیے کہ لوگ ان کی عزت کرتے ہیں، وہی اپنے کیریکٹر سے اور خود اپنی قربانیوں اور اپنے ایثار سے جس کے لیے وہ خصوصیت رکھتے ہیں، اور مانے ہوئے ہیں کہ یہ لوگ وہ ہیں کہ جو دوسروں کو کھلا کر کھاتے ہیں یا دوسروں کو کھلا کر خود بھوکے رہتے ہیں، یہ کم سے کم پیسہ خرچ کرتے ہیں، یہ زیادہ سے زیادہ دوسروں کی خدمت کرتے ہیں، یہ خدمت لیتے نہیں یہ خدمت کرتے ہیں، اور ان کو انسانیت کا درد ہے، تو ایسے ہی موقع پر مذہبی طبقہ میدان میں آیا ہے، اور خدا سے انسانوں کی اس نسل کو اور اس ملک کے رہنے والوں کو بہت دنوں تک کے لیے باقی رہنے کی اجازت لے لیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان کی بات مانتا ہے، اور پھر ایک موقع دیتا ہے، اور ان کو پھر زندگی کی ایک قسط مل جاتی ہے، ورنہ وہ لوگ زندگی کا استحقاق کھو چکے ہوتے ہیں۔

اہم ضرورت

اب ضرورت ہے کہ اس وقت ہمارا مذہبی اور پڑھا لکھا طبقہ یہ دونوں میدان میں آئیں، اور وہ اس ملک کو ڈوبنے سے اور اسے تباہ ہونے سے بچائیں، اس لیے کہ اگر یہ ملک ڈوبا اور تباہ ہوا تو پھر

صاف سن لیجیے مجھ سے بغیر کسی لحاظ اور بغیر کسی ریزرویشن کے کہ نہ پھر مسلمان بچے گا نہ ہندو بچے گا، نہ شریف بچے گا نہ مزدور بچے گا، اور نہ کوئی دولت مند بچے گا، اور نہ کوئی منسٹر بچے گا، اور نہ کوئی اور اس سے اوپر بھی، آگے میں نام نہیں لینا چاہتا کہ جو بڑے سے بڑے حکومت کے ذمہ دار اور حکومتیں بناتے ہیں، اور پورے ملک میں جو حکمرانی کرتے ہیں، ان کی بھی خیر نہیں ہے، کسی کی بھی خیر نہیں ہے، اس لیے اس وقت تو میدان میں آنے کی ضرورت ہے، اور اس صورت حال سے آنکھیں ملانے بلکہ اس صورت حال سے پنجہ لڑانے کی ضرورت ہے، اور اس کا ہاتھ موڑ دینے یا توڑ دینے کی ضرورت ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ یہ کہ وہ جو اس کے ذمہ دار ہیں، اس خرابی کے ذمہ دار ہیں، وہ زندگی سے شہروں سے نکل جائیں، یا نکل نہ جائیں تو وہ توبہ کریں اور وہ عہد کریں کہ ہم اب ایسا کام نہیں کریں گے، اور ان کے دل میں اس کی برائی آجائے، یہ کام مذہبی طبقہ سب سے آسانی کے ساتھ کرسکتا ہے، پھر تعلیم یافتہ طبقہ کرسکتا ہے، یہاں اتنی یونیورسٹیاں اور اتنے کالجز ہیں اور ہمارے ملک میں کتنے پڑھے لکھوں کی تعداد ہے، اور یہ تعداد بتارہی ہے کہ کتنے پڑھے لکھے لوگ اور کتنے مہذب اور شائستہ لوگ ہیں ہمارے ملک میں، اور پھر سب کچھ ہو رہا ہے؟ اور کوئی اس کا روکنے والا نہیں؟

یک لحظہ غافل بودم

بس میں اپنی بات کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتا، یہی کہتا ہوں کہ اپر کلاس والے اوپر بیٹھے ہیں تو اس لیے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نہیں ڈوبیں گے، حالانکہ جہاز جب ڈوبے گا تو پھر اوپر اور نیچے کسی کی تمیز نہیں کرتا، پھر وہ سب کو لے کر ڈوبے گا، پھر اس وقت کوئی کتابیں رکھے ہوئے ہے اپنی گود میں، وہ کتابیں بھی ڈوبیں گی، اور اگر بچے ہیں اس میں تو وہ (خدا محفوظ رکھے) اور خواتین ہیں، عورتیں ہیں تو وہ بھی، اور اگر کوئی سونا لے جارہا ہے تو وہ سونے کے ساتھ ڈوبے گا، اور پھر اس وقت کچھ بچے گا نہیں، بس اس وقت کے آنے سے پہلے ضرورت ہے کہ ہمارا یہ مذہبی اور تعلیم یافتہ طبقہ میدان میں آئے اور اس صورت حال کا مقابلہ کرے، اور اس طوفان کو جلد سے جلد روکنے کی کوشش کرے، ورنہ یاد رکھیے کہ پھر اس ملک کو بچانے والی کوئی چیز نہیں ہوگی، اور یہ ہماری سب سے بڑی بے وفائی، غداری اور ہماری ناقدری ہوگی کہ اللہ نے ہمیں یہ ملک دیا، اس کی کیا تاریخ ہے، اس کا کیا کردار ہے، کیا اس کا ریکارڈ ہے، کیا تاریخی ریکارڈ ہے، کیا اس کے کارنامے ہیں، اللہ تعالیٰ کے کیا کیا انعامات ہیں اس ملک پر، یہاں کتنے بزرگ پیدا ہوئے، کتنے اچھے مفکرین اور مصلحین پیدا ہوئے، اس کا کتنا شاندار لٹریچر ہے، اگر ہم نے اس ملک کو نہ بچایا تو یہ ملک اپنی تمام خصوصیات

کے ساتھ ڈوب جائے گا، یہ دنیا کی سب سے بڑی ٹریجدی (Tragedy) ہوگی۔

امید کی کرن

حضرات! میں اپنی حقیقت جانتا ہوں، میں کیا ہوں اور میری زبان کیا اثر رکھتی ہے، اور میں کیسے کتنے آدمیوں کو اپنے ساتھ لے سکتا ہوں، لیکن اپنا فرض سمجھ کر کہ خدا کے سامنے مجھ سے سوال ہوگا اور ہم جس نبی کی امت ہیں اور ہمیں جو تعلیم دی گئی ہے، اس کو سامنے رکھتے ہوئے یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم یہ بات کہیں اور اس امید پر کہیں کہ یہ بات پھر ایک اکیلی زبان سے ایک اکیلے آدمی کی زبان سے نکلنے والی نہیں ہوگی، اور سینکڑوں زبانیں اور ہزاروں زبانیں اس کو دہرائیں گی، میں مایوس نہیں ہوں، مایوسی سے کوئی کام نہیں کرتا، میں ناامید نہیں ہوں، اور ضرور اس ملک میں وہ طبقہ کھڑا ہوگا، اور اس کے دل پہ چوٹ لگے گی، اور وہ بے چین ہوگا، اور اس ملک کو ڈوبنے سے بچائے گا، اس امید پہ (امید پہ دنیا قائم ہے) ہم بھی اسی امید کے ساتھ یہاں آئے ہیں، اور یہ علاقہ جو ہے یہ علاقہ بہت سی خرابیوں سے محفوظ بھی ہے، اور اس میں تعلقات بھی اچھے ہیں مختلف مذاہب والوں کے، اور اپنے اپنے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں، یہ زیادہ سیاسیات میں (Politics) میں بھی نہیں پڑے ہوئے ہیں، اس لیے اگر یہاں سے یہ آواز اُٹھے، یہاں سے یہ کوشش شروع کی جائے، ہمیں امید ہے کہ وہ بے نتیجہ نہیں رہے گی، اس کا ضرور نتیجہ نکلے گا، میں اسی کے ساتھ اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔ (۱)

---

(۱) ماخوذ از "ملت اسلامیہ کا مقام و پیغام" صفحہ ۱۹۲ تا ۲۰۱ طبع اول لکھنؤ ۲۰۰۵ء۔

۲۳

ملک ومعاشرہ کا سب سے خطرناک مرض ظلم وسفاکی(۱)

امیرؔ جمع ہیں احباب درددل کہہ لے

حضرات! ہم اس وقت لکھنؤ شہر میں ہیں، میں اپنی تقریر کا آغاز اسی لکھنؤ شہر کے ایک معروف شاعر امیر مینائی کے شعر سے کروں گا، ادب کے بہت سے طالب علم، شعروشاعری سے دلچسپی رکھنے والے اور تاریخ کا علم اور اس کا ذوق رکھنے والے حضرات ان کے نام سے واقف ہوں گے، وہ کہتے ہیں ؎

امیرؔ جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

اور اسی کے ساتھ میں اسی برصغیر(Subcontinent) کے قابل فخر اور مشہور ترین شاعروادیب اور فلسفی ومفکر علامہ اقبالؔ کا بھی شعر پڑھوں گا، وہ کہتے ہیں ؎

تاتو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ وفغاں نیز کنند

مطلب یہ ہے کہ آپ جاگ جائیں، اس لیے میرے دل سے ایک آہ ایک کراہ نکلی ہے، ورنہ عشق تو ایسا کام ہے کہ جو آہ وفغاں اور اظہار درد کے بغیر بھی کیا جاتا ہے اور کیا جاتا رہا ہے۔

بعض اوقات کسی مظلوم کی آہ سے پورے دور کا خاتمہ ہوگیا

حضرات! میں بہت معذرت کے ساتھ اتنا عرض کردوں کہ میں لکھنے پڑھنے والا آدمی ہوں، لیکن میری توجہ اور میری دلچسپی کا مرکز دو موضوع(Subjects) ہیں: ایک مذاہب اور اس میں بھی تقابلی مطالعہ(Comparative Study)، اور ایک تاریخ، اور تاریخ صرف ایک حصہ کی

---

(۱) بارہ دری، قیصر باغ لکھنؤ میں ۶ رجنوری ۱۹۹۳ء کو پیام انسانیت کے ایک عظیم جلسہ میں کی گئی تقریر۔

نہیں بلکہ تاریخ عالم (Universal History)۔ میں نے عربی، فارسی، اردو اور انگریزی میں اس کا بڑا ذخیرہ دیکھا اور پڑھا ہے، اسی مطالعہ کے نتیجہ میں مَیں اس حقیقت تک پہنچا ہوں کہ دنیا کے مذاہب میں سب سے زیادہ اگر کسی چیز پر اتفاق ہے تو وہ یہ کہ ظلم بری چیز ہے، اور ظلم اس دنیا کو پیدا کرنے والے کو پسند نہیں ہے، اور جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے وہ بتاتی ہے کہ ظلم سے بعض اوقات بڑی بڑی سلطنتوں کے چراغ گل ہو گئے ہیں اور معاشرہ پر بادِ خزاں چل گئی ہے، ان پر مکمل زوال آ گیا ہے، اور سارے علمی و ادبی کارنامے اور ذخیرے خاک میں مل گئے ہیں۔

تاریخ میں ایسی شہادتیں موجود ہیں کہ بعض اوقات کسی ایک مظلوم مرد کی آہ، اور کسی ایک مصیبت زدہ خاتون کی کراہ سے پورے دور کا خاتمہ ہو گیا ہے، جو بات سب سے زیادہ ملکوں کی خیر خواہی، سچی ہمدردی، حقیقت پسندی، انسانیت کے فرض کی ادائیگی بلکہ اس کے احساس کی ہے، (خواہ اس ملک میں کتنی ترقیاں ہوں اور اس ملک کی تاریخ خواہ کیسی رہی ہو اور اس میں کتنے وسائل و ذخائر ہوں) یہ ہے کہ ظلم نہ ہونے پائے، کسی کمزور آدمی کو روندا نہ جائے، کسی گھر کا چراغ بجھایا نہ جائے، کسی بے زبان عورت پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے، اور کسی مظلوم کی بددعا نہ لی جائے۔

کیا شکار بنانے کے لیے صرف انسان ہی رہ گیا ہے؟

میں آپ سے کہتا ہوں کہ اس بارہ دری کی (ہندوستان کو چھوڑیے، لکھنؤ شہر کے مقابلہ میں) کیا حقیقت ہے؟ لیکن اگر کچھ لوگ آ کر اس بارہ دری میں توڑ پھوڑ شروع کر دیں، کرسیاں پٹخنا شروع کر دیں، اور لوگوں پر حملہ آور ہو جائیں، اور یہ جو آپ آرائش کا سامان دیکھ رہے ہیں، اس کو برباد کرنا شروع کر دیں، تو اس کا ٹرسٹی، اس کا محافظ، اور اس کی دیکھ بھال کرنے والا اسٹاف برداشت نہیں کر سکتا، آپ کمہار کی دوکان پر جا کر دیکھیے (میں آسانی سے یہ مشورہ نہیں دوں گا، مجھے آپ سے ہمدردی ہے) لیکن میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ کمہار کی دکان پر تجربہ کیجیے، ایک کمہار کی کیا حقیقت ہے؟ اس کے مٹی کے برتنوں کی کیا حیثیت ہے؟ دو پیسے کی چیز ہے! لیکن آپ کمہار کی دوکان پر جا کر اس کے گھڑے توڑنے لگیے، اس کے بدھنے توڑنے لگیے، اس کے برتن پھوڑنے لگیے، تو وہ آپ کو آسانی سے جانے نہیں دے گا، وہ آپ کو روکے گا، اپنے برتنوں کو بچانے کی کوشش کرے گا، اور آپ پر حملہ آور ہو جائے گا، اسی طرح آپ کسی اور دکان پر چلے جائیے اور اس دکان کو لوٹنے لگیں، اس کا سامان اٹھا کر لے جانے لگیں، توڑ پھوڑ شروع کر دیجیے، اور اپنی طاقت کا مظاہرہ

کرنے لگیں، تو وہ برداشت نہیں کرسکتا، اگر وہاں زندگی کے آثار ہیں اور واقعی وہ کوئی مہذب جگہ ہے، پڑھے لکھے لوگ وہاں رہتے ہیں، تو پورا محلّہ آ کر کھڑا ہو جائے گا، گھر کے لوگ باہر آجائیں گے، پڑھنا لکھنا چھوڑ دیں گے اور آپ کا ہاتھ پکڑ لیں گے کہ اس غریب دکاندار کا کیا قصور ہے کہ آپ اس کی دکان اور اس کے سامان کو توڑ پھوڑ رہے ہیں اور جلا رہے ہیں؟ یہاں قریب ہی ایک لائبریری ہے، (۱) مجھے وہاں کے ایک ایک صفحہ کی قدر ہے، میری بہت سی تحریریں اور کاوشیں اس کی رہین منت ہیں، لیکن میں کہتا ہوں اور دل پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہوں کہ وہاں جا کر کوئی کتابیں پھاڑنے لگے، کیا حقیقت ہے کتاب کی، انسان کی لکھی ہوئی کتاب ہے، دوبارہ لکھی جاسکتی ہے، دوبارہ چھپ سکتی ہے اور کئی بار چھپ سکتی ہے، تو آپ کو اس ذخیرہ یا اس کے کسی حصہ کو تلف اور برباد کرنے کی کوئی اجازت نہیں دے گا۔

بس کیا آدمی ہی رہ گئے ہیں، ہمارے بھائی بند ہی رہ گئے ہیں، نسل انسانی کے افراد ہی رہ گئے ہیں جن سے ہمارا ملک آباد ہے، جن سے یہاں کی رونق قائم ہے، جن کی وجہ سے ہمارا ملک ملک کہلاتا ہے، جنگل نہیں کہلاتا، یہاں کوئی شکار کھیلنے نہیں آتا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ لکھنؤ ہے، تہذیب کا مرکز ہے، یہ اجودھیا ہے، یہ دہلی ہے، تاریخی شہر ہے اور ملک کا دار السلطنت ہے، بمبئی ہے، احمد آباد اور سورت ہے، کہاں تک شہروں کے نام لوں، کوئی آپ کو اجازت نہیں دے گا کہ آپ مٹی کے سامان کو، شیشے کے سامان کو اور ٹین کے سامان کو بھی برباد کرنے لگیں، تو کیسے یہ خیال آسکتا ہے کہ آدمی جسے اس دنیا کے پیدا کرنے والے نے کس محبت سے، اپنی قدرت وصنعت اور اپنی رحمت سے انسان بنایا، وہ انسان شکار بن جائے، اور کس کا شکار بن جائے؟ خود انسانی ہاتھوں کا شکار بن جائے، اور اس کا اس طرح شکار کیا جائے جس طرح شکاری جانوروں کا شکار کرتا ہے۔

سب سے زیادہ ڈرنے والی چیز

خلاصہ یہ ہے کہ اگر یہ سارے مذہب اگر کسی بات پر متفق ہیں تو اس پر کہ ظلم بہت بری چیز ہے، اور ظلم خالق کائنات کو ناراض کرنے والی چیز ہے، اور اس کی طرف سے ظلم کرنے والوں پر ایسی ایسی سزائیں، آفتیں اور مصیبتیں آتی ہیں جن کا پہلے سے تصور وتعین بھی نہیں کیا جاسکتا، اور ان کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، میں کہنا نہیں چاہتا، اسی ملک کا رہنے والا ہوں، میری زندگی بھی اسی ملک سے وابستہ ہے، مگر کہتا ہوں کہ ظلم کرنے والوں پر خدا کی طرف سے آفتیں آتی

(۱) امیر الدولہ لائبریری واقع قیصر باغ کی طرف اشارہ ہے۔

ہیں، زلزلے آتے ہیں، بجلیاں گرتی ہیں، گرانی بڑھتی ہے، قحط سالی آتی ہے، چیزیں نایاب ہو جاتی ہیں، بیماریاں بھی عام ہو جاتی ہیں، اور آگے مجھ سے نہ کہلوایئے۔

میں کہہ رہا ہوں کہ سب سے زیادہ ڈرنے والی چیز جو ہے وہ ظلم ہے، دنیا کے سارے مذاہب، سارے کلچر، سارے رفارمرس، سارے صوفی سنت اس بات پر متفق ہیں کہ انسان سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے اور ہر مذہب کا انسان، ہر شہر کا انسان، ہر ملک کا انسان، ہر برادری کا انسان، ہر نسل کا انسان، ہر طبقہ کا انسان، ہر سوسائٹی کا انسان، ہر قابلیت کا انسان، ہر صلاحیت کا انسان، مفید ہو یا غیر مفید، وہ خدا کی صنعت ہے اور خدا کی رحمت کا مظہر ہے، ہم اس کو Master Piece نہیں کہہ سکتے، ورنہ اس سے بڑھ کر Master Piece اور کیا ہو سکتا ہے؟

پورے پورے ملک اور عہد پر دورہ پڑ جانا کوئی انوکھی اور تعجب خیز بات نہیں

اب میں آپ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ آدمی بیمار ہو جاتا ہے، اس پر اعصابی اور جنون کا دورہ پڑ جاتا ہے، اور یہ دورہ فرد (Individual) پر بھی پڑتا ہے، سوسائٹی پر بھی پڑتا ہے، اور پوری قوم (Nation) پر بھی پڑ سکتا اور پڑتا ہے، اور تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ مرض کا یہ دورہ، جنون (پاگل پن) کا یہ دورہ، ظلم سفاکی کا یہ دورہ، انسان کی تحقیر و تذلیل کا یہ دورہ، صرف افراد ہی پر نہیں بلکہ پورے پورے معاشرہ، پوری پوری سوسائٹی، پورے پورے ملک اور پورے پورے عہد پر پڑا ہے، اور یہ دورہ پڑنا کوئی انوکھی اور تعجب خیز بات نہیں ہے، لیکن جو چیز ڈرنے کی ہے اور خطرناک بھی ہے، وہ یہ کہ اس دورہ کو دور کرنے والے اور اس بیماری کا علاج کرنے والے لوگ نہ ہوں، ہم نے انسانی تہذیب اور نسل انسانی پر ایسے بڑے بڑے دورے پڑتے ہوئے دیکھے ہیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ اب یہ تہذیب زندہ نہ رہ سکے گی، اور یہ نسل اب آگے نہ چل سکے گی، لیکن ہمت والے لوگ سامنے آگئے اور انھوں نے واقعات کا رخ بدل دیا، اس کی مثالیں میں آپ کو اپنے تاریخ کے مطالعہ کی روشنی میں ایک نہیں دس دے سکتا ہوں لیکن اس موقع پر میں صرف دو مثالیں دوں گا۔

ایک تو جب چین کی سرحد سے ترکستان کے تاتاری اٹھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب نسل انسانی سب کچھ کھو دے گی اور اب کچھ بھی باقی نہ رہے گا، معلوم ہوتا تھا کہ اب دنیا کو اپنا تہذیبی سفر دوبارہ شروع کرنا پڑے گا، کیونکہ سب کچھ برباد ہو جائے گا، نہ کتب خانے رہیں گے، نہ مدرسے رہیں گے، نہ دانشور رہیں گے، نہ پڑھے لکھے انسان رہیں گے، اور حد یہ تھی کہ وہ اٹھے تھے ترکستان

سے، لیکن یورپ میں لوگ ان سے ڈرتے تھے، یہاں چند تاریخی شہادتیں پیش کی جاتی ہیں جو یورپ کے مستند و مشہور مؤرخوں کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔

گبن (Gibbon) اپنی مشہور کتاب ''تاریخ انحطاط وسقوط روما'' (The Decline and Fall of the Roman Empire) میں لکھتا ہے:

''سویڈن کے باشندوں نے روس کے ذریعہ تاتاری طوفان کی خبر سنی، ان پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ وہ ان کے خوف سے اپنے معمول کے مطابق انگلستانی سواحل پر شکار کھیلنے کے لیے نہیں نکلے۔''(۱)

ایچ جی ولز (H.G. Wells) کا قول ہے کہ:

''اگر کوئی سیاسی پیشین گو ساتویں صدی کے آغاز میں دنیا کا جائزہ لیتا تو اس نتیجہ پر پہنچتا کہ صرف چند صدیوں کی بات ہے کہ پورا یورپ اور ایشیا منگولوں کے زیر اقتدار آجائے گا۔''(۲)

ہیرالڈ لیمب (Harold Lamb) لکھتا ہے:

''چنگیز خاں کی جہاں آشوبی و غارت گری نے تمدن کو ایسا سخت صدمہ پہنچایا کہ نصف دنیا میں تہذیب و شائستگی کو مر کر از سر نو جنم لینا پڑا، خوارزم کی سلطنت، بغداد کی خلافت، روس کی مملکت اور کچھ دنوں کے لیے پولینڈ (پولار) کی حکومتیں مٹ گئیں۔''(۳)

لیکن کیا ہوا؟ کچھ صوفیاء (سَنت لوگ) کچھ اہل دل اٹھے، انھوں نے کوشش کی، ان سے ملے، خدا کی یاد دلائی، اس کے غضب سے ڈرایا، ان کو انسان پر ترس کھانے کی تلقین کی، اور اپنے اخلاق سے، اپنی روحانیت سے، اپنی بے غرضی اور خلوص سے، اپنی ہمدردی نوع انسانی سے ان کے دلوں کو موہ لیا، ان کے دلوں کو بالکل ایسا نرم بنالیا کہ وہ بالکل موم ہوگئے، جس کے اتنے قصے ہیں کہ بیان نہیں کیے جاسکتے، ان صوفیوں اور درویشوں کا دولت سے بے پرواہ ہونے اور ان کے خلوص کی حد یہ ہے کہ چند بزرگوں کے علاوہ ان میں سے اکثر کے نام بھی تاریخ میں نہیں ملتے، انھوں نے اپنے

(۱) P. 16, Vol. Vll , 3rd Edition, London 1909 (ح)

(۲) A Short History of the World, London, 1924 p. 140 (ح)

(۳) Genghis Khan, London, p. 206, London, 1928 (ح)

نام بھی چھپائے، انھوں نے پوری تاتاری نسل کو آدمی بنادیا اور ایسا آدمی بنایا کہ ان میں مصنف بھی پیدا ہوئے، ان میں بڑے بڑے قانون داں پیدا ہوئے، بڑے بڑے بانیان سلطنت پیدا ہوئے، انھوں نے انسانی تہذیب کی حفاظت کی، اور صدیوں تک دنیا کی رہنمائی کرنے کے قابل ہوئے۔

اصل ڈرنے کی بات

تو میرے بھائیو! کسی ملک پر، کسی فرقہ پر اور مجھے معاف کیجیے، میں صاف کہوں گا کہ کسی کمیونٹی (Community) پر، کسی مکتب خیال (School of Thought) پر، کسی سوسائٹی پر، کسی Country اور سویلائزیشن (Civilization) پر، یہاں تک کہ کسی ایج (Age) پر، پورے پورے ایج (Age) پر اس دورہ کا پڑ جانا، اس کا بیمار ہو جانا اور جنون کا شکار ہو جانا کوئی بعید بات نہیں ہے، یہ بار بار ہوا ہے۔

لیکن اصل ڈرنے کی بات یہ ہے کہ اس دورے کے دور کرنے اور آدمی کو پھر آدمیت کے حدود میں لانے اور آدمی کو آدمی بنانے اور آدمی کو ظلم سے، خونریزی سے ڈرانے اور آدمی کی آدمی سے دل میں محبت پیدا کرنے، اور اپنے ملک کی سچی خیر خواہی اور سچی حب الوطنی، سچا نیشنلزم اور اپنے ملک کی محبت پیدا کرنے کی تعلیم دینے کے لیے کوئی پارٹی اور کوئی جماعت کھڑی نہ ہو، یہ چیز ڈرنے کی ہے۔

دورے تو پڑتے رہتے ہیں

ایک آدمی جو فلسفۂ تاریخ پر نظر رکھتا ہے، اور جس کی مذاہب کی تعلیمات پر بھی نظر ہے، جس نے آسمانی کتابیں پڑھی ہیں، جس نے روحانی شخصیات کے ملفوظات اور زبان سے نکلے ہوئے الفاظ پڑھے ہیں، وہ جانتا ہے کہ یہ دورے تو پڑتے رہتے ہیں، دولت پرستی کا دورہ پڑ گیا، خواہشات نفس کی پرستش کا دورہ پڑ گیا، اور آدمی سے بیزار ہونے اور آدمی کی صورت دیکھنے کا روادار نہ ہونے اور ظلم سے لطف اٹھانے، Enjoy کرنے کی بیماری پیدا ہو جائے، جن کو جائز تفریحات اور فطری لذتوں میں وہ مزہ نہیں آتا اور کسی دلکش گیت اور عمدہ نغمہ سننے میں مزہ نہیں آتا جو آدمی کو مارنے میں مزہ آتا ہے، یہ ایک بیماری ہے، انسانیت کی آخری حد تک گراوٹ ہے، اور آخری درجہ کی ذلت ہے، لیکن انسان اس کا شکار ہوتا ہے اور ہوا ہے، اگر کہہ دوں کہ ہزاروں بار شکار ہوا ہے تو غلط نہیں ہوگا، پوری پوری تاریخیں لکھی گئی ہیں ایک قوم کے ظلم پر، ایک سلطنت کے دوسری سلطنت کو

غلام بنانے پر، اور ظلم کے کئی کئی طریقہ نکالنے پر، اور انسان کشی اور انسان سوزی کے واقعات پر، مگر یہ سب تاریخ کی نذر ہو گیا، تاریخ کے سواڈھونڈنے سے نہیں ملے گا، صاف معلوم ہو رہا تھا کہ یہ چیز دور نہیں ہو سکتی، یہ قہر خداوندی ہے، جس رقبہ کی چیز تھی، اس کی جو حدیں تھیں، اس میں جو انسانی برادری آباد تھی، اب یہ پنپ نہیں سکے گی، یہ اب سر اٹھا کر عزت سے چل نہیں سکے گی، اس کے بچے پڑھ نہیں سکیں گے، اس کی خواتین اور عورتیں عزت کے ساتھ رہ نہیں سکیں گی۔

لیکن اچانک ہوا کا رخ بدلا اور بہار کا ایسا جھونکا آیا، روحانیت کا ایک ایسا جھونکا آیا اور قربانی دینے کا ایسا جذبہ پیدا ہوا کہ لوگوں نے اپنی جانوں کی پرواہ نہیں کی، اپنی عزتوں کی پرواہ نہیں کی، عہدے تو عہدے کیا ہیں، اپنی صحت کی، اپنی زندگی کی پرواہ نہیں کی، خوف کا بادل چھٹ گیا، وہ کہر دور گیا، وہ انسان جو بالکل عقل کھو بیٹھا تھا، حواس باختہ ہو چکا تھا، اور اس کے منھ کو خون لگ گیا تھا، اس کو کھانے میں وہ مزہ نہیں آتا تھا جو انسان کا خون بہانے میں مزہ آتا تھا، وہ انسان اور انسانیت کا محافظ بن گیا، جو رہزن اور حملہ آور تھا، وہ پاسبان اور چوکیدار بن گیا، جو قاتل تھا وہ معالج اور تیماردار بن گیا۔

ایک ایسا دور بھی گزرتا ہے کہ لوگ اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش نہیں ہو پاتے، اور آج بھی کہیں کہیں ایسا ہو رہا ہے کہ لوگ اپنے بچوں، پوتوں اور نواسوں کو دیکھ کر خوش نہیں ہوتے، بچے ہنستے ہوئے آتے ہیں کہ دیکھ کر پیار آ جائے، مگر پیار کے بجائے آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں کہ کل نہیں معلوم کہ ان کا کیا حشر ہوگا، کب ہسٹیریا کا دورہ پڑ جائے اور ان بچوں کو ان کے ماں باپ کے سامنے چیر پھاڑ کر رکھ دیا جائے، ہزار افسوس اور شرم ایسی زندگی پر کہ آدمی اپنے جگر کے ٹکڑوں کو، آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کی راحت کو، اور ہنستے مسکراتے بچوں، نواسوں، پوتوں اور پوتیوں اور پردہ نشیں خواتین کو جن پر کسی کا سایہ نہیں پڑا، جن پر آج تک کسی کی نگاہ نہیں پڑی، ان کو دیکھ کر یہ خطرہ محسوس کرے کہ معلوم نہیں کب جنون کا ایک دورہ آئے، دیوانگی کا ایک اُبال آئے، اور اس کے بعد نہ شریف عورت رہے، نہ معصوم بچہ معصوم بچہ رہے، نہ یتیم کو یتیم سمجھا جائے، نہ بے کس پر رحم کیا جائے، نہ بیوہ پر ترس کھایا جائے۔

جو چیز ہوتی ہے اس کا ذکر بھی کرنا پڑتا ہے

یہ ایک بیماری ہے، اور انسانی فطرت کے بالکل خلاف ہے، خدا کے پیدا کرنے کے منشا کے

خلاف ہے، اور خدا کے پیغمبروں، رسولوں اور ریفارمرس کی تعلیمات کے خلاف ہے، لیکن یہ ہوتا ہے اور جو چیز ہوتی ہے اس کا ذکر بھی کرنا پڑتا ہے، دل پر پتھر رکھ کر ذکر کیجیے، آنکھوں پر پٹی باندھ کر ذکر کیجیے، رو کر کہیے، چیخیں مار کر کہیے، کراہوں کے ساتھ کہیے، آہوں کے ساتھ کہیے، لیکن اس کو کہنا پڑتا ہے، اور کہنا ہی نہیں پڑتا، لکھنے پڑھنے والا آدمی ہوں، لکھنا بھی پڑتا ہے، تاریخ میں ایسے واقعات درج ہوتے ہیں اور آنے والی نسل انھیں دیکھتی ہے، اور کہتی ہے کہ یہ کون لوگ تھے؟ کس نسل کے لوگ تھے؟ کس علاقہ کے لوگ تھے؟ ان کو کیا ہو گیا تھا؟ ان کو یہ دیوانگی کا دورہ کیسا پڑا تھا؟ اور ان کی انسانیت کہاں چلی گئی تھی؟ اور کیا دل نکال کر انھوں نے پھینک دیا تھا؟ کیا آنکھیں انھوں نے پھوڑ لی تھیں؟ کیا ان کو کسی کے دکھ سے تکلیف نہیں ہوتی تھی؟ کیا انسان کے رستے ہوئے خون کو دیکھ کر ان کے آنسو نہیں نکلتے تھے؟ جہاں خون بہا ہے، وہاں کم سے کم آنسو تو بہنے چاہیے تھے، آنسو بہنے میں کیا لگتا ہے؟ آنسو بہنے میں کیا جاتا ہے؟ لیکن نہیں، وہ ایسے سنگ دل تھے کہ انسان کے جسم سے خون بہتے ہوئے دیکھتے رہے، اور ان کی آنکھ سے ایک آنسو نہیں ٹپکا، کیونکہ وہ انسان کو جانچتے تھے مذہب سے، اور مذہب ہی نہیں انسان کو جانچتے تھے تاریخی روایات سے، انسان کو جانچتے تھے افسانوں سے اور کہانیوں سے، انسان کو جانچتے تھے لوگوں کی افسانہ طرازیوں سے، جس پر سیکڑوں برس نہیں ہزاروں برس گزر گئے، لیکن وہ ان کے نزدیک ایک زندہ چیز تھی، اور وہ خدا جو حیّ وقیوم ہے، وہ ان کے نزدیک زندہ نہیں ہے؟

انسان ہی اس دنیا کی رونق و بہار ہے

وہ انسانیت جو دنیا میں پنپ رہی ہے، پھل پھول رہی ہے، گل کھلا رہی ہے، شاہکار بنا رہی ہے، کتابوں کے ڈھیر لگا رہی ہے، کتب خانے بھر رہی ہے، اور اب بھی اس کے اندر ذہانت کا خزانہ ہے، اب بھی اس کے اندر محبت کا خزانہ ہے، اب بھی اس کے اندر گل کا کھلانا ہے، یہ انسان جس سے دنیا کی بہار ہے، اگر انسان نہ ہو تو دنیا کی کیا قیمت ہے؟ انسان ہی سے اس کی بہار ہے، انسان ہی سے اس کی رونق قائم ہے، انسان ہی سے اس کی چمک دمک برقرار ہے، چلے جائیے آپ قبرستان میں، کیا آپ کا دل وہاں لگے گا؟ چلے جائیے عجائب گھروں میں، کیا وہاں رہنے کو دل چاہے گا؟ کیسے کیسے جانور ہیں، کیسی کیسی شاہکار اور صنعت کی چیزیں ہیں، لیکن وہاں آپ ٹھہر نہیں سکتے، دیکھیں گے اور چلے آئیں گے، لیکن انسان کی بستی سے انسان نہیں گھبراتا، جنگل سے گزرتا ہے تو ڈرتا ہوا، خدا سے دعا کرتا ہوا کہ خیریت سے گزر جائے اور انسانوں کے پاس صحیح

سالم پہنچ جائے۔

انسان جب بھیڑیا بن جائے تو آپ کا دل کیوں نہیں دکھتا؟

اگر انسان کو انسان سے محبت نہ ہو، انسان کو انسان کے دکھ درد کا احساس نہ ہو، انسان انسان پر ترس نہ کھائے، انسان انسان سے ہمدردی نہ کرے تو وہ انسان نہیں بھیڑیا ہے، اور کون ہے جو بھیڑیے کی تعریف کرتا ہے؟ اور کون ہے جو بھیڑیے سے نفرت نہیں کرتا ہے؟ اور کون ہے جس کا بھیڑیے کی برائی سے دل نہیں دکھتا ہے؟ اتنے بڑے مجمع میں ہے کوئی شخص جو یہ کہے کہ آپ بھیڑیے کی برائی کیوں کر رہے ہیں؟ لیکن جب انسان بھیڑیا بن جائے تو کیوں آپ کا دل نہیں دکھتا؟ کیوں آپ کے دل پر چوٹ نہیں پڑتی؟ اس کے نام سے نفرت کا اظہار کیوں نہیں ہوتا؟ انسان بھیڑیا بننے کے لیے بنایا گیا ہے؟ انسان تو فرشتہ بننے کے بنایا گیا ہے، انسان تو ولی بننے کے لیے بنایا گیا ہے، انسان تو ہمدرد خلائق بننے کے لیے بنایا گیا ہے، انسان کو تو اشرف المخلوقات کا درجہ دیا گیا ہے، اور ہماری شاعری، ہماری بول چال، ہمارے احساسات اور ہماری مجلسوں میں اسی حیثیت سے اس کا تذکرہ کیا گیا ہے، اور بھیڑیا بھیڑیا ہے، آج تک بھیڑیا ہے، اور سینکڑوں برس سے بھیڑیا ہے، اور میں نے نہیں دیکھا کہ کسی شاعر نے بھیڑیے کی شان میں قصیدہ کہا ہو، اور کسی صحیح الدماغ آدمی نے بھیڑیے کو اپنا ہیرو بنایا ہو اور اپنا آئیڈیل سمجھا ہو، سانپ بچھو سے تو ہم نفرت کریں، بھیڑیے اور تیندوے سے تو ہم نفرت کریں، شیر اور چیتے سے تو ہم نفرت کریں، اور وہی کام ہم کریں اور ہمیں شرم نہ آئے۔

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر

میں کہتا ہوں کہ ایک انسان کا ایک انسان پر ہاتھ اٹھتا کیسے ہے؟ اس ہاتھ کو دیکھنا چاہیے، اس کو ڈاکٹروں کے پاس لے جانا چاہیے، اس کی طبی جانچ کرانا چاہیے، اس کو کاٹ کر دیکھنا چاہیے کہ اس کے اندر کون سی چیز بھری ہوئی ہے اور کس کا خون اس کے اندر دوڑ رہا ہے، یہ ہاتھ انسان پر اٹھنے کے لیے نہیں بنایا گیا تھا، یہ ہاتھ بنایا گیا تھا انسان پر ظلم روکنے کے لیے، انسان خواہ یورپ کا ہو، انسان خواہ افریقہ کا ہو، انسان خواہ امریکہ کا ہو، اس پر جہاں بھی زیادتی ہو، ہمارا ہاتھ اٹھنا چاہیے اور زیادتی کو روکنا چاہیے، اگر گھر میں ہے تو وہاں بھی، راستہ چل رہا ہے تو وہاں بھی، بازار میں ہے تو وہاں بھی، مولانا حالی کہتے ہیں:

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّ و بیاں (۱)

اور ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی، اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْأَرْضِ یَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ۔ (۲) (رحم کرنے والوں پر وہ خدا رحم کرتا ہے جس کا نام ہی رحمٰن ہے، تم اہل زمیں پر رحم کرو، تم پر وہ رحم کرے گا جو آسمان میں ہے۔)

مولانا حالی نے اس کا ایک شعر میں خوب ترجمہ کیا ہے:

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

اور یہ وہ حدیث ہے جو حدیث کے حلقہ میں سب سے پہلے سنائی جاتی ہے، اور اہل علم جانتے ہیں کہ اس حدیث کو کتنی اہمیت دی گئی ہے۔

مایوس ہونے کی ضرورت نہیں

موجودہ صورت حال کے پیش نظر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، لیکن اس وقت سب سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ ہمارے مذہبی پیشوا اور ہمارے پولیٹکل لیڈر نکل آئیں، ہاتھ پکڑ پکڑ کر کہیں کہ اس ملک کی عزت رکھ لو، اس ملک کی شہرت پر بٹہ نہ لگاؤ، آدمی بن کر رہو، ایک دوسرے سے محبت کرو، زندگی کا سارا لطف اس میں ہے کہ آدمی آدمی کو دیکھے، آدمی آدمی کو پہچانے اور امید رکھے کہ ہم پر اگر کوئی آفت پڑے گی، ہم پر اگر کوئی مصیبت آئے گی تو یہ بچائیں گے، اسی کا نام زندگی ہے، اسی کا نام تمدن ہے، اور اسی کا نام حب الوطنی ہے، اور اسی کا نام سیاست بھی ہے، سیاست بھی یہی ہے کہ ملک میں سب مل جل کر رہیں۔

اس جنون کو دور کرنے والوں کی ضرورت

بس حضرات! میں یہ کہتا ہوں کہ ہمارے ملک میں اس وقت جنون کا جو دورہ پڑا ہے، دیوانگی کا جو دورہ پڑا ہے، جذباتیت کا جو دورہ پڑا ہے، مذہبی سیاسی استحصال (Exploitation) کا جو دورہ پڑا ہے، یہ دورہ ہے اور دورہ عارضی ہوتا ہے، یہ دورہ چلا جائے گا، مگر اس کے دور کرنے کے

---

(۱) اونچے درجہ کے فرشتے مراد ہیں۔ (ح)

(۲) جامع الترمذي، أبواب البر والصلة، باب ما جاء في رحمة الناس۔

لیے علاج کرنے والوں کی ضرورت ہے، ہمدردوں کی ضرورت ہے، دل رکھنے والوں کی ضرورت ہے، جو اپنے گھروں سے گھبرا کر نکل آئیں اور اس کا بھی خیال نہ کریں کہ ہم کیا کھائیں گے؟ کیا پئیں گے؟ اور دیوانے بن کر اس ملک میں پھریں، جتھے بنا بنا کر دورے کریں، عوام کو جمع کریں، اور ملک کے نام پر، انسانیت کے نام پر، عقل و انصاف کے نام پر، اور خدا کے خوف اور اس کی پہچان کے نام پر ان سے اپیل کریں کہ اب اسے ختم کرو، اب ٹھنڈے ہو جاؤ، اور جو تعمیری کام ہیں، ترقی کے کام ہیں، ملک کو بنانے والے کام ہیں، ملک کا نام روشن کرنے والے کام ہیں، اور ملک کی عزت بڑھانے والے کام ہیں، وہ کام کرو، یہ ملک بہت بدنام ہو چکا ہے، آپ کو شاید معلوم نہیں، لیکن میں آپ سے کہتا ہوں، مجھے یاد نہیں اور تاریخ کے اندر ریکارڈ موجود ہے، اس ملک پر کبھی ایسا دھبہ نہیں آیا تھا، اور یہ ملک باہر کی دنیا میں کبھی اس نظر سے دیکھا نہیں گیا تھا جیسا کہ آج کل دیکھا جا رہا ہے، اس میں ہم سب شریک ہیں، ہندو مسلمان سب شریک ہیں، اس لیے کہ ہم بھی ہندوستانی ہیں اور ہندوستانی رہیں گے ان شاء اللہ، ہندوستان ہمیں عزیز ہے، یہاں کی تاریخ ہمیں عزیز ہے، یہاں کا سویلائزیشن ہمیں عزیز ہے، اور مسلمانوں نے اس ملک کو چھوڑا نہیں، وہ کہیں بھی جا سکتے تھے، ان کے لیے بہت سی جگہیں تھیں، لیکن ان سے اپنا وطن چھوڑا نہیں گیا، اور نہ چھوڑا جائے گا، مگر اس کے لیے ہمت سے کام لیں، حوصلہ سے کام لیں، پاور سے کام لیں، تنظیم سے کام لیں، حکومتیں اپنا فرض انجام دیں، اسکول اور کالجز اپنا فرض انجام دیں، پولس اپنا فرض انجام دے، پریس اپنا فرض انجام دے۔

ایجوکیشن، پولیس اور پریس اگر درست ہو جائیں....

ملک کی تین چولیں اگر بیٹھ جائیں تو ملک باقی رہ جائے گا، اور وہ تین چولیں ہیں: ایجوکیشن، پولیس اور پریس۔ یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں کہ اگر یہ درست ہو جائیں تو پھر کوئی بڑا خطرہ نہیں ہے، آدمی پڑھ کر نکلے تو روشنی کا سبق پڑھ کر نکلے، انسان کی عزت کا سبق پڑھ کر نکلے، اور اس کے بعد پولیس، جس میں خدمت کا جذبہ ہو، تعاون کا جذبہ ہو، میں آپ سے صاف کہتا ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ یہاں پولیس کی کتنی نمائندگی ہے، لیکن میں ایک حقیقت بیان کرتا ہوں، میں کتنے ملکوں میں گیا ہوں، وہاں پولیس کو دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے، وہاں پولیس کو رہنما اور مددگار سمجھا جاتا ہے، مجھے خود اتفاق ہوا ہے کہ لندن میں ایک کانسٹبل سے پتہ پوچھ لیا تو پوچھ کر پچھتایا، صرف اتنا ہی نہیں کہ اس نے پتہ بتلایا، بلکہ ساتھ ساتھ چلا، اور پولیس وہاں ہے ہی اس کام کے لیے کہ زیادتی نہ

ہونے دے اور کمزور کی مدد کرے، اور یہی نہیں بلکہ رہنمائی کرے، انگریزوں نے اپنا رعب قائم کرنے کے لیے (کہ وہ سمندر پار سے آئے تھے) انھوں نے پولیس ایجنسی بنائی تھی کہ اس کے ذریعہ اپنا رعب قائم کریں، انگریزوں کو پولیس کے ذریعہ مرعوب کرنا تھا، اب آج کل اس کی کیا ضرورت ہے؟ آج کل تو یہ ہونا چاہیے کہ آدمی پولیس کو دیکھ کر خدا کا شکر ادا کرے کہ میں خطرہ میں پڑ گیا تھا، محلّہ خطرہ میں پڑ گیا تھا، عورتیں بڑے خطرہ میں پڑ گئی تھیں، بچوں کی جانیں خطرہ میں پڑ گئی تھیں، یہ پولیس والے تھے جنھوں نے بچایا، ایسا ہونا چاہیے تھا، یہ احساس عام ہونا چاہیے تھا، میں کہتا ہوں: ایجوکیشن، پولیس اور پریس تین چیزیں اگر درست ہو جائیں تو اس ملک میں اس طرح کے واقعات پھر نہیں ہو سکتے جس طرح کے ہوئے ہیں۔

بیماری پھیلنے سے نہ گھبرائیے

اس کے بعد میں کہتا ہوں کہ دورہ پڑنے سے نہ گھبرائیے، بیماری پھیلنے سے نہ گھبرائیے، انسان ہے، زندگی میں سب کچھ ہوگا، یہ نشیب و فراز ہیں زندگی کے، اتار چڑھاؤ ہے زندگی کا، لیکن ڈرنے کی بات یہ ہے کہ اس دورہ کا علاج کرنے کے لیے، اس بیماری کا ڈر ختم کرنے کے لیے، اس مریض کو بچانے کے لیے کوئی جماعت نہ ہو، کوئی آرگنائزیشن (Organization) نہ ہو، کوئی پارٹی نہ ہو، اور محبّ وطن، ہمدرد انسانیت، صاحب دل اور منصف مزاج لوگ نہ ہوں، کسی بھی ملک کے لیے خواہ اس کی زمین خزانہ اگلے، اس کا آسمان سونا برسائے، اور اس کے دریا سونے اور چاندی کے بن جائیں، اور اس ملک میں بے کمائے اور بے محنت کیے سب کو روزی ملے، اطمینان نہیں اگر آپس کے تعلقات درست نہیں، اگر ایک دوسرے پر اعتماد اور بھروسا نہیں۔

یہ کیا بات ہے ہم آدمی کو دیکھ کر گھبرائیں، گھبرانے کی چیز بھیڑیا ہے، گھبرانے کی چیز تیندوا ہے، گھبرانے کی چیز سانپ ہے، گھبرانے کی چیز بچھو ہے، گھبرانے کی چیز آدمی نہیں ہے، کیا یہ آدمی اس لیے پیدا ہوا تھا کہ آدمی آدمی کو مارے؟ آدمی کے لیے اور اندیشے اور خطرات کیا کم تھے؟

میں کہہ رہا تھا کہ ان تاتاریوں کو جس نے آدمی بنایا، قانون کا احترام دیا، تہذیب کا محافظ بنایا، وہ اللہ والے لوگ تھے، وہ دل والے لوگ تھے، وہ روحانی لوگ تھے، ہندوستان کا آزاد کرانا آسان نہ تھا، آپ دیکھیے، انگریزوں کی سلطنت، برٹش ایمپائر (British Empire) کہاں تک تھی؟ ہم نے بچپن میں یہ مثل سنی تھی کہ "انگریزوں کی سلطنت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا"، کہیں نکلو گے کوئی نہ کوئی کونا ایسا مل جائے گا جہاں آفتاب روشن ہوگا، یہاں سے لے کر عدن تک

ان کی حکومت تھی، اور یہ ایک خواب تھا کہ کبھی یہ ملک آزاد ہوگا، لیکن ہندو مسلمان جو محبانِ وطن تھے، انھوں نے گاندھی جی کے ساتھ، مولانا ابوالکلام آزادؒ کے ساتھ، مولانا محمد علیؒ اور مولانا شوکت علیؒ کے ساتھ، مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے ساتھ، اور ان کے بعد مولانا حسین احمد مدنیؒ اور نہرو خاندان کے ساتھ یہ نعرہ دیا کہ انگریزوں کا بائیکاٹ کرو، گاندھی جی اور مولانا آزاد سب سے آگے آگے تھے، اور اس وقت ہندو اور مسلمان اپنے کلچر کے اختلاف کے باوجود، اپنی زبان کے اختلاف کے باوجود اس طرح باہم مربوط تھے اور اس طرح ملے ہوئے تھے جس طرح گھی اور شکر اور دودھ اور پانی ملا ہوتا ہے، میرا شروع کا زمانہ تھا، میں نے امین آباد پارک میں گاندھی جی کی تقریر سنی ہے، میں نے موتی لال نہرو کو دیکھا ہے، مولانا آزاد سے تو ہمارے پرانے تعلقات تھے، ان لوگوں نے مل کر اَن ہونی بات ہونی کردی کہ ہندوستان آزاد ہوا، اس وقت کوئی کہتا تو اس سے کہا جاتا کہ میاں! اپنے دماغ کا علاج کراؤ، اپنے ہوش وحواس کا علاج کراؤ، نارمل حالات میں ہو؟ انگریزوں کو کوئی نکال سکتا ہے؟ لیکن یہ ہندو مسلم اتحاد تھا، یہ حب الوطنی اور ملک کی محبت تھی جس نے انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا۔

سیکولرزم، ڈیموکریسی اور عدم تشدد

اس کے بعد تین چیزیں تھیں، گاندھی جی نے اور ان کے ساتھیوں نے اور مولانا آزاد نے (مولانا آزاد سب سے نمایاں اور سب سے آگے ہیں) تین چیزوں کو پیش کیا تھا کہ تین شرطیں ہیں، جب تک یہ رہیں گی ہندوستان آزاد رہے گا، پُرامن رہے گا، خوش حال رہے گا، اور محبت کا گہوارہ رہے گا، ایک سیکولرزم (Secularism)، ڈیموکریسی (Democracy) اور نان وائیلنس (Non-violence)، یہ تین چیزیں ہیں، جو ضروری ہیں ملک کی بقا کے لیے، یہ رہیں گی ملک رہے گا، اسکالرز (Scholars) بھی سن لیں، ہسٹورین (Historian) بھی سن لیں، اور سب سن لیں اور لوح دل پر محفوظ کرلیں، کچھ بھی ہوجائے یہ ملک ان تین چیزوں کے بغیر نہیں رہ سکتا، آج میں پھر کہتا ہوں کہ ملک تین چیزوں پر باقی رہ سکتا ہے، ایک یہ کہ ڈیموکریٹ اسٹیٹ (Democrat State) ہو، نان وائیلنٹ (Non Violent) ہو، اور سیکولر (Secular) ہو، اس لیے کہ تقدیر الٰہی نے یہ فیصلہ کردیا ہے (اور خدا کا فیصلہ کوئی بدل نہیں سکتا) اس ملک میں ہندو بھی رہیں گے اور مسلمان بھی، جینی بھی رہیں گے اور بودھ بھی، سکھ بھی رہیں گے اور عیسائی بھی، اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا کیوں باہر سے بھیجتا؟ کیوں یہ آسانی پیدا ہوتی؟ یہ

ملک اسی طرح رہ سکتا ہے کہ یہ ملک سیکولر ہو۔

تاریخ کو الٹا سفر کرانا بڑی غلطی ہے

عرب شاعر کہتا ہے کہ ”جب آگ کو کچھ اور کھانے کو نہیں ملتا تو اپنے کو کھانے لگتی ہے“، یہ اسلام سے پہلے کی شاعری میں ہے کہ آگ اپنے کو کھانے لگتی ہے اگر اسے کچھ کھانے کو نہ ملے۔ میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ آج اگر آپ نے مسلمانوں سے- خدانخواستہ کس منہ سے کہوں مگر کہنا پڑتا ہے- فرصت کرلی، آپ نے مسلمانوں کے عزیز اور مقدس مقامات کو اپنی تحویل میں لے لیا تو یاد رکھیے، پھر یہ اختلاف آپ کے اندر چلے گا، یہ بیک ورڈ کلاسز (Backward Classes) ہیں، جینی ہیں، بدھسٹ ہیں، کھڑے ہو جائیں گے، اور کہیں گے کہ ہماری عبادت گاہیں واپس کرو، آٹھویں صدی عیسوی میں ساؤتھ میں شنکر آچاریہ پیدا ہوئے تھے، انھوں نے تمام بودھ عبادت گاہوں کو ہندو مندروں میں تبدیل کر دیا تھا، میں نے وہاں جا کر دیکھا ہے، میں نے نالندہ کی بدھسٹ یونیورسٹی بھی دیکھی ہے جو کھدائی میں نکلی ہے، اور جگہ جگہ میں نے دیکھا ہے کہ جینیوں کے ہزاروں مندر بدل گئے، بدھوں کے سیکڑوں ہزاروں مندر ہندوؤں کی تحویل میں چلے گئے۔

راجیو جی سے لے کر جو پرائم منسٹر آیا، میں نے اس کو خط لکھا، میرے وہ خط چھپے ہوئے ہیں، میں نے لکھا کہ تاریخ کو الٹا سفر نہ کرائیے، تاریخ کو الٹا سفر کرانا بڑی غلطی ہے، تاریخ کو آگے بڑھائیے، فرصت کہاں ہے اتنی، کتنے دن کی زندگی ہے، کتنے ہمارے وسائل و ذرائع ہیں، اور کتنے مواقع و امکانات ہیں، اور دنیا میں کیسے کیسے حوادث پیش آرہے ہیں، اور کتنے لوگ ہیں جن کی عمریں سو سے متجاوز ہوتی ہیں، پھر کیوں وقت ضائع کیا جا رہا ہے؟ کیوں تاریخ کو الٹا سفر کرایا جا رہا ہے؟ کیوں اپنی طاقت، اپنی Energy، اپنی صلاحیت اور اپنی قابلیت کو برباد کیا جا رہا ہے، تاریخ کو آگے بڑھائیے، ملک کو آگے لے جائیے، یہ کیسا دورہ ہے کہ ملک کو پیچھے لے جانے کی کوشش کی جارہی ہے، اگر یہ ہوتا رہا کہ پہلے یہ تھا وہ تھا، پھر اس سے فرصت نہیں ملے گی، اور پھر ایسی خرابیاں پیدا ہوں گی کہ جینے کا مزہ نہ رہے گا، ہندوستان کا نام ڈوب جائے گا، اس کے نام پر خاک پڑ جائے گی، اور یہاں جو ہیروز (Heroes)، تھنکر (Thinker) اور فلاسفر پیدا ہوئے ہیں، وہ سب چھپ جائیں گے اور سامنے صرف یہ رہے گا کہ وہ ہندوستان جہاں آدمی جلایا جاتا ہے، وہ ہندوستان جہاں آدمی کو ٹکڑے ٹکڑے کیا جاتا ہے، وہ ہندوستان جہاں آدمی کو آرا مشین میں لکڑی کی طرح چیر دیا

جاتا ہے، وہ ہندوستان جہاں معصوم بچوں کو چلتی ٹرینوں سے اٹھا کر باہر پھینک دیا جاتا ہے۔

یہ باتیں خدا کو پسند نہیں، آپ ستاروں تک پہنچ جائیں، چاند تک پہنچ جائیں لیکن جیسے ایک انڈین فلاسفر نے کہا تھا، سی ایم جوڈ (C. M. Joad) نے لکھا ہے، وہ لندن میں فلاسفک ڈیپارٹمنٹ کا ہیڈ تھا، اس نے لکھا ہے اور یہ بات ہندوستانیوں کے لیے فخر کی ہے، اس نے لکھا ہے کہ ایک انڈین فلاسفر آئے، غالباً رادھا کرشنن تھے، وہ آئے، ہمارے یہاں کے ایک بڑے ذہین اور بولنے والے نے کہا: آپ کو خبر ہے ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے، ہم چاند پر پہنچ گئے، ہم نے یہ مسافت اتنے گھنٹوں میں طے کر لی، ہم ایک براعظم کے فلاں کنارے سے دوسرے براعظم تک ہوائی جہاز سے پہنچ گئے، پہلے وہ سنتے رہے، پھر سب سننے کے بعد انھوں نے کہا کہ ہاں پانی پر تم مچھلیوں کی تیرنے لگے، اور فضا میں چڑیوں کی طرح اڑنے لگے، مگر زمین پر آدمیوں کی طرح تم کو چلنا نہیں آیا، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے اس بات کو کوڈ کیا ہے، جامعہ کی پچاس سالہ جبلی میں میں بھی وہاں موجود تھا، کہ جو بچہ دنیا میں آتا ہے وہ اس بات کا ثبوت لاتا ہے کہ خدا انسان سے مایوس نہیں ہے، ورنہ اس بچہ کو دنیا میں نہ بھیجتا، مگر ہمارا فعل بتاتا ہے (اس زمانے میں دہلی میں خنجر زنی کی ایسی وارداتیں ہو رہی تھیں) کہ ہم انسانوں سے مایوس ہیں، خدا مایوس نہیں، اگر وہ مایوس ہوتا تو بچہ کو اس دنیا میں نہ بھیجتا۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

آپ انسان کو آزما کر تو دیکھیے، کہ وہ ہے کیا چیز، اسے آزمائیے تو، اس کو خدا نے وہ دل دیا ہے جو اپنی مخلوقات میں کسی کو نہیں دیا، میں یہ کہہ دوں، مذہب کا جاننے والا اور مذہب کا لکھنے والا ہونے کے باوجود کہ یہ دل فرشتوں کو بھی نہیں دیا گیا، خدا نے جو دل انسان کے درد میں جلنے والا، پگھلنے والا، تڑپنے والا، آنکھوں سے آنسو بہانے والا، اور خدا سے مانگنے والا، اس کے سامنے گڑگڑانے والا دل انسان کو دیا ہے، وہ کس کو دیا ہے؟ یہ انسان تو اس قابل تھا کہ اس کو آنکھوں میں بٹھایا جائے، سر پر جگہ دی جائے، اپنے گھر میں اس کو رکھا جائے کہ ہمارا بھائی ہے، لیکن اسی انسان پر ہاتھ اٹھتا ہے، اسی انسان کو روندا جاتا ہے، کمزور عورتوں اور معصوم بچوں کو ظلم کا نشانہ بنایا جاتا ہے، بمبئی، احمد آباد اور خاص طور پر سورت میں آپ دیکھیے کہ کیا ہوا، رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، میں آپ سے صاف کہتا ہوں، مجھے بہت جگہ جانا ہوتا ہے، میرے دوست احباب ہر جگہ ہیں، کہہ نہیں سکتا وہاں جو ہوا، عورتوں کو برہنہ کر کے سڑکوں پر چلایا گیا، ان کے ساتھ بُرا سلوک کیا گیا، اور اس

کے بعد گولی تک ماردی گئی، یہ کسی طرح سے نہ مذہب کے شایانِ شان ہے، نہ انسانیت کے، نہ علم کے، نہ عقل کے، نہ شرافت کے، اور نہ ہندوستانیت کے، آپ کو پتہ نہیں کہ ہندوستان کو باہر کی دنیا میں کس نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اور اس کو کیا مقام ملا ہوا تھا، یہاں اللہ کے ایسے ایسے بندے پیدا ہوئے، بتانے پر آؤں تو شام ہو جائے لیکن آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔

ہر ملک و تہذیب اور ہر عہد کے لیے خطرناک بات

آخر میں پھر یہ کہتا ہوں، پتے کی بات ہے، نوٹ کرنے کی بات ہے، بیماری ڈرنے کی چیز نہیں ہے، بیماری کا علاج کرنے والوں کا نہ ہونا ڈرنے کی چیز ہے، بیمار کی بیماری دیکھ کر تڑپنے والوں کی کمی، بیمار کی بیماری دیکھ کر علاج کا جذبہ رکھنے والوں کی کمی، یہ بات ہر ملک، ہر سوسائٹی، ہر تہذیب اور ہر عہد کے لیے خطرناک ہے، اور یہ دنیا جو اب تک باقی ہے، یہ انھیں علاج کرنے والوں کی بدولت باقی ہے، اولاً پیغمبروں کی برکت سے، پھر صوفیوں اور دل والوں، ہمدردوں اور انسان دوستوں کی برکت سے قائم ہے، جنھوں نے اپنا آرام چھوڑا، کھانا پینا بھول گئے، گھر والوں کو بھول گئے، اور انسانوں کو دکھ سے بچانے کے لیے، اور انسانوں کو انسانوں کے خنجر سے محفوظ رکھنے کے لیے، اور انسان دشمنی کا علاج کرنے کے لیے گھروں سے باہر آگئے، فاقے کیے، جاگ کر راتیں گزاریں، جان کو خطرہ میں ڈالا اور دیوانہ وار نکل پڑے، آج اس ملک میں اسی کی ضرورت ہے۔

ہم امید کرتے ہیں، ہمارے یہ معزز بھائی جو یہاں اسٹیج پر بیٹھے ہوئے ہیں، اور بہت سے معزز بھائی جن کو اسٹیج پر جگہ نہیں ملی، یہ لوگ ہمت کر کے اور دوسرے پولیٹکل لیڈر اور مذہبی پیشوا باہر نکلیں، اور اس صورت حال کو ختم کرنے کی کوشش کریں کہ اب یہ دوبارہ نہ ہونے پائے، کچھ بھی ہو جائے یہ نہ ہونے پائے، خدا اس سے خوش ہوتا ہے کہ آپ اس کا نام لیں، آپ اس کے بندوں کی خدمت کریں، خدا کو اس سے خوشی ہوتی ہے، اور یہ بنا دیا وہ بنا دیا، خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے، انسانوں ہی کے لیے اس نے سب چیزیں بنائی ہیں، یہاں تک کہ مسجد و مندر بھی انسانوں ہی کے لیے ہیں، کیا وہاں جا کر جانور عبادت کرتے ہیں؟

میں نے آپ کا بہت وقت لیا لیکن پھر میں وہ شعر پڑھوں گا امیرؔ مینائی کا کہ

امیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

نہ زندگی کا بھروسا، نہ ہمارے آپ کے جمع ہونے کا اطمینان، نہ اس معتدل زندگی کا یقین کہ

آپ اس تعداد میں جمع ہوں جس تعداد میں آج جمع ہوئے، شاید کسی کے دل کو لگ جائے اور کوئی کھڑا ہو جائے، پھر اس کے ساتھ اور لوگ بھی چلیں گے اور ملک کی صورت حال - جو شرمناک بھی ہے اور دردناک بھی - بدلے گی، اللہ ہمیں توفیق دے، آمین! (۱)

(۱) یہ تقریر حلقۂ پیام انسانیت، لکھنؤ سے متعدد بار علاحدہ رسالہ کی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔

﴿۲۴﴾

ملک کی آزادی کا صحیح مطلب اور فائدہ (۱)

بھائیو اور دوستو! ہمارے چھوٹے وطن رائے بریلی اور بڑے وطن ہندوستان کے رہنے والو! میں بے تکلف کہتا ہوں کہ مجھے فخر ہے کہ وقت کی اہم ضرورت اور وقت کے تقاضے پر ہمارے شہر رائے بریلی میں ایک آواز پر اتنا بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا، میرے لیے بڑے فخر کی بات ہے، یہ رائے بریلی کی تاریخ کے لحاظ سے بھی (جس کا میں ایک طالب علم بھی ہوں اور مصنف بھی) رائے بریلی کے شایانِ شان ہے، اس رائے بریلی کا نام آپ تاجکستان وترکستان اور ترکی میں جا کر لیں، افغانستان میں جا کر لیں، بہت سے عرب ممالک میں جا کر لیں، یورپ اور امریکہ کے ان حلقوں میں لیں جو اصلاحی تحریکوں اور ملکوں کی آزادی کی کوششوں کی تاریخ اور تحریکات سے واقف ہیں، اور اس موضوع پر لکھتے پڑھتے ہیں، تو وہ رائے بریلی کے نام سے واقف نکلیں گے اور احترام وتوجہ کے ساتھ پیش آئیں گے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ اور تحریک آزادیٔ ہند

یہ کیوں؟ یہ شہر ہندوستان کا کوئی بہت بڑا شہر نہیں ہے، اور یہاں آثار قدیمہ اور قابل دید مقامات بھی نہیں ہیں، یہ بات صرف اس وجہ سے ہے کہ یہاں بعض بڑی باعظمت شخصیتیں پیدا ہوئیں، اور یہ بعض ایسی شخصیتوں کا وطن اور جائے پیدائش ہے جنھوں نے ہندوستان کو آزاد کرانے کی سب سے پہلے اور سب سے بڑی کوشش کا آغاز کیا، میری مراد حضرت سید احمد شہیدؒ سے ہے جو یہیں (اس مقام سے کچھ فاصلہ پر) پیدا ہوئے، اور انھوں نے انگریزی حکومت کے خلاف جدو جہد شروع کی، اور ایک ایسی جماعت تیار کی جو اپنے اخلاق وسیرت، خداترسی وانسان دوستی، عالی

---

(۱) ۸ر فروری ۱۹۹۳ء کو شہر رائے بریلی میں گورنمنٹ کالج کے وسیع میدان میں منعقد ایک جلسہ میں کی گئی تقریر۔

ہمتی و بلند نگاہی، جان سپاری و سرفروشی میں دور دور تک اور دیر دیر تک بھی اپنی نظیر نہیں رکھتی، اس کام کے لیے انھوں نے ہندوستان کے والیانِ ریاست اور اہلِ اثر و اقتدار کو بھی آواز دی، ان کی انسانی غیرت، وطن دوستی اور خطرہ کے احساس کو بیدار کرنے کی کوشش کی، اس کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں:

وہ راجہ ہندوراؤ (وزیر گوالیار) کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

”جناب کو خوب معلوم ہے کہ یہ پردیسی سمندر پار کے رہنے والے[۱] دنیا جہاں کے تاجدار، اور یہ سودا بیچنے والے سلطنت کے مالک بن گئے، بڑے بڑے اہلِ حکومت کی حکومت اور ان کی عزت و حرمت کو انھوں نے خاک میں ملا دیا ہے، جو حکومت و سیاست کے مرد میدان تھے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں، اس لیے مجبوراً چند غریب اور بے سروسامان کمر ہمت باندھ کر کھڑے ہوگئے۔“[۲]

ریاست گوالیار کے ایک معتمد اور اعلیٰ عہدے دار غلام حیدر خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

”ملک ہندوستان کا بڑا حصہ غیر ملکیوں کے قبضہ میں چلا گیا ہے، اور انھوں نے ہر جگہ ظلم و زیادتی پر کمر باندھی ہے، ہندوستان کے حاکموں کی حکومت برباد ہوگئی، کسی کو ان کے مقابلہ کی تاب نہیں؛ بلکہ ہر ایک ان کو اپنا آقا سمجھنے لگا ہے، چونکہ بڑے بڑے اہلِ حکومت ان کا مقابلہ کرنے کا خیال ترک کر کے بیٹھ گئے ہیں، اس لیے چند کمزور اور بے حقیقت اشخاص نے اس کا بیڑہ اٹھایا۔“[۳]

۱۸۵۷ء میں انگریزی اقتدار کے خلاف اور پورے ہندوستان کے انگریزی حکومت کی غلامی میں آجانے کے اندیشہ کے پیش نظر جس جنگ آزادی کا آغاز ہوا، اور جس میں اس ملک کے باشندے عمومی طور پر شریک ہوئے، اور جس کو انگریزوں اور ان کی نقالی کرنے والوں نے غدر (Mutiny) کا نام دیا ہے، جو ابھی تک چلا آرہا ہے، اس کے بارے میں مشہور انگریز مصنف

(۱) انگریز مراد ہیں، جنھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں ہندوستان پر اپنا اقتدار جمانا شروع کر دیا تھا، اور اس کی سیاست میں دخیل ہوگئے تھے۔ (ح)

(۲) ماخوذ از مجموعۂ خطوط حضرت سید احمد شہیدؒ بزبان فارسی۔ (ح)

(۳) ایضاً۔ (ح)

سر ولیم ہنٹر (Sir William Hunter) نے صاف طور پر لکھا ہے کہ:

''۱۸۵۷ء کے غدر میں سید صاحب کی تحریک جہاد کی بچی کھچی چنگاریاں کام کر رہی تھیں۔''(۱)

ہندوستان کی جنگ آزادی کی کامیابی کا جو شہرہ ہوا، اور دنیا میں اس جدو جہد اور اس کے مخلص اور صاحب بصیرت رہنماؤں کو جو عزت ملی، ان کے کارنامہ کا جس طرح اعتراف کیا گیا، اور معاصر دنیا اور محکوم ملکوں کے لیے وہ جس طرح ایک شاندار نظیر اور ہمت افزا کارنامہ بن گیا، اس نے جس طرح ہندو مسلم اتحاد کا، ترک موالات (Non Co-operation) جیلوں کے بھر دینے اور قربانیوں کے نمونے پیش کرنے کا منظر دنیا کے سامنے پیش کیا، اس نے ہندوستان کا نام روشن کیا اور دنیا کے کئی ملکوں نے جو آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے، اس کو اپنے لیے نمونہ اور قابل تقلید مثال سمجھا، آج بھی بہت سے ایشیائی و مشرقی ملکوں میں ہندوستان کا نام بڑی عزت سے لیا جاتا ہے، اور جنگ آزادی کے سورماؤں (Freedom Fighters) کو بڑے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

ملک کی آزادی کی اس نعمت اور کارنامہ کا حق یہ تھا کہ ہم ہر قیمت پر اور ہر طرح کی قربانی دے کر اس کی حفاظت کریں، اور اس کی آبرو اور عزت قائم رکھیں، اس پر ہر دور میں اور ہر جگہ فخر اور شکر کے جذبات کا اظہار کیا جائے، غلامی کے دور کے تصور سے ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں، اور ہمارے اندر کراہت و حقارت، نفرت اور ''گھن'' کا ایک جذبہ پیدا ہو، اور ہم کسی حال میں اس دور کے واپس آنے کا تصور اور اس کو ترجیح دینے کا تخیل بھی گوارا نہ کرسکیں۔

آج غلامی کے دور کو یاد کیا جانے لگا ہے

لیکن میں اب دل پر پتھر رکھ کر اور اپنے ضمیر (Conscience) اور سامعین سے معذرت کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ آج ہمارے ملک کی جو حالت ہو رہی ہے اور خاص طور پر (۶ / دسمبر کے بعد سے) ہندوستان کے کئی بڑے بڑے شہروں میں اپنے ہم وطنوں اور ملکی بھائیوں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا، جس سفاکی اور بے دردی کے ساتھ ہزاروں آدمیوں کا خون بہایا گیا، گھر اور دکانیں لوٹی گئیں اور جلائی گئیں، عورتوں کی بے عزتی کی گئی، بچوں کو مٹی کے برتنوں کی طرح توڑا اور خاک میں ملا دیا گیا، کروڑوں اور اربوں کا سرمایہ لوٹا گیا اور ضائع کیا گیا، میدانِ جنگ کی طرح خوف و ہراس کی فضا باغ و بہار شہروں اور تماشا گاہ بستیوں پر ہفتوں طاری رہی، اس نے ملک کو ایک ایسی

(۱) The Indian Musalmans (ج)

منزل پر کھڑا کر دیا کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد غلامی کے دور کو یاد کرنے لگی، اور اس زمانہ کو نہ صرف ترجیح دینے لگی؛ بلکہ اس کی آرزو کرنے لگی، جب ملک میں ہر طرف امن و امان کا دور دورہ تھا، عزتیں اور عصمتیں محفوظ تھیں، بچوں پر کوئی بری نگاہ نہیں ڈال سکتا تھا، ساری خرابیوں اور بد کرداریوں کے ساتھ اور اس حقیقت کے ساتھ کہ سات سمندر پار کے رہنے والے انگریزوں کو اس ملک پر حکومت کرنے کا ہرگز حق نہ تھا، اور وہ ایک بدیسی راج تھا جو یہاں سے دولت حاصل کر کے اپنے ملک کو منتقل کرتا تھا، عام شہریوں کو اس کا اطمینان تھا کہ وہ محفوظ ہیں، پولیس اور فوج ڈرنے کی چیز نہیں تھی، وہ کرایہ کے ٹٹو تھے اور بدیسی حکومت کے غلام؛ لیکن ان میں اپنے ہم مذہبوں اور اپنی ذات برادری کی حمایت و ترجیح کا جذبہ نہیں تھا، وہ امنِ عامہ اور تحفظ کا اپنے کو ذمہ دار سمجھتے تھے، اس سے زیادہ اس دور اور اس دور کے حاکموں کی تعریف اور اعتراف میں کہنا اپنی غیرت و ضمیر کو گوارا نہیں، اور یہ بھی جو کچھ کہا گیا وہ بھی دل پر جبر کر کے کہا گیا۔

اس سے بڑی بات یہ ہے کہ یہاں کی مختلف قومیں اور مذاہب اپنے عقیدے اور مذہب اور اپنی تہذیب و ثقافت (Religion and culture) کے مطابق زندگی گزارنے اور اس کو اپنی آئندہ نسل تک منتقل کرنے اور اس کے مطابق تعلیم گاہیں، مکاتب و مدارس قائم کرنے، اپنی زبان میں لکھنے پڑھنے میں آزاد تھے، ان پر کوئی علم الأصنام (Mythology) مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی، اس وقت انگریزی کی ریڈروں اور نصابِ تعلیم (Curriculum) میں جانوروں کے قصے، کتے بلی کی حکایتیں اور تصویریں، یا عالمی تاریخی شخصیتوں (Historical Personalities) کے قصے اور ان کا تعارف ہوتا؛ لیکن عیسائی مذہب (Chiristianity) کے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں، عقیدۂ تثلیث (Trinity) یا صلیب (Cross) کی تصویر و تقدیس کی دعوت نہیں ہوتی تھی، اس لیے جن لوگوں کو مذہب سب سے زیادہ عزیز تھا، ان کو اس معاملہ میں کوئی بڑی تشویش نہ تھی، صرف مغربی تہذیب و معاشرت، مغربی فیشن اور مغربی تخیلات و معیار اور کسی کسی وقت مذہبی آزادی، الحاد اور بے راہ روی کا ڈر رہتا تھا۔(۱)

لیکن اب اس سلسلہ میں صورتِ حال مختلف ہے، اور بعض جماعتوں اور سیاسی پارٹیوں نے اپنے تعلیمی و تربیتی منصوبوں کا صاف اعلان کر دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ اب ایک ہی زبان ہندی

---

(۱) اس کے بارے میں لسان العصر اکبرؔ الہ آبادی اور علامہ اقبالؔ کا کلام دیکھنا چاہیے، اور علماء کی ان کوششوں کو جو انھوں نے اس کے اثر کو زائل کرنے میں صرف کیں، اور ان کے اچھے نتائج برآمد ہوئے۔ (ح)

رہے گی، نصاب کی کتابوں میں ایک خاص میتھالوجی (دیومالا) ہی داخل کی جائے گی، ایک بدلی ہوئی تاریخ پڑھائی جائے گی، آزاد مدارس و مکاتب کا قیام مشکل ہو جائے گا، وغیرہ وغیرہ۔

حضرات! اب اس کے بعد دل کو تھام کر اور پوری معذرت کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بہت سے وہ لوگ جن کو اپنا مذہب عزیز ہے اور اپنے خاندانوں اور ہم قوموں کی عزت و ناموس عزیز ہے، اور پھر اس سے آگے بڑھ کر ملک کا امن وامان اور پرسکون زندگی عزیز ہے، جس میں وہ دینی، اصلاحی، تعلیمی، تصنیفی، ادبی اور فنی کام اور مشاغل اطمینان سے انجام دے سکیں، اور اس سے بڑھ کر اپنی عبادت گاہیں، درس گاہیں اور کتب خانے عزیز ہیں، وہ اس زمانہ کو یاد کرنے لگے ہیں، (خواہ وہ کتنا ہی غیر فطری تھا) جب یہ سب چیزیں عام طور پر محفوظ اور خارج از بحث تھیں۔

اس سے زیادہ شرم کی کوئی بات نہیں

میں آپ کو یہ بھی سنادوں کہ میں نے ایک مرتبہ محترمہ اندرا جی سے ان کی وزارتِ عظمیٰ کے زمانہ میں جب ایمرجنسی نافذ تھی، اور بعض جگہ بعض اقلیتوں کے ساتھ بڑی زیادتیاں ہوئی تھیں، کہا کہ اندرا جی! اس سے زیادہ شرم کی کوئی بات نہیں کہ لوگ انگریزوں کے دور کو جو غلامی کا دور تھا یاد کرنے لگے ہیں، مجھے یہ یقین ہے کہ ہمارے جنگ آزادی کے رہنماؤں کو اس کا کسی وقت اندازہ ہوتا یا تصور بھی آتا کہ ملک کے آزاد ہونے کے بعد ایک ایسا وقت بھی آسکتا ہے کہ ملک کے ذمہ داروں کی تنگ نظری اور غلط کاری کی بنا پر انگریزوں کی حکومت کا دور یاد آنے لگے گا اور وہ اس کی تمنا کرنے لگیں گے، تو آپ یقین مانیے کہ ان کے عزم و ہمت اور جوش خروش میں (جو ملک کو آزاد کرانے کے لیے ظاہر ہو رہا تھا) کمی ہو جاتی، اور ان کے دل اور قوتِ عمل (Vigour) کو بڑا دھکا لگتا، اور ان کی تقریروں میں وہ زور اور ان کی جدوجہد میں وہ جوش وخروش نہ رہتا، اور یہ جنگ آزادی اس آسانی کے ساتھ اور نیک نامی کے ساتھ کامیاب نہ ہوتی، اور اپنی منزل کو نہ پہنچتی، جس پر پہنچی۔

ایک ایسا زمانہ جس میں آدمی اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش نہ ہو، اپنے مدرسوں اور کتابی ذخیروں کو دیکھ کر مطمئن نہ ہو، اپنی محنتوں کے حاصل، اور اپنے جوہر و قابلیت کے نتیجہ سے اس میں افتخار کیا، اعتماد کا بھی جذبہ پیدا نہ ہو، انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنے مستقبل کی طرف سے مشکوک و متردد ہو، اس میں زندگی کا کیا مزہ؟ اور ایسے ملک میں کس معنی میں آدمی اپنے کو آزاد شہری، ملک کی زندگی میں دخیل اور اس کی تعمیر و ترقی میں شریک اور سرگرم ہو؟ پوری انسانی تاریخ میں انسان کا ضمیر اس بات کو

پکار پکار کر کہتا سنائی دیتا ہے کہ غلامی سے بڑھ کر عیب و ذلت اور شرم کی کوئی بات نہیں، خدا نہ کرے کہ ایسی عدالت قائم ہو کہ مجھے گواہ پیش کرنے کی نوبت آئے؛ لیکن سیکڑوں کو پیش کیا جا سکتا ہے، جو یہ کہتے تو نہیں ہوں گے؛ لیکن سوچتے ضرور ہوں گے، گھر میں بیٹھ کر باتیں بھی کرتے ہوں گے۔

یہ میکدہ کی یہ ساقی گری کی ہے توہین

پھر کسی آزاد ملک میں جس نے ملک کی آبادی کے تمام عناصر (Sections) اور قوموں اور فرقوں (Castes and Creeds) کے تعاون (Co-operation) جدوجہد اور قربانیوں کے ذریعہ آزادی حاصل کی ہو، اس کی قیادت اور رہنمائی میں وہ ملک آزاد ہوا ہو، اس کا کوئی جواز نہیں کہ کوئی ایک فرقہ یا قوم (Community) خواہ وہ کیسی کھلی اکثریت اور بڑی تعداد میں ہو، اور کیسا ہی سرمایہ دار اور باوسائل ہو، وہ نہ صرف اپنی تہذیب وثقافت، اپنے عقائد اور دیومالا کی تعلیم و تبلیغ اور اس کو اپنی نئی نسل کی طرف منتقل کرنے، اور اپنی تہذیب وثقافت اور اپنی زبان ورسم الخط کے نہ صرف رواج دینے اور قائم رکھنے میں؛ بلکہ پورے ملک پر اور نئی نسل پر اس کو جاری اور رائج کرنے میں آزاد ہو، اور دوسرا فرقہ (Other Community) دوسرا مذہب رکھنے والے (خواہ وہ اپنی تعداد میں کئی ملکوں کے اسی مذہب کے باشندوں سے زیادہ تعداد رکھتے ہوں) اپنے دین ومذہب کے مطابق تعلیم دینے، اپنی زبان ورسم الخط کی ترویج وبقا، اپنی تہذیب و ثقافت (Culture and Traditions) کے تسلسل کی کوشش میں آزاد نہ ہو، روز بروز اس پر نئی نئی پابندیاں عائد کی جائیں، اور رفتہ رفتہ وہ محسوس کرنے لگے کہ وہ چلنے پھرنے، کھانے کمانے میں تو آزاد ہے؛ لیکن لسانی، ثقافتی اور تعلیمی طور پر پابند اور غلام ہے۔ اہلِ علم ونظر جانتے ہیں کہ صرف رسم الخط (Script) کی تبدیلی سے ایک ملک کے پورے باشندوں کا اپنے قدیم علمی ورثہ (Intellectual Heritage) اور پوری ثقافت (Culture) سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے، اور وہ اپنے ماضی سے منقطع ہو جاتے ہیں، اسی بنا پر ایک فلسفی مؤرخ Arnold Toynbee نے لکھا ہے کہ "اب کسی کتب خانہ، اور علمی ذخیرہ کو نذر آتش کرنے اور برباد کرنے کی ضرورت نہیں، رسم الخط (Script) کا بدلنا کافی ہے، اس طریقہ سے اس ملک کا اپنے ماضی سے رابطہ بالکل ختم ہو جائے گا"۔ (۱)

---

(۱) A Study of History, P. 518-519 (ح)

ہم اس مضمون کو اور اس اظہارِ حقیقت کو کہ وہ آزادی ہی نہیں جس کا سایہ ملک کے ایک حصہ پر پڑے، دوسرا حصہ محروم رہے، ایک فرقے کے حق میں آزادی کی بہار آئے اور اس کا باغ نئے برگ و بار لائے اور دوسری جگہ خزاں کا دور دورہ ہو، اور نئے نئے علمی اور ذہنی، تعلیمی و تربیتی اور مذہبی و اعتقادی طوق و سلاسل اور رکاوٹوں اور پابندیوں کا منظر، اس مضمون کو اس دور کے مشہور و مقبول شاعر حضرت جگر مرادآبادی کی ایک غزل پر ہم اپنے اس مقالہ کو ختم کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

چمن چمن ہی نہیں جس کے گوشہ گوشہ میں
کہیں بہار نہ آئے ، کہیں بہار آئے
یہ میکدہ کی یہ ساقی گری کی ہے توہین
کوئی ہو جام بکف، کوئی شرمسار آئے
خلوص و ہمت اہل چمن پہ ہے موقوف
کہ شاخ خشک میں بھی پھر سے برگ و بار آئے (۱)

(۱) یہ تقریر دفتر تحریک پیام انسانیت لکھنؤ سے ۱۹۹۳ء میں رسالہ کی شکل میں شائع ہوئی۔

۲۵

ظلم کا انجام [1]

یہ دنیا اعتبار پر چل رہی ہے

میرے بھائیو اور دوستو! سب سے پہلے تو میں اپنے اس تاثر کو، اپنے اس احساس کو چھپا نہیں سکتا، اور اس کا اظہار کرنا انصاف کی بات بھی، شرافت کی بات بھی سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات ایک دعوت پر، ایک اعلان پر یہاں جمع ہوگئے، اور آپ کو جو چیز یہاں کھینچ کر لائی وہ اعتبار ہے، Confidence ہے، اور انسان دوستی ہے، اور ملک دوستی بھی ہے، یہاں کوئی Enjoyment کی، کوئی تفریح کی چیز نہیں تھی جس کے لیے آپ جمع ہوں، کوئی ٹورنامنٹ نہیں تھا، کوئی Show نہیں تھا، کوئی تفریحی پروگرام نہیں تھا، یہ بڑی اچھی علامت ہے، جب تک کہ انسانوں میں یہ بات رہے گی، یعنی ایک کو دوسرے پر اعتبار ہوگا، یہ ساری دنیا اعتبار پر چل رہی ہے، اور یہ ساری دنیا قدردانی پر چل رہی ہے، یہ صرف نفع حاصل کرنے پر، ذہانت پر، Intelligence پر، اور کسی اسکالرشپ پر اور کسی خیالی (Genius) ان چیزوں پر نہیں چل رہی ہے۔

یہ جو دنیا کا کارخانہ چل رہا ہے، عام طور پر یہ اعتبار پر چل رہا ہے، ایک دوسرے کی عزت کرنے پر چل رہا ہے، اور ایک دوسرے سے اچھی امید رکھنے پر چل رہا ہے، اگر یہ اچھی امید ختم ہوجائے اور ہر شخص یہ سمجھنے لگے کہ یہ سب دھوکے باز ہیں، اور سب اپنا فائدہ چاہتے ہیں، اور سب نقصان پہنچانے والے، ڈرنے والے ہیں، یہ شیر کی طرح ہیں، بھیڑیے کی طرح ہیں، شیر تو خیر بہت اونچی چیز ہے، بھیڑیے کی طرح ہیں، سانپ بچھو کی طرح ہیں، تو اس دنیا میں جینا بالکل محال ہوجائے، ساری ٹکنالوجی اور سارا علم اور تمام Universities جو ہیں، یہ ساری کی ساری دھری کی دھری رہ جائیں، اور زندگی کا جو سلسلہ چل رہا ہے، ہزاروں برس سے چل رہا ہے، یہ ٹوٹ

(۱) ۲۴؍اپریل ۱۹۹۴ء کو غازی پور میں پیام انسانیت کے ایک جلسہ میں کی گئی تقریر۔

جائے، یہ سب اعتبار پر، بھروسے پر، عزت پر، اچھی امید پر چل رہا ہے۔

تو میں اپنی اس خوشی کو چھپا نہیں سکتا کہ میں یہاں پر اپنے اتنے بھائیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوں، اور جیسا کہ بیان کیا گیا کہ غازی پور سے ہمارا تعلق بہت پرانا ہے، اور بچپن سے ہم نے جو کتابیں پڑھیں، اور خاندان میں جو باتیں سنیں، جو روایات سنیں، اور جو ہسٹری ہمارے سامنے ہے، اس ہسٹری میں ہمارے خاندان کا بھی ایک حصہ ہے، Contribution ہے، اس میں غازی پور کا ایک مقام ہے، ایک حصہ ہے، تو ہمیشہ غازی پور کے نام سے ہم کو ایک محبت رہی، اور ایک کشش رہی، کہ غازی پور ہمیں کوئی پردیش نہیں معلوم ہوا، اور کوئی اجنبی شہر یا Foreign Country یا Foreign City نہیں معلوم ہوا، ایسا معلوم ہوا جیسے اس سے ہمارا خاندانی تعلق ہے۔

صحت اور بیماری انسان کی زندگی کی علامت ہیں

اب بھائیو! میں آپ سے یہ صاف صاف بغیر کسی تمہید کے، بغیر کسی علمی پہیلی بجھانے کے، اور آپ کو کچھ متاثر کرنے کی کوئی کوشش کرنے کے بجائے صرف سیدھی سیدھی بات کہتا ہوں کہ صحت تندرستی اور بیماری یہ دونوں انسان کے لیے بالکل قدرتی نیچرل چیزیں ہیں، انسان اچھا بھی رہتا ہے، بیمار بھی ہوتا ہے، اور یہ اس کی زندگی کی علامت ہے، کہ دیوار بیمار نہیں ہوتی، اور کوئی پہاڑ بیمار نہیں ہوتا، ویسے زلزلے آتے ہیں، سیلاب آتے ہیں، یہ الگ بات ہے، لیکن صحت اور بیماری جو ہے یہ انسان کی خاصیت ہے، یہ نہ مایوس ہونے کی چیز ہے، اور نہ نفرت کرنے کی چیز ہے، تو انسان بیمار بھی ہوتا ہے اچھا بھی ہوتا ہے، اور یہ ایک انسان، Individual ہی نہیں، فرد ہی نہیں، بلکہ پورا سماج کا سماج بھی بیمار ہو جاتا ہے، پوری تاریخ بتاتی ہے، پوری تاریخ جو ہے یہ صرف صحت و تندرستی اور خوبیوں اور کمالات اور فتوحات اور خدمات اور کارناموں کی تاریخ نہیں ہے، بلکہ تاریخ میں تو دونوں چیزیں موجود ہیں، اس میں ترقی بھی ہے، زوال کی داستان بھی ہے، اس کے اندر انصاف وعدل کے قصے بھی ہیں، اور بڑے سفاکی اور ظلم کے قصے بھی ہیں، اس کے اندر بڑی ترقی کے واقعات بھی ہیں، اور بڑے تنزل اور گراوٹ کے، بلکہ خودکشی اور Suicide کے واقعات آپ کو ملیں گے۔

پورے سماج اور ملک کا بیمار ہونا کوئی نئی بات نہیں

جیسے ایک فرد (Individual)، ایک یونٹ بیمار ہوتی ہے، اچھی ہوتی ہے، ویسے ہی سماج بھی بیمار ہوتا ہے، ویسے ہی پوری تہذیب بھی، Civilization بھی بیمار ہوتی ہے، اور ویسے ہی

پورا Age بھی بیمار ہوتا ہے، یعنی Age، ایک سال کا، دو سال کا، پانچ سال کا نہیں، بلکہ پورا کا پورا عہد Age بیمار ہو گیا، ایسے واقعات ہیں کہ Hystorian's History of the World پڑھیں، یا The History of The Decline and Fall of The Roman Empire پڑھیں، یا ساسانیوں کی، ایرانیوں کی تاریخ جو ڈنمارک کے ایک پروفیسر نے لکھی ہے، وہ پڑھیں، اور آپ اپنے دیس کی بھی تاریخ پڑھیں، تو آپ دیکھیں گے کہ یہاں بھی ایسے جھونکے آتے رہے، اور کبھی جھونکا آیا اور نکل گیا، اور کبھی جھونکا آیا اور ٹھہر گیا، ایسا بھی ہوا ہے، آندھی تو آندھی ہوتی ہے، وہ آئی اور گزر گئی، درختوں کو ہلا دیا اس نے، اور شور مچا دیا اور پھر نکل گئی، لیکن کوئی کوئی آندھی ایسی ہوتی ہے کہ وہ ٹھہر جاتی ہے، پھر اس کی مدت میں اختلاف ہے، تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی سو برس تک رہتی ہے، کبھی پچاس برس تک رہتی ہے، کبھی دس برس رہتی ہے، اس کا انحصار، یہ بات Depend کرتی ہے اس پر کہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی آئے۔

تو میں اصل میں Medical Term میں آپ سے کہوں، طبی اصطلاح میں کہوں، دورہ پڑتا ہے، ہسٹیریا جیسے ہے، یا کوئی Attack ہے، Attack جیسے فرد پر پڑتا ہے، Nation پر بھی پڑتا ہے، اور یہ پڑ سکتا ہے، (یہ زندگی کی علامت ہے، اس سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں) اور پوری تہذیب پر بھی پڑتا ہے، اور یہ بعض مرتبہ پورے زمانہ پر بھی پڑ جاتا ہے۔

جب چین کے اور ترکستان کی سرحد کے تاتاری نکلے، آپ اگر آرنلڈ کی کتاب پڑھیں جو اس نے تاتاریوں پر لکھی ہے، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ ساری دنیا ہل کر رہ گئی تھی، اور مؤرخین نے لکھا ہے کہ ایسا صاف نظر آرہا تھا کہ اگر یہی حالات رہے اور تاتاریوں کو ظلم کرنے کا، تاتاریوں کو اپنی کارروائی کرنے کا، اپنی خواہشات کو پورا کرنے کا ایسا ہی موقع ملا تو دنیا کو دوبارہ نیا سفر شروع کرنا پڑے گا، دنیا کو ایک نئی Journey شروع کرنی پڑے گی، ایک نئی تہذیب (Civilization) کی، اور اس کو ساری بگڑی ہوئی دنیا کو بنانے کے لیے پھر ایک مرتبہ شروع سے کام کرنا پڑے گا، کتب خانے برباد ہو گئے ہوں گے، تعلیم کی جو جگہیں ہیں، Educational Centers جو ہیں، وہ سب کے سب ٹوٹ چکے ہوں گے، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ انسان کے دماغ پر دورہ پڑ چکا ہوگا، کہ وہ سمجھتا ہوگا کہ بس قوت، اپنی قوت کا مظاہرہ (Demonstration)، اپنے پاور کا اور اپنی فتوحات کا، اور اپنی کامیابیوں کا، اور اپنی خواہشات پوری کرنے کا، بس یہی انسان کا کام ہے کہ اپنی خواہشات کو پوری کر لے، اور جب یہ کوئی ایک فرد کا معاملہ نہ ہو، بلکہ یہ ایک Individual، ایک

Unit کا معاملہ نہ ہو، یہ نیشن کا معاملہ بن جائے، پھر آگے بڑھ کر وہ اس پورے عہد (Age) کا معاملہ بن جائے، حد یہ ہے کہ آرنلڈ نے لکھا ہے کہ تاتاری نکلے چین کی سرحد سے، ترکستان سے، اور ڈنمارک اور انگلینڈ کے ماہی گیر مچھلی پکڑنے والے وہ کئی ہفتے اور کئی مہینے مچھلی کا شکار کھیلنے نہیں نکل سکے، اس ڈر کے مارے کہ تاتاری یہاں نہ آجائیں، پوری دنیا ہل کر رہ گئی تھی، اور مایوس تھی، اور مایوسی تھی Despair، کہ اب انسان سکون کی اور اطمینان کی زندگی نہیں گزار سکے گا، اب اعتماد اور سب سے بڑی چیز یہ کہ دنیا بھروسے پر چل رہی ہے، Confidence پر چل رہی ہے، Confidence ہل کر کے بلکہ غارت ہو کر کے رہ گیا تھا کہ انسان کو کسی انسان پر بھروسا نہیں رہا تھا، کہ پتہ نہیں کہ یہ کس وقت تلوار اٹھائے اور ہماری گردن کاٹ دے، اور انھوں نے سروں کے مینار بنائے تھے، سر پر سر، سر پر سر رکھ کر کے، کہ دیکھو ہم اِس طرح مارتے ہیں، اور بغداد میں یہ حال ہوا تھا کہ دجلہ کا پانی (وہاں دجلہ اور فرات دو دریا ہیں) ان کا پانی کبھی انسانی خون سے سرخ ہو جاتا تھا اور کبھی کتابوں کی سیاہی سے سیاہ ہو جاتا تھا، کالا ہو جاتا تھا، بالکل مایوسی کی حالت تھی۔

مگر کچھ خدا کے بندے کھڑے ہوئے، انھوں نے ان تاتاریوں کا دل جیت لیا، دماغ بدل دیا، یہ لوگ کہ جنھوں نے اس وقت دنیا کو ہلا کر کے رکھ دیا تھا، اور معلوم ہو رہا تھا کہ قیامت آگئی، اب یہ دنیا اس طرح نہیں رہے گی، انھوں نے بغیر تلوار سے مقابلہ کیے، لشکر کا لشکر سے مقابلہ کیے، انھوں نے اپنی ہمدردی سے، اپنی دلی جلن سے، اور اپنی فکرمندی سے، اور محبت اور انسانیت کے قدر کے جذبہ سے انھوں نے تاتاریوں کا دل بدل دیا، اور وہ سب کے سب بجائے اس کے کہ لٹیرے ہوتے، مارنے والے ہوتے، وہ انسان دوست اور بڑی بڑی سلطنتوں کے قائم کرنے والے اور تہذیب کی حفاظت کرنے والے بن گئے، ان میں مصنف (Authors) تیار ہوئے، Literary man تیار ہوئے، اور Saint بڑے خداترس انسان ان میں تیار ہوئے۔

پیغمبر پوری انسانیت کا چارج لیتے تھے

میں کہتا ہوں کہ ایک انسان پر، انسان کا ذکر نہیں، ایک محلّہ پر، پھر محلّہ سے بڑھ کر شہر پر، پھر شہر سے بڑھ کر پورے ملک (Country) پر اور اس سے بڑھ کر اس پورے عہد (Age) پر دورہ پڑ جانا کوئی نئی بات نہیں ہے، ساری تاریخ بھری ہوئی ہے، اگر تاریخ سے اس بات کو نکال دیا جائے تو کچھ رہ نہیں جائے گا، تاریخ میں پیغمبروں کی اصلاحات اور خدا کے پیغمبروں کا آنا اور Reformers کا پیدا ہونا، اور بڑے بڑے عابد وزاہد اور Saints اور اللہ والے لوگوں کا پیدا

ہونا، یہ سب سلسلہ اسی لیے تھا کہ بیچ بیچ میں ایسے دورے پڑتے رہتے تھے، ایسے Intervals آتے رہتے تھے، ایسے Abnormal حالات پیدا ہوتے رہتے تھے کہ ایسے لوگوں کی ضرورت تھی، وہ آکر کے چارج لے لیتے تھے، پوری انسانیت کا چارج لیتے تھے، کوئی پوری انسانیت کا چارج لیتا وہ پیغمبر ہیں، اور کوئی ملک کا چارج لیتا، وہ Reformers اور لیڈر ہیں، اور کوئی اپنی سوسائٹی کا چارج لے لیتا، وہ سوسائٹی کے بڑے ہمدرد اور انسان دوست لوگ تھے۔

بڑا خطرہ

تو اس دنیا کی آس، انسانیت کی آس اس وقت تک قائم ہے جب تک کہ برائی کو برائی سمجھنے والے، ظلم کو ظلم سمجھنے والے، اس سے نفرت کرنے والے، اور دنیا کے بگاڑ کو پسند نہ کرنے والے، Dislike کرنے والے، اور اس سے بے چین ہو جانے والے کہ ان کی نیند اُڑ جائے، جب تک یہ موجود ہیں، کوئی ڈر کی بات نہیں ہے، لیکن جب یہ موجود نہ ہوں، ان کا کال ہو جائے، یا یہ کم ہو جائیں، بالکل ڈھونڈھنے سے ملیں، کہیں دوربین سے دیکھنے کی ضرورت ہے، اور کہیں تلاش کرنے کی ضرورت ہے، اور کہیں وہ سیکڑوں میل پر اور کہیں کسی کونے پر بیٹھے ہوئے نظر آئیں تو پھر بڑا خطرہ ہے۔

آج جو اس وقت خطرہ ہے ہندوستان کے لیے، وہ یہ ہے جیسا کہ ہمارے بھائی انیس چشتی صاحب نے کہا کہ اس وقت ایسا آدمی اور اگر احتیاط سے کام لوں سے تو ایسے آدمی (ایسا آدمی اور ایسے آدمی میں فرق آپ سمجھتے ہیں، ایک اور جمع کا) ایسے آدمی اس ملک میں نظر نہیں آرہے ہیں جن کی نیند اڑ گئی ہو، اور جن کے کھانے پینے میں مزہ نہ آتا ہو، اور جو بے چین ہو کر نکل پڑیں اور کہیں کہ ہم اس ملک کو ڈوبنے نہیں دیں گے، ہم اس ملک کو تباہ ہونے نہیں دیں گے، اس لیے کہ ہم آپ سب سمجھتے ہیں کہ ہم سب خدا کے پیدا کیے ہوئے ہیں، تو خدا کو کیسے یہ پسند آئے گا، میں اکثر کہا کرتا ہوں اور میں نے کہا کہ کسی کمہار کی دکان پر آپ چلے جائیے، آپ اس کے مٹی کے بنے ہوئے گھڑے اور مٹی کے بنے ہوئے ایک برتن کو توڑ کر کے دیکھیے، فوراً وہ کمہار کھڑا ہو جائے گا اور آپ کا ہاتھ پکڑ لے گا، اور کہے گا کہ آپ کون ہوتے ہیں؟ آپ یہاں کیسے آئے؟ آپ کو کیا حق ہے ہمارا ایک برتن توڑنے؟ ہم نے اتنی محنت سے بنائے، تو کیا خدا اس کو پسند کرے گا، Creator اس کو پسند کرے گا، کہ آپ اس کے بنائے ہوئے انسانوں کو اس طرح توڑیں، جس طرح مٹی کے برتنوں کو توڑا جاتا ہے؟

کیا خدا کی غیرت اتنی بھی نہیں؟

کچھ تو سمجھنا چاہیے آدمی کو کہیہاں اگر کوئی شخص الٹ پلٹ کرنے لگے، کرسیوں کو گرانے لگے، اور شامیانہ اتارنے لگے، کوئی اس کو برداشت نہیں کرے گا، تو انسان میں جب اتنی غیرت ہے تو خدا میں اتنی بھی غیرت نہیں؟ خدا اس کو برداشت کرے گا کہ آپ اس کے بنائے ہوئے انسانوں کو، کس محبت سے کس پیار سے اس نے آدمیوں کو بنایا ہے، اور میڈیکل سائنس کا ایک طالب علم ہی نہیں، ایک معمولی آدمی (Common Man) بھی اس کو جانتا ہے کہ ماں کے پیٹ میں بچہ رہتا ہے، کس طرح پیدا کرنے والا خدا اس کی حفاظت کرتا ہے، ماں کے پیٹ کا تھوڑا حصہ اس میں ایک پورا انسان سانس لینے والا، آنکھیں رکھنے والا، کان رکھنے والا، دل و دماغ رکھنے والا، وہ اس میں رہے اور حفاظت سے رہے، اور اس کے بعد جب اس کا صحیح وقت آئے تو وہ باہر آجائے، باہر آنے میں اگر خدا کی مدد نہ ہو تو باہر آنا مشکل، اور باہر آنے کے بعد وہ بول نہیں سکتا، اپنی تکلیف بیان نہیں کرسکتا، لیکن خدا اس کی حفاظت کا سامان کرتا ہے، ماں باپ اس کی تکلیف کو سمجھتے ہیں، اور جب خدا رکھنا چاہے تو کوئی اس کو کیسے چھیڑ سکتا ہے؟ پھر اس کو چلنے پھرنے کے قابل بنایا، اس کو بڑا کیا، اور بڑا کیا، جب اتنا بڑا ہو گیا تو آپ آئے، آپ نے مار دیا اس کو، کچھ سمجھ کی بات ہے؟ آپ کو کیا حق تھا؟ اور آپ خدا سے نہیں ڈرے؟ اپنے پیدا کرنے والے سے نہیں ڈرے کہ خدا کی بنائی ہوئی چیز کو اس طرح توڑ رہے ہیں؟!!

آپ کسی گھر کو توڑ کر دیکھیں، آپ کے باغ کا ایک درخت کوئی جا کر گرانے کی کوشش کرے، اور آپ اس کو برداشت کریں؟ یہ نہیں ہوسکتا، خدا کیسے برداشت کرلے گا کہ آپ اس کے بنائے ہوئے انسانوں کو اس طرح ماریں؟ اور یہ زندگی کیسے چلے گی؟

میں نے تو بعض مرتبہ کہا کہ بعض والدین ہیں، ماں باپ ہیں، ان کو دیکھا کہ کہیں سے آئے، یا کہیں سفر سے آئے، کام سے آئے، دکان سے آئے، کارخانہ سے آئے، ان کے بچے جمع ہوگئے، یہ دو بچے ہیں، چار بچے ہیں، یہ پوتے ہیں، یہ نواسے ہیں، کتنی خوشی کی بات ہے، باغ و بہار ہے، لیکن دیکھا کہ وہ خوش نہیں ہورہے ہیں، پوچھا کہ کیا بات ہے؟ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ آپ نارمل نہیں ہیں کیا؟ یہ سب بچے آپ کو سلام کررہے ہیں، ہنس رہے ہیں، آپ خوش نہیں ہوتے؟ انھوں نے کہا: ہاں ٹھیک ہے، لیکن میرے خیال میں آتا ہے کہ اگر کہیں Communal Riot ہوا، ان بچوں کا حشر کیا ہوگا، یہ اس طرح مارے جائیں گے جیسے سانپ بچھو مارے جاتے ہیں، جیسے

کیڑے مکوڑے مارے جاتے ہیں، میں کیا کروں، اللہ مجھ پر رحم کرے کہ میری آنکھیں اس کو دیکھنے لگتی ہیں، اس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔

میں واقعات اخبار میں پڑھتا ہوں، واقعات سنتا ہوں، آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جب کبھی ایسا Communal Riot ہوا، کوئی ایسا فرقہ وارانہ فساد ہوا تو بچوں کو بھی نہیں چھوڑا گیا، عورتوں کو بھی نہیں چھوڑا گیا، تو بھئی یہ بالکل Unnatural اور Abnormal بات ہے، اور بالکل فطرت انسانی کے خلاف ہے، اور خدا کی رحمت اور خدا کے انصاف کے بھی خلاف ہے، اور خدا کی غیرت کے بھی خلاف ہے، بھئی ہماری آپ کی بھی ایک غیرت ہوتی ہے، خدا کی غیرت اتنی بھی نہیں؟ آپ اس کی بنائی ہوئی چیزوں کو توڑیں، اور پھر اس کے بعد یہ ملک بالکل پنپ نہیں سکتا، کوئی ملک پنپ نہیں سکتا۔

تاریخ خاص طور پر میری Hobby ہے، میرے پڑھنے کی اور لکھنے کی، اس میں یہی دیکھا، بالکل یہی معلوم ہوا کہ یہ چراغ بجھا، یہ چراغ بجھا، انسانیت کا چراغ بجھا، ایک دم سے کوئی اللہ کا بندہ آیا اور اس نے اس چراغ کو اپنے دامن کے نیچے لے لیا، اور کہا کہ پہلے میں جلوں گا، پہلے مجھے مارو، مگر میں اسے بجھنے نہیں دوں گا، دنیا سنبھل گئی، اور پھر اس کو ایک قسط (Installment) زندگی کی پھر مل گئی، اچھا پچاس برس تک سو برس تک یہ رہے گی، ہمارے ملک میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوئے، ایسے صوفی اور سنت پیدا ہوئے، کہ جنھوں نے انسان کو انسان سمجھا، اور ساری کوشش انسان کو انسان سے ملانے میں صرف کردی۔

انسانیت کے بیش بہا نمونے

میں ایک چھوٹی سے مثال عرض کرتا ہوں کہ حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ ایک بزرگ تھے ہمارے صوفیوں میں، ہمارے فقیروں میں، تو کوئی ان کے پاس ایک بہت عمدہ چاقو لایا، کہیں چاقو اچھے بہت عمدہ بنتے تھے، تو تحفہ کے طور پر، سوغات کے طور پر چاقو لایا اور بہت خوش کہ یہاں خانقاہ ہے، یہاں پھل کاٹے جاتے ہیں، ترکاریاں کاٹی جاتی ہیں، تو میں چھری لایا ہوں، بہت عمدہ اچھے لوہے کی اور بڑی تیز، تو بجائے خوش ہونے کے انھوں نے کہا کہ بھئی ہمارے لیے چاقو کا کام نہیں تھا، ہمارے یہاں سوئی کا کام تھا، ہمارا کام سینا ہے، ہمارا کام پھاڑنا نہیں، ہم ٹوٹے ہوئے پھٹے ہوئے دلوں کو سیتے ہیں، آپ سوئی لائے ہوتے ہمارے پاس۔

ایسے ہی ان کے خلیفہ تھے، ان کا ہم نے قصہ پڑھا، یہ انسانیت کی باتیں ہیں، ہمارے ملک کو ان پر فخر ہونا چاہیے کہ ایک صاحب تھے حضرت نظام الدین اولیاءؒ جن کو سلطان جی کہتے ہیں دہلی میں اور ان کی خانقاہ ہے، سب لوگ ان کا ادب کرتے ہیں، تو ان کے یہاں لوگ تحفے لاتے تھے، کوئی مٹھائی لایا، کوئی پھل لایا، وہ سب تقسیم کردیتے تھے، اور روزہ رکھتے تھے، پوری عمر انھوں نے روزہ میں گزاردی، عید اور بقرعید میں وہ روزہ نہیں رکھتے تھے، کیونکہ ہماری شریعت میں عید اور بقرعید کا روزہ نہیں ہے، باقی وہ پوری عمر روزہ رکھتے تھے، گرمی ہو یا سردی ہو، تو ان کے پاس بہت سے تحفے آتے تھے، ابھی مٹھائی کا ایک ڈبہ آیا، ابھی ایک لپٹی ہوئی چیز آئی، معلوم ہوا اس کے اندر کوئی میٹھی چیز ہے، اس کے اندر کوئی اور کام کی چیز ہے۔

ایک صاحب نے کہا (ہر طرح کے آدمی ہوتے ہیں) انھوں نے کہا کہ حضرت کو تو خبر نہیں ہوتی کہ کوئی کیا لایا، وہ تو سب چیزیں سامنے بندھی ہوئی رکھ دی جاتی ہیں اور وہ اپنے خادم اقبال سے کہتے ہیں: اس کو لے جاؤ اور خانقاہ میں جو لوگ ہیں ان کے بچوں کو تقسیم کردو، گھروں کو بھیج دو، تو ان کو تو خبر ہی نہیں ہوتی، تو انھوں نے کیا کیا کہ مٹی لی اور مٹی کو کاغذ میں لپیٹ کر ایسا بنایا جیسے کوئی ایک بہت بڑا تحفہ ہے، اس میں حلوہ ہے، مٹھائی ہے، اس کو اچھی طرح بند کر کے وہ لائے اور اس کو پیش کردیا، رکھ دی گئی، ابھی کسی کو کچھ خبر نہیں، نہ کوئی دیکھ سکا، نہ کسی کو معلوم، اور انھوں نے گویا ان کا ایک امتحان لیا، اس کے بعد جب اٹھانے کا وقت آیا، تو خادم اقبال نے یہ اٹھایا، وہ اٹھایا، جب اس پر ہاتھ پڑا تو حضرت نے کہا کہ اس کو مت اٹھاؤ، یہ میری آنکھ کا سرمہ ہے، وہ آدمی فوراً قدموں پر گر گئے کہ میری لاج رکھ لی، کہ جب وہ چیز کھولی جائے گی، کوئی نہ کوئی پہچان جائے گا کہ اسے کون لایا تھا، تو لوگ اس کے پیچھے پڑ جائیں گے کہ تم ایسے بے ادب ہو؟ ایسے بدتمیز ہو؟ حضرت کے پاس تم مٹی لائے ہو؟ اس لیے ان کو بچانے کے لیے اور قدردانی کے لیے کہا کہ نہیں نہیں، یہ میری آنکھ کا سرمہ ہے، اس کو یہیں رہنے دو، ایسے دل والے، ایسے رحم دل، ایسے فیاض، شریف انسان!! وہ قدموں پر گر گئے، اور کہا: ہمیں معاف کردیجیے۔

ضرورت ہے کہ کچھ لوگ دیوانے و بے قرار ہو کر نکلیں

آج اس ملک میں جس Element کی کمی ہے، جس گروپ کی کمی ہے، جس سوچنے کے طریقے کی کمی ہے، وہ کمی یہی ہے کہ اس وقت سب اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں، میں نہیں کہتا کہ سب زیادتی کرتے ہیں، آپ سب کے متعلق میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ

زیادتی کو ناپسند کرتے ہیں، لیکن اتنا کافی نہیں ہے، ضرورت ہے کہ کچھ لوگ دیوانے بن کر اور بے قرار ہو کر نکل جائیں، اپنے گھروں سے نکل آئیں، اور کہیں کہ ہم یہ نہیں ہونے دیں گے، ہم کہیں ہندوستانی کو ہندوستانی کو مارنے نہیں دیں گے، ہم اس طرح سے رشوت کا بازار گرم ہونے نہیں دیں گے، ہم اس طرح سے کسی کے زمین پر قبضہ کر لینے، گھر پر قبضہ کر لینے کی اجازت نہیں دیں گے، گورنمنٹ کیسی ہی ہو، میں اس کا احترام کرتا ہوں، گورنمنٹ ، اس کا Administration، اور اس کا اسٹاف، جیسا ہو، لیکن وہ کافی نہیں ہے، جب تک کہ پبلک کا Conscience، اور Human Conscience بیدار نہ ہو، اور وہ برائی کو برائی نہ سمجھتا ہو، اور نیکی کو نیکی نہ سمجھتا ہو، اور نیکی کرنے والے سے محبت نہ کرتا ہو، اور برائی اور ظلم کرنے والے کو نفرت کی نگاہ سے نہ دیکھتا ہو، نفرت کی نگاہ سے نہ سہی، لیکن ناپسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھتا ہو، Dislike نہ کرتا ہو، اس وقت تک کوئی ملک رہ نہیں سکتا۔

آپ میری بات مان لیجیے، میں کوئی پیشین گوئی کرنے والا آدمی نہیں ہوں، میں کوئی پہنچا ہوا آدمی نہیں ہوں، لیکن تاریخ کا طالب علم ہوں، تاریخ کا کیڑا ہوں، میں آپ سے کہتا ہوں کوئی ملک کتنی ہی ترقی کر جائے، سائنس میں ترقی کر جائے، اور ٹکنالوجی میں ترقی کر جائے، اور سائنسز میں ترقی کر جائے، لٹریچر میں ترقی کر جائے، اور یہاں تک کہ پاور میں، Atomic Energy پیدا کر لے، وہ ملک بچ نہیں سکتا، جب تک کہ اس کے اندر انصاف نہ ہو، اس کے اندر رحم کا مادہ نہ ہو، اس کے اندر انسان دوستی نہ ہو، اور وہ برائی کو برائی نہ سمجھتا ہو، اور بھلائی کو بھلائی نہ سمجھتا ہو۔

یہ چیز ہے جس نے ہم لوگوں کو اس پر آمادہ کیا، ہمارے پاس کوئی ساز و سامان نہیں، ہمارے پاس کوئی بڑا Organization نہیں، لیکن خدا کا شکر ہے کہ کچھ ہمارے ہندو دوست بھائی بھی جن کے نام چشتی صاحب نے لیے، ان کے علاوہ بھی لوگ ہیں، انھوں نے بھی ہمارا ساتھ دیا اور ہم نے ہندوستان کے بہت سے صوبوں (States) میں اور Capitals میں صوبوں کے، ان میں بمبئی سے لے کر ہماچل پردیش تک اور کلکتہ سے لے کر جنوبی ہند تک، South تک جہاں موقع ملا وہاں ہم پہنچے اور ہم نے یہ بات کہی کہ انسان اور انسانیت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے، تاریخ یہی بتاتی ہے کہ کبھی انسان سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، انسان بہر حال انسان ہے، Conscience رکھتا ہے، اس کے اندر اوپر سے ایک گرد و غبار آ گیا ہے، لیکن اس کے اندر ایک دل ہے اور دھڑکتا ہوا دل ہے، سوچتا ہوا دماغ ہے، اور بیدار اور زندہ Conscience ضمیر ہے۔

اپنے شہر ہی نہیں بلکہ پورے ملک کی فکر کریں

اس لیے یہی چیز ہم کو یہاں بھی لائی کہ آپ لوگ اپنے شہر کی فکر کریں، اور شہر ہی کی فکر نہ کریں، اپنے State کی فکر کریں، اور State کی ہی فکر نہ کریں، Country کی، ملک کی فکر کریں، اور یہ بات نہ ہونے دیں، یہ باتیں ایسی ہیں کہ ان کے بعد ملک زیادہ دن تک باقی نہیں رہتا، پھر یا تو کوئی قدرتی سزا ملتی ہے، (Earthquake) زلزلہ آجاتا ہے، یا کوئی قحط سالی آجاتی ہے، غلہ نہیں پیدا ہوتا ہے، یا یہ بھی نہیں، بیماریاں پھیل جاتی ہیں، خدا کسی نہ کسی طریقے سے سبق دیتا ہے، قبل اس کے کہ یہ نوبت آئے، یہ اسٹیج آئے، ہم اپنی حالت سدھاریں، اور انسان کو دیکھ کر خوش ہوں، انسان کو دیکھ کر یہ نہیں کہ یہ کون ہے، یہ مسلمان ہے کہ ہندو ہے، یہ کرشچین ہے یا کیا ہے، نہیں، یہ آدمی ہے، یہ ہمارا بھائی ہے، کئی رشتوں سے ہمارا بھائی ہے، سب سے بڑھ کر انسانیت کے رشتے سے بھائی ہے، پھر ہندوستانیت کے رشتے سے بھائی ہے، پھر ایک صوبے کے رہنے والے کی حیثیت سے بھائی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ خدا کا پیدا کیا ہوا ہے، اور یہ ہمارے خاندان کا، بڑے خاندان کا فرد ہے، ایک چھوٹا خاندان ہوتا ہے، آپ سب کے خاندان ہیں، اور ہمارے بھی خاندان ہیں، اور ایک بڑا خاندان ہوتا ہے، برادری ہوتی ہے، وہ انسانی برادری کا فرد ہے، اس لیے وہ ہمارا عزیز ہے۔

یہ بات اس ملک میں ہمیشہ رہی ہے اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں، کہ اپنے کو خطرہ میں ڈال دیا ہے آدمی نے، اور بچالیا ہے دوسرے آدمی کو، اسی پر یہ انسانی نسل یہ Human Race چلتی رہی ہے، اگر یہ بات نہ ہوتی تو دنیا کب کی ختم ہو چکی ہوتی، تاریخ میں ایسے ایسے حملے آپ کو ملتے ہیں، Attacks ملتے ہیں، اور نسل کشی (Genocide) کے ایسے منصوبے ملتے ہیں کہ اس دنیا کو سیکڑوں ہزاروں برس پہلے ختم ہو جانا چاہیے تھا، کیوں نہیں ختم ہوئی؟ ایسے ہی لوگوں کے پیدا ہونے کی وجہ سے، جیسے میں نے تاتاریوں کی مثال دی، ایسے ہی اور کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں، اللہ کے بندے ان کے اندر گھسے اور ان سے انسانیت کی بات کی اور ان کے دل کو جگایا، اور ان کے اندر جو ایک چیز دبی ہوئی تھی، وہ دبی ہوئی چیز ضرور ہوتی ہے، Conscience تھا، اور اس Conscience کو دبایا، اور غصہ کی نفرت کی بات نہیں کہی، بلکہ ان کی دوستی کی بات کہی، اور یہ بات ان پر ثابت کی کہ آپ کی خیر خواہی میں کہہ رہے ہیں، اگر انسان نہیں رہے گا تو آپ بھی نہیں

رہیں گے، ان کے بات سمجھ میں آ گئی، انھوں نے ظلم سے ہاتھ اٹھایا، اور ایسی بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں، Empire قائم کیے، اور اس میں علم کے دریا بہائے گئے، اور اس میں کتب خانے تیار ہوئے، اور اس میں انسانی تہذیب نے ترقی کی، اور ابھی تک انسان کی نسل باقی ہے، کم سے کم یہ پورا حصہ جو تھا ایران ترکستان کا اور پھر افغانستان کا، پھر ہندوستان ملا ہوا ہے اس سے، یہ سب خطرہ میں پڑ گیا تھا، لیکن بچ گیا۔

اس ملک کو بربادی سے بچائیے

بس ہمیں آپ سے یہ کہنا ہے کہ سب کام آپ کو مبارک ہو، آپ سب کیجیے، آپ کی جولائن ہو، اور آپ کا جو فنکشن ہو، اور جو آپ کا Taste، اور آپ کا جو ذوق ہو، وہ سب اپنی جگہ پر، لیکن ایک اس بات کو ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ اس ملک کو ہم برباد نہیں ہونے دیں گے، اور یہ بات خدا کو، انسان کو پیدا کرنے والے کو پسند نہیں ہے، وہ زیادہ برداشت نہیں کرے گا کہ انسان انسان کو مارے، بھئی انسان سانپ اس کو ڈسے، بھیڑیا اس پر حملہ کرے، سمجھ میں آتا ہے، چیتا تیندوا اس پر حملہ کر لے، وہ چیتے اور تیندوے اپنے طور پر جنگلوں میں بیٹھے ہیں، کوئی نہیں آتا شہر میں، انسان چیتا اور تیندوا بن جائے، انسان سانپ اور بچھو بن جائے، کوئی عقل کی بات ہے؟ سمجھ کی بات ہے؟

بس اتنی بات ہے کہ اس ملک میں اس وقت اس حقیقت سے، Reality سے، اور اس صداقت سے ایک غفلت ہو گئی ہے، اس چیز کو لوگوں نے بہت پیچھے ڈال دیا ہے، سیاست اور پاور میں آنے کی خواہش، اور پھر الیکشن کا جو طریقہ ہے کہ ایسی بات کہو جس سے ووٹ ملے، اور جس سے لوگ خوش ہوں، ہماری برادری کے لوگ خوش ہوں، اور ہماری Community کے لوگ خوش ہوں، اور اس سے مطلب نہیں، اسی وقت یہ ارادے ہوتے ہیں کہ ہم دوسری کمیونٹی کو کچلیں گے، لیکن ہماری کمیونٹی کے ووٹ ہم کو مل جائیں، یہ طریقہ زیادہ دن چلنے والا نہیں ہے، اور یہ انسانی شرافت کے خلاف ہے۔

اپنی اپنی دسترس کے مطابق ملک کو بچانے کی کوشش کریں

بس میں زیادہ طول دینا نہیں چاہتا، آپ سب حضرات مشغول ہیں، اور آپ تھوڑی سی بات سے بہت آگے تک پہنچ سکتے ہیں، اور صحیح نتیجہ نکال سکتے ہیں، کہ آپ صرف غازی پور میں نہیں بلکہ ہندوستان میں کوشش کریں، اپنی اپنی دسترس کے مطابق، اپنی طاقت کے مطابق، اپنے تعلقات

کے مطابق، اور پھر فرصت کے مطابق، کہ آپ اس ملک میں یہ جو ایک دھارا چل گیا ہے Genocide کا، Communal Riots کا، Corruption کا، اور دولت پرستی کا، کہ اصل چیز ہے پیسہ، اس پیسہ کی خاطر سب کچھ کیا جاسکتا ہے، یہ بہت بڑا زہر ہے، یہ بہت بڑا Poison اور قاتل چیز ہے انسان کے لیے اور Human Race کے لیے، اور Civilization کے لیے، اور عام شہری زندگی (Civil Life) کے لیے، اس کے ساتھ نہ تو بچے پڑھ سکیں گے اطمینان سے، اور نہ کوئی کمانے کے قابل ہوگا، اور نہ راتوں کو نیند آئے گی، اور نہ دن کو اطمینان ہوگا۔

پہلے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے مل کر بڑے خوش ہوتے تھے، ہم نے شادی کے نیوتے دیکھے ہیں جو ہندو بھائیوں کی طرف سے اردو میں مسلمان بھائیوں کو بھیجے جاتے تھے کہ آپ آئیں ہمارے یہاں Wedding تقریب میں، اور پھر جس طرح مل جل کر رہتے تھے، تو ہم نے اپنے بچپن میں دیکھا ہے کہ ذرا سا کام ہوا اور جمع ہو جاتے تھے لوگ بلا مذہب کے فرق کے کہ کیا کام ہے، کیا ضرورت ہے، کیا پریشانی ہے، خیریت تو ہے؟ ذرا سا کہیں کسی گاؤں میں کسی قصبے میں کوئی بات ہوتی، وہاں کی ہندو مسلم آبادی بغیر کسی فرق کے، اور امتیاز کے جمع ہو جاتی مدد کے لیے، ہمارا یہ ہندوستان اس کے لیے ضرب المثل تھا، میں دنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں پھرا ہوں، شاید کوئی ملک باقی ہو، بار بار برطانیہ انگلینڈ جانا ہوتا ہے، تقریباً ہر سال جانا ہوتا ہے، امریکہ وغیرہ بھی گیا ہوں، شکاگو، فرانس وغیرہ ہو کر کے آیا ہوں، اور پھر اس کے بعد بیلجیم اور فرانس اور جرمنی اور سویزرلینڈ اور اسپین سب دیکھ آیا ہوں، میں آپ کے سامنے گواہی دیتا ہوں کہ ہندوستان کی بہت بڑی عزت گاندھی جی کے نام سے تھی، تو یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے اس ملک کی سیوا کی، اس ملک کی محبت میں، Interest میں اپنے کو خطرے میں ڈالا، اور پھر جوان کے ساتھ جوان کے ساتھی تھے، جواہر لال جی، مولانا ابوالکلام آزاد، یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے پہلے اس ملک کو آزاد کرنے کی کوشش کی، پھر اس کے بعد اس کو بچانے کی کوشش کی، پھر اس کو عزت دلانے کی کوشش کی۔

بس آپ ہم سب ان کے جانشین ہیں، ان کی جگہ پر ہیں، آپ یہ پیغام کم سے کم اپنے گھروں میں، محلوں میں بچوں کو سنائیے اور ابھی سے یہ کوشش کیجیے کہ ذہن بدلے، یہ اخبارات جو ہیں، یہ اخبارات ایسا زہر پھیلاتے ہیں، ہمارا پریس جو ہے، وہ بڑا Communal بن گیا ہے، اور اس کے علاوہ اور جو میڈیا ہے، ذرائع ابلاغ ہیں، وہ سب ایسی ایسی چیزیں سناتے ہیں، یا

چھاپتے ہیں جس سے کہ آدمی کا خون کھولنے لگے، آدمی کے اندر نفرت پیدا ہو، یہ سب بھی تب درست ہوں گے جب یہ سمجھیں گے کہ پسند نہیں کیے جاتے، آپ Dislike کرتے ہیں، آپ ان سب باتوں کو ناپسند کرتے ہیں، تو وہ تو Popularity چاہتے ہیں، وہ خود ہی اپنا Trend بدل دیں گے۔

غازی پور کی ایک اچھی تاریخ ہے، شاندار تاریخ ہے، جیسا کہ بیان کیا گیا کہ اُس وقت ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کے لیے سب سے پہلے جو کھڑے ہوئے، وہ حضرت سید احمد شہیدؒ ہیں جنھوں نے مہاراجہ گوالیار کو خط لکھا، کہاں وہ رائے بریلی کے رہنے والے، کہاں مہاراجہ گوالیار کو خط لکھا، کہ دیکھیے یہ سودا بیچنے والے اور یہ باہر کے پردیسی یہ زمین اور علاقوں کے بادشاہ بن گئے ہیں، آئیے ہم دونوں مل کر ان کو نکالیں، پھر اس کے بعد یہ انتظام ہوگا کہ کون سا عہدہ کس کو دیا جائے، اور کون سی خدمت کس کے سپرد کی جائے، یہ پہلا خط تھا جو اس جذبہ کے ساتھ لکھا گیا، اور ٹیپو سلطان کا تعلق بھی ان کے خاندان سے رہا ہے، ٹیپو سلطان نے انگریزوں کا سب سے جم کر مقابلہ، یہاں تک کہ جب وہ شہید ہوئے تو اس وقت جو کمانڈر انچیف تھا انگریز ملٹری کا، وہ آیا اور اس سے کہا گیا کہ ٹیپو سلطان مارے گئے، تو اس نے کہا: میں دیکھوں گا، وہ آیا اور اس نے لاش کو دیکھا اور کہا: آج سے ملک ہندوستان ہمارا ہے، آج سے ہندستان ہمارا ہے، جب اس نے دیکھا ٹیپو سلطان ختم ہوگئے تو اس نے کہا: اب کوئی خطرے کی بات نہیں، تو یہ آزادی کی جنگ میں ہندو مسلمان اسی طریقہ سے سب ساتھ رہے ہیں۔

اسی طریقہ سے اب ہندوستان میں، ہندوستان کو بچانے کی جنگ میں ہم کو آپ کو سب کو ساتھ ہونا چاہیے، برائی کو برائی سمجھنا چاہیے، ظلم کو ظلم سمجھنا چاہیے، انصاف کو انصاف سمجھنا چاہیے، اور انسان کو بھائی سمجھنا چاہیے، بس میں اس سے زیادہ طول دینا نہیں چاہتا، میں شکر گزار ہوں جلسہ کے منتظمین کا بھی اور پھر آپ کا کہ آپ نے وقت نکالا، اور آپ جس شخصیت سے، Personality سے جس کا نام لیا گیا، آپ اس سے واقف بھی نہیں تھے، آپ محض انسان دوستی میں، اور اپنی شرافت میں، اور قدر دانی میں اتنی بڑی تعداد میں جمع ہوگئے، یہ بات بہت امید افزا، امید دلانے والی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں یہ مادہ دے، یہ ہمت دے کہ ہم اس ملک کو بچائیں۔

آگ کو جب کچھ کھانے کو نہیں ملتا تو وہ خود کو کھانے لگتی ہے

چھوٹی چھوٹی باتوں میں یہ خیال کرنا کہ یہ کس مذہب کا ہے، یہ کس برادری کا ہے، یہ دیکھیے،

جب مذہبوں سے بات نکلتی ہے تو پھر برادریوں میں بات چلی جاتی ہے، جاتوں میں بات چلی جاتی ہے، میں نے وی پی سنگھ سے جب وہ Prime Minister تھے، ایک بات کہی تھی، میں نے کہا: وزیراعظم صاحب! وی پی سنگھ جی! عربی کا ایک شعر ہے کہ آگ کو جب کچھ کھانے کو نہیں ملتا تو اپنے کو کھانے لگتی ہے، وہ رائے بریلی بھی ملنے آئے اور لکھنؤ میں بھی ملے، اور کہا: میں آپ کی یہ بات کوڈ کرتا ہوں، مجھے خوب یاد ہے کہ آپ نے یہ بات کہی تھی، کہ آگ کو کچھ باہر کی چیز کھانے کو نہیں ملتی، ایندھن نہیں ملتا، لکڑی نہیں ملتی تو وہ اپنے کو کھانے لگتی ہے، وہ بغیر کھائے رہ نہیں سکتی۔

تو یاد رکھیے جب مذہبوں سے یہ بات ہٹے گی، اور Communities سے ہٹے گی، Reiligions سے یہ بات ہٹے گی، تو پھر اس کے بعد ذاتوں اور برادریوں میں جائے گی، اور ذاتوں اور برادریوں سے بھی بات آگے بڑھ کر پھر افراد میں، Individuals میں جائے گی، Families میں یہ بات جائے گی، اور رنگتوں میں جائے گی، لباس میں جائے گی، اور رہنے سہنے کے طریقوں میں جائے گی، پھر یہ ملک ملک نہیں رہے گا، میدان جنگ بن جائے گا، یہ Battle Field بن جائے گا۔

اور ایسا ہوا ہے، کتنے ملک ہیں کہ جن کا تاریخ میں نام ہے اور آج وہ پائے نہیں جاتے، کتنے Empires ہیں، Civilizations ایسی گزری ہیں، اور کتنے کلچر ایسے گزرے ہیں جن کا تاریخ میں نام رہ گیا ہے، اگر آپ International History پڑھیں، Universal History پڑھیں، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بعض کا اب صرف نام رہ گیا کہ کبھی وہ تھے، اور آج کہیں ان کا نشان نہیں، انہی باتوں کی وجہ سے کہ آپس میں لڑنے کا، آپس میں ایک دوسرے کو مارنے کا، ایک ذوق، ایک Hobby پیدا ہوگئی، بس اس میں مزہ آتا تھا کہ اِن کو مارا، اُن کو مارا، ہم بڑے آدمی ہیں، اور ہم طاقت ور ہیں، پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ پھر اس کے بعد یہاں تک کہ Families تک میں چلے گی یہ بات، اور برادریوں میں، خاندانوں میں چلے گی، بھائی بھائی میں چلے گی۔

تو یہ سلسلہ یہیں روکنا چاہیے، ظلم کا سلسلہ، زیادتی کا سلسلہ، Cruelty کا سلسلہ، اور خون ریزی، خون بہانے کا اور کسی کو ذلیل کرنے کا، خون بہانا تو بہت بعد کی بات ہے، کسی کو ذلیل کرنا، کسی کو اپنے سامنے جھکانا، اپنا غلام بنا لینا، اور ہر قیمت پر عزت حاصل کرنا، اور ہر قیمت پر دولت حاصل کرنا، یہ مرض ہے، یہ جب قوموں کو لگ جاتا ہے، اور یہ مرض خالی افراد کا نہیں ہے،

Individuals کا نہیں ہے، Units کا نہیں ہے، یہ مرض ہے Nations کا، Civilizations کا، Cultures کا، اور معاف کیا جائے تو Religions کا بھی، کہ جب یہ مرض لگ جاتا ہے کہ آدمی کو اپنا فائدہ چاہیے، اپنا مفاد چاہیے، اور آنکھیں بند کہ اس مفاد کے حاصل کرنے میں کسی پر کیا گزرتی ہے، کتنے آدمی ذلیل ہوتے ہیں، کتنے آدمی مارے جاتے ہیں، کوئی پرواہ نہیں، ہمیں اتنا روپیہ چاہیے، اتنی دولت چاہیے، ہمیں بینک میں اتنا بڑا سرمایہ چاہیے، ہمیں شہر میں اتنا اونچا نام چاہیے، ہمیں وزارت چاہیے، ہمیں پاور چاہیے، تو پھر اس کے بعد پھر یہ ہوتا ہے کہ پھر ٹکراؤ ہوتا ہے، پھر ایک Community کا دوسری Community سے، ایک برادری کا دوسری برادری سے، اور ایک پارٹی کا دوسری پارٹی سے، اور ایک Interest کا دوسرے Interest سے ٹکراؤ ہوتا ہے، اور پھر کوئی زندگی کا مزہ نہیں رہتا، شہر نہیں رہتے، آبادی نہیں رہتی، میدان جنگ بن جاتے ہیں، Battle Field بن جاتے ہیں، ابھی پہلی جنگ عظیم (Great War) کب ہوئی اور دوسری Great War کب ہوئی، ابھی اس میں ایک Interval آ گیا، اس میں بیچ میں ایک خلا آ گیا، اب جو Great War ہوگی وہ ختم ہونے والی نہیں، اور وہ ختم کر کے جائے گی، وہ ختم کر کے ختم ہوگی، وہ ختم کیے بغیر جائے گی نہیں، اس لیے بھی اس کو سمجھنا چاہیے کہ یہ کتنا بڑا خطرہ ہے، یہ خطرہ خالی کسی Minority کے لیے خطرہ نہیں، یہ خطرہ پورے ملک کے لیے ہے، یہ پورے ملک کی شہری زندگی، معتدل حالات، Normalcy، Confidence اور Cooperation، سب کے لیے خطرہ ہے، یہ سب چیزیں خطرہ میں پڑ جائیں گی، اور آدمی کو محسوس ہوگا کہ میں جنگل میں ہوں یا میں کسی عجائب خانہ میں ہوں، یہاں یہ شیر کا کٹھرا ہے، یہ چیتے کا کٹھرا ہے، اور یہ تیندوے کا ہے، اور یہ بھیڑیے کا ہے۔

زندگی کا مزہ صرف کھانے پینے سے نہیں ہے

زندگی کا مزہ کیا ہے؟ میرے بھائیو! زندگی کا مزہ صرف کھانے پینے سے نہیں ہے، زندگی کا مزہ بعض مرتبہ بھوکے رہنے میں زیادہ ہے کھانے پینے کے مقابلہ میں، خدا کے ایسے بندے گزرے ہیں، ہر قوم میں گزرے ہیں، ہر مذہب میں گزرے ہیں، جو بھوکے رہ کر خوش ہوئے، جنھوں نے اپنا اور اپنے بچوں کا کھانا ڈال دیا سامنے، ایسے واقعات اس ملک میں پیش آئے، اسی سے مذہب چلے ہیں، تہذیبیں چلی ہیں، یہ Human Race انسانی نسل باقی رہی ہے، اگر یہ بات نہ ہوتی تو یہ Human Race انسانی نسل پوری کی پوری ختم ہو چکی ہوتی، فنا کے گھاٹ اتر جاتی، جیسے نہ

جانے کتنی اور Races ختم ہو گئیں۔

بس آپ Normalcy پیدا کیجیے، Confidence پیدا کیجیے، انسان کو دیکھ کر خوش ہونے کی عادت ڈالیے، وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، وہ کسی Nationality سے تعلق رکھتا ہو، وہ کسی زبان سے تعلق رکھتا ہو، یہ ہمارا بھائی، یہ ہمارے شہر کا رہنے والا، اور شہر کا رہنے والا نہ ہو جب بھی ہمارے ملک کا رہنے والا، ہمارے ملک کا رہنے والا بھی نہ ہو، میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ انسان ہے، Human Race کی ایک Unit، اس کا ایک فرد ہے، اس لیے اس رشتہ سے وہ ہمارا بھائی ہے، رشتے کئی ہوتے ہیں، سگے رشتے بھی ہوتے ہیں، دور کے رشتے بھی ہوتے ہیں، سگے رشتے تو آپ کے شہر کے بھائیوں سے ہیں، لیکن دور کے رشتے ایک عرب سے بھی ہیں، ایک ایرانی سے بھی ہیں، ایک برطانیہ کے رہنے والے انسان سے بھی ہیں، امریکہ کے رہنے والے انسان سے بھی ہیں۔

محبت کے گیت

اور ہندوستان کو یہ خصوصیت حاصل رہی ہے کہ اس نے پرانے زمانے میں بھی محبت کے گیت گائے، آپ اگر پڑھیے پرانی نظمیں، اور یہاں کی جو شاعری اور قدیم Poetry اور یہاں کی جو History ہے، پرانا جو ذخیرہ ہے، اور کہیں کہیں کتب خانوں میں پایا جاتا ہے، تو اس میں محبت کے گیت آپ سنیں گے، ایسے محبت کے گیت کہ ان کو سن کر آج بھی آدمی کو لطف آتا ہے، اور نشہ سا چھا جاتا ہے، سب بھائی بھائی ہیں، سب بھائی اپنے ہیں، سب بھائیوں سے ہمدردی کرو، سب بھائیوں کو سینے سے لگاؤ، سر پر بٹھاؤ، اور بھوکے رہ کر ان کو کھلاؤ، یہ ہمارے ملک کا امتیاز رہا ہے، اس امتیاز کو باقی رہنے دیجیے، ورنہ یہ کام آدمی چلا لیں گے، اپنا مطلب نکال لیں گے، مگر پھر وہ کہتے ہیں، جس کو کہ نہ پھر وہ درخت رہے گا نہ وہ شاخ رہے گی، نہ وہ پتی رہے گی، نہ وہ پھول رہے گا، تو درخت ہی گر جائے گا، پھر اس کے بعد انسان انسان کی صورت دیکھنے کو ترسے گا، اور محبت کی بات سننے کو ترسے گا، کہ کوئی بھائی کہہ کر اس کو بلائے، کوئی اور کسی رشتے سے اس کو عزت کے ساتھ بلائے، عزت کے ساتھ اس کو بٹھائے، اور اس کے ساتھ مل کر کے خوش ہو، اس سے باتیں کر کے اپنا دل خوش کرے، یہ سب باتیں کافور ہو جائیں گی، خواب وخیال بن جائیں گی، ابھی سے اس کی فکر کی ضرورت ہے، بھئی اس چیز نے ہم کو بے چین کیا، ورنہ ہمارے لیے پڑھنے لکھنے کا سامان اور ممبر شپ جو باہر کے ملکوں کی ہے، اور کہیں کہیں کی چیرمین شپ یہ کافی تھی کہ ہم اسی میں لگے رہتے، مگر

ہم نے کہا کہ جب ہمارا ملک، ہمارا دیس، ہماری زمین، ہمارا گھر اگر ٹھیک نہیں ہے تو باہر اگر کہیں کوئی آپ کو ہوائی جہاز پر لے جائے اور آسمانوں کی سیر کرائے، اور آپ کو وہاں کے بڑے بڑے قابل دید مقامات دکھائے، کچھ مزہ نہیں، کہیں کچھ مزہ نہیں، اگر اپنے گھر میں شانتی نہیں ہے، سکون نہیں ہے، Confidence نہیں ہے، بھروسا نہیں ہے، اور اپنے گھر آ کر خوشی نہیں ہوتی، اطمینان نہیں ہوتا، دنیا میں کہیں اطمینان نہیں مل سکتا۔

بس اس چیز نے ہم کو مجبور کیا، ورنہ ہماری عمر، ہمارے مشغلے، اور ہمارا Taste، اور ہمارا ذوق، اور ہماری جو ذمہ داریاں ہیں، بہت سے اداروں کی ممبر شپ اور کہیں کہیں کی Presidentship، اور Chairmanship ہے، یہ سب چیزیں کافی تھیں کہ ہم بیٹھ کر لکھتے پڑھتے رہتے، مگر ہم نے سوچا خدا نے ہم کو Conscience دیا ہے، ہم نے کہا: کچھ نہیں چلے گا اگر اس ملک میں نارمل حالات (Normal Conditions) نہیں ہیں، اگر اس ملک میں امن و اطمینان نہیں ہے، اور یہاں پر وہ Peaceful Life اور Confidence اور ایک دوسرے کی عزت کرنا اور پر سکون حالات نہیں ہیں، تو پھر نہ لکھنا پڑھنا ہو سکتا ہے اور نہ باہر نکلنا ہو سکتا ہے، اور نہ باہر جا کر کوئی خوشی ہو سکتی ہے، اور نہ یہ تقریبات وغیرہ جو ہوتی ہیں شادی بیاہ وغیرہ کی، نہ اطمینان کے ساتھ یہ کی جا سکتی ہیں، جب آدمی آدمی کو دیکھ کر خوش نہ ہو، آدمی آدمی کو دیکھ کر جب یہ رشتہ نہ محسوس ہو کہ ہمارا اس کا انسانیت کا رشتہ ہے، آدمیت کا رشتہ ہے، ہندوستانیت کا رشتہ ہے، ایک دیس کا رشتہ ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم بھی خدا کے پیدا کیے ہوئے اور یہ بھی خدا کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔

انسان انسان پر حملہ کیسے کر سکتا ہے؟

ہم نے نہیں دیکھا کہ سانپوں کا کوئی لشکر آیا ہو، ہم بیٹھے ہوں شہر کے کسی کنارے، ایک سانپوں کا کوئی لشکر آ رہا ہے، ہم نے پوچھا: بھئی کہاں جا رہا ہے؟ کہا: ایک سانپوں کا لشکر اُدھر ہے، اس سے لڑنے جا رہا ہے، ہم نے کہیں نہیں دیکھا، ہم شکار بھی کھیلے ہیں، اور بندوق چلاتے تھے، اور نشانہ تھا ہمارا، ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ بھیڑیے ایک جگہ کے جمع ہو کر دوسری جگہ کے بھیڑیوں پر انھوں نے حملہ کیا ہو، یا شیروں پر حملہ کیا ہو، بھیڑیوں نے تیندوؤں پر حملہ کیا ہو، تیندوؤں نے بھیڑیوں پر حملہ کیا ہو، یہ جنگل میں نہ ہم نے دیکھا نہ سنا، یہ آدمی آدمی پر کیسے حملہ کرتا ہے؟ بھیڑیے سے گیا گزرا ہوا؟ سانپوں سے گیا گزرا ہوا؟ بچھوؤں سے گیا گزرا ہوا؟ بڑے شرم کی بات ہے، ہم

ایک دیس کے رہنے والے، اور ایک ہوا میں سانس لینے والے، ایک گھاٹ کا پانی پینے والے، اور یہیں بظاہر ہماری زندگی گزرے گی، کوئی یہاں سے جانے کا ارادہ نہیں کر رہا، جن کو جانا تھا وہ چلے گئے پاکستان، ہم لوگوں کو بھی آفر آئی، اور بہت لالچ دی گئی، مگر ہم نے کہا: ہم یہیں پیدا ہوئے، اور یہیں رہیں گے، ہمارا وطن ہے، ہمارا ملک ہے، تو اب تو اس کے بعد وہ مل جل کر رہنے کی عادت اور سلیقہ نہ رہے، اس سے بڑھ کر کوئی ٹریجڈی نہیں، اس سے بڑھ کر کوئی آزمائش اور مصیبت کی بات نہیں۔

تو بس یہ چیز ہے کہ جس نے ہم کو بے چین کیا کہ بھئی صدا لگاؤ، سننے والے چاہے کم ہوں، اور ماننے والے اور کم ہوں، مگر صدا لگاؤ، تم تو صدا لگاؤ ہی، کیونکہ تاریخ کا تجربہ یہ ہے کہ کوئی صدا خالی نہیں جاتی، جب کوئی صدا لگاتا ہے، تو کچھ نہ کچھ اس کا اثر ہوتا ہے، نہ سہی سیکڑوں کی تعداد میں، بیسیوں دسیوں کی تعداد میں، درجنوں کی تعداد میں نہیں، تو انگلیوں کی تعداد میں کچھ لوگ نکل آتے ہیں، اور تاریخ بتاتی ہے کہ بعض بہت چھوٹی تعداد نے حالات کو بدل دیے، ایسی تعداد کہ بغیر دور بین کے دیکھے، خورد بین کے دیکھے دیکھے نہ جاسکے، ایسی تعداد نے ملک کے ملک کے حالات بدل دیے، اور لوگوں کو سیدھے راستے پر ڈال دیا۔

مقصد اور ذرائع دونوں صحیح ہونے چاہئیں

بس اسی امید میں ہم یہ صدا لگا رہے ہیں، آپ کے پاس بھی آئے ہیں، اور پھر جہاں خدا موقع دے گا، جائیں گے، ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ میں بھی لوگ کھڑے ہوں، ہر جگہ ایسے لوگ کھڑے ہوں، جو اس شہر کو بدنامی سے بچائیں، اور خانہ جنگی سے بچائیں، اور دولت وعزت پیدا کرنے کی ہوس اور اس کی انتہائی لالچ، بلکہ جنون و دیوانگی سے بچائیں۔

اس طرح سے ہمارا ملک باقی نہیں رہ سکتا، اور باقی رہے گا بھی تو بڑی بدنامی کے ساتھ باقی رہے گا، لوگ انگلیاں اٹھائیں گے اور کہیں گے: یہ دیکھو یہ ہندوستان کے ہیں، یہ اس ملک کے ہیں، لندن میں اور واشنگٹن ڈی سی میں اور شکاگو میں ہر جگہ انگلیاں اٹھیں گی کہ دیکھیے یہ ہندستانی جارہے ہیں، جو ہر وقت آپس میں لڑا کرتے ہیں، ہمیشہ ان میں Communal Riots ہوتے ہیں، فسادات ہوتے ہیں، یہ اچھی بات نہیں ہے، ہم نے کہا کہ ابھی تک ہندوستان کا اچھا نام ہے ان ملکوں میں، اور اس میں زیادہ تر اثر گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں کا، مولانا آزاد، جواہر لال جی، اور جو ہمارے تحریک آزادی کے رہنما تھے، ان کو ضرب المثل کے طور پر، آئیڈیل کے طور

پر نام لیا جاتا اور پیش کیا جاتا ہے، آپ اس عزت کو برقرار رکھیں، اس ساکھ کو، اس شہرت کو، اس اعتماد کو، اور پھر کھائیں کمائیں، سب کچھ کریں، مگر آدمی بن کر رہیں، اور یہ Communal Riots ہیں، یہ ذات و برادری کی لڑائیاں ہیں، اور یہ پاور میں آنے کے لیے سب کچھ کرلینا، اور لوگ کہتے ہیں کہ جو مقصد ہو تو اس مقصد کے لیے تمام ذرائع سب جائز ہیں، سب Means اختیار کیے جاسکتے ہیں، کسی Purpose کے لیے، کسی Target کو حاصل کرنے کے لیے، یہ غلط ہے، مقصد بھی صحیح ہونا چاہیے، ذرائع بھی صحیح ہونے چاہئیں، یہ ہے وہ سبق اخلاق کا سبق، مذہبوں کا سبق اور خدا کے نیک بندوں کی سکھائی ہوئی، دی ہوئی تعلیم، اور خود ہمارے جنگ آزادی کے رہنماؤں اور Leaders کا عمل اور ان کی تعلیم۔

بس میں اس پر ختم کرتا ہوں، اور آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ تشریف لائے ایک انجانی شخصیت کی بات سننے کے لیے، اور اتنے اطمینان و سکون کے ساتھ آپ نے سنا، خدا آپ کو ترقی دے، اور آپ کے نیک مقاصد پورے کرے، اور آپ کو صحت کے ساتھ، اچھی، بڑی عمر کے ساتھ آپ کو باقی رکھے، اور آپ سے اس ملک کی خدمت کا، اس دیس کی خدمت کا کام لے۔ [۱]

(۱) یہ تقریر ٹیپ رکارڈ سے قلمبند کر کے شامل کی گئی۔

۲٦

اس وقت ملک کو بربادی سے بچانے کے لیے دیوانوں کی ضرورت ہے (۱)

ایک چونکا دینے والی آیت

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

﴿فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُوا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ﴾ (سورة هود: ۱۱٦)

میرے عزیز بھائیو، میرے دوستو، میرے ہم وطنو! میں اگر الفاظ کے بجائے اپنی تقریر آنسوؤں سے کرسکتا، اور زبان کے بجائے میں آپ کے سامنے اپنا دل نکال کر رکھ سکتا، اس سے آگے بڑھ کر کہتا ہوں (اس کو کسی شاعرانہ مبالغہ پر محمول نہ کیا جائے) کہ میں ہندوستان کے ضمیر کو آپ کے سامنے لاکر کھڑا کرسکتا، ہندوستان کا ضمیر آپ سے بولے، آپ کا ملک آپ سے مخاطب ہو، وہ آنسوؤں سے بھی، آہوں سے بھی، شکایتوں سے بھی اور پیار ومحبت سے بھی آپ سے بات کرے، ان میں سے کوئی بھی میرے بس میں نہیں ہے، اس لیے میں الفاظ سے اللہ کی توفیق سے اس جذبہ اور درد کی بنا پر جو میرا ذاتی جذبہ ہے، اس میں کوئی سیاسی مقصد، کوئی مادی فائدہ ،کوئی شہرت، کوئی ناموری نہیں ہے، میں آپ سے عرض کرتا ہوں۔

میں نے ابھی آپ کے سامنے قرآن شریف کی آیت پڑھی ہے، وہ چونکا دینے والی آیت ہے، اللہ فرماتا ہے تم سے پہلے جو صدیاں اور نسلیں گزری ہیں ان میں جب تباہی اور بربادی آئی،

(۱) سہکارتا بھون لکھنؤ میں ۹/ اکتوبر ۱۹۹۴ء کو ہندو مسلمانوں کے ایک بڑے منتخب مجمع کے سامنے کی گئی تقریر۔

انار کی پھیلی اور دولت کا جو دور دورہ ہوا، اور اس کے ساتھ ساتھ جذبات پرستی، حیوانیت پرستی اور طاقت پرستی کا جو دور دورہ ہوا، ان میں سے کچھ بچے کھچے لوگ کہاں تھے جن میں کچھ بچا کھچا احساس ہوتا، ''اُولُوا بَقِیَّۃٍ'' ایسا قرآنی لفظ ہے کہ اس کا ترجمہ ہمارے ہندوستان کے مترجموں کے لیے مشکل ہو گیا، شاہ عبدالقادر صاحب دہلویؒ نے اس کا ترجمہ ''صاحب شعور'' سے کیا ہے، کچھ احساس وشعور رکھنے والے کہاں تھے، اس وقت میدان میں آتے اور اس صورت حال کا مقابلہ کرتے۔

جب نسل انسانی خودکشی پر آمادہ تھی

حضرات! میں ایک تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ اس انسانی نسل پر ایسے وقت اور ایسے دور آئے ہیں جو صاف نظر آ رہا تھا، اور معلوم ہو رہا تھا کہ اب یہ انسانی نسل مٹا کر رکھ دی جائے گی اور اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہے گا، اور انسانی نسل خودکشی پر آمادہ ہے، جن کو خدا نے ذرا بھی دیکھنے والی نگاہ عطا فرمائی تھی اور جن کو واقعات سے نتائج نکالنے کی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے دی تھی، وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ پوری کی پوری نسل انسانی خودکشی پر آمادہ ہے، وہ قسم کھائے ہوئے ہے کہ ہم اپنا نشان باقی نہیں رکھیں گے، اس وقت کوئی پیشین گوئی کرنے والا پیشین گوئی کر سکتا تھا کہ چند برسوں کی بات ہے کہ جب آدمی کو تلاش کرنا پڑے گا، آدمی کو تلاش کرنے کے لیے بھی آدمی چاہیے، اور تلاش کرنے والا آدمی بھی نہیں ملے گا، تلاش کون کرے، اور تلاش کس کو کرے، یہ الگ بات ہے، مثال کے طور پر اگر آپ Gibbon کی کتاب پڑھ لیں جس کا تمام دنیا میں ڈنکا بج رہا تھا، اور رومن لا کا نام دنیا میں گونج رہا تھا، جس سے قانون سازوں نے فائدہ اٹھایا ہے، ایسے ہی ساسانیوں کی تاریخ آپ پڑھ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ ایسے کئی دور اس دنیا میں آئے ہیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان ایک کہانی بن کر رہ جائے گا، اور کہانی بھی پڑھے گا کون، پڑھنے والے کہاں سے آئیں گے، لکھنے اور پڑھنے کہاں سے آئیں گے، ایسا ہوا کہ اگر آپ حیوانات کی تاریخ میں جائیں، کیڑے مکوڑوں کی یا پرندوں کی تاریخ میں جائیں تو معلوم ہوگا کہ ایسے بھی جانور ہیں جن کی نسل ختم ہو گئی، کتابوں میں پڑھنے میں آتا ہے کہ فلاں فلاں چڑیا اور فلاں قسم کا جانور تھا، اور اب وہ دیکھنے میں نہیں ملتا، ایسے ہی انسانوں کے ساتھ ہوگا، آخر یہ نسل کیسے بچی؟

انسانیت کے محسن

تو ہوا یہ کہ جب انسانوں پر دورہ پڑا، خودکشی کا اور ضمیر کشی اور شرافت کشی کا دورہ پڑا ہوا تھا،

اس وقت خدا کے کچھ ایسے بندے پیدا ہوئے جن پر اصلاح کا دورہ پڑ گیا، یہ انسانی تاریخ سب سے زیادہ ممنون اور شکر گزار اور زیر بار احسان ہے خدا کے پیغمبروں کی، جن کے سامنے صرف انسانوں کے بچانے کا مقصد تھا، خدا کا ڈر اور اس کا خوف تھا، خدا کے خوف کے سوا کوئی خوف نہیں تھا، اور خدا کی خوشی اور اس کے راضی ہونے کے سوا کوئی لالچ نہیں تھی، دنیا کی تاریخ گواہ ہے، بڑی سے بڑی دولت اور شہنشاہی تو کیا، میں گناہ گار ہوں گا اگر ان کا نام لوں، اس سلسلہ میں نام تو زبان سے لینا مشکل ہے، ان برگزیدہ ہستیوں کے غلاموں نے اس کو ٹھکرا دیا، اور صاف کہہ دیا کہ ہم تو اس کو دیکھنے کے بھی روادار نہیں، تمہاری دولت تم کو مبارک ہو، ہم تو انسانوں کے خادم ہیں جیسا کہ ابھی ہمارے عزیزی پروفیسر یونس نگرامی نے اپنے خطبہ میں کہا کہ خواجہ فرید الدین رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کوئی شخص قینچی لے کر آیا تو انھوں نے کہا کہ یہاں قینچی کا کام نہیں ہے، یہاں سوئی کا کام ہے، یہاں ٹوٹے ہوئے دلوں کے جوڑنے کا کام ہوتا ہے، کاٹنے کا کام نہیں ہوتا، قینچی لے جاؤ اپنے ساتھ، اگر تم یہاں سوئی لائے ہوتے تو سوئی لیتے۔

اس وقت چار چیزوں کی پرستش ہو رہی ہے

میں صاف کہتا ہوں خدا کے ایک گناہگار بندے کی حیثیت سے کہ ساری دنیا جو آپ دیکھ رہے ہیں، یہ ان پیغمبروں اور ان کے غلاموں کا نتیجہ ہے جو ہر ملک میں پہنچے، اور انھوں نے انسانیت و وحدت کا پیغام سنایا، خدا کے خوف وخشیت اور انسانیت کی محبت کا پیغام سنایا، اپنا کھانا پینا بھول گئے، ان کو بعض مرتبہ کئی کئی روز فاقے کرنے پڑے، نہ کھانے کا ہوش تھا نہ کپڑوں کا، بس یہ فکر تھی کہ خدا کی اس مخلوق کو سینہ سے لگائیں اور ان کو دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں، کہ یہ آدمیوں کی طرح رہ رہے ہیں، جانوروں کی طرح نہیں رہ رہے ہیں، کہ بھیڑیا بھیڑیے پر حملہ کر رہا ہے اور چیتا چیتے پر حملہ کر رہا ہے، میں نے بعض جگہ کہا کہ ہم نے نہیں سنا کہ چیتوں نے چیتوں پر حملہ کیا ہو، کہیں اخبار میں خبر چھپی ہو کہ چار سو چیتے گئے اور ادھر سے چیتوں کا قافلہ آ رہا تھا اس نے اس پر حملہ کر دیا، شیروں نے شیروں پر حملہ کیا ہو، اور مجھے اس مہذب مجلس میں معاف کیا جائے کہ ہم نے کبھی نہیں سنا کہ کسی محلے کے کتوں نے دوسرے محلے کے کتوں پر حملہ کیا ہو، اور کہیں کے سانپوں نے سانپوں پر حملہ کیا ہو، کہیں کے بچھوؤں نے بچھوؤں پر حملہ کیا ہو، لیکن یہ کیا غضب ہے خدا کا کہ انسان انسان پر حملہ کرتا ہے، آخر کس لیے؟ اس لیے کہ اس وقت چار چیزوں

کی پرستش ہورہی ہے،ایک دولت، ایک طاقت، ایک سیاست اور ایک فرقہ واریت، یہ چار معبود ہیں جن کے سامنے جھکنے اور ان کے پا لینے کے لیے سب کچھ کرگزرنے کے لیے ہر شخص تیار ہے۔

جغرافیائی نقشہ کے بجائے اخلاقی نقشہ

مجھے افسوس ہے کہ ہندوستان کا جو جغرافیائی نقشہ بنتا ہے، یہ ہمالیہ پہاڑ ہے، یہ دریائے ہگلی ہے، یہ فلاں صوبہ ہے، یہ کرناٹک ہے، یہ یوپی ہے، یہ بہار ہے، اور یہ بنگال ہے، لیکن ابھی تک کوئی ایسا نقشہ نہیں بنا ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہو کہ یہ لالچ کا پہاڑ کھڑا ہے، یہ انسان کشی کا دریا بہہ رہا ہے، اور یہ دولت پرستی کا طوفان آرہا ہے، اور یہ سیاست کے لیے سب کچھ کرگزرنے اور تمام صداقتوں اور اخلاقی معیاروں کو بالکل بھول جانے کا مرض پیدا ہو گیا ہے، میرا خیال ہے کہ کچھ ایسے اسکالر ہوں جو ہندوستان کا ایسا نقشہ بھی کھینچیں، اخلاقی نقشہ ابھی تک نہیں سنا گیا، ایک ٹیم ایسی ہونی چاہیے جو حالات کو سامنے رکھ کر ایک نقشہ بنائے جس میں بتایا گیا ہو کہ دولت کی پوجا اس حد تک پہنچ گئی ہے، اور اس کی بلندی یہ ہے، اور اس وقت طاقت کی پوجا اس حد تک پہنچ گئی ہے، اس وقت انسان کشی اور نفرت کی وبا اس حد تک پہنچ گئی ہے، ان سب کا گراف بنا دے جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ چیز کہاں تک پہنچ گئی، آج اگر وہ نقشہ ہوتا تو کچھ کہنے کے بجائے بس یہ نقشہ سامنے رکھ دیا جائے اور ہر زبان میں لکھ دیا جائے کہ یہ طاقت کی پوجا ہے، یہ دولت کی پوجا ہے، یہ سیاست کی پوجا ہے، اس کی خاطر سب کچھ کر لینا معقول اور جائز ہے، اور یہ کہ پسندیدہ جہیز اور مطلوبہ رقم نہ لانے پر معصوم لڑکیوں، اپنی بہنوں، اپنی بھتیجیوں، بھانجیوں کو (کتنے رشتے بتائے جائیں) قتل کر دیا جائے، نیشنل پریس کی رپورٹ کے مطابق صرف دہلی میں ہر بارہ گھنٹے میں ایک بیاہی ہوئی دلہن صرف اس لیے مار اور جلا دی جاتی ہے کہ وہ اتنا جہیز لے کر نہیں آئی ہے، اتنا چیک بینک کا لے کر نہیں آئی، آپ دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھیے کہ ایسی حرکت کرنے والوں کو اللہ پسند کرے گا؟ اس کی ذات تو بہت اونچی ہے، برداشت کرنے کا سوال کیا، آپ کو یہ بات برداشت ہوگی، حقائق کو برداشت ہوگی، خدا نے جو فطرت بنائی ہے، جس پر یہ دنیا چل رہی ہے، بہرحال یہ دنیا کھانے پینے پر چل رہی ہے، کھانے پینے کا یہاں انتظام ہونا چاہیے، علاج کا انتظام ہونا چاہیے، موسم ہونا چاہیے، حفظان صحت کے اصول بھی ہونے چاہئیں، تو اس اخلاقی حالت میں یہ دنیا چل سکتی ہے۔

اس ملک کو دیوانوں کی ضرورت ہے

اس وقت اس دنیا میں جو کچھ بھی کمی ہے، وہ یہ کہ ایسے لوگ جن پر یہ دورہ پڑ جائے، میں معذرت کرتا ہوں، اور اپنے ضمیر سے بھی معافی چاہتا ہوں کہ میں اس کے لیے دورہ اور ہسٹیریا کا لفظ استعمال کررہا ہوں، کہ وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں، اور ان کے ذہن پر حاوی اور سوار ہو جاتے ہیں، اور دل کے اندر بیٹھ جاتی ہے کہ یہ جو خرابی پھیلی ہوئی ہے اس کو دور کرنا چاہیے، اس کے بغیر ہم رہ نہیں سکتے، اس کے بغیر کھانے میں مزہ نہیں آسکتا، اس کے بغیر اپنے یہاں شادی کی تقریبات نہیں کرسکتے، اس کے لیے کچھ دیوانے چاہئیں، سو پچاس کی تعداد میں بھی ہمیں وہ سنیاسی اور وہ مذہبی انسان نظر نہیں آتے، اور نہ ہی ملک کے ہمدرد، مخلص بلکہ ملک دوست اور ملک پر جان دینے والے ہمیں نظر آتے ہیں کہ میدان میں نکل آئیں اور کہیں کہ یہ نہیں ہوسکتا، اور پیسے کی پوجا اس حد تک ہو، اور مجلسوں کا یہ موضوعِ سخن بن گیا ہے کہ یہ کام اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک رشوت نہ دی جائے، اس میں کسی محکمے کی تخصیص نہیں، اور پھر یہ کہ طاقت حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کرنا جائز ہے، توڑنا جائز ہے، اور جان پر کھیل جانا جائز ہے، بس ہمیں طاقت حاصل ہو جائے۔

ملک ہے تو سب کچھ ہے

میرے بھائی! طاقت کس لیے ہے؟ ملک ہے تو سب کچھ ہے، ملک اگر کرپٹ اور اخلاقی طور پر دیوالیہ ہوگیا اور ضمیر بالکل مر گیا، اچھے برے میں کوئی تمیز نہیں رہی، اور حد یہ ہے کہ انسان باہر سے آئے، بچے ان سے سب لپٹ لپٹ کر ملے تو وہ کچھ خوش نہیں ہوئے، انھوں نے بچوں کو پیار نہیں کیا، کسی نے پوچھا کہ آپ اتنے دن کے بعد آئے، وہ کہنے لگے کہ ہمیں اطمینان نہیں کہ کبھی کوئی فساد ہو جائے، اور یہ بچے مارے جائیں، اور یہ بچے تڑپ رہے ہوں، روز اخبار پڑھتا رہتا ہوں، میرے دماغ میں ہے کہ نہ جانے کب Riot ہو جائے، اور گھروں تک پہنچ جائے، اور یہ بچے خون میں تڑپتے ہوئے نظر آئیں۔

انسانیت کی محبت، ایثار و قربانی اور استغناء کی دولت

یاد رکھیے، ہم نے بار بار کہا ہے کہ اس ملک کو تین چیزیں بچاسکتی ہیں، اور پھر کہتا ہوں اور کہتا رہوں گا، وہ یہ کہ ایک تو اس کو جمہوریت بچائے گی، دوسری چیز عدم تشدد، اور تیسری چیز اس کی صحیح حب الوطنی ہے، اس کے بغیر یہ ملک بچنے والا نہیں ہے، کسی ملک کا بڑا ہونا، بڑی آبادی کا ہونا،

دوستوں کا ہونا بالکل کافی نہیں ہے، تاریخ بتاتی ہے کہ ان سب پر بالکل پانی پھر جاتا ہے، اور یہ چیزیں جلا کر خاک کر دی جاتی ہیں، جب کسی ملک پر ادبار اور زوال آتا ہے تو یہ چیزیں کچھ کام نہیں آتیں، کام آتا ہے خدا کا خوف، کچھ انسانیت کی محبت، ایثار و قربانی اور استغناء کی دولت کہ کچھ مل جائے ہم کو، کہیں کی سلطنت اور دولت مل جائے ہم کو، جام جمشید کی سلطنت اور سکندر کی سلطنت بھی مل جائے جب بھی ہم اصول کے خلاف نہیں کر سکتے، یہ آج تک جو انسانیت برقرار ہے کچھ اصولوں کی پیروی کی وجہ سے برقرار ہے، اور کچھ خدا کے ان بندوں کی موجودگی کی وجہ سے برقرار ہے جن کے دل تڑپ رہے ہیں، اور جو آنسو بہا رہے ہیں، اور جن سے جو ہو سکتا ہے وہ کر رہے ہیں ہمیں خدا سے امید ہے کہ میدان میں کچھ ایسے لوگ آئیں۔

پوری انسانیت کو بچانا آپ کا فرض ہے

بہر حال اس وقت سب سے ضروری بات یہ ہے کہ اس وقت ملک کو بچانے کی فکر کی جائے، ملک بچا تو سب کچھ ہے، ہمارے ہندوستان میں ایسے لوگ پیدا ہوئے کہ عالم عربی کو ہندوستان کی ان ہستیوں پر فخر ہے، اور پورے عالم اسلام اور عالم عربی میں ان کا جواب نہیں، اور میں صاف کہتا ہوں کہ آپ اپنے ملک کا نام اونچا کیجیے، بلکہ میں یہاں تک کہتا ہوں کہ آپ اپنے ملک نیز پوری دنیا کو بربادی سے روکیے، اور نئی جنگ عظیم کو چھیڑنے اور نئے ایٹمی جنگ سے روکنے، اور یورپ و امریکہ کی تہذیبوں میں جو خلل پیدا ہو گیا ہے، اور ان میں جو کیڑے لگ گئے ہیں، اور جس طرح یہ وبائی بیماریوں میں مبتلا ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تہذیبیں بھی زیادہ دنوں تک نبھنے والی نہیں، آپ کا یہ فرض تھا، اللہ نے آپ کو یہ موقع دیا تھا، خدا نے یہاں ایسے مصلح (Reformer) پیدا کیے، اور خدا ترس انسان اور ایسے روحانی پیشوا پیدا کیے کہ جنہوں نے اس ملک کو نہیں بلکہ دوسرے ملکوں کو پیغام دیا، اور انہوں نے فائدہ اٹھایا، آپ کا فرض تھا کہ آپ امریکہ اور یورپ کو بچاتے، اور ان کی تہذیب جس کو اس وقت کیڑا لگ گیا ہے، زہر پیدا ہو گیا ہے، اور بس اس وقت دم توڑنے کے لیے تیار ہے، ان کا پروپیگنڈہ اور ان کے جو ذرائع ہیں، ان کے آلات اور ان کی ٹکنالوجی، ان کا سائنس، یہ چیزیں ان کو دھوکے میں رکھے ہوئے ہیں، جو وہاں زیادہ دن رہے ہیں اور رہتے ہیں، ان سے آپ پوچھیے، وہ کہتے ہیں کہ یہاں کی تہذیب بیمار ہو گئی ہے اور اب وہ کچھ دنوں کی مہمان ہے، وہ خودکشی کر لے گی، اور ان ملکوں کا انجام بھی وہی ہوگا جو تاریخ میں بہت سے ملکوں کی تہذیب کا ہوا۔

اس ملک کو ڈوبنے سے بچائیے

بھائیو! ایسے معزز حضرات کی موجودگی میں مجھے بہت زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں، میں آپ سے پھر کہتا ہوں، سیدھی سی بات یہ ہے کہ اس ملک پر دورہ پڑا ہے دولت پرستی کا، طاقت پرستی کا، سیاست پرستی کا اور فرقہ پرستی کا، آپ اس دورہ کے مقابلہ میں دورہ لائیے، دورہ پیدا کیجیے اصلاح کا، محبت کا، صلح و آشتی کا، اور انسانیت کے احترام کا، تب تو یہ ملک بچے گا، اور یہاں رہنے میں کچھ لطف آئے گا، اور اس ملک کا نام روشن ہوگا، اور اس کی دوسرے ملکوں میں عزت بھی ہوگی، اس کے لیے ہندوستان کی ایک تاریخ ہے، اور اگر یہ نہیں ہے تو پھر یاد رکھیے کہ پھر یہ دولت کسی کے کام نہیں آئے گی، یہ غلط فہمی ہوتی ہے انسان کو کہ میں اس وقت فائدہ اٹھالوں گا، وہ جتنا فائدہ اٹھالے گا اس کو اتنا ہی تاوان دینا پڑے گا، جب معاشرہ میں کوئی برائی پھیلتی ہے تو پھر ایک شخص تک وہ محدود نہیں رہتی، یہ تجربہ ہے اور کچھ فطرت ہے، اللہ نے نیچر بنائی ہے کہ فائدہ جب ہوتا ہے جب سب فائدہ میں شریک ہوں، سب کو فائدہ پہنچ سکے، تنہا ایک آدمی کا قارون بن جانا، ہامان بن جانا، سکندر بن جانا کافی نہیں ہوتا، اس کا انجام تاریخ نے اور ہم نے آپ نے دیکھا ہے۔

بس ہم کہتے ہیں کہ اس وقت سب سے ضروری کام یہ ہے کہ سب اپنے کام کرتے رہیے، لکھنے پڑھنے کے کام کیجیے، سیاست کے بھی کام کرتے رہیے، لیکن کچھ دیوانے ایسے ہونے چاہئیں جو اصلی سیانے ہیں، جو اس ملک کو ڈوبنے سے بچائیں، اور باہر نکل آئیں، اپنا کھانا پینا بھول جائیں، اور وہ ملک کو محسوس کرائیں کہ یہاں کچھ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈال دیا ہے، اگر ہم نے اپنا طرز عمل نہیں بدلا تو زندہ نہیں رہیں گے، یہ اتنے سنت حضرات ہندوستان میں ہیں، ہمارے سیاسی لیڈر اور اخلاقی معلمین ہیں، یونیورسٹیوں اور کالجوں کے پروفیسرس ہیں، ہمارے جرنلسٹس ہیں۔

صحافت کا کردار

جب میں نے جرنلسٹس کہہ دیا ہے تو میں کہتا ہوں کہ اس فساد میں بہت بڑا سبب جرنلزم کا بھی ہے، ایک مرتبہ اسی لکھنؤ میں ایڈیٹروں کی کانفرنس ہوئی تھی، اور ان کا ایک بہت بڑا وفد ہمارے ندوہ میں آیا تھا، تو میں نے ان کے سامنے فارسی کا ایک شعر پڑھا، فارسی کی غزل کا شعر ہے۔

زیر قدمت ہزار جان است
آہستہ خرام بلکہ مہ خرام

”دیکھو اے محبوبہ، تمہارے قدم کے نیچے ہزار جانیں ہیں، آہستہ چلو بلکہ نہ چلو۔“

ہم نے کہا: ہم آپ کے سامنے پڑھتے ہیں۔

زیر قلمت ہزار جان است
آہستہ خرام بلکہ مہ خرام

”آپ کے قلم کے نیچے ہزاروں جانیں ہیں، آپ آہستہ سے قلم چلائیے بلکہ نہ چلائیے۔“

ہم نے دیکھا ہے کہ یہ ساری دنیا، یہ ساری عمارتیں اور یہ سارے کام احساس تناسب پر چلتے ہیں، ہمارے اخبارات کے یہاں بالکل احساس تناسب نہیں، کوئی ذرا سی چیز ہوگی تو اس کو اتنا پھیلا کر دیں گے، اور کوئی بہت بڑی چیز ہوگی اس کا بالکل ذکر نہیں کریں گے، اگر بیماری بڑھ رہی ہے تو دینا چاہیے کہ کس تناسب سے بڑھ رہی ہے تاکہ اس کا علاج کیا جاسکے، میں وباؤں کا نام نہیں لیتا، لوگ اس وقت بہت ڈرے ہوئے ہیں، اگر کوئی چیز پھیل رہی ہے تو اس کو صحیح حقائق کے ساتھ دینا چاہیے، مثال کے طور پر کہتا ہوں کہ کلکتہ میں پرسنل لا بورڈ کا جلسہ ہوا، وہاں شہید مینار میدان ہے جہاں جلسہ ہوا، تو میں نے کئی آدمیوں سے پوچھا کہ کتنے آدمی ہوں گے، تو کسی نے کہا کہ پانچ لاکھ آدمی سے کم نہیں ہوں گے، علاقوں سے لوگ بسوں میں بھر کر آئے ہیں، پورا میدان بھرا ہوا تھا، جلسہ ختم ہوا، مجھے صبح ہی آسنسول جانا تھا، میں نے چلتے وقت کلکتہ کے تمام بڑے اخبارات خریدے، اس میں خبر تھی کہ چند سو مسلمان اس جلسہ میں شریک ہوئے، اسی طرح بمبئی میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے جلسے میں مسلمانوں کی تعداد غیر معمولی تھی لیکن انگریزی اخبارات نے خبر کو بہت معمولی طریقہ سے پیش کیا۔

اصل ہے انسانی ضمیر اور اخلاقی اصول

حضرات! دولت کی پوجا اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ جو غلط کام کرانا چاہو کرالو، فلاں فرقہ کا نام لو اور کہو کہ ہم فلاں ذات برادری کے ہیں، اور جو غلط کام کرانا چاہو وہ کرالو، اس جرم میں کہ یہ مسلمان ہے اس کے ساتھ ناانصافی کی جائے، ہندو ہے تو انصاف کیا جائے، اصل ہے اصول و صداقت اور خدا کا خوف، اصل ہے انسان کا ضمیر اور اخلاقی اصول، ان کے سامنے ذاتیں کچھ نہیں ہیں، اسلام میں تو یہاں تک کہہ دیا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سب انسان برابر ہیں، إِنَّ

أَبَاكُمْ وَاحِدٌ، إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ، تمہارا رب بھی ایک ہے اور باپ بھی ایک، لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ إِلَّا بِالتَّقْوَى،(۱) کسی عرب کو غیر عرب پر اور کسی غیر عرب کو کسی عرب پر کوئی فضیلت نہیں، سب خوبی اس کے عمل اور اصول کی ہے، اگر کوئی اصول پر عمل کرتا ہو تو وہ سر پر بٹھانے کے قابل ہے، اور کوئی عمل نہیں کرتا تو اس کو رد کر دینا چاہیے۔ ملک کو بچانے کے لیے اس وقت یہ پیام انسانیت کا جلسہ ہے اور پھر ایک ایسا منتخب مجموعہ اور پھر اس کا انتظام اور پھر جس طرح حاضری ہوئی، جس درجے کے ہمارے مہمان مقررین مدعووین حضرات شریک ہیں، ان سب سے یہ امید کرنی چاہیے کہ یہاں سے یہ ارادہ کر کے نکلیں گے کہ آپ اصول کا ساتھ دیں گے، انسانی ضمیر کی ترجمانی کریں گے، اور آپ کو اپنے مذہب، اخلاقیات اور اپنی تاریخ اور یہاں کی تعلیمات اور جو روایات اس ملک کی رہی ہیں، ان کے مطابق آپ اس ملک کو بربادی و تباہی سے بچائیں گے، اور اس ملک کو دنیا میں ایک لیڈرشپ کا، ایک قائدانہ کردار ادا کرنے کا موقع دیں گے۔

زمانہ آپ کا منتظر ہے

میں آپ سے صاف کہتا ہوں، دنیا کے ایک سیاح کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ آج دنیا کو انتظار ہے ایک ایسے قائد کا، اور آج پوری دنیا میں خلا ہے، ایک شگاف پڑا ہوا ہے کہ سب کچھ ہے، تہذیب ہے، ترقیات ہیں، تمدن ہے، دولت ہے، فوجیں ہیں، لیکن اخلاق نہیں ہیں، شکاگو میں ایک کانفرنس ہوئی تھی، میں اس میں بھی گیا تھا، اس میں تمام مذاہب کے نمائندے موجود تھے، میرا مضمون بھی چھپا تھا، اور پڑھا بھی گیا تھا، وہاں بھی یہ حال ہے جیسا کہ علامہ اقبالؔ نے کہا ہے یہاں کا جو رند ہے اس کو لغزش میخانہ نہیں ہے، وہ گرے گا تو یہ دیکھ کر گرے گا کہ زمین صاف ہے یا نہیں، کپڑے خراب تو نہیں ہوں گے، اور میں کس کروٹ گروں گا، مجھے چوٹ نہ آئے، یہ نہیں ہے بلکہ رند تو وہ ہے جو پرواہ نہ کرے کہ اس پر کیا گزرے گی، ایسے رندوں کی ضرورت ہے جو اپنی اور اپنے خاندان کی پرواہ نہ کریں، کسی چوٹ کی اور کسی مالی نقصان کی اور حکومت کے کسی منصب سے ہٹنے کی، اور وہ ملک کو دیکھیں اور کسی چیز کو نہ دیکھیں، اگر ایسا عنصر اس ملک میں رہتا ہے تو یہ ملک بچے گا۔ میں آپ سے صاف کہتا ہوں۔ ورنہ بڑا خطرہ ہے، آئندہ نسلیں ہماری اور آپ کی شکایت کریں گی، اور ہمیں مجرم گردانیں گی کہ انہوں نے اس ملک کو بچانے کی کوئی کوشش نہیں کی، یہ اپنے ساتھ بھی ناانصافی ہے، اور آئندہ آنے والی نسلوں کے ساتھ بھی ناانصافی ہے، اور اس ملک کے

(۱) مسند الإمام أحمد بن حنبل (۲۳۸۸۵)۔

ساتھ بھی ناانصافی ہے، اس ملک کے ہمارے اوپر اتنے احسانات ہیں، یہیں کی ہوا میں ہم سانس لیتے ہیں، یہیں کا پانی ہم پیتے ہیں، یہیں کی چیز ہم کھاتے ہیں، خدا نے ہم کو یہاں پیدا کیا۔

مسلمانوں کی ذمہ داری

میں مسلمانوں سے صاف کہتا ہوں کہ خدا نے آپ کو کہاں کہاں سے بھیجا، اس لیے بھیجا ہے کہ صرف یہاں کی نعمتوں سے فائدہ اٹھائیں؟ آپ پر ذمہ داری ہے، اگر کوئی نہیں تو آپ سامنے آئیں، میں صفائی سے کہتا ہوں کہ آپ کا اولین فرض ہے کہ آپ سامنے آئیں اور بتائیں کہ پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہے، طاقت ہی سب کچھ نہیں ہے، اصل چیز ہے خدا کی خوشی، اور اخلاق کی پابندی، اور ضمیر کی آواز کے مطابق چلنا، اصول پر عمل کرنا، اور ملک سے سچی محبت، اس کو اپنے خاندان، اپنی جان، اپنی اولاد پر ترجیح دینا، بس میں نے بلا ارادہ جو کچھ کہا اور خدا نے جو کچھ کہلوایا، ہمیں اس وقت کی سچی تصویر کو سامنے رکھنا تھا۔ (۱)

(۱) پندرہ روزہ "تعمیر حیات" لکھنؤ (شمارہ ۲۵/اکتوبر ۱۹۹۴ء)۔

۲۷

ملک کی فکر کیجیے![1]

حضرات! میں اس عظیم و وقیع مجمع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جو بڑے صحیح وقت پر اور صحیح مقام پر جمع ہوا ہے، اور ملک کی اہم ترین ضرورت کے پورا کرنے کے لیے اور اس کے اہم ترین مسئلہ پر غور کرنے کے لیے جمع ہوا ہے، جس سے اس ملک و معاشرہ کا مستقبل ہی نہیں اس کی قسمت اور تقدیر وابستہ ہے، اپنے کچھ باخبر خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں، شاید وہ اس ملک کو اختلاف اور انتشار ہی سے نہیں، نسل کشی (Genocide)؛ بلکہ خودکشی (Suicide) سے بچا سکے۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن

حضرات! یہ ایک خدائی فیصلہ اور تقدیری بات ہے (جس میں بہت سی حکمتیں اور رحمتیں شامل ہیں) کہ ہمارا یہ دیش ہندوستان مختلف قوموں، نسلوں، مذہبوں، زبانوں اور تہذیبوں کا مرکز رہے گا، یہ ایک پھول نہیں؛ پھولوں کا گلدستہ، ایک سایہ دار باثمر درخت نہیں؛ بلکہ بے شمار سایہ دار اور باثمر درختوں کا چمن ہوگا، اور اس ملک کے باشندے دنیا کو مذاہب، نسلوں، زبانوں اور فلسفوں کے اختلاف کے باوجود مل جل کر رہنے، ایک دوسرے کا احترام اور قدر کرنے، ایک دوسرے کی عزت و آبرو اپنی عزت و آبرو سمجھنے اور ملک کے مسائل اور مصائب ہی نہیں، بیرونی دنیا، اقوام و ممالک اور انسانی نسل کے مسائل و مصائب میں بھی نیک مشورہ دینے، ظلم و ناانصافی سے روکنے، مظلوم کی مدد کرنے اور حق بات کہنے کا نمونہ پیش کریں گے، اور ایسا اس ملک کی تاریخ میں کئی بار ہوا ہے، اور اس نے ہندوستان کا سر اونچا اور نام بلند کیا ہے، اور اس کی وجہ سے ملکوں میں ہندوستان

(۱) ۷ر دسمبر ۱۹۹۴ء کو نئی دہلی کے رام لیلا گراؤنڈ میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا، اس جلسے میں ڈاکٹر یونس نگرامی ندوی نے حضرت مولاناؒ کا یہ پیغام پڑھ کر سنایا۔ اس جلسہ میں وزیر مملکت جناب راجیش پائلٹ، کئی صوبوں کے وزرائے اعلی اور سو سے زائد ممبران پارلیمنٹ نے شرکت کی۔

کے نام ہی کی عزت نہیں ہوئی، ہر ہندوستانی کو عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔

میں اس موقع پر اس شہر کے جہاں آپ سب جمع ہیں، بلند پایہ شاعر استاذ ذوق کا وہ شعر پڑھوں گا جس کو مولانا آزاد نے بھی اپنی تحریروں میں نقل کیا ہے ۔

گل ہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے

ملک کی خطرناک صورت حال

لیکن اب اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر اور اس کو سنبھال کر کہتا ہوں کہ اس وقت کچھ عرصہ سے اس ملک کی صورت حال اور اس کے باشندوں بلکہ ملک میں اثر ورسوخ رکھنے والوں اور مختلف فرقوں اور سیاسی جماعتوں کا طرز عمل اس سے مختلف نہیں، بلکہ متضاد ہے، یہ ملک جو اپنے پریم اور محبت، بھائی چارہ، خوبی اور کمال کی قدر اور پڑوس وہمسائیگی کے لحاظ واحترام میں مشہور بلکہ ضرب المثل تھا، اب فرقہ وارانہ فسادات، انسان کشی اور باہمی نفرت اور اس سے آگے بڑھ کر عملاً جسمانی طور پر نسل کشی (Genocide) اور نقشے اور منصوبے کے اعتبار سے ثقافتی، لسانی، مذہبی، تہذیبی نسل کشی پر آمادہ معلوم ہوتا ہے، اور یہاں اب ان تین بنیادوں کے بجائے - جو اس ملک کے بقا وترقی کے لیے تجویز کی گئی تھیں: یعنی جمہوریت (Democracy)، عدم تشدد (Non-Violence) اور نامذہبیت سیکولرزم (Secularism) - اب اس ملک کے چار معبود بن گئے ہیں: ایک دولت، ایک طاقت، ایک سیاست اور ایک فرقہ واریت، جن کے سامنے جھکنے اور ان کو پالینے کے لیے سب کچھ کر گزرنے کے لیے ہر شخص تیار ہے۔

اور افسوس ہے کہ اس طویل وعریض ملک میں جو اپنی ایک شاندار تاریخ رکھتا ہے، اور جہاں محبت کے گیت ہر جگہ سنے جاتے تھے، اور جن سے یہاں کی شاعری اور ادب اور مذاہب ان کی تعلیمات، ہدایات اور مثالوں سے مالا مال تھے، وہاں حقیر سے حقیر دولت اور رقم کے لیے بے گناہ اور بے بس لڑکیوں اور دلہنوں کو بعض اوقات محض ایک چھوٹی سی رقم نہ لانے یا اسکوٹر کے ساتھ نہ آنے پر بے محابا جلا دیا جاتا ہے، طاقت حاصل کرنے اور سیاست کے لیے سب کچھ کرنا جائز سمجھا جاتا ہے، فرقہ وارانہ فسادات میں نہ عورتوں کو چھوڑا جاتا ہے نہ معصوم بچوں پر رحم کھایا جاتا ہے، اور حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ اس لمبے چوڑے ملک میں جہاں بڑی سے بڑی تعلیم گاہیں بھی ہیں اور عبادت خانے بھی اور آشرم بھی، پچاس آدمی بھی میدان میں آنے والے، اور اس صورت حال

کو بدلنے کے لیے جان کی بازی لگا دینے والے، اور کم از کم گاندھی جی کی طرح اپنی جان وصحت کو خطرہ میں ڈالنے والے اور پد یاترا اور مرن برت کرنے والے بھی نظر نہیں آتے۔ میں بڑی معذرت اور ندامت کے ساتھ یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس سے کم درجہ کے مظالم اور سفاکیوں کے نتیجے میں بعض بعض ملکوں اور تہذیبوں پر تقدیر وانصاف الٰہی نے قلم پھیر دیا اور تاریخ میں صرف ان کا نام باقی رہ گیا۔

آگ کو جب کچھ کھانے کو نہیں ملتا.....

اس پیغام کی قدرے طوالت اور معذرت کرتے ہوئے جس کو دردِ دل اور ملک دوستی نے قدرے طویل کردیا، آخر میں ایک فطری اور قدرتی نتیجہ، اور تاریخ بلکہ زندگی کے تجربہ کی طرف آپ کو متوجہ کرتے ہوئے اس سمع خراشی سے معافی چاہوں گا، وہ یہ کہ جیسا ایک عرب شاعر نے کہا ہے کہ آگ کو جب کچھ جلانے اور کھانے کو نہیں ملتا تو پھر وہ خود اپنے کو کھانے لگتی ہے۔

اَلنَّارُ تَأْكُلُ نَفْسَهَا
إِنْ لَمْ تَجِدْ مَا تَأْكُلُ

جب دولت پرستی اور طاقت پرستی کا یہ مرض اور فرقہ وارانہ منافرت بڑی حد تک اپنا کام کرلے گی، اور اس کے لیے باہر کا کوئی نشانہ نہیں رہے گا، تو پھر وہ ''اندرون خانہ'' اپنا کام کرنا شروع کردے گی، اور یہ آگ ہر گھر کو جلانا شروع کردے گی، پھر ذات برادریوں میں نفرت و رقابت کی آگ بھڑکے گی، اونچی ذات والے نیچی ذات والوں کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنائیں گے، اور نیچی ذات والے (اور یہ اونچے نیچے الفاظ اپنے مذہب کی تعلیم اور عمل سے معذرت کرتے ہوئے کہے جارہے ہیں) اونچی ذات والوں سے انتقام لینا شروع کریں گے، اور یہ ملک خانہ جنگی، برادرکشی اور ہم وطن وہم مذہب انسانوں کے قتل وغارت گری کا ایک میدان بن جائے گا، اس لیے باہمی منافرت، انسان دشمنی، خونریزی وسفاکی، دولت وطاقت پرستی اور سیاست کے لیے سب کچھ جائز سمجھنے اور کر گزرنے کے مرض کو اسی نقطۂ آغاز (Starting Point) پر روکنے کی ضرورت ہے، ورنہ اگر پانی سر سے اونچا ہوگیا اور آگ میدان میں پھیل گئی تو پھر اس ملک کو نہ کوئی فوجی طاقت بچاسکتی ہے، نہ کوئی سیاسی حکمت عملی، آخر میں اقبالؔ کا یہ شعر پڑھ کر آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ وفغاں نیز کنند

''تاکہ تو آپ بیدار ہو جائے اس لیے میں نے زور سے آہ بلند کی اور کراہا، ورنہ عشق ایسا کام ہے جو آہ وفغاں کے بغیر بھی کیا جاسکتا ہے۔''(۱)

(۱) پندرہ روزہ ''تعمیر حیات''، لکھنؤ (شمارہ ۱۰ر دسمبر ۱۹۹۴ء)۔

۲۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (۱)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفاً وَّطَمَعًا﴾ (سورة الأعراف:٥٦)

اللہ کے نام سے

میرے بھائیو، دوستو اور عزیزو! آج میں نے آپ کے سامنے بسم اللہ سے تقریر شروع کی ہے، سب لوگ جانتے ہیں کہ بسم اللہ کیا ہوتی ہے اور کب پڑھی جاتی ہے، لیکن بہت کم لوگوں نے غور کیا کہ بسم اللہ کے اندر کیا پیغام ہے، جب کوئی اہم کام شروع کرنا ہوتا تھا تو پیغمبر اسلام حضور اکرم ﷺ، صحابہ کرامؓ، بزرگان دین اور علمائے کرام سب کا طریقہ یہ تھا کہ بسم اللہ سے کام شروع کرتے، اور یہاں ہندوستان میں بھی آپ دیکھیں، مولانا آزاد ہوں یا اور کوئی دیش کے بڑے خدمت گزار اور اس کو آزاد کرنے والے، وہ بھی بسم اللہ پڑھنے کے کتنے عادی تھے، یہاں تک کہ کھانا کھانے کے لیے بھی یہی سنت ہے کہ پہلے بسم اللہ کی جائے، پھر اس کے بعد کھانا شروع کیا جائے، اور کوئی بڑا یا چھوٹا کام کرنا ہو تو بسم اللہ کہہ کر شروع کیا جائے، مگر آپ یہ سوچیے کہ جب اللہ کا نام لے کر شروع کیا جا رہا ہے تو اللہ کے نام تو بہت ہیں، ﴿وَلِلّٰهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى﴾ (سورة الأعراف:٥٦) قرآن شریف میں خود آتا ہے کہ اللہ کے بڑے اچھے نام ہیں، وہ جبار بھی ہے، قہار بھی ہے، طاقت والا قوی بھی ہے، توانا بھی ہے، قادر بھی ہے، اور وہ بڑے جلال والا ہے، بڑے کمال والا ہے، اور بڑے جمال والا ہے، سب کچھ ہے، مگر کیوں ہمیں یہ تعلیم دی گئی کہ جب ہم کام شروع کریں تو اللہ کے نام سے شروع کریں؟

(۱) بھٹکل میں ۱۰ر مارچ ۱۹۹۷ء کو منعقد جلسۂ پیام انسانیت میں کی گئی تقریر۔

صفات رحمت زندگی کا رخ متعین کرتی ہیں

اور اس کی صفتوں میں سے یہ دو صفتیں ''الرحمٰن الرحیم'' بڑی رحمت والا اور بڑا رحمٰن ہے، یہی مزاج بناتا ہے، یہ مسلمان ہی کا نہیں انسان کا مزاج بناتا ہے کہ خدا کی صفتوں میں سے ان دو صفتوں کو خاص طور پر یاد رکھے کہ ہم یہ کام شروع کر رہے ہیں اس خدا کے نام سے جو بڑی رحمت والا ہے اور بڑا مہربان ہے۔ یہاں کیا کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ ہم یہ کام شروع کر رہے ہیں اللہ کے نام سے جو بڑا قوی ہے، بڑا توانا ہے، بڑا قادر ہے، بڑی سلطنت والا ہے، بڑی قدرت والا ہے، لیکن یہ ''الرحمٰن الرحیم'' کی صفت اس میں اس لیے داخل کی گئی ہے تاکہ ہماری زندگی اس کے سانچے میں ڈھلے، اور ہم یہ سمجھیں کہ خدا جس نے ہم کو پیدا کیا، اور جو ہمیں زندہ رکھے ہوئے ہے، اور جو ایک ساتھ زندگی گزارنے کا موقع دے رہا ہے، ایک ملک میں ہمیں بسایا ہے اور ایک جگہ ہمیں پیدا کیا ہے، وہی کھلاتا ہے اور پلاتا ہے، وہ خدا جس کی یہ شان ہے، وہ تو ہے ہی لیکن ''الرحمٰن الرحیم'' بڑی رحمت والا اور بڑا مہربان اور بڑا ہی شفیق ہے، تو وہ اس سے ہماری زندگی کا رخ معین کرتا ہے کہ ہماری زندگی کا رخ رحمٰن کی طرف ہو، ہم یہ سمجھیں کہ ہم جس خدا کے بنائے ہوئے ہیں، جس خدا کے بندے ہیں، جو خدا ہمیں کھلا رہا ہے، پلا رہا ہے، ہماری حفاظت کر رہا ہے، اور پھر اس نے ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ بسایا ہے، وہ الرحمٰن الرحیم ہے، بڑی رحمت والا ہے، بڑا مہربان ہے۔

رحمت الٰہی ہر چیز پر سایہ فگن ہے

اور اسی طرح سورۂ فاتحہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ میں کیا کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا، یہ وہ چیزیں ہیں، جب کوئی چیز بہت زیادہ کان میں پڑتی ہے، ہر وقت سنائی دیتی ہے، اذان ہی ہے، کیا اذان کوئی نہیں سنتا لیکن اذان پر، اذان کے الفاظ پر، اذان کے معنی پر غور کرنے والے کتنے ہیں؟ کسی چیز کا علم ہونا آسان ہو جانا، قابو میں آجانا، ہر وقت سننا اور ہر وقت اسے دیکھنا وہ ایک حجاب بن جاتا ہے، ایک پردہ بن جاتا ہے، آپ خیال کیجیے کہ ''الحمد للہ'' سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، وہ رب العالمین ہے، سارے جہانوں کا پالنے والا ہے، ایک جہاں کا نہیں، ایک ملک کا نہیں، ایک سوسائٹی یا ایک ذات کا نہیں، ایک کلاس، ایک طبقہ اور ایک درجہ کا نہیں، ایک Standard کا نہیں، وہ تو رب العالمین ہے، سارے عالموں کا، ساری دنیاؤں کا پالنے والا ہے، ہماری دنیا، ستاروں کی دنیا، آسمانوں کی دنیا، اور پھر کہاں کہاں کی دنیا، کتنے براعظم کتنے ملک، یہ سب اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سایہ کے نیچے ہیں۔

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر

لہذا ہمیں یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ ہم رحمت کو، ایک دوسرے کو دیکھ کر خوش ہونے کو، ایک دوسرے کو دیکھ کر اس کو اپنا بھائی سمجھنے کو، اس کی ضرورت پوری کرنے کو، اس کی تکلیف دور کرنے کو اور اس کے غم ورنج میں شریک ہونے کو اپنا فرض سمجھیں، اور یہ سمجھیں کہ یہ خدا کی شان اور خدا کی صفتیں ہیں، ہمیں ان کو اپنا Ideal بنانا چاہیے، اپنا پیشوا اور اپنا رہنما بنانا چاہیے۔

زمین میں بگاڑ نہ پیدا کرو

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا﴾ ”زمین میں بگاڑ نہ پیدا کرو اس کے بنانے کے بعد“ کسی کو اپنا گھر بگڑتے ہوئے دیکھنا پسند نہیں آتا کہ کوئی اس کے بنائے ہوئے گھر کو بگاڑ دے، ایک معمولی سی چیز ہے، اگر بچہ بھی ذرا سا لکھے اور کوئی اس کو مٹا دینا چاہے، پھاڑ دینا چاہیے، تو اس بچہ کو بھی غصہ آئے گا، اور ایسے ہی کوئی اینٹ پر اینٹ رکھ دے، کوئی معمولی سا کام کرے، چاہے وہ سفر میں ہو یا حضر میں، اور اس میں کوئی دخل دے اور اس میں دست درازی کرے اور اس کی بنائی ہوئی چیز کو بگاڑے تو اس کو گوارا نہیں، تو پھر وہ خدا جس نے یہ دنیا پیدا کی، اور اس شان سے پیدا کی، اور کتنی وسیع پیدا کی، اور کتنی طویل اور عریض اور کتنی طویل العمر پیدا کی، تو اس کے بگاڑ کو خدا کیسے پسند کر سکتا ہے؟ یہ دنیا اس کی بنائی ہوئی ہے، وہی اس کو چلا رہا ہے، وہی اس کا مالک ہے، وہ اپنے گھر کو بگاڑنے کی اجازت کیسے دے سکتا ہے؟ آپ دیکھیے کہ ہمارا اور آپ کا گھر ہی کیا، میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ یہاں کے بڑے بڑے جو مرکزی حکمراں ہیں، اور دارالسلطنت (Capital) ہے، اور بڑے بڑے حکمرانوں کے محل ہیں، خدا کی اس دنیا کے سامنے ان کی کیا حیثیت ہے؟!! اگر آپ ان میں ذرا سی اینٹ توڑنا چاہیں، اگر اس میں درخت لگا ہوا ہے، اس درخت کو کاٹنا چاہیں، تو کوئی اس کو گوارا نہیں کرے گا، اللہ تعالیٰ جو سب سے زیادہ غیور ہے، جو سب سے زیادہ قادر ہے، اور سب سے زیادہ عزت والا ہے، وہ اپنے گھر کے بگاڑ کو کیسے پسند کرے گا؟

ظلم وزیادتی معاشرے کو کھا جاتی ہے

لیکن آج کیا ہو رہا ہے؟ آج ہم اسی گھر کے رہنے والے اسی گھر کو تباہ کر رہے ہیں، اور یہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ کوئی گھر اکیلا محفوظ نہیں رہ سکتا، کوئی گھر اگر شیشہ کا بنایا ہوا ہے، لوہے کا بنایا ہوا ہے، اور ہزار اس کے تحفظ کا سامان کیا جائے، اس کے علاوہ اور بھی جو اس کے تحفظ کے

ذرائع ہوسکتے ہیں وہ سب کیے جائیں کہ ہاتھ لگانے سے آدمی کا ہاتھ کٹ جائے، اور اس میں اور زیادتی کرنے سے آدمی کی جان چلی جائے، تب بھی کوئی گھر اس طرح محفوظ نہیں رہ سکتا، آپ کو معلوم ہے کہ جب لوگ اٹھتے تھے، فوجیں نکلتی تھیں، تو پھر ملک کے ملک الٹ پلٹ ہوجاتے تھے، اس میں نہ بادشاہ کا گھر بچتا تھا اور نہ کوئی کسی صدر جمہوریہ کا گھر بچتا تھا، نہ کسی بڑے دولت مند کا گھر بچتا تھا، نہ کسی حکیم و دانا کا گھر بچتا تھا، تو ہمیں سمجھنا چاہیے کہ یہ ہمارا گھر ہے، ہم سب اس کے رہنے والے ہیں، ہم اپنا گھر محفوظ رکھ ہی نہیں سکتے چاہے اس کے باہر شیشہ کی دیواریں بنادیں یا لوہے کا بڑا حصار بنادیں، اس کو روکنے کے لیے جو طریقے ہوتے ہیں، سب کریں، تب بھی جب موسم خراب ہوگا تو اس گھر پر بھی اثر پڑے گا، جب کوئی زلزلہ آئے گا تو اس گھر پر بھی اثر پڑے گا، جب زور کی بارش ہوگی تو وہ گھر بھی متاثر ہوگا، اور جب لوگوں کے اخلاق خراب ہوں گے اور لوگ کسی کی عزت کو عزت نہیں سمجھیں گے، جان کو جان نہیں سمجھیں گے، اور یہ سمجھیں کہ بس ہم محفوظ رہیں، ہمارے گھر کے بچے گھر والے محفوظ رہیں، باقی جو کچھ ہوجائے، تو ان کا گھر بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔

تاریخ کا دردناک سبق

دنیا کی تاریخ بتاتی ہے، جو Universal History ہے، History of the World ہے، آپ Gibbon کی The Decline and Fall of The Roman Empire کو پڑھیے، دیکھیے کہ ظلم کس طرح شروع ہوا تھا، اس سے کتنی بڑی رومۃ الکبری جو دنیا کا سب سے بڑا Empire تھا، جس کا Roman Law آج تک مشہور ہے، اور مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، اور جس کی تہذیب آج برطانیہ، امریکہ اور پورے یورپ پر آج بھی سایہ فگن ہے، تو اس ملک کا یہ زوال، اس کا یہ Decline and Fall کیسے شروع ہوا؟ اسی طرح کی زیادتیوں سے شروع ہوا، انسان کی ذات کی کوئی قیمت نہیں، مال کی کوئی قیمت نہیں، ایک معمولی بات جو انھوں نے لکھی کہ کوئی امیر آدمی اگر کوئی دعوت کرتا اور وہ سوچتا کہ اگر میں چراغ جلالوں اور شمع جلالوں تو مجھ میں اور ایک معمولی آدمی میں کیا فرق ہے، تو وہ روشنی کیسے پیدا کرتا؟ (آج بھی یورپ میں اصل کھانا جو ہے، ہم نے انگلینڈ میں دیکھا ہے لندن میں اور دوسری جگہوں پر رات کا کھانا اصل ہوتا ہے، اور اسی میں وہ سب سیاسی باتیں ہوتی ہیں، مشورے ہوتے ہیں اور اسکیمیں تیار ہوتی ہیں) تو جب امیر آدمی دعوت کرتا تھا تو بجائے چراغ جلانے کے،

شمع جلانے کے جیل خانہ سے قیدیوں کو بلوا کر اور منگوا کر ان کے کپڑے میں آگ لگا دیتا تھا، ان کے کپڑے جلتے رہیں اور وہ خود جلتے رہیں، اور ہم کھانا کھاتے رہیں، یہ فیشن تھا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کسی کی بڑائی کا، تو یہ کتنا بڑا ظلم تھا، پھر اس کے بعد انھوں نے لکھا ہے کہ وہ ان کو جانوروں سے لڑواتے تھے، اور جس وقت جانور ان کو گرا دیتا اور آدمی کی جان نکلنے لگتی تو اس کی سسکی سننے کے لیے، اس کی کراہ سننے کے لیے اس طرح ریلا ہوتا تھا کہ پولیس اور فوج بھی نہیں روک سکتی تھی، جب انسان کی فطرت اتنی بگڑ جاتی ہے، اتنی مسخ ہو جاتی ہے تو وہ ملک بھی سلامت نہیں رہتا، وہ پوری سوسائٹی پوری نسل سب کی سب تباہ کر دی جاتی ہے۔

مذہب امن کا پیامبر ہوتا ہے

میرے بھائیو! یہ مذہب جو سب سے بڑی تعلیم دیتا ہے، خدا کی پہچان کے بعد، اس کی یکتائی، اس کے قادر مطلق ہونے کے بعد، وہ یہ کہ انسانوں کے ساتھ، اپنے بھائیوں کے ساتھ، آدمؑ کی اولاد کے ساتھ مہربانی کرنا اور ان کو دیکھ کر خوش ہونا، ان کی ترقی سے، ان کی صحت سے، ان کی دولت سے خوش ہونا اور ان کی مدد کرنا، لیکن جب یہ بات چلی جائے پھر پوری کی پوری تہذیب (Civilization)، پورا Culture اور پورا جتنا بھی وہ پہلے ترکہ میں ملا ہے قوموں سے، وہ سارا کا سارا تباہ کر دیا جاتا ہے اور مٹا دیا جاتا ہے، آپ تاریخ میں دیکھیے کہ دنیا میں کتنے ملک ہیں، کتنی تہذیبیں ہیں، Civilizations ہیں، اور کتنے Cultures ہیں اور کتنے بڑے بڑے Empires ہیں، وہ سب کے سب مٹ کر رہ گئے، ان کا نام رہ گیا ہے۔

خدا کا قانون یکساں ہے

تو سب سے زیادہ جو ڈرنے کی بات ہے وہ ظلم و زیادتی ہے، غرور و تکبر ہے، اور اپنے چھوٹے سے مقصد کے لیے بڑے بگاڑ کو پسند کرنا ہے، یہ بگاڑ ہمیشہ چل نہیں سکتا، اور کوئی گھر ایسی حالت میں محفوظ نہیں رہ سکتا کہ دوسرے گھر محفوظ نہ ہوں، یہ سمجھ لیجیے، چاہے وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، خدا کا قانون یکساں ہے، ایک بادل چھایا ہوا ہو، اوپر سے ایک شامیانہ تنا ہوا ہو، وہ شامیانہ محبت کا ہو، وہ شامیانہ امن و امان کا ہو، وہ شامیانہ اعتماد کا ہو، ایک دوسرے پر Confidence کا ہو، یعنی یہاں تک یہ بات ہو کہ آدمی اپنے مال کے متعلق بھی یہ سوچے کہ کوئی ڈرنے کی بات نہیں، ایسی Society ہونی چاہیے۔

سب سے زیادہ خوش قسمت ملک

وہی ملک سب سے زیادہ خوش قسمت، سب سے زیادہ ترقی یافتہ، سب سے زیادہ قابل مبارکباد ہے کہ جہاں کے لوگ چور کی چوری سے نہ ڈریں، اور دھوکہ دینے سے نہ ڈریں، بے رحمی اور سنگ دلی سے نہ ڈریں، اور یہ سمجھیں کہ یہ سب بھائی ہیں، ایک کنبہ ہے، ایک فیملی ہے، یہاں کسی ڈر کی ضرورت نہیں، اور خاص طور پر ہمارا ہندوستان تو اس کا بہت زیادہ مستحق تھا، یہ تو رشی اور منیوں کا ملک ہے، یہ صوفیہ کا ملک ہے، یہ تو خدا کے ان بندوں کا ملک ہے جنہوں نے صالح محبت کا پرچار کیا، محبت کی تعلیم دی، محبت کر کے دکھایا، محبت کا سب کو سبق پڑھایا، اور یہ سبق سکھایا کہ ہر انسان کو دوسرے انسانوں کو دیکھ کر خوش ہونا چاہیے، کہ یہ ہمارا بھائی ہے، اس ملک میں تو خاص طور پر یہ بات ہونی چاہیے، بلکہ دوسرے ملکوں کے لیے اس ملک کو مثال بننا نمونہ بننا چاہیے تھا۔

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

مگر افسوس ہے جیسے شاعر نے کہا ہے:

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

باہر سے کوئی شعلہ نہیں آیا، باہر سے کوئی چنگاری تک نہیں آئی، یہاں جو کچھ ہوتا ہے وہ یہاں کے رہنے والوں کے ذریعہ ہوتا ہے، یہ Communal Riots، یہ دھوکہ اور یہ بے رحمی کی باتیں، سنگ دلی کی باتیں اور یہ فرقہ وارانہ فساد، یہ سب یہاں کے لوگوں کے کرتوت ہیں، ان کی کمزوریاں ہیں، باہر سے کسی نے آ کر یہ سبق نہیں پڑھایا، نہیں سکھایا، اور اگر کسی نے سکھایا تو اس کے سکھانے کی کوئی حیثیت نہیں تھی، یہاں کے جو رشی اور منیوں نے زندگی گزارنے کا طریقہ سکھایا، اور انہوں نے اس میں ساری عمر فنا کردی، محبت کا سبق دیا، اور انسانیت کی حفاظت کا سبق دیا، اپنے بھائیوں کی عزت کی حفاظت کرنا اور ان کے ناموس کی حفاظت کرنا، اور عورتوں کی عصمت وعزت اور ان کی آبرو کی حفاظت کرنا، اور لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ انصاف کرنا، اور ان کا حق دینا، اور اسی طریقہ سے کمزوروں پر رحم کھانا، یہ سب چیزیں ہمارے بزرگوں نے سکھائی ہیں۔

خدائی تعلیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہوتی ہے

آپ کتابوں میں دیکھیے، تاریخ بھری پڑی ہے کہ انہوں نے کس طریقہ سے یہاں پر رحم کا اور محبت کا سبق دیا تھا، اور جہاں تک آسمانی مذہب کا تعلق ہے، خدائی تعلیم کا تعلق ہے، وہ تو بسم

اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہی ہوتی ہے، تاکہ آپ سبق لیں، کام کرنے والا سبق لے کہ ہم جو کام شروع کررہے ہیں، وہ اس خدا کے نام سے شروع کررہے ہیں جو رحمٰن و رحیم ہے، قہار کہا جاسکتا تھا، قوی کہا جاسکتا تھا، جبار کہا جاسکتا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ''الرحمٰن الرحیم'' کو بسم اللہ میں کیوں داخل کیا؟ بسم اللہ کو اس کا جزو کیوں بنایا؟ تاکہ ہم اس سے سبق لیں۔!!

ہندوستان محبت کی سرزمین ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفت جو سب پر غالب ہے، اور حاوی ہے، اور جو سارے جہاں کی حفاظت کرنے والی ہے، وہ رحمت کی صفت ہے، اس رحمت کی صفت کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے، دوسرے کی عزت وناموس کو اپنی عزت وناموس سمجھنا چاہیے، دوسرے کی ملکیت کو، اس کے مال کو اپنے بھائی کا مال سمجھنا چاہیے، اس کی حفاظت کرنا چاہیے، اور کم ازکم ہندوستان کو تو اس بارے میں وہ Leading Part ادا کرنا چاہیے تھا کہ تمام ملکوں میں اس سے سبق لیا جاتا، اور اس کو استاد مانا جاتا، اور یہاں کے لوگوں کو بلایا جاتا، یورپ میں دعوت دی جاتی، امریکہ میں دعوت دی جاتی کہ کسی ہندوستانی کو بلاؤ، وہ امن کا پیغام دے گا، اور وہ محبت کرنا سکھائے گا، سب سے زیادہ محبت اور مساوات اس ملک میں پائی جاتی ہے، مگر افسوس ہے کہ یہاں بجائے اس کے اپنے عارضی اور حقیر چھوٹے چھوٹے سیاسی مقاصد اور مفاد حاصل کرنے کے لیے، یا مالی فوائد حاصل کرنے کے لیے، یا عزت ووجاہت پیدا کرنے کے لیے، اور کونسل اسمبلی وغیرہ میں منتخب ہونے کے لیے ایک دوسرے سے باہمی منافرت کا سبق دیا جاتا ہے کہ کس وقت ہمارا کام کس طرح نکل سکتا ہے، دشمنی ہو، ایک دوسرے سے عداوت ہو، پھر اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اور اس سے عزت حاصل کرتے ہیں، حالانکہ یہ عزت عزت نہیں، جس میں ملک کی بے عزتی ہو، وہ کسی آدمی کی عزت نہیں ہوسکتی، چاہے وہ کتنا بڑا ہو، بس آپ کم سے کم یہ طے کرلیں کہ ہم یہ فضا پیدا کریں گے، اور اس طرح کا ایک محبت کا شامیانہ ہمارے اوپر تنا ہوا ہوگا۔

مثالی جگہ بنائیے

آپ بھٹکل کے ہی سب ہندو مسلمان بھائی کم ازکم اس کو ایک نمونہ کی جگہ بنائیے، ایک ایسی مثالی جگہ (Model) کہ جس کو دیکھنے کے لیے لوگ باہر سے آئیں، اور وہ دیکھیں کہ محبت کا شامیانہ تنا ہوا ہے، اور محبت کی فضا چھائی ہوئی ہے، اور جہاں پہنچ کر انسانیت کی قدر ہوتی ہے، اور یہ دولت، عزت اور وزارت، حکومت ساری چیزیں بالکل عارضی اور محدود ہیں، اور ان سے کسی

ملک کی قسمت وابستہ ہو جائے یا اس کو Ideal مان لیا جائے، تو ملک بچ نہیں سکتا، ساری تاریخ بھری ہوئی ہے کہ جہاں پر یہ چیز ہو کہ صرف دولت کی پوجا ہو، اور اپنا مطلب نکالنا مقصود ہو، چاہے کسی کا کتنا ہی کیوں نہ نقصان ہو، پھر وہاں کوئی سوسائٹی نہیں رہ سکی، وہ خودکشی کرتی ہے، ایک دوسرے کو ختم کرتی ہے، پھر اپنے کو ختم کرتی ہے، ایک دوسرے کو ختم کرنا اپنے کو ختم کرنا ہے۔

ملک بچانے کا واحد راستہ

بس بھائیو! ہمارے اس ملک کو خاص طور پر اس میں Leading Part ادا کرنا چاہیے، پیشوائی کا جو منصب ہے، وہ ہمیں قبول کرنا چاہیے، اور اس کی ذمہ داری سنبھالنی چاہیے کہ وہ دنیا کے لیے ایک نمونہ بنے، مگر افسوس ہے کہ یہاں Communal Riots اور یہاں چھوٹے چھوٹے اور حقیر مقاصد کے لیے، ایک دوسرے کی عزت و آبرو پر ہاتھ ڈالنا اور جان کی پرواہ نہ کرنا، جان لے لینا اور اس کو تباہ کر دینا، یہ روزمرہ کا کھیل بن گیا ہے، اس سے ہمارے ملک کی بڑی بدنامی ہوتی ہے، میں چونکہ باہر جاتا رہتا ہوں، امریکہ اور یورپ کے دورے بھی ہوتے ہیں، عرب ممالک میں شاید ہی کوئی ملک بچا ہو گا جہاں میں نہ گیا ہوں، تو یہ بات ہندوستان کی وہاں پہنچ گئی ہے، وہاں خبر لگ گئی ہے کہ ہندوستان میں Communal Riots بہت ہوتے ہیں، اور وہاں اس میں جو محبت ہونی چاہیے، شہریوں میں جو اُلفت ہونی چاہیے، نہیں پائی جاتی ہے، اس سے خود ہمارا سر ندامت اور شرمندگی سے جھک جاتا ہے کیا کہا جائے، کیا ہم لوگ اس کا انکار کر سکتے ہیں؟ جتنے بھی یہ واقعات ہیں، اخباروں میں آتے ہیں، اور ریڈیو وغیرہ سے ایک دوسرے ملکوں تک پہنچ جاتے ہیں، کتابیں بھی جاتی ہیں، اور اس پر Criticise ہوتا ہے، تنقید ہوتی ہے، لیکن ہم انکار بھی نہیں کر سکتے، تو ہم ہندوستانیوں کو باہر جانے کے قابل رکھیے، ہم مسلمانوں کو جانے کے قابل بنائیے کہ ہم وہاں آنکھیں ملا سکیں، بلکہ ان سے کہہ سکیں کہ نہیں! ہم تو امن و محبت کا پیغام دیتے ہیں، ہم سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں، اور بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔

اس وقت ہندوستانیوں کو سب سے زیادہ اس چیز کی ضرورت ہے، اگر یہ چیز پیدا ہو گئی تو یہ ملک باقی رہے گا، یہ پارٹیوں کے بدل جانے سے، وزارتوں کے بدل جانے سے، کسی کے مستعفی ہونے سے یا کسی کے الیکشن ہار جانے اور اس کو اپنی Majority ثابت نہ کر سکنے سے یہ ملک نہیں بچ سکتا، یہ ملک بچے گا امن سے، محبت سے، پریم سے، ایک دوسرے پر اعتبار کرنے سے، اب یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ آدمی ایک پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ آدمی کا اعتبار نہ کرے، پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ بڑی

سے بڑی مالیت کی چیز بغیر کسی ڈر کے چھوڑ جاتے تھے، لیکن اب تو ذرا سی چیز بھی نہیں چھوڑ سکتے۔

محبت کو عام کیجیے

ریلوں پر کیا ہوتا ہے اور بازاروں میں کیا ہوتا ہے، یہاں بھی اور ہمارے پڑوسی ملک میں کیا ہوتا ہے؟ میں صاف کہتا ہوں، کسی میں بھی وہ فضا نہیں ہے جو فضا ہونی چاہیے، ایک دوسرے پر اعتبار کرنے کی اور ایک دوسرے کی عزت کرنے کی، اور اس کی عزت و آبرو سمجھنے، اس کے عزیزوں کو اپنے خاندان ہی کا فرد سمجھنے کی، مختصر بات یہ ہے محبت کو عام کیجیے تا کہ آدمی یہ سمجھے کہ شریف اور پڑھا لکھا آدمی ہے، ہمارے ملک کا ہمارا ہم وطن آدمی ہے، اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، جب آدمی اپنے ہم وطنوں سے ڈرنے لگے، اور پھر کیا؟ سانپ اور بچھو کا موقع کب آتا ہے؟ وہ کب ظاہر ہوتے ہیں؟ آدمی کا تو آدمی سے کام پڑتا ہے، ایک محلّہ میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں، بعض اوقات تو ایک ہوٹل میں معلوم نہیں کتنے مذہب کے لوگ ٹھہرے ہوئے ہوتے ہیں، ایک اسکول میں کالج میں پڑھتے ہیں، یونیورسٹی میں سب میں مختلف مذاہب کے لوگ ہوتے ہیں، انہیں چاہیے کہ ایک دوسرے کی عزت کریں، ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھیں، اور اس کی طرف سے مدافعت (Defence) کریں، حفاظت کریں، اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق دے، اگر ایسا ہم کریں گے تو ہمارا یہ ملک چمن بن جائے گا، گلزار بن جائے گا، اور پھر اس دنیا میں اس کا نام ہوگا، اور لوگ اس کو دیکھنے آئیں گے کہ یہ کیسا باغ و بہار ملک ہے، کیسی محبت و پریم ہے، اور بھائی چارہ کا ملک ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس کے بجائے ہماری شہرت دوسرے ملکوں میں دوسری طرح ہو رہی ہے، اور ہمارے ملک کی جو شناخت ہے، جس پر ہمیں فخر تھا، وہ جاتی رہی، لیکن اب ہمیں چاہیے کہ ہم ایک نیا Model پیش کریں، ہماری زندگی کا اس سے پھر وہ اعتبار، وہ شناخت اور عزت و وقار جو تھا، واپس آئے، و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔[1]

---

(۱) ماخوذ از پندرہ روزہ ''تعمیر حیات'' لکھنؤ (شمارہ ۲۵ رجون ۱۹۹۷ء) و ''ملت اسلامیہ کا مقام و پیغام''، (صفحہ ۲۳۹ تا ۲۵۰)۔

۲۹

انسانیت کی بقاو تحفظ کی فکر (۱)

تعجب کی بات

حضرات! مجھے آپ جیسے موقر حضرات کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، میں بڑے مجمع کا ہرگز قائل نہیں ہوں، لوگ تھوڑے ہی ہوں لیکن ان کے اندر نت نئے جذبات موجزن ہوں، انسانیت کا درد ہو، خلوص ہو، ان کے اندر قربانی دینے کا جذبہ ہو، یہی اصل مقصود بھی ہے، تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ ہمیشہ انقلاب برپا کرنے والے تھوڑے ہی ہوتے ہیں، لہذا مجھے چند چیدہ افراد پر مشتمل ایک چھوٹا سا مجمع دیکھ کر اس لیے بہت خوشی ہو رہی ہے کہ آپ میں سے ہر ایک حقیقت کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

میرے بھائیو! ایک باپ کو جتنا غم اپنے بیٹے کی بیماری پر ہوتا ہے، سچ تو یہ ہے کہ اتنا ہی غم اپنے پڑوسی کے بیمار ہو جانے پر، اتنا ہی غم اپنے گاؤں میں بسنے والے کسی بیمار فرد پر، اتنا ہی غم اپنے ملک کے کسی بھائی کے بیمار پڑ جانے پر ہونا چاہیے، یاد رکھیے! تاریخ اس بات پر گواہ ہے، بلکہ میں بھی تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ جب بھی یہ حسین جذبہ کسی حساس دل کے اندر پیدا ہوا تو اس نے ہماری سوسائٹی کو بدل ڈالا، ماحول اور معاشرے میں اصلاح کا زبردست کام کیا، اور اپنا نام روشن کیا، گھر اور خاندان کا نام روشن کیا، اپنے ملک کا نام روشن کیا لیکن یاد رکھیے! یہ کام انھیں خوش قسمت افراد کے ہاتھوں انجام پاتا ہے جن کا ذہن و دماغ عصبیت سے خالی ہوتا ہے، جو انسانیت کی بقاو تحفظ کی خاطر جان عزیز تک کی بازی لگا دیتے ہیں، لیکن انسانیت پر آنچ نہیں آنے دیتے، لیکن افسوس اس بات پر ہے کہ آج معاملہ خلاف فطرت ہے، انسان انسان سے

---

(۱) ۶-۷/جون ۱۹۹۸ء کو پونا میں رابطہ ادب اسلامی کی جانب سے منعقد ہونے والے سیمینار کے موقع پر پیام انسانیت کے ایک جلسہ میں کی گئی تقریر۔

وحشت کھائے، انسان انسان سے ڈرے، یہ بڑے تعجب کی بات ہے، انسان شیروں سے ڈرے، انسان پھاڑ کھا جانے والے درندوں سے ڈرے، لیکن انسان انسان سے ڈرے؟ یہ بڑے تعجب اور خسارے بلکہ انسانی بقا و تحفظ کے خلاف بات ہے۔

ہماری ذمہ داری

میرے بھائیو! ہمیں چاہیے کہ ہم سب مل کر اپنے اس ملک میں نظام امن پیدا کریں، اپنے ملک کے وقار کو مجروح نہ ہونے دیں، آپس میں میل محبت کے ساتھ رہیں، کسی کے بارے میں غیر ہونے کا گھٹیا تصور و خیال بھی ہمارے ذہن و دماغ میں نہ آنے پائے، یہی وہ ملک ہے جس کے پریم و محبت کی داستان سرائی دوسرے ملکوں میں ہوتی تھی، بلکہ آج بھی ہوتی ہے، میں ایک سیاح کی حیثیت سے بھی کہتا ہوں، اور مجھے بار بار یورپ، امریکہ اور دنیا کے مشہور ممالک میں جانے کا اتفاق ہوا ہے، اور خود یہ میرا مشاہدہ بھی ہے کہ جب لوگ یہ جان جاتے ہیں کہ یہ ہندوستانی ہیں تو یہ سمجھتے ہوئے بڑی قدر اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، کہ یہ وہ قوم ہے، اور یہ ایسے ملک کے رہنے والے ہیں جن کے اندر اختلاط کا حسین امتزاج ہے۔

میرے بھائیو! اب ان کی یہ خوش فہمی اور ان کا یہ خواب اس وقت شرمندۂ تعبیر ہوگا جب کہ ہمارے اندر میل و محبت ہو، اور ہم میں جو ایک دوسرے کو گھٹیا سمجھنے کا غلط تصور پایا جاتا ہے، وہ ختم ہو جائے، اگر ہم ایسا نہیں کرتے ہیں تو ہم نے اپنے ملک کے ساتھ انصاف نہیں کیا، بلکہ میں اس سے آگے بڑھ کر کہوں گا کہ ہم نے اپنی ذات کے ساتھ ناانصافی کی۔

یاد رکھیے! اگر معاملہ اس کے برعکس ہے تو میں آپ سے معذرت چاہتے ہوئے صاف صاف یہ کہتا ہوں اور کہوں گا کہ اس ملک ہندوستان کے لیے بھی خطرہ ہے، یاد رکھیے! تاریخ نے آج تک کسی کو بخشا نہیں، آپ رومۃ الکبریٰ کے زوال کی تاریخ پڑھیے، ان کے یہاں جب کھانے کے وقت روشنی کی ضرورت پڑتی تو قیدیوں کو دربار میں لا لا کر جلایا جاتا اور جلنے کی وجہ سے جو ان کے جسم سے روشنی نکلتی اس میں بیٹھ کر کھانا کھاتے، ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے، اپنی اپنی محفلیں سجاتے، ان کے یہاں بھیڑیوں کو آدمیوں کے ساتھ بھڑا دیا جاتا اور یہ کھڑے تماشے دیکھتے، گبن (Gibbon) نے اس قسم کے واقعات اپنی کتاب The Decline and Fall of The Roman Empire میں جمع کیے ہیں، آپ چاہیں تو ان کی کتاب پڑھیں، اسی طرح آپ پرشین ایمپائر کے زوال کی تاریخ پڑھیں، یہ دنیا کے مختلف ملکوں کو فتح

کر کے ہندوستان کے باڈر تک آ پہنچا، لیکن اخلاقی نہیں، ذہنی و دماغی عصبیت اور دوسروں کو اپنے سے کمتر اور حقیر سمجھنے کے تصور نے اس کے ستارے کو بھی غروب کر کے چھوڑا، اس کے علاوہ میں آپ سے معذرت چاہتے ہوئے یہ بات بھی کہوں گا کہ بعینہ یہی حال آج یورپ اور ان ترقی یافتہ ملکوں کا ہے جن کے یہاں اخلاق نام کی کوئی چیز نہیں، جو کسی حال میں اپنے سے بڑا کسی کو ماننے کے لیے تیار نہیں، قریب ہے کہ یہ بھی زوال و اضمحلال کا شکار ہو، بلکہ اب اس کے آثار بھی نمایاں ہو رہے ہیں۔

ترقیات کے پردے میں تنزل و انحطاط

میرے بھائیو! آزادئ ملک کے باوجود آج ہم میں اتحاد نہیں، آج دنیا کے اندر بڑی بڑی مشینیں کام کر رہی ہیں، لیکن صرف اخوت، بھائی چارگی، مساوات، ہمدردی، انسانیت کے ناطے ایک دوسرے پر مرمٹنے کے حسین جذبہ کی ہی مشین اپنا کام نہیں کر رہی ہے، آج اگر ساری مادی طاقتوں کے باوجود قوموں اور ملکوں میں اتحاد اور بھائی چارگی نہیں، تو یاد رکھیے، میں صاف صاف کہتا ہوں، یہ ترقیات نہیں بلکہ ترقیات کے پردے میں تنزل و انحطاط ہے، علامہ اقبالؔ نے کیا خوب کہا ہے:

ڈھونڈ ھنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاؤں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

ہمارے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی مادی طاقت نہ تھی، لیکن انھوں نے جو دنیائے انسانیت کے سامنے پیغام پیش کیا، آپ اگر دیانت داری کے ساتھ تاریخ کا مطالعہ کریں تو خود حقیقت آپ کے سامنے واشگاف ہو جائے گی۔

اسی طرح میں اس حقیقت کا بھی اعتراف کرتا ہوں کہ جس محبت و درد والے لوگ اس ملک ہندوستان میں پیدا ہوئے، شاید کسی اور ملک میں پیدا نہ ہوئے ہوں، آپ مولانا ابوالکلام آزادؔ کی

زندگی دیکھیں، آپ مولانا محمد علی جوہر کی زندگی کا جائزہ لیں، اسی طرح گاندھی جی کی خدمات پر غور کریں، تو یہ بات آپ کی سمجھ میں آجائے گی کہ کسی انسان کی ترقی کے لیے یا کسی ملک کی ترقی کے لیے کن کن عناصر کی ضرورت پڑتی ہے، اور کن کن قربانیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

آج کی ضرورت

لہذا آج ضرورت ہے کہ اپنے اندر سوز دروں اور جذبۂ صادق پیدا کیا جائے، اپنے اخلاق کو بلند کیا جائے، ایک دوسرے سے بھائی چارگی کے ناطے، انسانیت کے ناطے ملنے جلنے کے رواج کو بغیر کسی بھید بھاؤ کے عام کیا جائے، یاد رکھیے! یہی وہ عناصر ہیں جن کے بغیر کسی قوم وملک میں تبدیلی نہیں آسکتی، بس اخیر میں آپ سے یہی اپیل کرتا ہوں کہ آپ اس ملک کو بچانے کی کوشش کریں، اگر یہ ملک بچا تو یقیناً یہ دوسرے ملکوں کے بھی کام آئے گا، لیکن یہ اسی وقت ہوگا جب کہ ہمارا ذہن و دماغ بھید بھاؤ سے خالی ہو، اور ہمارے اندر اختلاط، آپس میں میل جول، الفت ومحبت کا حسین امتزاج ہو، میں اپنی بات اس امید کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ اب ہم ان شاء اللہ ایک نیا جذبہ لے کر کھڑے ہوں گے، اور اپنے ملک کے بقا وتحفظ کی خاطر اپنے اپنے سینے میں ایک چبھن محسوس کریں گے، اور ہم سب ایک پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر اپنے اپنے ملک کی فکر کریں گے۔ (۱)

---

(۱) پندرہ روزہ "تعمیر حیات" لکھنؤ (شمارہ ۱۰ ر جولائی ۱۹۹۸ء)۔